میر تقی میر
حیات اور شاعری

میر تقی میرؔ

حیات اور شاعری

از

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی

ریڈر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

مُصنّف کی دوسری کتابیں:

(۱) مکتوباتِ اُردو کا ادبی و تاریخی ارتقاء
(۲) کلاسکی ادب (تنقیدی مضامین)
(۳) تحریکِ آزادی اور اردو ادب
(۴) مرزا شوق لکھنوی

اشاعت اوّل
جولائی ۱۹۵۴ء عیسوی
شائع کردہ:- انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ
مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی
قیمت ۱۲ بارہ روپے

ترتیب

بہ عزِّ قبولِ نگاہ

قبلۂ دیدہ و دل حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مدّ ظلّہم

وزیر معارف جمہوریہ ہند

دیباچہ

میر تقی میر: حیات اور شاعری سنہ ۱۹۴۰ء میں ایک مختصر مقالہ کے طور پر شروع کی گئی تھی لیکن شوق کی بے پایانی سے پوری ایک کتاب بن گئی اور سنہ ۱۹۴۵ء میں پہلی مرتبہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مگر یہ مسودہ میری غلطی سے ضائع ہو گیا۔ آج بھی اُس کے خیال سے تشنہ لبی کا وہ گلو گیر احساس پیدا ہو جاتا ہے جس کے متعلق عرفی نے کہا ہے:

العطش می زند از تشنہ لبی ہر مُوئیم که قدح ہائے پُر از خونِ جگر باختہ ام

سنہ ۱۹۴۸ء میں مَیں نے ہمّت کر کے اس کام کو دوبارہ شروع کیا اور خدا کا شکر ہے کہ یہ نقشِ ثانی، جو مواد کی فراہمی اور ترتیب کے اعتبار سے نقشِ اول سے بہتر ہے، اکتوبر سنہ ۱۹۵۳ء میں مکمل ہو گیا۔

میر کا درجہ ہمارے کلاسکی ادب میں بہت ممتاز ہے ان کی حیثیت ایک منجمد اکائی کی نہیں ہے۔ وہ ادبی ارتقا کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔ انھوں نے صرف اپنے زمانے ہی کے ادب پر نقش نہیں چھوڑا بلکہ مستقبل کی گزرگاہوں کو بھی روشن کر دیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک اُن کی حیات اور شاعری پر کوئی مبسوط اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع پر مواد کی کمی نہیں ہے لیکن وہ بکھرا ہوا ہے اور کسی ایک مقام پر مجتمع نہیں۔ اسی لئے اُس کی تالیف کی ذمہ داریاں بھی سخت ہیں۔ ضرورت اِس کی ہے کہ دید و دریافت اور تنقید و تحقیق سے کام لے کر اس پورے مواد کو ایک لڑی میں پرو دیا جائے اور اُسے سماجی حقائق کی روشنی

میں اس ترتیب سے جلوہ گر کیا جائے کہ میر اور عہدِ میر کا ایک صحیح مرقع پیش نظر ہو جائے۔
اس کتاب کے لکھتے وقت میرے سامنے یہی مقاصد تھے لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ ان ذمہ داریوں سے کہاں تک عہدہ برا ہو سکا ہوں۔ میر کی تصویر غیر معتبر روایتوں کی گرد میں اس طرح اٹی ہوئی تھی کہ اُن کی سیرت اور شخصیت کے اصلی خط و خال ہی نظروں سے چھپ گئے تھے میں نے مستند مآخذ کی مدد سے اُن کے ذہن اور زمانے کو سمجھنے اور ادبی تاریخ میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی کتاب جامعیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ زیرِ نظر مقالہ میں بھی بہت سی خامیاں ہیں لیکن جہاں تک ہو سکا ہے میں نے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ، قلمی اور نادر مواد کی مدد سے میر کے ذہنی سفر کا تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں مجھے پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، حضرت اثر لکھنوی، جناب قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے بہت مفید مشورے دیے ہیں اور میں اِن حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ کتاب شاید اب بھی نہ چھپتی اور چھپتی تو اتنی اچھی نہ چھپتی اگر مخدومی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب کی عنایتیں شاملِ حال نہ ہوتیں۔ اس مرقع میں آپ کو جو خوشنما رنگ نظر آئیں گے وہ دراصل اُن کی محبت و شفقت، اور نیک کام میں اعانت کے جذبے ہی نے بھرے ہیں۔

خاکسار
خواجہ احمد فاروقی

دہلی یونی ورسٹی
جمعہ، ۲ جولائی ۱۹۵۴ء

مقدمہ

میر تقی میر کے کمالات کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہمیں ان کی زندگی اور شاعری کو تاریخ اور ادب کے بڑے نقشے میں دیکھنا چاہیئے۔ نوادر الکملا کی رُو سے ان کی عمر نوّے برس کے قریب ہوئی۔ اس طویل مدت میں نادر شاہ کے حملے سے لے کر عبدالقادر روہیلے کے جور و ستم تک بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے اور سلطنت مغلیہ نے زوال و انحطاط کے تمام مدارج و منازل طے کر لئے۔ میر ان واقعات کے تماشائی نہیں، اس قلزم خون کے شناور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تخیل اور جذبے کے تمام نقش و نگار ان ہی خارجی احوال کا عکس معلوم ہوتے ہیں۔

سلطنت مغلیہ کا زوال تاریخ کا ناگہانی حادثہ نہیں، اسباب و علل کا ایک سلسلہ ہے جس کی ابتدا بعض مورخین نے شاہ جہاں کے آخری زمانہ سے کی ہے جب اس کے بیٹوں میں تاج و تخت کے لئے جنگ چھڑی اور ملک کی اقتصادی حالت بگڑ گئی۔ اس دور کے ایک شاعر بہشتی نے آشوب نامۂ ہندوستان

کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں "سوانحے کہ در اثنائے ۱۰۶۸ھ/۱۶۵۷ء و دریں عالم کون و مکان ظہور آمدہ" کے عنوان سے مختلف طبقوں کی اقتصادی بدحالی، پیشوں اور صنعتوں کی بے رونقی، تجارت کی بربادی اور عام بے نوکری و بیروزگاری کا ذکر کیا ہے۔[1]

بعض لکھنے والوں نے اس زوال کی ابتدا اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء سے کی ہے۔ جو امراء محفل سے اُٹھ گئے تھے، ان کی جگہ خالی تھی۔ بادشاہ اور اس کے وزیروں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اتنی بڑی سلطنت کے شیرازہ کو قائم رکھ سکیں بہادر شاہ اول جو دو برس تک بھائیوں کا خون بہانے کے بعد تاج و تخت کا مالک بنا تھا، ۱۷۱۲ء میں مرگیا اور پھر وہی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ اس وقت ایسی غارت گری اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی کہ ایک مہینہ تک بادشاہ کا مُردہ بے گور و کفن پڑا رہا اور کسی کو اس کے تجہیز و تکفین کی فکر نہ ہوئی۔ ۱۷۱۲ء میں جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ ہر وقت غرق مے ناب رہتا تھا۔ اس لئے معاملات سلطنت میں ایک ادنیٰ درجہ کی عورت لال کنور دخیل ہوگئی۔ اس کے زمانہ میں نااہلوں کو ایسا عروج ہوا کہ "باز کے آشیانے میں جغد آباد ہوگئے اور بلبل کی جگہ زاغ نے لے لی۔" لیکن ایک سال کے بعد فرخ سیر نے جہاں دار شاہ کو بڑی بے رحمی اور سفاکی سے قتل کرا دیا اور سادات بارہ کی مدد سے خود بادشاہ بن بیٹھا فرخ سیر کا زمانہ درباری سازشوں کے لئے مشہور ہے۔ اس کا بھگتان سب سے زیادہ خود اسے بھگتنا پڑا۔ ۱۷۱۹ء میں اسے اندھا کرکے قتل کر دیا گیا، اور سلطنت محمد شاہ کے ہاتھ میں آگئی اس کی رامش و رنگ[2] کی دلچسپیاں اتنی مشہور ہیں کہ

---

[1] مثنوی آشوب ہندوستان بہشتی: مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر ۲۶۲۲۳۵ [2] محمد شاہ کی ٹوڑی جس کے شوق میں سلطنت ادھ موئی کر چھوڑی اب تک مشہور ہے: مرقع زبان و بیان دہلی از سید احمد دہلوی طبع ۱۹۱۵ء۔

ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسی کے دورِ حکومت میں نادر شاہ کا حملہ ہوا، جس نے سلطنت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ (۱۷۳۹ء)

سلطنتِ مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہادر شاہ کے زمانہ سے لے کر نادر شاہ کے حملے تک اس کے ٹہنے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ بہادر شاہ اول اور فرخ سیر نے سکھوں کا مقابلہ بڑی پامردی سے کیا تھا۔ اور ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں تو محمد شاہ نے ابدالی کی فوجوں کو بھی ہرا دیا تھا لیکن یہ اتفاقی بات تھی جیسا کہ اس کی تاریخ "فتح خدا ساز" (۱۱۶۱ھ) سے ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغلوں کی بربادی ۱۷۳۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے حملہ نے اُن کی کمر توڑ دی اور بقول شاہ ولی اللہ رح "از سلطنت بجز نامے باقی نماند"۔

آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں مغلوں کے عسکری زوال کا جابجا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح شاکر ناجی نے اپنے شہر آشوب میں اقتصادی اور فوجی اسباب کا احاطہ کیا ہے۔ اور ان ہی کو ہندوستانیوں کی شکست کی اصلی وجہ قرار دیا ہے۔ یہ دو بند مجموعۂ نغز سے نقل کیے جاتے ہیں:

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے
دعا کے زور سے دائی دوا کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں، بازوا دپر طلاء کی نال

قضا سے بچ گیا، مرنا نہیں تو ٹھانا تھا   کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا

ملے تھے وہاں جو لشکر تمام چھانا تھا — نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ دانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دکّان نہ غلّہ و بقّال[۱]

نادر شاہ نے ہندوستانیوں کا وہ ستھراؤ کیا کہ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہو گئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جوہر کی رسم ادا کر کے اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا[۲] مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا، اس کی مالیت اسّی کروڑ سے کم نہیں تھی۔

نادر شاہ کے حملے کے وقت میر کی عمر ۱۷ برس کی تھی اور وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں تنہا اور بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ ان کے والد اور منھ بولے چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور ان کے سوتیلے بھائی نے بے مروتی اختیار کر لی تھی۔ نادشاہ کے حملے سے میر کے "آشیانے کے کانٹے" بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اور صمصام الدولہ کے یہاں کا وہ روزینہ جس کی بدولت ان کو نان و نمک میسر آجاتا تھا، یک لخت بند ہو گیا۔

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کے مرنے کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا۔ اس زمانہ میں صفدر جنگ اور نواب بہادر کی آویزش اور مرہٹوں، جاٹوں اور

۱۔ مجموعہ نغز (مطبوعہ لاہور)۔ آب حیات میں لکھا ہے "(شاکر ناجی) نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔"

۲۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز، مطبوعہ میرٹھ۔ رائے ٹیک چند بہار نے لکھا ہے:
چگویم کہ چہ قیامت گزشت اکثر جاہا بہ رسم ہندوستان جوہر واقع گردید۔ و در بیشتر موقع کار از خودداری گزشتہ بہ سرحد خودکشی کشید" آگے لکھتا ہے: "اکنوں مانند زلفِ تباں عمر طویلے باید کہ دار العشق بہ حالت اصلی آید۔" (وقائع رائے آنند رام حصہ دوم)

روہیلوں کی شورش کے علاوہ ابدالیوں کے حملے اور عماد الملک کی ریشہ دوانیوں نے زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ امرا کا باہمی نفاق سلطنت کو گھن کی طرح کھا گیا اور سنہ ۱۷۵۲ء کے بعد وہ پھر کبھی نہ سنبھل سکی۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ صفدر جنگ کی فوجیں دہلی کے ایک طرف اور غازی الدین عماد الملک کی فوجیں دوسری طرف مورچہ لگائے ہوئے تھیں۔ چکی کے ان دو پاٹوں کے بیچ میں دلی کے رہنے والے تھے جو چھ مہینے تک برابر پستے رہتے۔ اس خانہ جنگی نے وہ نقصان کیا جو نادر شاہ کے حملے سے بھی نہ ہو سکا تھا۔ بالآخر آصف جاہ نظام الملک اول کا پوتا عماد الملک کامیاب ہوا جس کی عمر ۱۷ سال کی تھی۔ لیکن اس کی جاہ طلبی اور حرص و آز نے سلطنت مغلیہ کا سارا خون نچوڑ لیا اور وہ سسکنے لگی۔

عماد الملک کے اشارہ سے احمد شاہ بادشاہ دہلی اندھا کر کے قتل کر دیا گیا۔ میر محمد حسین کلیم نے لکھا ہے: "کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے ہو لبصیر۔ ایسی دولت زینہار زینہار، فاعتبروا یا اولی الابصار"[۵۱] احمد شاہ کے بعد عالم گیر ثانی تخت پر بیٹھا لیکن اسے بھی عماد الملک نے ۱۷۵۹ء میں قتل کروا دیا۔ اس کے بعد شاہ عالم تخت نشین ہوا جس کی ۴۷ سالہ مدت حکومت اکبر اور اورنگ زیب سے بڑی ہے لیکن جس کے مصائب و آلام کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ غلام قادر روہیلہ نے اس کی آنکھیں نکال لیں، طرح طرح کی ایذائیں پہنچائیں، شہزادوں کو مارا اور ان کو ناچنے پر مجبور کیا، بعض بیگمات فاقہ کی تکلیف اور غیرت کے مارے قلعہ کی دیوار سے جمنا میں کود پڑیں۔ ان کے محلوں کے فرش کھود ڈالے اور تمام ضروری اور

---

۵۱ تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۳۸۔

قیمتی ساز و سامان چھین لیا۔[1]

اس وقت جاٹ، مرہٹے، روہیلے، سب ہی لُوٹ کھسوٹ پر آمادہ تھے۔ جاٹوں کے ظلم و ستم کے بارے میں ہرچرن داس مصنف چہار گلزار شجاعی کا بیان ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دلّی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہو۔[2] مرہٹوں کے متعلق گنگا رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے، لوگوں کے ہاتھ، ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسّیوں میں باندھ کر لے جاتے۔[3] اسی زمانہ میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو مرتبہ ہندوستان کو زیر و زبر کیا۔ یہاں ان تمام واقعات کا ذکر ممکن نہیں ہم صرف چھٹے حملے (۱۷۶۰–۶۱ء) کے حالات ذکر میر سے نقل کرتے ہیں:

جب تھوڑی سی رات گزر گئی، غارت گروں نے دست تطاول دراز کیا، شہر کو آگ لگادی، ..... آدمیوں کو زنجیر بند کیا، اکثروں کو جلایا اور سر تن سے جدا کیا۔ ایک عالم کو خاک و خون میں نہلایا۔ تین دن تک شبانہ روز ستم رانی سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کوئی چیز خوردنی و پوشیدنی نہیں چھوڑی جھتیں گرادیں، دیواریں ڈھادیں...... وضیع و شریف عریاں تھے، کد خدایان بے خان و ماں اکثر بلا میں گرفتار تھے اور رسوائے کوچہ و بازار...... شہر پر بلاؤں کا ہجوم تھا اور قتل و غارت عام.....

---

[1] جاناتھن سوئفٹ کا خط وارن ہیسٹنگز کے نام بحوالہ ٹوائی لائٹ آف دی مغلز ص ۲۷۔

[2] چہار گلزار شجاعی (قلمی): ہرچرن داس۔

[3] بحوالہ زوال سلطنت مغلیہ ج ا ص ۸۷ (سرکار)۔

> سات آٹھ دن یہ ہنگامہ گرم رہا۔ کسی کے گھر میں پوشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی ...... میں (میر) غریب تھا، اور زیادہ غریب ہو گیا اور میری حالت بے اسبابی اور تہی دستی سے ابتر ہو گئی۔ میرا کلیہ سڑک کے کنارے تھا وہ خاک کے برابر ہو گیا۔[1]

ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے ہر زبردست کے گھوڑے ان کے کھیتوں کو پامال اور ہر جابر امیر کے سپاہی ان کے گھروں کو بے چراغ کر سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ صبح کو ملی تو شام کی خیر نہیں۔ دست کار، صناع، کسان، مزدور، وضیع و شریف سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خالصہ کی زمین کم ہو جانے سے خود شاہی خاندان پر تین تین دن کے فاقے گزرتے تھے۔[2] اور سلاطین"[3] کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پر کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔ بقول مصحفی ؎

فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر
جو ماہ کہ آتا ہے وہ رمضان ہے

وہ چند سلاطین کی حالت زار بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ ہجو نہیں حقیقت ہے:

گل جائے زباں میری کروں ہجو گر ان کی
یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے
اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشن دہلی میں خزاں ہے[4]

---

[1] ذکر میر ص ۸۵، ۸۸ [2] تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی) ص ۱۹۰ [3] میجر کننگھم بحوالہ ٹوائی لائٹ آف دی مغلز ص ۶۲ [4] کلیاتِ مصحفی (قلمی) نسخہ لاہور ص ۳۰۶ بحوالہ مصحفی اور ان کا کلام۔

دلّی کی تباہی کا نقشہ ملاحظہ ہو:

دلّی ہوئی ہے ویراں، سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلّے، سنسان گھر پڑے ہیں
دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں
بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں
بیرونِ درِ چمن کے ایک مشت پر پڑے ہیں[۱]

میر فرماتے ہیں:

دلّی میں بہت سخت کی اب کے گزراں | دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شان | کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروت جو کرے | اجڑے تھے گھر
تا مدِ نظر صاف پڑے تھے میداں | عرصہ تھا تنگ

میر کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

اب خرابہ ہوا جہاں آباد | ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

۱۔ کلیاتِ مصحفی (قلمی) نسخہ لاہور ص ۶ ۳ ۴ ۔

سودا لکھتے ہیں ؎

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں ڈھیے مرغول

مرزا رفیع سودا نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب نوکری نہیں ملتی۔ اگر گھوڑا لے کر گئے اور نوکری مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ "علف و دانہ" کی خاطر ع

شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

سال سال بھر کی ملازمت کے بعد بھی ایک حبہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا کچھ سپاہیوں ہی پر موقوف نہیں، ہر پیشہ کا یہی حال ہے۔ اگر کسی امیر کی طبابت اختیار کی جائے تو آقا کی نازک مزاجی اور تنگ حالی سے زندگی اجیرن ہے۔ اگر سوداگری کی جائے اور اصفہان سے مال خرید بھی لایا جائے تو دکن سے ادھر بکے کہاں؟ شمالی ہند کے امیروں کا حال یہ ہے کہ ہزار دقتوں سے قیمت چکائیں گے، پھر وصولی کے لئے پروانہ لکھیں گے، اسے لئے لئے عامل اور دیوان بیوتات کے پاس پھرئیے لیکن پھر بھی کامیابی کی امید نہیں ——— یہی حال شاعری، ملائی اور فن کتابت وغیرہ کا ہے۔ اگر دنیا سے کنارہ کش ہو کر توکل اختیار کیجئے تو زن و فرزند کو کہاں لے جائیے۔ غرض ؎

دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام
عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے

سو اس کا تیقّن تو کسی دل کو نہیں ہے
یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغۂ حشر
آسودگی حرفے است نہ یاں ہی نہ وہاں ہے

مصحفی کا شعر ہے ؎

یہ زمانہ وہ ہی جس میں ہیں بزرگ و خورد جتنے
انھیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا

اس وقت امرا و اعیان کی عیش پسندی اور نا اہلی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ حاتم نے لکھا ہی ؎

عجب حال دیکھا اس زمانے کے امیروں کا
نہ ان کو ڈر خدا کا اور نہ ان کو خوف پیروں کا

میر نے بھی امیروں اور رئیسوں کی اخلاقی حالت پر روشنی ڈالی ہی:

لعل خیمہ جو ہے سپہر اساس
پالیں ہیں رنڈیوں کی اس کے پاس[1]

ہے زنا و شراب بے وسواس
رعب کو لیجیے یہیں سے قیاس

قصّہ کوتاہ رئیس ہے عیاش

جتنے ہیں یاں امیر بے دستور
پھر تجسّسِ سلوک سب مشہور
پہنچنا ان تلک بہت ہے دور
بات کہنے کا واں کسے مقدور

[1] نیز مرقع دہلی از نواب ذو القدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ ص، تا ۸ ، مطبوعہ تاج پریس حیدر آباد دکن۔

حاصل ان سے نہ دل کو غیر خراش

چار لچے ہیں مستعد کار
دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار
لوٹ سے کچھ ہے گرمیٔ بازار
سو ہی قند سیاہ ہے یا ماش

در پہ عمدوں کے روز و شب شر و شور
حرف یکسر فریب و رشوت خور
لے لئے دیکھیں نے کسو کی اور
مُردہ شو پر وہ سب کفن کے چور
رحمت اللہ بر اولیں نباش

یک بیک گر کسو کی موت آئی
اس کے مردے کی پھر ہے رسوائی
کیوں کہ پہنچے ہے جن کو امرائی
سب وے اولاد حاتم طائی
کون دے کر کفن اٹھاوے لاش

شاہ ظہور الدین حاتمؔ ان امیروں کے متعلق لکھتے ہیں۔

کیا بیاں کیجئے بیرنگیٔ اوضاع جہاں — کہ بیک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھرے ہیں جوتی کو محتاج پڑے سرگرداں
نعمتیں جن کو میسر تھیں ہمیشہ ہر وقت — روز پھرتے ہیں یہاں قوت کو اپنے حیراں
جن کے پوشاک سی معمور تھے توشک خانے — سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں

پرچۂ نان کو رکھ ہاتھ ہیں کھاتے ہیں امیر | جس کو دیکھوں ہوں سو ہے فکر میں غلطاں پیچاں
خوان الوان کہاں اور وہ کہاں دسترخوان | یعنی چہ میر و چہ مرزا و چہ نواب چہ خاں
پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اس وقت | ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں
کان دھر بات کسو کی نہیں سنتا کوئی | آنکھ سے آنکھ ملانا تو یہاں کیا امکاں
وے جو بیکار ہیں ان کا تو خدا حافظ ہے | وے جو ہیں نام کو نوکر انھیں تنخواہ کہاں
کیا زمانہ کی ہوا ہو گئی سبحان اللہ | زندگانی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں
زن و بچوں سے چھپا کھاتے ہیں ٹکڑے کے تئیں | غضب آئے، جو کوئی جائے کسی کے مہماں
وے جو ٹھڈے کو ترستے تھے سو اس دور میں آج | ہوئے ہیں صاحب مال و محل و فیل و نشاں
رتبہ شیروں کا ہوا ہی گا شغالوں کو نصیب | جائے بلبل ہے یہ چمن بیچ غزل خواں زاغاں
اے خدا! خوب کہا ہے یہ کسو نے مصرع | یعنی نعمت بسگاں بخشی و دولت بہ خراں[۱]

یہ امرا کسی ایسے ذکر کو پسند ہی نہیں کرتے تھے جو انھیں حرکت و عمل پر آمادہ کرے۔ مرزا رفیع سوداؔ فرماتے ہیں ؎

جو کوئی ملنے کو ان کے اُنھوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا

جو ذکر سلطنت اس ہیں وہ درمیاں لایا
انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا

خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

فوجی نظام میں گھوڑے کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن وہ بھی مرجھبرے اور کوتل تھے۔ نہ ان کو چارہ میسر تھا اور نہ دانہ۔ سوداؔ نے شاعرانہ مبالغہ کیا ہے لیکن ان کی بنا۔۔۔

---

[۱] دیوان زادہ (نسخہ رام پور) درمیان سے بہت سے اشعار نکال دیئے ہیں۔

غلط نہیں:

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑا جائے باد سے
میخیں گر اس کی تھان کی ہو ویں نہ استوار
نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دَم کو اپنے کہ جوں کھال کو لُہار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکّھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار

سپاہی بھی فاقہ کش تھے اور ان کی بزدلی کا یہ عالم تھا:

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈلتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

ایک سوار کا نقشہ ملاحظہ ہو جو مرہٹوں سے لڑنے کے لئے میدان میں نکلا ہے:

چابک تھے دونو ہاتھ میں، پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنہ کی مرے پانو تھے فگار
آگے سے تو بڑا ادسے دکھلائے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

اس وقت عام بے روزگاری اور قلتِ معاش کی انتہا نہیں رہی تھی:

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو، لے کے گھوڑا مول

لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں وہ بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

شریف اور شریف زادیاں ٹکڑوں کو محتاج تھیں :

دیا بھی واں نہیں، روشن تھی جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کروڑ دل پُراز امید ہو گئے مایوس
گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انھیں جو تھے صاحب چنڈول
نجیب زادوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقعہ سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

اس وقت جتنے طبقے تھے سب ہی پریشان اور فلاکت زدہ تھے۔ راسخ عظیم آبادی نے کسانوں کی تباہی کے متعلق لکھا ہے:

زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے — دُر مدعا یاں تو نایاب ہے

سپاہیوں کی حالت ملاحظہ ہو ؎

سپاہی کی مٹی بھی اب ہی خراب — کہ تیغا ہوا نوکری کا نوباب
(راسخ)

خوش نویسوں کے متعلق لکھتے ہیں :

لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا ۔۔۔ نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا
کہیں ہیں بچارے کہ کس اور جائیں ۔۔۔ لکھا اپنی قسمت کا کیسے مٹائیں (راسخ)

غرض ہر چھوٹا بڑا اقتصادی مصیبتوں میں گرفتار تھا۔ بادشاہ کے ملازمین میں اہل نقدی اور اہل جاگیر کاسۂ گدائی" ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ جاگیرداری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اندھیرے میں انگریز جن کے پیچھے انگلستان کا صنعتی انقلاب تھا، اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ اور انھوں نے ۱۷۵۷ء میں بنگال پر قبضہ کر کے ہماری اقتصادی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں بنگال کی اہمیت کیا تھی۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ آخر زمانہ میں اورنگ زیب کے تمام اخراجات بنگال ہی سے پورے ہوتے تھے۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان سے انگریزوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اپنے اقتدار کا پرچم سارے ملک میں لہرا دیا۔ انگریزوں کے اس سیاسی استحصال سے ہندوستانی بے خبر نہیں تھے مولانا سید احمد بریلویؒ نے تو انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کے لئے راجہ ہندو راؤ کو ایک خط بھی لکھا تھا۔[۲]

---

[۱] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: مکتوب دوم ص ۱ھ (طبع علی گڑھ)

[۲] اس خط کا ترجمہ یہ ہے: "جناب کو معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اس لئے مجبوراً چند غریب و بے سر و ساماں کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں۔۔۔۔ مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں، جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بار آور ہوں گی، حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہو گی۔" ملاحظہ ہو مجموعہ مکاتیب سید احمد بریلوی (قلمی) کتب خانہ ریاست ٹونک، راجہ ہندو راؤ، مہاراجہ دولت راؤ سندھیا والی گوالیار کا نسبتی بھائی (باقی ص ۳۰ پر)

اسی طرح ہمارے شاعروں نے بھی ان حالات کی طرف چشمِ سخن سے اشارہ کیا ہے۔ راجہ رام نرائن موزوں نے جنگ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شہادت پر جو شعر کہا تھا، وہ یادگار رہے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

> راجہ رام نرائن، صوبہ دارِ عظیم آباد، موزوں تخلص، از شاگردانِ شیخ علی حزیں ...... شعر ریختہ کم گفتہ بلکہ نگفتہ مگر در وقتے کہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر افتاد ہماں وقت فی البدیہہ ایں شعر می خواند و از خبر داراں خبر می پرسید و می گریست۔
>
> غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
>
> دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری؟[1]

مصحفی نے انگریزوں کے معاشی مظالم کو بے نقاب کیا ہے:

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی

جرأت نے دیسی حکمرانوں کی بے دست و پائی پر اظہارِ خیال کیا ہے:

کہیے نہ انہیں امیر اب اور نہ وزیر — انگریزوں کے ہاتھ یہ قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں — بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے اسیر

مختصر یہ کہ انگریزوں کے معاشی استحصال، مرکزی حکومت کی کمزوری، جاگیرداری اور اجارہ داری کے مذموم اثرات اور آئے دن کی لڑائیوں نے مفلسی اور بے زری کو عام کر دیا تھا۔

(بقیہ ص ۲۹ یہ ہے) اور ریاست کا مدار المہام تھا۔ سید صاحب سفرِ ہجرت میں چند روز گوالیار ٹھہرے تھے اور مہاراجہ کی ضیافت اور مہمان داری سے مشرف ہوئے تھے ـــــ اس اہم معلومات کے لئے ہم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے شکر گزار ہیں۔ [1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۵۰۔

حاتم لکھتے ہیں ؎

محتاجگی سے مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

میر کے اشعار ہیں ؎

بے زری کا نہ کر گلہ غافل ——— رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہاں میں گزرے ——— وقت رحلت کے اک کنے زر تھا

میر کے سوزِ عشق میں محبت کی ناکامی[1] کے علاوہ اُن کی بے زری بھی شامل ہے۔ اس قسم کے اشعار بغیر تجربہ کی مدد کے کہنا ممکن نہیں :

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا ——— گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری

یا ؎ روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں ایک داغ
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

مفلسی اور بے زری کا ذکر اس زمانہ کے تقریباً تمام شاعروں نے کیا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں : ہر چند کہ ہم فاقوں سے جان دیتے ہیں ——— تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں

سودا کا شعر ہے :

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا ہے وہ یا گول

مفلسی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ان حالات میں امن اور سکون کہاں میسر آسکتا تھا۔

---

[1] تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے : "(میر) تا بقید رشتہ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت۔ از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک برد۔"
(قلمی نسخہ ملکہ مولانا سید ابو الحسن ندوی، لکھنؤ)

بقول مصحفی:

بس قلعہ کے نیچے ہی ٹک ایک امن و اماں ہے

سودا نے لکھا ہے کہ لوگ چوروں کے ڈر سے عیش و نشاط کی محفلوں میں اس طرح مسلح ہو کر جاتے ہیں جیسے رَن میں جا رہے ہوں:

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں

اس وقت دہلی میں ہر طرف بدامنی اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہر صبح ایک نئے فتنے کا پیغام لاتی تھی۔[1] اور رات کی تاریکی میں ستارے بھی "ناگوں کی آنکھیں اور بچھوؤں کے سر معلوم ہوتے تھے۔"[2]

اس انتشار کا اصلی سبب یہ تھا کہ سوسائٹی میں اقتصادی توازن باقی نہیں رہا تھا۔ جاگیری نظام کی شمع بھڑک کر خاموش ہو جانے والی تھی۔ اس کی جمالیاتی اور اخلاقی

---

[1] شاہ ولی اللہ (متوفی ۱۱۷۶ھ) نے شیخ محمد عاشق پھلتی رح کو لکھا ہے:

"اختلال حال شہر کہ روز فتنہ تازہ گل می کند اور ترسے دیگر در خواطر مردم می نشیند"۔

شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (طبع علی گڑھ) ص ۷۷۔

[2] شاہ ولی اللہ کا شعر ہے:

كَأَنَّ نُجُوماً أَوْمَضَتْ فِى الْغَيَاهِبِ ۔۔۔ عُيُونُ الأَفَاعِي أَوْ رُؤُسَ الْعَقَارِبِ

(ترجمہ) گویا ستارے چمکتے ہیں تاریک راتوں میں سانپوں کی طرح یا بچھوؤں کے سر کی طرح۔

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں ملک کی خرابی و ویرانی کے دو سبب ہیں۔ ایک ملک کے خزانہ پر تنگی، وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑ گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ حاصل کریں کہ وہ سپاہی یا عالم یا زہد پیشہ صوفی یا شاعر ہیں دوسرے کاشتکاروں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا۔
(حجۃ اللہ البالغہ)

قدریں کم، ورضرور ہو گئی تھیں لیکن وہ ابھی باقی تھیں۔ سرمایہ دارانہ نظام، جس کی جلو میں یورپ کا مشینی انقلاب اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں، نئے امکانات لئے ہوئے ابھر رہا تھا لیکن ابھی اس میں زندگی کا رخ متعین کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ عوام پامال تھے، اُمرا غیر منظم، دستکار بے روزگار، اور صناع ذلیل وخوار:

صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

(میر)

لیکن ان انتشاری رجحانات کے باوجود یہ سمجھنا کہ اس زمانہ کی تاریخ محض شورش پسندی یا عیش کوشی کی داستان ہے، یا اس زمانہ کا ادب، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں غیرت وشجاعت، ایثار وکرم، محبت اور رواداری کی حیرت انگیز مثالیں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح اردو ادب بھی کانچ گھر میں چھوئی موئی کی طرح دنیا سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہا ہے۔ ہمارے شاعروں نے اپنے مخصوص علامتی انداز میں عوام کے دل کی دھڑکنوں کو پیش کیا ہے۔ اور رمزیت میں خارجی حقیقتوں کو سمولیا ہے، اس کی ایک دل کش مثال میر کا کلام ہے جن کے غم میں "سینکڑوں دلوں کی دھڑکنیں اور سینکڑوں نگاہوں کی محرومی اور تشنگی چھپی ہوئی ہے۔"

اس عجیب وغریب تاریخی ماحول میں جس کی طرف پچھلے صفحات میں چند اشارے کئے گئے ہیں (اور جس کو دیکھ کر شاہ ولی اللہ نے فرمایا تھا کہ "چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے۔" اور حضرت مظہر جان جاناں اس اعتراف پر مجبور ہو گئے

تھے کہ "از تشویشاتِ ہر روزۂ دہلی تنگ آمدہ ام") میر کی شاعری پلی بھی، بڑھی بھی اور اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اس سطحِ امتیاز یہ پر پہنچ گئی جہاں ان کی میر مجلسی مسلّم ہے۔

میر کا عہد ایک بڑی تہذیب کا اختتامیہ ہے۔ اس وقت پرانی دنیا بے رونق تھی اور وہ جہان تازہ، جو بعد میں انگریزوں کے سرمایہ دارانہ تصورات کی بدولت وجود میں آیا، ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس عمرانی خلا میں میر کی حیثیت ایک قطرۂ گریۂ بے اختیار یا ایک نقش فریادی کی سی ہے:

شمعِ آخر شب ہوں، سن سرگزشت میری
پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

ان کے یہاں جو غم ہے، وہ محض اپنا نہیں، اپنے تمدن اور طبقہ کی بے رونقی کا بھی ہے یہ سارا تمدنی ماحول ایک خاموش درد بن کر ان کی غزلوں میں سما گیا ہے۔ اسی لئے ان کی ہر غزل ایک فضا رکھتی ہے اور

ہر ورق، ہر صفحے میں اک شعرِ شور انگیز ہے (میر)

میر سے جب تک بن پڑا، دلّی میں قدم جمائے رہے۔ لیکن جب بات اختیار سے باہر ہو گئی اور آصف الدولہ نے فخریہ طلب بھی کیا تو لکھنؤ چلے آئے جس کی چمن بندی، دلی کی خزاں سے ہوئی تھی۔ یہ ہجرت ان کے لئے معمولی واقعہ نہیں، ایک تہذیبی سانحہ اور نفسیاتی حادثہ تھی۔ لکھنؤ کی تہذیب طاؤس ورباب سے عبارت تھی اور اس کے دربار کا ہر منظر جنّت نگاہ اور ہر گوشۂ لباط، دامانِ باغباں بنا ہوا تھا۔ لیکن یہاں کی تہذیبی قدروں اور میر کی خواہشوں میں ہم آہنگی اور ہم ربطی نہیں تھی۔[۱] لکھنؤ نے سیاست میں، معاشرت میں اور

(۱؎ فٹ نوٹ کی عبارت ص ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے)

ادب میں ایک نئی راہ نکالی تھی جس سے مصالحت آسان نہیں تھی"۔ دہلی میں نیچی چولی کا انگرکھا پہنا جاتا تھا۔ یہاں چولی اونچی ہوگئی اور ایک نہیں، تین تین کمر توئیاں اضافہ کی گئیں۔ مندیل کی جگہ بنکے دار ٹوپی نے لے لی اور چست مہری کا پاجامہ غرارے دار ہوگیا۔ سلیم شاہی جوتہ گھیتلا بن گیا۔ ملائی، بالائی اور اندھیری، اندھیاری بن گئی"۔ میر کی نفسی کیفیت اہل لکھنؤ سے بالکل مختلف تھی۔ ان کو یہ نئے انداز اور نئی تراشیں، طبیعتوں کی غیر معتدل شوخیاں، ایجادوں کا انوکھا پن ایک آنکھ نہیں بھایا۔ اور وہ "خرابۂ دلّی" ہی کو لکھنؤ سے دس گنا اچھے سمجھتے رہے۔

(فٹ نوٹ صفحہ ۳۴ ملاحظہ فرمائیں)

لہ تذکرہ آب حیات میں آصف الدولہ کو فرشتہ سیرت بتایا ہے۔ اس کی تائید دوسرے بیانات سے نہیں ہوتی۔ صاحب سیر المتاخرین نے لکھا ہے کہ "مجھ کو بکرر آصف الدولہ کی حضوری خلوت میسر آئی۔ ظاہراً شعور و خرد سے بے نصیب تھے۔ نہایت درجہ اراذل اور پواچ نوکروں کی صحبت میں مصروف تھے اور بجز لہو و لعب کے کسی طرف راغب نہ تھے"۔ مولوی ذکاء اللہ تاریخ ہند میں لکھتے ہیں کہ "آصف الدولہ کا دل و دماغ اوباشی اور شراب نوشی نے خراب کر دیا تھا"۔ محمد فیض بخش نے تاریخ فرح بخش میں لکھا ہے: "مزاج ہمایوں طفلی سے لہو و لعب کی طرف مائل تھا رذیل، سفلہ اور دوں ہمت لوگوں کی ہم نشینی زیادہ پسند تھی، بے محل ہنسنا، گالی دینا، اور پھر فحش کلام کے جواب ترکی بہ ترکی طالب رہنا۔ لایعنی کھیلوں کی طرف رغبت رکھنا.... محفل میں زیادہ تر کلمات فسق کو پسند کرنا طبعی خاصہ تھا"۔ (نیز تاریخ اودھ حصہ سوم ص ۲ نجم الغنی) اور یہ ظاہر ہے کہ میر آصف الدولہ ہی کی دعوت پر لکھنؤ گئے تھے (ذکر میر ص ۱۳۹) اداں ہی سی بنا ہنا تھا۔ دلی کے دلبستان شاعری میں لکھا ہے: "دہلویت نام ہے ایک نقطۂ نظر، ایک افتاد ذہنی ایک مزاج شعری کا جسے سمجھنے کے لئے لکھنویت سے قدم قدم پر مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ اختلاف دراصل آصف الدولہ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے" (ص ۲۷۲)۔

حقیقت یہ ہے کہ دلّی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب وجگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی [1] میرؔ ہی نہیں، مہاجروں کا پورا قافلہ دلّی کو یاد کرتا تھا اور اسی کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ انشاؔ نے دریائے لطافت میں لکھا ہے:

ازیں جا دریافت تواں کرد کہ باوصف تولد در لکھنؤ خود را دہلوی پندارند و سکنہ قدیم را پوربی۔ دیگر ایں کہ اگر کسے پرسد کہ شما بذات خود در لکھنؤ بوجود آمدہ اید پا وطنِ شما ہمیں است، خشم آلود در و نگاہ کنند و گویند خدا نکند کہ ما متوطن ایں جا باشیم [2]

یہی بات مصحفیؔ نے بھی لکھی ہے:

صحرائیانِ پورب کیا جانتے ہیں اس کو
اے مصحفیؔ جدا ہے انداز اس زباں کا

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں ؎

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تُونے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تُونے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے یہ کیا کیا تُونے

---

[1] سوداؔ نے لکھا ہے:

جہاں آباد تو کب اس جفا کے قابل تھا | مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقش باطل تھا | عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں پہ ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

[2] دریائے لطافت ص ۶۷۔

دلی کی تعریف میں فرماتے ہیں ؂

یہ دلّی کا نقشہ سنوارا زمیں پر | کہ لا عرش گویاں اتارا زمیں پر

میر کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے | جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں | دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

انھوں نے لکھنؤ کا ذکر بڑی حقارت کے ساتھ کیا ہے:

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا، سراسیمہ نہ آتا یاں

مربوط کیسے کیسے کہے ریختے و لے | سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

میر کی زندگی اور شاعری کو اس سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ اس بڑے نقشے میں بادشاہوں اور امیروں کی غلط بخشی اور رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں، جتنی میر کی مستقل مزاجی۔ تاریخ میں ایک محمد شاہ، ایک ابو اسحاق، ایک لوٹی پا نزدہم ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی پرچھائیں اور اس کا نعرۂ ہائے و ہُو:

بیا تا یک امشب تماشا کنیم | چو فردا شود فکر فردا کنیم

ذرا سی دیر میں فضا میں تحلیل ہو گیا ہے لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرہ میں کسی ایک فرد کا ثباتِ قدم اور اقدارِ عالیہ پر ایمانِ محکم ہے۔ میر کا حال یہ ہے کہ آسمان کی کمان جھک سکتی ہے لیکن ان کا سر نہیں جھک سکتا۔ ان کی شخصیت دلِ پُرخون کی گلابی سے سرشار ہے۔ ان کی آواز امرت میں ڈوبی ہوئی ہے

ان کا غم روایت نہیں، زندگی کی صداقت ہے۔ اسی طرح ان کی محبت کے پیچھے زندگی کے قیمتی تجربات ہیں جنہوں نے ان کی شاعری میں سچائی کے جوہر پیدا کر دئے ہیں[1]۔ حسن ادا کے ان طلسمی دریچوں سے ان کا لازوال عشق، ان کی انسان دوستی اور سماجی خبر کا جذبہ صاف جھلکتا ہے۔

میر نے جب غزل سرائی شروع کی ہے، اس وقت زبان و بیان دونوں آرائشِ اصلاح کے محتاج تھے۔ بقول قائم:

اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

سلطان قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، تانا شاہ، فیروز، محمود، وجہی، غواصی جنیدی، ابن نشاطی، طبعی، نوری، شوقی، نصرتی، شاہی، اور ہاشمی وغیرہ کے دکنی کارنامے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے ہماری ادبی روایات کے تسلسل کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ یہاں ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ اردو کی ابتدا دکن سے ہوئی ہے یا شمال سے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو شمال سے دکن گئی ہے۔ لیکن جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو پھر مرکزِ ثقل شمال کو منتقل ہو گیا۔ ولی کی مقبولیت ادبی خلا میں نہیں ہوئی۔ امیر خسرو[2]۔ کبیر[3] اور برہمن[4] کے قدیم نمونوں کو چھوڑ کر اس وقت

---

[1] میر نے ایک پری تمثال عزیزہ سے محبت کی تھی (تذکرہ بہارِ بے خزاں: قلمی) ان کا محبوب منظر یا جنس کم ارزنہیں ہے۔ جیسا کہ اس زمانہ میں عام دستور تھا (مرقع دہلی: دہلی بارہویں صدی ہجری میں از نواب ذوالفقار علی خاں سالار جنگ مرتبہ حکیم سید مظفر حسین ص ۳۳، ۴۳۔)

[2] امیر خسرو (متوفی ۷۲۵ھ) نے دیباچۂ غرۃ الکمال میں لکھا ہے: "جزوے چند نظم ہندوی نیز نذرِ دوستاں کردہ شدہ است" [3] صاحب مخزن الاصفیا نے کبیر کے متعلق لکھا ہے: "اول کسے کہ بزبان ہندی حقائق و معارف بیان فرمودہ اوست۔ و انواع اشعار ہندی دارد۔" (ص ۴۴۶)

[4] ہماری زبان دہلی: یکم دسمبر ۱۹۴۲ء۔

بھی بیدل، خان آرزو، ٹیک چند بہار، انندرام مخلص، عبدالغنی قبول، مرزا علی قلی ندیم، قزلباش خاں امید وغیرہ جو فارسی کے شاعر تھے، منھ کا مزہ بدلنے کے لئے بالطور تفنن کے ریختہ میں بھی شعر کہتے تھے۔ پروفیسر محمود شیرانی کا خیال ہے کہ ریختہ ابتدا ایک موسیقی کی اصطلاح تھی جو امیر خسرو نے ایجاد کی۔ اس کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا تھا جس میں ہندی اور فارسی کے اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون راگ اور تال کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے، ترکیب دیئے جاتے تھے[۱]۔ مثلاً امیر خسرو کی یہ غزل

"زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں"[۲]

یا سعدی کاکوروی کا یہ شعر

سعدی طرح انگیختہ شہد و شکر آمیختہ

در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے[۳]

گیارہویں صدی ہجری میں ریختہ کا اطلاق بالعموم اُردو کے ایسے اشعار پر ہونے لگا تھا:

جاناں رحم فرماؤ ناں یا مجھ بلا یا آؤ ناں

اتنا بھی کیا ترساؤ ناں یا مجھ بلا یا آؤ ناں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء سے ہوا جب دکنی اورنگ آبادی کا مکمل دیوان دیوان دہلی پہنچا[۴] اور اُسے اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں

---

[۱] ریختہ: مقالہ پروفیسر محمود شیرانی مطبوعہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۲۶ء۔
[۲] پنجاب میں اردو: محمود شیرانی (طبع دوم) ص ۱۷۳۔
[۳] مخزن نکات: قائم چاندپوری ص ۲۔
[۴] مصحفی نے "تذکرہ ہندی" میں لکھا ہے۔

در سنہ دوم فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) دیوان ولی در شاہ جہاں آباد آمدہ

و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ"۔ (ص ۸۰)

پرلیا۔ ولی ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں[1] ایک "تاریخی ضرورت" بن کر دہلی آئے تھے۔ یہاں کے شاعر اس گھریلو زبان میں شعر کہنا تو چاہتے تھے لیکن ان کے سامنے کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال نہیں تھی۔ ولی کی زبان دیکھ کر ان کے تعجب کی انتہا نہیں رہی اس لئے کہ یہ تقریباً وہی زبان تھی جو وہ بولتے تھے۔ اورنگ آباد جو ولی کا مولد تھا، بالکل دہلی کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ محمد تغلق نے دولت آباد کو دار السلطنت بنایا تھا جو اورنگ آباد سے تقریباً آٹھ میل دور ہے[2]۔ شہزادہ اورنگ زیب نے موخر الذکر کو ۱۰۶۶ھ/۱۶۵۶ء میں اپنا مستقر بنایا اور بادشاہ ہونے کے بعد کم و بیش ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء تک دکن میں قیام کیا۔ مرکز سے اتنے گہرے تعلقات نے اورنگ آباد کے تمدن اور اس کی زبان کو دہلوی رنگ میں رنگ دیا تھا[3]۔ ولی کی غزلیں اسی زبان میں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب ان کا دیوان دلی پہنچا تو "قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت سے زبان نے پڑھا، گیت موقوف ہوگئے اور قوال معرفت کی غزلوں میں اُن ہی کی غزلیں گانے لگے۔۔۔۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے، انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا[4]۔" قائم نے مخزن نکات میں لکھا ہے:

بہ یمن قبول زبانِ ایشاں سخن ایں بابا چناں حُسنِ قبول یافت کہ ہر بیت

---

۱ قائم نے لکھا ہے: "درسنِ چل وچار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ میر ابوالمعالی نام سید پسرے کہ دلش فریفتۂ او بود بہ جہاں آباد آمد۔" (مخزن نکات ص ۱۰)

۲ کلیات ولی (طبع دوم) انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۴۵ء: ولی کی زبان: مقالہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۳۰۔

۳ تذکرہ گل رعنا میں لکھا ہے: "اب تک اورنگ آباد اور اس کے نواح کی زبان و شائستگی۔۔۔۔ میں دہلویت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔" (ص ۲۹ حاشیہ)

۴ آب حیات: آزاد۔

دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ و ریختہ را قسمے بفصاحت و بلاغت
می گفت کہ اکثر استادانِ آں وقت ز راہِ ہوشِ شعر ریختہ موزوں می نمودند
چناں چہ ..... مرزا عبد القادر بیدل ..... نیز دریں زبان غزلے
گفتہ[1]

ولی سے پہلے کے دکنی شاعر بقول میر "پُر بے رتبہ"[2] تھے لیکن "ولی کا کلام گویا زبان اور خیالات کا وہ آخری نقطہ ارتقا تھا جسے تاریخ عرصہ سے طے کر رہی تھی"[3] ان کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ لوگ فارسی کو چھوڑ کر اردو میں لکھنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ شاعر جو اردو میں لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ "تاریخی قوتیں ولی کے ساتھ تھیں۔ فارسی مغلوں کے زوال کے ساتھ زوال پذیر تھی اور اردو کا ستارہ عروج پر تھا۔"

اردو اس وقت سیّال حالت میں تھی۔ ابھی اس کے ادبی معیار قائم نہیں ہوئے تھے۔ جن لوگوں نے اس پر اپنا نام ثبت کر کے اس کا ایک معیار قائم کیا، وہ فارسی شاعری ہی کے دل دادہ نہیں تھے بلکہ ان کی ذہنیت، رجحانات اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے۔[4] اس لئے وہ شعرائے فارسی (اور

---

[1] مخزن نکات ص ۱۰ [2] نکات الشعرا ص ۸۹ [3] کلیاتِ ولی طبع ثانی ص ۲۲ [4] میر حسن، شاہ واقف کے حال میں لکھتے ہیں "طرز کلامش مانا بہ طرز ناصر علی و جلال اسیر است"۔ (تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۹۰) میر کلیم کے متعلق لکھتے ہیں: "اکثر بزبانِ مرزا بیدل حرف می زند" (نکات الشعرا ص ۴۲) میر حسن، قائم کے متعلق لکھتے ہیں: "طرزش مانا بطرز طالب آملی می ماند" (تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۲۵) میر کے بارے میں ان کا خیال ہے: "طرزش مانا بطرزِ شفائی" (تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۵۱) اس کے علاوہ میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ شاہ سعد اللہ گلشن رح نے ولی کے اشعار سن کر فرمایا تھا: "ایں ہمہ مضامینِ فارسی کہ بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت"۔ (نکات الشعرا ص ۹۰)

خاص طور پر متاخرین شعرائے فارسی) سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایہام جو اتفاق سے ہندوستان کا سبزۂ خود رو بھی تھا، اسی راستہ سے ان کے کلام میں داخل ہوا ہے۔

ایہام کی مثالیں ولی، داؤد، سراج، عزلت، آبرو، مضمون، حاتم، ناجی، یک رنگ وغیرہ کے یہاں بکثرت ملتی ہیں۔ اس سے اردو شاعری کو نقصان پہنچا اور وہ کیف و لذت سے محروم ہو گئی لیکن جلد ہی اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہو گیا۔ اور یہ "غیر فطری التزام و تصنع"، مردود ٹھہرا۔ حاتم ایہام گوئی کے بڑے علمبردار تھے لیکن وہ ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں اپنے کلام کا انتخاب "دیوان زادہ" کے نام سے کرنے پر مجبور ہوئے جو دورِ اصلاح میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر مانوس ہندی عناصر کو خارج کر دینا چاہتے تھے:

> لسان عربی و زبانِ فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرۂ دہلی کہ میرزایانِ ہند و فصیح گویان رند در محاورہ (کذا) دارند، منظور داشتہ سوائے آں زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آں را بھاکا گویند، موقوف نمودہ۔ فقط روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار کردہ[۱]

حاتم کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں جن میں ایہام کو ناپسند کیا ہے:

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

ان دنوں سب کو ہوئی ہے صاف گوئی کی تلاش
نام کو حاتم کہیں چرچا نہیں ایہام کا

---

[۱] دیباچۂ دیوان زادہ: حاتم (قلمی)، بنیر سرگزشتِ حاتم: ص ۱۲۶ طبع حیدر آباد دکن۔

ایہام گوئی کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی تھی، اس میں اس دور کے تمام اکابر شعرا شریک تھے۔ قدرت اللہ شوق نے مرزا مظہر کے حال میں لکھا ہے:

می گویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ، ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام وخواص گردیدہ ومروج ساختہ، مرزا جانِ جاناں متخلص بہ مظہر، مردے ست فرشتہ خصلت۔

مصحفی نے بھی یہی لکھا ہے:

در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود دور ایہام گویاں بود، اول کسے کہ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست، نقاش اول ریختہ باعتقاد فقیر اوست۔

میر نے ایہام گوئی کی مذمت ہی نہیں کی بلکہ فارسی اور ہندی کے عناصر میں اعتدال و توازن قائم کیا۔ یہ ان کا اردو پر بڑا احسان ہے۔ وہ ریختہ کے اقسام لکھتے ہوئے اپنے اصولوں کی وضاحت کرتے ہیں:

جو (فارسی) ترکیبیں زبان ریختہ کے موافق ہیں ان کا صرف جائز ہے اس کی تمیز غیر شاعر نہیں کر سکتا۔ اور جو تراکیب نامانوس ریختہ ہیں، وہ معیوب ہیں۔ ..... ایہام کا شاعرانِ سلف میں رواج تھا اب اس کی طرف رغبت کم ہے جب تک نہایت شستگی کے ساتھ نظم نہ ہو۔۔۔۔ (وہ اندازِ شاعری) جسے ہم نے اختیار کیا ہے وہ تمام صنعتوں مثلاً تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندی، خیال وغیرہ پر مشتمل ہے۔[1]

یہ تبدیلیاں دفعتاً نہیں ہوئیں اور نہ قدیم طرز سخن یک قلم متروک ہو گیا۔ میر کے

([1] فٹ نوٹ ص ۴۴ پر ملاحظہ کیجئے)

زمانہ میں بھی کہیں کہیں اس کا التزام ملتا ہے ۔ ان کا مشہور شعر ہے :

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بھی کچھ لوگ ایہام کے دلدادہ تھے ۔ اور اسے شعر کی دلچسپی کا سبب سمجھتے تھے ۔ لیکن میر، مظہر، سودا ، درد، قائم اور حاتم نے اس پر ایسی کاری ضرب لگائی تھی کہ اس کا چلن زیادہ دنوں تک نہیں رہا اور اردو اس عیب سے پاک ہو کر اس قابل ہو گئی کہ وہ مختلف مضامین اور خیالات کو کامیابی کے ساتھ ادا کر سکے ۔

خواجہ میر درد کا شعر ہے :

ازبس کہ ہم نے حرف دوئی کا اٹھا دیا
اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

سودا لکھتے ہیں :

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

(فٹ نوٹ ص ۴۳ نمبر ا ملاحظہ کیجئے)

لہ نکات الشعرا ص ۱۷۹ (فارسی سے ترجمہ) مرزا مظہر (سودا کے خیال میں) اس اعتدال اور توازن کو قائم نہیں رکھ سکے تھے جو فارسی اور ریختہ میں ضروری تھا چنانچہ وہ ہجو میں لکھتے ہیں ؎

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ	سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ	واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹ کا
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ	اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شاہ کی لاٹ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں	کتا ہے دھوبی کا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا (سودا)

قائم نے ایہام گوئی کو "ستم" کہا ہے۔ مخزن نکات میں لکھتے ہیں:

این ستم کہ شاعرانِ ابتدائی زمانہ محمد شاہ بہ اعتقادِ خود تلاش الفاظ تازہ وایہام نمودہ، شعر را از مرتبہ بلاغت انداختند تا معنی چہ رسد اغرض ناگفتہ بہ"

قائم کے یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

ہو روم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بتِ چیں
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج یاں سرِ شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

میر کا شمار بھی ان اساتذہ میں ہے جنھوں نے ایہام گوئی کی مذمت کی اور اس کے رواج کو متروک کر دیا۔ وہ احسان اللہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود۔ ازیں جہت شعر او بے رتبہ ماند۔[1]

میر نے قدیم طرز ہی کو نہیں چھوڑا، ایک نئی روش بھی اختیار کی۔ ان کے "انداز" کی بنیاد بہت سے محاسن پر قائم ہے:

انداز... کہ ما اختیار کردہ ایم..... محیطِ ہمہ صنعت ہا است۔

اس میں تہ داری و پرکاری، خلوص و صداقت، لہجۂ عام، روزمرہ کا لطف، فنی حسن طلسمی رمزیت اور تمام صوتی محاسن شامل ہیں۔

میر نے زبان و بیان کی اصلاح کی تحریک کو مضبوط کرنے کی پوری کوشش کی جس کی بدولت اردو میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا ہو گئی۔ تکلف اور تصنع کا داغ مٹنے سے اس کا فطری حسن چمک اٹھا۔ فارسی اور ہندی کے خوب صورت امتزاج سے اس کی رنگت نکھر آئی اور شاعری کی بنیاد پُرخلوص اور سچے جذبات پر قائم

---

[1] نکات الشعرا ص ۲۷۔

کی گئی۔

بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا گفتارِ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

میر نے جب ایک نئی روش اختیار کرنا چاہی تو ان کو زیادہ دقت پیش نہیں آئی اس لئے کہ قدیم طرز کے خلاف تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اردو ترتیب و تشکیل کے ابتدائی مدارج سے گزر چکی تھی۔ اس کا قالب بن چکا تھا۔ اور زبان و عروض کی خامیاں کم سے کم تر رہ گئی تھیں۔ اس دور کے اساتذہ نے جدّتِ ادا، لطافتِ تخیّل اور وسعتِ نظر کے کمالات دکھلائے اور صحت و فصاحت کے وہ اعلیٰ اصول وضع کئے کہ اردو شاعری بعض نکتہ چیں اور مشکل پسند طبائع میں بھی مقبول ہو گئی۔ میر کی معصومیت اور سپردگی اور درد کی والہانہ ربودگی نے تغزل میں معیاری شان پیدا کر دی چنانچہ داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں میر کا ہمسر کوئی نہیں پیدا ہو سکا محبت اور انسانیت کے نغمہ کو انھوں نے جس درد اور سوز کے ساتھ چھیڑا ہے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح خواجہ میر درد نے عرفانِ نفس اور کائنات کے روحانی پہلوؤں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ بھی ان ہی پر ختم ہو گیا۔ مثنوی میں میر حسن نے شمعِ سخن کو اس شان سے فروزاں کیا کہ مستقبل کی گزرگاہیں روشن ہو گئیں۔ سودا نے قصیدہ کو شان و شکوہ کی اونچی کرسی پر بٹھایا اور اپنی شگفتگی و ظرافت، طرفگی، مضامین اور جزئیات نگاری سے شاعری کو "لعل و گوہر کی توقیر" بخشی۔[۱]

میر اس ادبی ماحول کے پروردہ ہی نہیں، اس کے پروردگار بھی تھے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج دیا اور تہذیبِ رسمِ عاشقی کو زندہ کر دیا۔ ان سے پہلے

۱؎ حکیم اصلح الدین نے سودا کے متعلق لکھا ہے:

تھی ریختہ کی قدر خزف ریزہ سے کمتر دی اس کی زباں نے گہر و لعل کی توقیر

غزل ایک تنگ دائرہ میں محدود تھی اور اس کے پاس چند رسمی خصوصیتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ میرؔ نے اسے تہ دار اور بلیغ بنایا اور اس کے نغمے کو پوری انسانیت سے ہم آہنگ کرکے اس میں بلند معنویت اور اعلیٰ سنجیدگی پیدا کردی[۱]۔ میرؔ کی غزلیں جذباتی زندگی اور تمدّنی احوال کی ترجمان ہیں[۲]۔ وہ قافیہ پیمائی، لفظی عشوہ گری یا تلاشِ لفظِ تازہ سے عبارت نہیں ہیں۔ ان میں تخیّلی فکر اور اندرونی جذبے کی ہم آمیزی ہے۔ میرؔ کا ایک الگ نقطہ نظر اور ان کی ایک علیٰحدہ شخصیت ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں صدقِ اظہار کا کمال نظر آتا ہے۔ ان کے الفاظ حسن و لطافت کے نگینے اور ایمائی اثر کے خزانے ہیں۔ اسی طرح ان کے اسلوب میں ان کی شخصیت کے علاوہ غزل کی چاہت، اس کا اختصار، اس کی نغمگی اور اس کی بے پایاں رمزیت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔

میرؔ کا سرمایۂ شاعری صرف غزل ہی نہیں ہے۔ انھوں نے دوسرے اصنافِ سخن میں بھی قابلِ قدر اضافے کیے ہیں۔ زبان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا ہے

---

[۱] میرؔ فرماتے ہیں: (۱) چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

(۲) بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

(۳) زلف سا پیچ دار ہے ہر شعر — ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

(۴) مرا حرف رشکِ کتاب ہے — مری بات لکھنے کا باب ہے

[۲] میرؔ فرماتے ہیں: (۱) ہے عشق سے بتوں کے مراُدعا کچھ اور

(۲) دہر کا ہو گلہ کہ شکوۂ چرخ — اسی ستم گر ہی سے کنایت ہے

(۳) اس پردے میں غم دل کہتا ہے میرؔ اپنا — کیا شعر و شاعری ہے یارو شعارِ عاشق

(۴) مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع سو دیوان کیا

مشاعرے اور مراختے کئے ہیں، اُردو کو نئے اسالیب دیئے ہیں اور اس میں اپنے دور کے تمام ادبی اور فکری معیار سمو لئے ہیں۔ ہندی کے نرم اور رسیلے الفاظ کو قائم رکھا ہے ثقیل اور مکروہ الفاظ نکال دیئے ہیں۔ فارسی سے ترجمے کئے ہیں۔ روزمرۂ دہلی اور اور محاورات و مصطلحات کا صحیح استعمال بتلایا ہے۔ اور تنقید و تذکرہ کے ذریعہ شعر و ادب کی رہنمائی کی ہے ـــــــ یہ خدمات اتنی جلیل القدر ہیں کہ ان کی وجہ سے ان کو غیر فانی عظمت اور شہرت حاصل ہوگئی ہے۔

میر کی سحر کار آواز الگ پہچانی جاتی ہے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے ان کی سیرت اور شخصیت کا اچھا مطالعہ ضروری ہے۔ میر نے جو انقلابات دیکھے تھے، اور جو تکلیفیں زمانہ کے ہاتھوں اٹھائی تھیں، ان کا اتصاف ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ بلکہ میر کو الفاظ میں تحویل کرنے ہی سے ان کا شاعرانہ آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے۔ انھوں نے شعر نہیں کہے، دل اور دلّی کے مرثیے لکھے ہیں، محبت اور انسانیت کو جلا بخشی ہے۔ غم عشق اور غمِ آفاق نے مل کر ان کے اشعار میں آگ کی سی لپٹ پیدا کر دی ہے اور لفظ و معنی کی دوئی کو مٹا دیا ہے۔ ان کی شاعری کی پشت پر اُردو کے ارتقا کی تاریخ ہے اور اس میں برس ہا برس کی روایات، تمدنی وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔

ہم نے آئندہ اوراق میں میر کی تصویر کو ادب اور معاشرہ کے تاریخی مرقع میں سجانے کی کوشش کی ہے اور ان کی زندگی اور شاعری کی تحقیق اور تنقید کر کے ان کا ادب میں صحیح مقام متعین کیا ہے۔

حِصّہ اوّل: حیات اور سیرت

۷۸۶

باب اوّل: حیاتِ میر

میر کے اسلاف میر تقی میر نے اپنے بزرگوں کا حال خود نوشت سوانحِ عمری ذکرِ میر میں لکھا ہے۔ اور وہ ہی سب سے زیادہ مستند ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

میرے بزرگ زمانے کی ناسازگاری سے اپنی قوم و قبیلہ کے ساتھ حجاز سے روانہ ہو کر سرحد دکن میں پہنچے۔ راستے میں بہت سی صعوبتیں اور مصیبتیں اٹھائیں وہاں سے وہ احمد آباد گجرات میں وارد ہوئے۔ بعض تو ان میں سے وہیں رہ گئے اور بعض تلاش معاش کے لئے آگے بڑھے۔ چنانچہ میرے جد کلاں نے دارالخلافہ اکبرآباد میں توطن اختیار کیا۔ مگر آب و ہوا کی ناموافقت سے بیمار پڑ گئے اور اسی بیماری میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ایک فرزند چھوڑا۔ جو میرے دادا تھے۔ انھوں نے تلاش معاش میں تگ و دو کی اور بہت زحمت و مصیبت کے بعد اکبرآباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے۔ شریفانہ بسر کرتے تھے۔ جب سن شریف پچاس سال کا ہوا تو علیل ہو گئے اور ابھی پوری صحت نہ ہوئی تھی کہ گوالیار

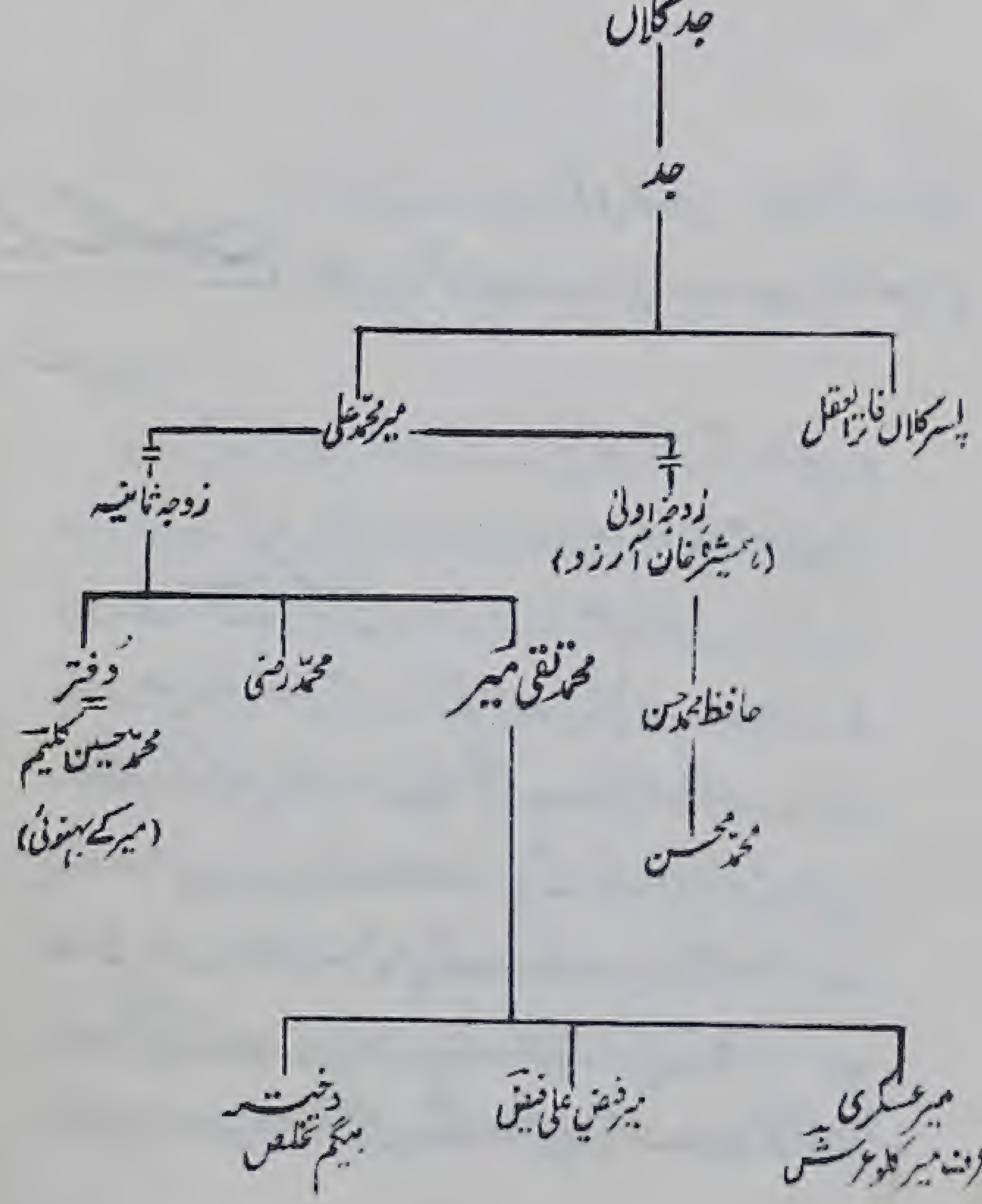
گئے اور چند ہی روز بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کو کچھ خلل دماغ تھا اور وہ جوان مر گئے۔
چھوٹے بیٹے نے جو میرے والد تھے، درویشی اختیار کی اور ترک دنیا کر کے بیٹھ گئے[1]

---

[1] ذکر میر ص ۳، ۴ - فارسی سے ترجمہ
میر کے خاندان کو ایک شجرہ کے ذریعہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

شجرہ خاندان میر



علی متقی یا محمد علی؟ ارباب تذکرہ میر کے والد کے نام میں اختلاف رکھتے ہیں۔ سعادت خاں ناصر[1]، حکیم عبدالحیٔ (صاحب گل رعنا)، مولوی محمد حسین آزاد (مصنف آب حیات) اور بلوم ہارٹ[2] ان کے والد کا نام میر عبداللہ لکھتے ہیں۔ گلزار ابراہیمی میں بھی یہی لکھا ہے۔ بیل نے محمد متقی مانا ہے[3]۔ اور سر شاہ سلیمان نے میر محمد علی نام اور علی متقی لقب یا عرف قرار دیا ہے[4]۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اصلی نام علی متقی تسلیم کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

ان کے (میر کے) والد کا نام ذکر میر میں بارہا آیا ہے۔ میر صاحب کی زبان سے ہو یا کسی دوسرے کی زبان سے ہو لیکن ہر جگہ علی متقی ہی لکھا ہے اس سے وثوق ہوتا ہے کہ اصلی نام یہی تھا۔[5]

لیکن یہ صحیح نہیں۔ ذکر میر میں صاف لکھا ہے:۔

جوان صالح عاشق پیشہ بود، دل گرمی داشت، بہ خطاب علی متقی امتیاز یافت[6]

میر کے والد کا نام بھی ذکر میر میں آیا ہے، جس سے شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

خواجہ باسط کہ برادر زادہ صمصام الدولہ امیرالامرا بود، عنایتے بحال من کرد و پیش نواب برد، چوں مرا دید، پرسید کہ ایں پسر از کیست؟ گفت از میر محمد علی است فرمود از آمدن ایں پیدا است کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند[7]

---

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا مولفہ سعادت خاں ناصر میں لکھا ہے: "پسر رشید میر عبداللہ"

[2] بلوم ہارٹ: ہندوستانی مخطوطات کی فہرست (انڈیا آفس)

[3] بیل: اورنٹیل بایوگرافیکل ڈکشنری

[4] مقدمہ مثنویات میر: سر شاہ محمد سلیمان

[5] مقدمہ ذکر میر: ڈاکٹر عبدالحق ص ۸

[6] ذکر میر ص ۵ [7] ذکر میر ص ۶۲

ذکرِ میر کی ان دو عبارتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کے والد کا نام محمد علی تھا اور لوگ انھیں ریاضت اور تقویٰ کی وجہ سے "متقی" کہنے لگے تھے۔

میر محمد علی: حالات اور سیرت

میرؔ نے اپنے والد کا حال خود نوشت میں لکھا ہے۔ ان کے انتقال کے وقت میرؔ کی عمر دس برس سے زیادہ نہ تھی لیکن ان کی سیرت کا اوّلین نقش انھیں کے ہاتھوں صورت پذیر ہوا تھا اس لیے ان کے حالات بھی مفصل طور پر جاننے کی ضرورت ہے۔

میرؔ نے لکھا ہے کہ میرے والد بڑے صوفی صافی اور درویش دل ریش تھے۔ انھوں نے علم ظاہری جس کے بغیر عالم معنی تک پہنچنا دشوار ہے، شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی[۱] سے حاصل کیا اور اُن ہی بزرگ کی رہنمائی میں بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ اور ترک و تجرید کی سعی میں بہت کچھ زحمت برداشت کی جس سے وہ درویشی کے اعلیٰ مقام تک پہنچے۔ جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے۔ دل میں گرمی اور سوز رکھتے تھے۔ اس لیے علی متقی کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ ہمیشہ یادِ الٰہی میں مصروف رہتے تھے اور حق تعالیٰ نے ہمیشہ انھیں ذلت سے محفوظ رکھا اور جب کبھی ان کی طبیعت شگفتہ ہوتی تو فرماتے کہ "بیٹا! عشق اختیار کرو کہ عشق ہی اس کارخانہ پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق کے زندگانی وبال ہے۔ اور عشق میں دل کھونا اصلِ کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے اور عشق ہی بگاڑتا ہے۔

---

[۱] تاریخ محمدی (قلمی رام پور) مولفہ مرزا محمد حارثی بدخشی میں ص ۱۰۱۳ پر افق المبین کے حوالہ سے لکھا ہے: "شیخ کلیم اللہ اکبر آبادی جامع المعقول والمنقول در اکبر آباد فوت شد در ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۷ء"

بے عشق نباید بود، بے عشق نباید زیست
پیغمبر کنعانی، عشق پسرے دارد"

میرؔ کے کلام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ان خیالات کی بازگشت موجود ہے۔

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو — سارے عالم میں بھر رہا ہی عشق
عشق معشوق، عشق عاشق ہے — یعنی اپنا ہی مبتلا ہی عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا — آرزو عشق، مدعا ہی عشق

عشق سے نظم ہے یعنی عشق ہے کوئی ناظم خوب
ہر شئے یاں پیدا جو ہوئی ہے موزوں کرلایا ہی عشق
ظاہر باطن، اول آخر، پایئں بالا عشق ہے سب
نور و ظلمت، معنی و صورت سب کچھ آپ ہوا ہی عشق
موج زنی ہی میرؔ فلک تک، ہر لجّہ ہی طوفاں زا
سرتاسر ہے تلاطم جس کا وہ اعظم دریا ہی عشق

درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق
شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے
سچّے ہیں شاعراں خدا ہے عشق

اگر میرؔ صاحب کے والد کسی وقت استغراق اور مجاہدے سے فرصت پاتے

تو کہتے کہ عالم میں جو کچھ ہے، عشق کا ظہور ہے، آگ سوزِ عشق ہے، پانی، رفتارِ عشق ہے۔ خاک قرارِ عشق ہے۔ ہوا اضطرارِ عشق ہے۔ موت، عشق کی مستی ہے، حیات عشق کی ہوشیاری ہے۔ رات عشق کا خواب ہے، دن عشق کی بیداری ہے۔ تقویٰ قربِ عشق ہے، گناہ، بُعدِ عشق ہے، بہشت عشق کا شوق ہے، دوزخ، عشق کا ذوق ہے، اور مقامِ عشق تو عبودیت، عارفیت زاہدیت، صدیقیت، خلوصیت، مشتاقیت اور حبیبیت سے بلند و برتر ہے۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ آسمانوں کی حرکت، حرکتِ عشقی ہے یعنی بمطلوب می رسند و سرگرداند میرؔ نے بالکل یہی مضمون ایک شعر میں لکھا ہے۔ ؎

مقصودِ گُم کیا ہے تب ایسا ہے اضطراب
چکر میں ورنہ کاہے کو یوں آسماں رہے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کے یہ اولین نقوش، دھندلے نہیں ہوئے بلکہ خارجی ماحول نے ان کو اور چمکا دیا۔

میر کے والد دن کو کھوئے کھوئے سے رہتے، اور رات کو عبادت میں مصروف رہتے (روز حیراں کار، شب زندہ دار، اکثر روئے نیاز برخاک) وہ درویش پرست اور وسیع المشرب تھے، میرؔ نے لکھا ہے: "چہرہ نورانیش رونق افزائے بزم صبح خیزاں، آفتابے بود امّا از سایۂ خود ہم گریزاں۔" جس وقت ہوش میں آتے تو فرماتے کہ "بیٹا عالم کی حقیقت ایک ہنگامہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس سے دل نہ لگانا عشقِ الٰہی اختیار کرو اور خدا سے لو لگاؤ، آخرت کی فکر لازم ہے۔ یہ دنیا گزرنے والی ہے اور زندگی وہم ہے۔ وہم کے پیچھے دوڑنا عبث ہے۔ چل چلاؤ لگا ہے اس لئے زادِ راہ کی فکر کرو ورنہ اس منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ اُس سے رجوع کرو عالم جس کا آئینہ ہے اور اختیار اُس کو سونپو جس کو ہم اپنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ تمھارا وجود بے اس

کے نہیں اور اُس کی نمود بے تیرے نہیں۔

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت بدو کنند"

میر نے لکھا ہے کہ میرے والد کامل فقیر[1] تھے، اور بڑی درد مند طبیعت رکھتے تھے جب مجھے گلے لگاتے تو شفقت سے کہتے کہ اے سرمایۂ جان یہ کیسی آگ ہے جو تیرے دل میں چھپی ہے اور وہ کیسا سوز ہے جو تیری جان کے ساتھ لگا ہے۔ اس پر میں ہنس دیتا اور وہ رونے لگتے۔

ایک روز نماز اشراق کے بعد میری طرف توجہ فرمائی اور مجھے کھیلتا دیکھ کر کہنے لگے "بیٹا! زمانہ سیال ہے یعنی بہت کم فرصت۔ اپنی تربیت سے غافل نہ رہو۔ اس رستہ میں بہت نشیب و فراز ہیں دیکھ کر چلو ؎

نشان پائے تو فرد حساب زندگیست

قدم شمردہ دریں کہنہ خاک داں بردار

.... ایسے پھول کا بلبل ہو جو صدا بہار ہے .... فرصت کو غنیمت سمجھو اور اپنے تئیں پہچاننے کی کوشش کرو۔"

میر کے والد کی صورت بڑی پاکیزہ اور متبرک تھی چہرہ سے نور برستا تھا۔ اخلاق سنجیدہ اور اوصاف حمیدہ رکھتے تھے۔ استقامت ایسی تھی کہ کم کسی میں ہوگی[2] "طبعش مشکل پسند، جانش درد مند، مژگاں نم، حال درہم"۔ ان کو علائق دنیوی سے نفرت تھی اور طبیعت ہجوم خلائق سے پرہیز کرتی تھی۔ بعض اوقات اس درجہ رقت طاری ہوتی کہ ہچکی بندھ جاتی:

---

[1] بلوم ہارٹ نے ان کو شرفائے اکبرآباد میں شمار کیا ہے ملاحظہ ہو ہندوستانی مخطوطات کی فہرست (انڈیا آفس)، [2] ذکر میر ص ۹۔

ازبس گریستے گرباش درگلو گرہ گشتے۔ نالہ کہ ازدلش سر برزدے از آسماں گزشتے۔
(ص ۱۱)

میرؔ نے بعض اشعار میں اس کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں مشاہدہ اور تجربہ کی صداقت شامل ہے۔

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ہمیشہ چشم ہے نمناک، ہاتھ دل پر ہے خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

پوچھا جو میں نے درد محبت سے میرؔ کو رکھ ہاتھ ان نے دل پہ ٹک اک اپنے دبا دیا

امڈی آتی ہیں آج یوں آنکھیں جیسے دریا کہیں اُبلتے ہیں

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم نے جانا تھا کہ بس اب تو یہ ناسور گیا

میرؔ کے والد بہت کم اختلاط اور کم آمیز تھے۔ خصوصاً امرا و روسا سے ملنے میں بہت تکلف کرتے اور صاف کہہ دیتے کہ میں فقیر اور تم امیر۔ مجھ سے کیوں ملتے ہو۔ امیرالامرا صمصام الدولہ نے بہت اصرار کیا کہ مجھے دولتِ دیدار سے محروم نہ رکھیے۔ آپ نے تبسم فرمایا اور کہا کہ ملاقات کے لیے مناسبت شرط ہے۔ امید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں گے۔ میرؔ نے لکھا ہے:-

مردے بود بحال خودی، کسے را بار دوشے نشدے۔

مرتے وقت بھی جو نصیحت آپ نے فرمائی تھی وہ یہی کہ

حق تعالیٰ غیور است و غیور را دوست دارد۔

میرؔ کے یہاں جو خودداری ہے، اس کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔

سر کسو سے فرو نہیں آتا — حیف بندے ہوئے، خدا نہ ہوئے

آگے کسی کے کیا کریں دست طمع دراز — وہ ہاتھ سو گیا ہی سرہانے دھرے دھرے

میرؔ کے یہاں جو آزادگی اور کشادہ قلبی ہی وہ بھی باپ سے آئی ہی۔ انھوں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "پس کا فر شدل چہ عیب است بمنظور چشم اوست از ہر جا که رونماید؎

بدیر و کعبہ می گردیم گاہ ایں جا و گاہ آں جا

کہ مطلب جستجوے اوست خواہ ایں جا و خواہ آں جا"

میرؔ نے اپنی والد کی کرامتیں اور خوارق عادات بیان کی ہیں اور لکھا ہی کہ ایک روز حالتِ اضطراب میں بھوکے پیاسے نکل کھڑے ہوئے اور لاہور پہنچے۔ وہاں سے دہلی آئے۔ جب لوگوں کا ہجوم بڑھنے لگا تو ایک روز آدھی رات کو چپکے سے نکل کھڑے ہوئے لوگ ڈھونڈھتے ہی رہ گئے۔ بیانہ پہنچے وہاں ایک نوجوان سید (لالہ رخسارے، خوش پرکارے) پر ان کی نظر پڑی اور وہ دل و جان سے ان کا معتقد ہو گیا۔ بیانہ سے وہ آگرے آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔

یہ نوجوان سید بھی اپنی نئی نویلی دلہن اور گھر بار چھوڑ کر میر محمد علی کی تلاش میں آگرہ آیا اور ان کی توجہ سے درویشی کے اعلیٰ مقام پر پہنچا۔ ان کا نام سید امان اللہ تھا اور ان کو علی متقی کی بڑی قربت حاصل تھی۔ میرؔ کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے

میر ان کو عم بزرگوار کہتے اور ہر وقت ان کے پاس رہتے۔

میر کی وِلادت میر محمد تقی میر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:-

دوطن، اکبر آباد است۔ بہ سبب گردش لیل ونہار از چندے در شاہ جہان آباد است [1]

میر کے سن ولادت میں اختلاف ہے لیکن تاریخ وفات متنازعہ فیہ نہیں۔ ناسخ کے اس مصرع سے "واویلا مُرد شہ شاعراں" تاریخ وفات سنہ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۰۸ء نکلتی ہے۔ [2]

آزاد نے میر کی عمر ۱۰۰ سال قرار دی ہے جس کی رُو سے سن ولادت سنہ ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء ہوا۔ تذکرۂ جہاں میں اسّی برس عمر بتائی ہے۔ اس کی رُو سے سن ولادت سنہ ۱۱۴۵ھ / ۱۷۳۲ء ہوا۔ مصحفی نے عقد ثریا میں میر کی عمر کا ذکر نہیں کیا [3] لیکن اپنے دوسرے تذکرہ میں جس کا سن تالیف سنہ ۱۲۰۹ھ / ۱۷۹۴ء ہے لکھتے ہیں:-

"عمرش تخمیناً قریب ہشتاد ست" [4]

اس طرح میر کا سالِ ولادت تقریباً سنہ ۱۱۲۹ھ / ۱۷۱۶ء ہوا۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے سن ولادت سنہ ۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء لکھا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ قرار

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۲۳ [2] دستور الفصاحت (ص ۲۹) میں بھی ایک قطعہ درج ہے ؎

جب دل احباب پر موجب رنج و الم
واقعہ جاں گداز۔ میر تقی کا ہوا
مادہ تاریخ کا بیر خرد نے وہیں
درد کے رو سے کہا "آج نظیری مُوا" ۱۲۲۵ھ

نیز ملاحظہ ہو فہرست کتب خانہ اودھ (اسپرنگر) جلد اول، نساخ :- گنج تواریخ، بلوم ہارٹ:- ہندوستانی مخطوطات کی فہرست و کلیات ناسخ ص ۲۲۱ [3] عقد ثریا ص ۵۳، ۵۴ [4] تذکرہ ہندی ص ۲۰۴

دی ہے کہ ذکرِ میر جو ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء میں ختم ہوئی اس وقت میر کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔[1]
رام بابو سکسینہ نے بھی ۱۱۳۷ھ ہی کو صحیح جانا ہے۔ لیکن سر شاہ محمد سلیمان نے ایک برس کم کر کے یعنی ۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء کو سالِ ولادت تسلیم کیا ہے۔[2]

خان بہادر جعفر علی خاں اثر نے نیرنگ کے میر نمبر میں سنِ ولادت ۱۱۳۷ھ اور سنِ وفات ۱۲۲۵ھ لکھا ہے۔[3] مزامیر میں بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں۔[4] اس سلسلہ میں نوادر الکملا کی حسبِ ذیل عبارت بیحد اہم ہے۔ جو میر کے دیوانِ چہارم کے ایک مستند قلمی نسخے[5] پر درج ہے۔ یہ نسخہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

در اواخر یک ہزار و یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ

اس دیوان کے سرورق پر محمد محسن شاگردِ میر تقی میر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت موجود ہے۔

بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار و دو صد و بست و پنجم ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب، میر تخلص، صاحبِ ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بہ جوارِ رحمتِ ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است بہ محررِ سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیأتہ در حینِ حیات خویش بکمالِ رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد۔

---

[1] مقدمات عبدالحق حصہ اول ص ۲۴۲ [2] انتخاب مثنویاتِ میر ص ا [3] نیرنگ میر نمبر ص ۲
[4] مزامیر، مقدمہ ص ۱۱ [5] نسخہ دیوان چہارم میر تقی میر (قلمی)، مکتوبہ محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد کتب خانہ ریاست محمود آباد (یہ عبارت نوادر الکملا کے حوالہ سے درج ہے جو نایاب ہے)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر سنہ ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے، ۹۰ برس کی عمر پائی اور سنہ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں انتقال فرمایا۔

سیّد امان اللہ میر نے سید امان اللہ کی صحبت سے بڑا فیض اٹھایا ہے۔ سات سال کی عمر سے وہ اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ سید امان اللہ بھی ان کو اپنے بیٹے کی طرح رکھتے تھے اور ایک لمحہ کو اپنی نظر سے الگ نہیں کرتے تھے۔ میر نے لکھا ہے کہ میں روز و شب ان کے ساتھ رہتا تھا اور قرآن شریف پڑھتا تھا۔

میر نے ان کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، ایک روز میر امان اللہ جمعہ کے بازار کی سیر کو گئے۔ وہاں ان کی نظر ایک روغن فروش لڑکے پر پڑی۔ دیکھتے ہی دل قابو سے باہر ہو گیا۔ اور ضبط کی طاقت جاتی رہی۔ اس محبت کے غم میں اتنا ضعف ہو گیا کہ زمین پر پیر نہیں اتار سکتے تھے۔ ایک غلام کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کھڑے ہوتے تھے۔ جب حالت بہت غیر ہو گئی تو پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان کی توجہ حاصل کریں۔ اس وقت حال یہ تھا کہ آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر ٹھنڈی آہیں، حاضرینِ مجلس نے ان کو دیکھتے ہی جگہ کر دی، لیکن میر محمد علی نے انھیں صدر میں بٹھایا اور کہا "اے بھائی کہاں تھے" عرض کیا کہ جمعہ کے بازار کی سیر کو گیا تھا، فرمایا کیا تم نے نہیں سنا ؏

دیدنِ طفلانِ تہہ بازار رسوائی کند

پھر فرمایا "جاؤ آٹھ دن تک اپنے حجرے سے باہر مت نکلو اور خبردار کسی کے سامنے یہ داستان مت بیان کر ناحق تعالیٰ کریم ہے کیا عجب ہے کہ اس کی رحمت تمہارے شامل حال ہو" ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ وہ ماہ دو ہفتہ بے چین ہو گیا۔ اور بھاگا ہوا آستانہ اقدس پر حاضر ہوا۔ جو شہر پناہ کے باہر عید گاہ کے قریب واقع تھا۔ میر محمد علی نے ایک غلام کو اشارہ کیا، اور کہا: "جاؤ برادر عزیز کو بلا لاؤ

اس سے کہو کہ تمھارا مطلوب تمھیں ڈھونڈتا ہے۔" میر امان اللہ دست افشاں و پاکوباں بھاگے ہوئے آئے۔ اور اپنے پیر کے قدموں سے لپٹ گئے۔ اس کے بعد اپنے مطلوب سے بغل گیر ہوئے۔ اس لڑکے نے کہا "میں نے بہت تکلیف اٹھائی لیکن خیر خزانہ پالیا۔ اب اس آستانہ کی جاروب کشی کو اپنی سعادت سمجھتا ہوں۔"

یہ نوجوان اپنی ریاضت سے مریدانِ خاص اور درویشانِ باصفا میں شمار ہونے لگا۔

میر صاحب لکھتے ہیں کہ میرے "چچا" کو درویشوں سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز وہ احسان اللہ نام ایک درویش کے پاس گئے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، اس فقیر کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دروازے پر آواز دیتا وہ کہہ دیتا کہ احسان اللہ گھر میں نہیں ہے۔ آج بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ میرے چچا نے کہا "اگر احسان اللہ نہیں ہے تو امان اللہ ہے۔" وہ ہنسا اور اس نے فوراً دروازے کے کواڑ کھول دیئے۔ ایک جوان شخص نظر آیا۔ شیر اندام، خورشید سوار، اس کے چہرے سے ہیبت حق ظاہر ہو رہی تھی۔ میر لکھتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں وہ بزرگ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا یہ لڑکا کس کا ہے۔ فرمایا علی متقی کا فرزند اور مجھ گنہگار کا پروردہ ہے۔ درویش نے فرمایا کہ یہ ابھی بچہ ہے۔ اگر اس کی بخوبی تربیت ہوئی تو ایک ہی پرواز میں آسمان کے اس طرف پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد درویش نے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا پانی میں تر کرکے کھانے کو دیا۔ میر صاحب کا بیان ہے کہ اس میں مجھے وہ لذت ملی جو آج تک کسی کھانے میں نہیں ملی۔ اور اس کا ذائقہ اب تک یاد ہے۔

میر صاحب نے احسان اللہ درویش کے انتقال کا عجیب واقعہ لکھا ہے کہ ایک دن ان کے پاس ایک گویا لڑکا آیا "طنبورہ بر دوش، حلقہ زر در گوش"

درویش نے میرے چچا سے کہا کہ اسے بلالو اس نے آکر یہ غزل پڑھنی شروع کی ؎

بیا کہ عمر عزیزم بہ جستجوئے تو رفت   ز دل نہ رفتی و جانم ز آرزوئے تو رفت

اس کو سنتے ہی فقیر پر وجد کی حالت طاری ہوئی اور اس نے بڑا لطف اٹھایا اور کہا "اے عزیز آج کی رات تو یہیں رہ اور جو کچھ تجھے یاد ہے سنا" اس نے قبول کیا۔ جب شام ہوئی تو اس نے ہم لوگوں کو رخصت کیا اور دروازہ بند کر کے یاد الٰہی میں بیٹھ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فقیر نے سوتے وقت اشرفیاں (جو نصرت یار خاں صوبہ دار شہر نذر کے طور پر دے گئے تھے) تکیے کے نیچے رکھ لی تھیں۔ وہ اس لڑکے کی نظر پڑ گئیں وہ بازار سے ایک پیالہ دودھ کا زہر ڈال کر لایا۔ اور درویش کو بڑے اصرار سے پلایا۔ زہر نے فوراً اپنا اثر کیا اور وہ بے مروت اشرفیاں لے کر بھاگ گیا۔

میر نے لکھا ہے کہ میرے چچا کو درویشوں کی خدمت میں سعادت حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا ایک روز معلوم ہوا کہ ایک درویش بایزید نام سرائے گیلانی کے قریب جو سیلاب سے تباہ اور برباد ہو گئی تھی ٹھیرے ہوئے ہیں وہ فوراً ملنے کے لیے گئے دیکھا کہ ایک جوان شکستہ دل، کشادہ روح، برشتہ جان، دلدادہ، بڑی بے کسی کی حالت میں پڑا ہے۔ اور یاد حق میں مصروف ہے۔ نہ کھانے پینے سے رغبت رکھتا ہے۔ اور نہ پہننے اوڑھنے سے، یہ درویش میرے چچا سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور زبان مبارک سے بہت نصیحتیں کیں ان نصیحتوں میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ دیر و مسجد کی قید سے آزاد ہو جاؤ اور اگر مقصود تک پہنچنا چاہتے ہو تو کسی دل میں راہ پیدا کرو۔ میر کے کلام میں جا بجا ان خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ؎

کس کا کعبہ کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

مت رنجہ کر کسو کو کہ اپنے تو اعتقاد
دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

شرکت شیخ و برہمن سے میرؔ | کعبہ و دیر سے بھی جائیے گا
اپنی ڈیڑھ اینٹ کی جدی مسجد | کسی ویرانہ میں بنائیے گا

بایزید نے سب سے زیادہ اس بات پر زور دیا تھا:
زنہار کہ دل شکنی کسے نہ کنی و سنگ ستم بر شیشۂ نہ زنی۔ دل را کہ عرش ہی گویند از یں راہ است کہ منزل خاص آں ماہ است ؎

بیازارم ز خود ہرگز دلے را | کہ می ترسم درو جائے تو باشد

میرؔ نے ان خیالات کو اکثر جگہ نظم کیا ہے ؎
دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا
اس کارواں سرا میں کیا میرؔ بار کھولیں
یہاں کوچ لگ رہا ہے شام و سحر ہمارا

سعیٔ طوفِ حرم نہ کی ہرگز | آستاں پر ترے مقام کیا

تیرے کوچہ کے رہنے والوں نے		یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
عشق خوباں کو میرؔ میں اپنا		قبلہ و کعبہ و امام کیا

دیر و حرم میں کیوں کہ قدم رکھ سکے گا میرؔ
ایدھر تو اس سے بت پھرے، اُدھر خدا پھرا

بایزید نے دوسری ملاقات میں میرؔ کے سر سے ٹوپی اتاری اور پوچھا یہ کون ہیں؟ سید امان اللہ نے کہا علی متقی کے بیٹے ہیں۔ درویش نے کہا "ہاں وہ تو بڑے بزرگ ہیں دانائے اسرار، خورشید آسماں، یہ اسی دریا کا موتی ہیں ہاں ہم فقیر تو ان کے مقابلہ پر بالکل تہی دست ہیں"

ایک روز میر امان اللہ میر کو لے کر پھر بایزید کے پاس پہنچے یہ تیسری اور آخری ملاقات تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ بایزید بیمار اور رنجور ہیں اور ایک پہلو سے لیٹے ہوئے آہ، آہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے سید امان اللہ کو دیکھ کر ایک سرد آہ کھینچی اور شفائیؔ کا یہ شعر پڑھا ؎

پرستارے ندارم بر سرِ بالیں بیمارے		مگر آہم ازیں پہلو بہ آں پہلو بہ گرداند

پوچھا کہ یہ کیا حال ہے؟ فرمایا اے عزیز میرا سینہ ایسے جل رہا ہے گویا اندر آگ سلگ رہی ہے۔ ہر نالہ آتش ہے اور ہر آہ ایک شعلۂ سرکش ؎

من نمی دانم کہ دل می سوزد از غم یا جگر		آتش افتادست در جائے و دودے می کند

اگر موت میری فریاد کو پہنچ جائے تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھوں گا۔ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو قرار، ہوا جو چلتی ہے اس آگ کو بھڑکا دیتی ہے۔ پانی جو پیتا ہوں وہ

آگ پر تیل کا کام کرتا ہے۔ کاش کوئی میرے سینے کو چیر ڈالے اور دل و جگر کو باہر نکال پھینکے۔ زوال آفتاب تک اُن کا یہی حال رہا اور ظہر کی نماز پڑھتے ہی راہی عدم ہوئے۔ رات کو میرے چچا نے انھیں خواب میں دیکھا، بہت خوش تھے اور کہہ رہے تھے: "دیکھا تم نے! اس عشق نے میرے اندر کیسی آگ لگا دی تھی۔ اس کا علاج بجز موت کے اور کچھ نہ تھا۔ جب میرے محبوب نے میری بیتابی کو دیکھا تو مجھے رحمت کے سمندر میں ڈال دیا اور مجھے گوہر مقصود سے ہم کنار کیا۔"

میر امان اللہ میر محمد علی اور ان درویشوں کی سیرت اور شخصیت نے میر کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کا اندازہ ان کے کلام سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ احسان اللہ کی بیخودی میں ایک عجیب کیفیت پوشیدہ تھی۔ میر نے ایسا معلوم ہوتا ہے ان کی حالت کو سامنے رکھ کر ان اشعار میں ان کی تصویر کشی کی ہے ؎

ملنے والوں پھر ملے گا ہے وہ عالم دیگر میں
میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

بیخودی پر نہ میر کی جاؤ تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

بیخودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

رہے ہم عالم مستی میں اکثر رہا کچھ اور ہی عالم ہمارا

دل جو نہ تھا تو رات زخود رفتگی میں میر
گہہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

میر کے یہاں وہ بے دماغی بھی ہے جو بایزید کے یہاں نظر آتی ہے ؎

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے — گل گشت کو جو آئیے آنکھوں پہ آئیے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا — وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اٹھائیے

گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن — جی جو اچٹا تو کسو طرح لگایا نہ گیا

بایزید کے دل میں جو آگ تھی اس کی چنگاری میر کے دل پر بھی آپڑی تھی وہ خود اس کوچہ سے گزرے تھے اور مصائب روزگار نے اس آگ کو بھڑکا دیا تھا۔ ان کی محرومی اور ناکامی کو بھی ان کی سیرت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عشق کی کیفیات کا اس صداقت اور خلوص کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ دل اور نظر دونوں جذب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

قامت خمیدہ رنگ شکستہ بدن نزار — تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

گلی میں اس کی گیا سو گیا نہ بولا پھر — میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

بایزید نے خواب میں کہا تھا "دیدی کہ عشق چہ آتشے در من زد و چنانم سوخت چارۂ کار جز مرگ نبود۔" اس قول کی روشنی میں میر کے اس شعر کو دیکھیے۔ ؎

چارۂ عشق بجز مرگ نہیں کچھ اے میر — اس مرض میں ہے عبث فکر تمھیں درماں کا

میر کے والد نے ان کے زرد رنگ کو دیکھ کر کہا تھا "اے بیٹے تیرا رنگ زرد ہے تجھے کس کا درد ہے" ان اقوال کی صدائے بازگشت ان اشعار میں سنائی دیتی ہے تجربہ کی صداقت نے ان کو تیر و نشتر بنا دیا ہے۔ ؎

کیا میر ہی یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا　　نمناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

دل ہم پہنچا بدن میں تب سے سارا تن جلا

آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

ان بزرگوں کی اگر تصویروں کو سامنے رکھا جائے تو ان اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

؎ ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے

خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر پر ان صحبتوں کا گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے بے نیازی، خودداری، اور کم آمیزی اپنے باپ سے سیکھی۔ اور سوز و گداز اور جوش و خروش سید امان اللہ سے حاصل کیا۔ میر کی سیرت میں ان تمام بزرگوں کی سیرت کے نقوش نظر آتے ہیں۔ اس کی گواہ ان کی زندگی اور شاعری دونوں ہیں۔

میر کے چچا اور والد کا انتقال میر نے اپنے والد کی وفات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور ایک عجیب نقل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے والد نے سید امان اللہ سے فرمایا "اے برادر عزیز ہر روز ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ اگر قرآن حفظ کر لو تو کیا اچھا ہو" عرض کیا کہ بہت خوب۔ ایک روز دونوں باہم بیٹھے دور کر رہے تھے کہ ایک درویش اسد اللہ نام۔ نیلے کپڑے پہنے اور نمدی کلاہ اوڑھے وارد ہوا۔ جوں ہی میرے والد کے سامنے آیا آپ نے فرمایا "اے سراپا پرنکبود جامہ اتنے دور دراز کا سفر تو نے کیوں اختیار کیا۔ اور اس قدر زحمت اور مشقت کیوں اٹھائی" درویش دوڑ کے قدموں پر گر پڑا۔ والد اس سے بغل گیر ہوئے

اور اپنے قریب جگہ دی۔ چچا جان یہ اختلاط دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ کہا کہ میرے قدیم آشنا ہیں۔ وہ اور زیادہ متعجب ہوئے اس لئے کہ ان کو اس سے پہلے نہ دیکھا تھا۔ فرمایا: "ہم دونوں ایک ہی آستانے کے غلام ہیں۔ سال میں ایک بار ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے مرشد سے عرض کیا کتنا اچھا ہو اگر مرنے سے پہلے مجھے اس کی اطلاع ہو جائے اور آثار مرگ کے ساتھ میں اپنی توجہ دوسری چیزوں سے ہٹالوں۔ ارشاد ہوا جب تم اس سیرا یہ پر کبود جامہ کو دوبارہ دیکھو گے تو یقین کر لینا کہ دوسرے سال تک زندہ نہ رہو گے۔ سمجھ لو کہ اب عمر بہت تھوڑی باقی ہے۔" عم بزرگوار اس بات کو سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور کہا کہ انشاء اللہ میں اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھوں گا۔ اور اس سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا۔

جب اس درویش سے باتیں ہوئیں تو اس نے کہا کہ کچھ دنوں سے میری دکان بالکل نہیں چلتی تھی، اور اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ ایک روز میں نے اپنے پیر و مرشد کو خواب میں دیکھا کہ وہ سرہانے کھڑے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ اے اسد اللہ ہر چند کہ سفر میں صعوبت بہت زیادہ ہے اور راستہ بھی دور کا ہے لیکن ایک بار تم علی متقی کے پاس ضرور جاؤ۔ میرے اور ان کے درمیان ایک اشارہ ہے جس کو وہ تمہارے جانے سے سمجھ جائیں گے۔ اس لئے جلدی جاؤ۔ اور کساد بازاری سے پریشان نہ ہو۔ وہاں سے واپسی پر تمہاری دکان خوب چلے گی۔" میں نے دکان کو ایک شاگرد کے سپرد کیا اور سیدھا اکبر آباد کے لئے چل کھڑا ہوا۔

عید کا دن تھا چچا جان نے کپڑے بدلے اور نماز پڑھی۔ اس کے بعد ان کے سینہ میں ایسا درد شروع ہوا کہ کسی کروٹ چین نہیں آیا، چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اور صبر کی طاقت جاتی رہی۔ والد سے بلا کر کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ درد جان کے ساتھ

جائے گا۔ دم گھٹا جاتا ہے اور صبر ہے کہ کسی طرح نہیں ہوتا۔ شام تک یہ درد سارے جسم میں پھیل گیا اور ان کی تکلیف سے دیکھنے والوں کے دل ہلنے لگے۔ فجر کی نماز کے وقت انھوں نے انتقال کیا۔ اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔

میرؔ نے لکھا ہے کہ ان کے انتقال کا میرے والد کو بڑا صدمہ ہوا۔ اور وہ اپنے آپ کو "عزیز مردہ" کہنے لگے۔ خود میرے اوپر قیامت گزر گئی۔ ہر وقت ان کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی ضرورتوں کو ان ہی سے کہتا تھا۔ اب دن اور رات سوائے ان کی یاد کے اور کچھ شغل نہیں تھا۔ والد بہتیری دلجوئی کرتے لیکن غم غلط نہ ہوتا کبھی فرماتے کہ مجھے تیرا بڑا خیال ہے لیکن میں خود بر سر راہ ہوں۔ کبھی کہتے خدا کا شکر ہے کہ دس برس کے ہو۔ اُس پر نظر رکھو اور اپنے دل کو مضبوط کرو۔ اس سے بڑا اور کوئی وارث نہیں۔

آخر وہ دن جس کا ڈر لگا ہوا تھا آ پہنچا۔ ایک روز آپ دوپہر میں محمد باعث کی عیادت کے لئے عالم گنج تشریف لے گئے۔ رات کو مجھ سے فرمانے لگے کہ مجھے تُو کا سا اثر ہے اس وقت کچھ نہیں کھاؤں گا۔ صبح کو بیدار ہوئے تو خوب تیز بخار تھا حکیم ابوالفتح نے بہت سی تدبیریں کیں لیکن ایک بھی سودمند نہ ہوئی۔ یہ بخار رفتہ رفتہ دق میں تبدیل ہو گیا۔ اور غذا بالکل چھٹ گئی صرف نرگس کے پھول سونگھ لیتے تھے۔ ۲۱ رجب سے دوا بھی موقوف ہو گئی۔ اسی روز حافظ محمد حسن کو جو میرؔ کے بڑے بھائی تھے بلایا اور فرمایا کہ میں فقیر ہوں، کچھ نہیں رکھتا۔ یہ تین سو کتابیں ہیں ان کو آپس میں بانٹ لو۔ انھوں نے کہا "میں طالب علم ہوں ان کتابوں کی مجھے ضرورت ہے۔ ان بھائیوں کو ان سے کیا واسطہ۔ سوائے اس کے کہ ان کی پتنگ بنا کر اڑائیں یا پھاڑ ڈالیں"۔ والد کو یہ بات ناگوار گزری اور فرمایا: "اگرچہ تو نے فقیری اختیار کی ہے لیکن تیرے نفس کی برائی نہیں گئی۔ ان کتابوں کو تو ہی لے لیکن

یاد رکھ کہ اللہ تعالیٰ غیور ہے اور غیور کو دوست رکھتا ہے۔ میر محمد تقی تیرا دست نگر نہ ہوگا اور تو اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔" اس کے بعد وہ میرؔ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا۔ "مجھ پر تین سو روپے بازار کے قرض ہیں۔ جب تک وہ ادا نہ ہو لیں میری نعش نہ اٹھانا گھبراؤ نہیں۔ خدا کریم ہے۔ ہنڈی راستہ میں ہے۔ پہنچا ہی چاہتی ہے۔" اس کے بعد میرؔ کے حق میں دعا کی اور اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

میرؔ کی پریشانی

میرؔ نے لکھا ہے کہ باپ کا مرنا تھا کہ مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ دریا در دریا گریستم۔ لنگر از کف دادم۔ سر را بر سنگ زدم برخاک افتادم۔

بڑے بھائی نے ظاہر داری بھی چھوڑ دی۔ اور اس خیال سے کہ باپ مفلس مرا ہے، قرضخواہ دق کریں گے، پہلو تہی کرنے لگے اور کہنے لگے کہ جن کو انھوں نے ناز و نعم سے پالا ہے۔ وہ جانیں اور ان کا کام میں تو کسی کام میں نہ پہلے دخیل تھا اور نہ اب ہوں۔ میرؔ لکھتے ہیں کہ مجھے ان کی باتوں سے بڑا رنج ہوا لیکن خدا پر نظر کی اور صبر و استقلال سے کام لیا۔ بازار کے بقال دو سو روپے لے کر حاضر ہوئے لیکن میں نے قبول نہ کئے۔ اتنے میں مکمل خاں جو میرے عم بزرگوار کے مرید تھے۔ پانچ سو روپے کی ہنڈی لے کر آئے اور میرے رنج اور غم میں شریک ہوئے۔ میں نے تین سو روپے تو فوراً قرض خواہوں کو دے دیئے اور ایک سو روپے درویش کی تجہیز و تکفین میں صرف گئے۔ اور ان کو پیر کے پہلو میں دفن کیا۔

میرؔ کی تربیت

میرؔ کی ابتدائی تعلیم سات برس کی عمر سے شروع ہوئی۔ انھوں نے قرآن شریف سید امان اللہ سے پڑھا جو ان کے والد کے خاص مریدوں میں سے تھے اور جن سے خود میرؔ بھی بے حد مانوس تھے۔ ذکر میرؔ میں لکھا ہے:

من دراں ایام ہفت سالہ بودم۔ باخودم مانوس ساخت و در گریبانم انداخت

لمحۂ از خود جدا یم نمی کرد و بناز و نعم می پرورد۔ چنانچہ روز و شب با او می ماندم
و قرآن شریف بخدمت اُو می خواندم۔

میرؔ سید امان اللہ کے ساتھ احسان اللہ، بایزید، اور اسد اللہ وغیرہ درویشوں
کی صحبتوں میں بھی شریک رہے۔ سید صاحب کو اہل دل سے ملنے کا بہت شوق
تھا اور چونکہ میرؔ بھی ان کے بغل پروردہ تھے اس لئے وہ بھی ساتھ جاتے اور ان
بزرگوں کی درد بھری باتیں سنتے۔ بچپن کی ان صحبتوں کا میرؔ پر بڑا اثر پڑا اور ان
میں شروع ہی سے دردمندی اور قلندری کی شان پیدا ہو گئی۔ اور اس کا رس
ان کے کلام میں ہمیشہ باقی رہا۔ اولیا اللہ سے ان کی عقیدت بھی ہمیشہ قائم رہی اور
میرؔ اجمیر کے سفر میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی درگاہ کی زیارت سے
مشرف ہوئے۔[۱]

خود میرؔ کے والد بھی فقیر کامل تھے۔ اور ان کی شہرت دُور دُور تک
پھیلی ہوئی تھی۔ ہر درویش ان کا ادب اور احترام کرتا تھا۔ اور ان کی دلسوزی
اور وسیع المشربی کو سراہتا تھا۔ میرؔ کو بھی انھوں نے اس عشق پیشگی کی تعلیم دی
تھی جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ یہ باتیں ان کے دل میں اتر گئیں اور اس کا
اثر جابجا ان کے کلام میں جھلکتا ہے۔

میرؔ کی عمر دس برس کی تھی کہ سید امان اللہ کا انتقال ہو گیا۔ (۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء)
اس سے میرؔ کو بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے والد اکثر سمجھاتے تھے کہ

اے پسر من ترا بسیار می خواہم، امّا ازیں غم می کاہم کہ من نیز بر سرِ راہم
گاہ می گفت کہ ماہ من نہ طفل بالہ، الحمد للہ کہ دہ سالہ۔ چہ بہ کاہش افتادہ
آخر درویش زادہ۔ دل قوی دار۔ خود را بخدا سپار۔[۲]

---

[۱] ذکر میر ص ۶۹ [۲] ایضاً ص ۵۴۔

اسی سال علی متقی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اور میر کو لڑکپن ہی میں یتیمی کا داغ سہنا پڑا۔ اس وقت بقول ڈاکٹر عبدالحق ان کی عمر دس یا گیارہ برس کی تھی۔

باپ کے انتقال کے بعد میر پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیکن اس لاوارث اور خوددار بچہ نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ خود لکھتے ہیں۔

خدائے کریم مرا شرمندہ احسان کسے نہ کرد و دست نگر برادر کہ سر بہ سر من داشت نساخت بقل ماتم درویش قسمت ساختم۔ کار را بہ لطف خداوند اندا ختم دم خود را بہ برادر خورد سپردہ تبلاش روز گار در اطراف شہر استخوان شکستم لیکن طرفے نہ بستم یعنی چارہ کار در وطن نیافتم۔ ناچار بہ غربت شتافتم۔ رنج راہ برخود ہموار کردم۔ شدائد سفر اختیار کردم بہ شاہ جہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم۔

سر شاہ سلیمان کا خیال ہے کہ میر صاحب نے اس وقت اپنی عمر کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ عبدالباری آسی نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ اور لکھا ہے۔ کہ

میر صاحب کا رسوم موتی ادا کرنا۔ معاملات کو طے کرنا۔ چھوٹے بھائی کو خانہ داری کے امور کا متکفل کر کے خود تلاش معاش میں پھرنا، اپنی غیرت اور خودداری کو کام میں لانا اور کسی سے کوئی امداد نہ چاہنا اور مزید برآں یہ کہ اپنے عم مرحوم یعنی سید امان اللہ کے ساتھ اکثر درویشوں اور خدا رسیدوں کی صحبت میں جا کر فیض اٹھانا۔ یہ سب باتیں ایسی نہیں ہیں کہ ایک دس بارہ برس کے بچے کے لئے موزوں ہوں [1]

لیکن عہد وسطیٰ میں یہ بات کچھ ایسی حیرت انگیز بھی نہیں تھی۔ بابر نے بارہ برس کی عمر میں فرغانہ کی عنان حکومت سنبھالی۔ اکبر تیرہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اس تھوڑی سی عمر میں اسے غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قسم کی مثالیں آج بھی مل جائیں گی

---

[1] کلیات میر (آسی)، ص ۱۳

سید امان اللہ کے انتقال پر جب میر کو سخت رنج اور ملال ہوا تھا تو ان کے والد نے ان کو سمجھایا تھا اور اس وقت ایک فقرہ یہ بھی کہا تھا۔

ماہ من نہ طفل ہالہ۔ الحمد للہ کہ دہ سالہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد خود اسے بہت تھوڑی عمر خیال نہیں کرتے تھے۔ سید امان اللہ عید کے مہینے میں راہی عدم ہوئے۔ (۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء) اور والد نے رجب کے مہینہ میں وفات پائی۔ (دسمبر ۱۷۳۲ء) یہ میر صاحب کا بیان ہے اور اسے انھوں نے پورے یقین اور وثوق کے ساتھ لکھا ہے۔

سیادت میر کی سیادت میں اختلاف ہے۔ ذکر میر میں میر نے سید ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ والد اور بھائی کسی کو سید نہیں لکھا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔ کہ میر اپنے آپ کو سید کہتے تھے لیکن اس زمانہ میں کچھ لوگ اس دعویٰ پر حرف زن تھے۔ چنانچہ تذکرہ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت ان کو شاعری کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ آزاد ہی کا بیان ہے۔

کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سیّد ہو جاؤ گے اس وقت انھوں نے خیال نہ کیا۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔[۱]

لیکن یہ غلط ہے۔ والد کی وفات کے وقت ان کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ اس وقت یہ شعر نہیں کہتے تھے۔ شعر گوئی کا خیال دلّی آکر پیدا ہوا ہے۔
آزاد نے سودا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جو ان کے کلیات میں درج ہیں ؎

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر — کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد — بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو تھ میر

اس قسم کے اعتراضات کے جواب میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ "بدنظر زمانے کا

---

[۱] آبِ حیات ص ۲۰۳ نیز فہرست اشپرانگر ص ۱۷۵۔

دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامن شہرت کو ہوا میں اڑتے دیکھتا ہی تو ایک داغ لگا دیتا ہی" ان کے کلام میں کافی موثر شہادتیں ان کی سیادت کی موجود ہیں جن کو جھٹلانا آسان نہیں ہی۔

منکر نہیں ہی کوئی سیادت کا میر کی   ذات مقدس ان کی یہی ذات ہو تو ہو

سید ہیں میر صاحب درویش دردمند   سر رکھئے ان کے پاؤں پہ جائے ادب ہے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں   اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

مذہب میر کے مذہب کے بارے میں بھی بہت سے شبہات ظاہر کئے گئے ہیں لیکن ان کے کلام میں جا بجا ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں جناب مرتضیٰ علی اور امام تشنہ کام کی خاص محبت تھی:

ع   قبلہ علی، امام علی، مقتدا علی

ع   تھا بزم لامکاں میں بھی رونق فزا علی

ع   تھا جانشین ختم رسل کا بجا علی

ع   مقصود خلق و مطلب ارض و سما علی

ایک مخمس میں فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ معترضین کو جواب دے رہے ہیں

ے قدر کو میری بہت ہے برتری   کب مری خورشید سے ہو ہمسری
حکم بز رکھے ہے یاں شیر نری   کر مخالف سوچ کر ٹک اژدری
حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

منقبت خوانی سے میری سب ہیں سُن   اس سوا مجھ میں نہیں ہی کوئی گن

ساتھ سر کے ہے علی گوئی کی دُھن   مدعی اس کان یا اس کان سُن

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

ہے ولائے اہلِ بیت اپنا شعار   جانے ہے اس کے تئیں سارا دیار

زیرِ لب کہتا ہوں میں پر اب کی بار   تو سنے جو میں کہوں سب میں پکار

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اے مخالف بحث مت کر نابکار   بات ایسی سے ہے مجکو ننگ و عار

بس کہا اس آستاں کا ہوں غبار   کیا کہا تجھ سے کروں میں بار بار

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

اور آخر میں قسم کھا کر کہتے ہیں:

میرؔ جی باور کرو واللہ میں

حیدری ہوں حیدری ہوں حیدری

وہ "ولائے علی" کو "مسلمانی" سمجھتے تھے اور ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ

ہم علی کو خدا نہیں جانا   پر خدا سے جدا نہیں جانا

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ مغلوں کے آخری زمانہ میں سیاسی عنان اختیار بالکل ایرانیوں کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ سر جادو ناتھ سرکار نے "زوال سلطنت مغلیہ" میں لکھا ہے[1] کہ ۱۷۴۴ء میں ایرانی اثر تمام دربار پر چھا گیا۔ اور تورانی پارٹی کو شکست فاش ہو گئی۔ میر آتش کا عہدہ ایک تورانی سے لے کر صفدر جنگ ایرانی کو دے دیا گیا اور ۱۷۴۵ء میں بادشاہ کے ایما سے صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی، نواب اسحاق خاں دوم نجم الدولہ کی بہن سے کر دی گئی۔

۱؎ سرکار۔ زوال سلطنت مغلیہ ص ۳۵، ۳۶ ج ا نیز خاندان شیواجی (سرکار) باب اول ص

یہی خاتون وارن ہسٹینگز کے مظالم کا ہدف بنیں اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس رشتے نے ایرانی اثرات کو اور زیادہ مستحکم کردیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۳۶ء سے مغلوں کی تاریخ ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش کی داستان ہے۔ سیاست کے علاوہ ادب[1] اور مذہب کے میدان میں بھی یہ آویزش نظر آتی ہے۔ ذکر میر میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے جس سے میر کے معتقدات بھی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ میر جب تیس۳۰ برس کے بعد آگرہ گئے ہیں تو ایک عالم کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے میر کی تسبیح خاک شفا پر اعتراض کیا اور کہا۔

این تسبیح خاک امام شما کہ موجب غبار خاطر با صفا پیشگاں است دلیل است کہ
شما میل بہ رفض دارید۔ اگر در واقع چنیں است، مرا بحال من وا گذارید۔

میر صاحب نے فرمایا:۔

مرا نیز ہمیں تردد بود، الحمد للہ کہ صاحب سنی بر آمدند۔

اس کے بعد میر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ احمق میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا۔

بے مزہ تر شدم و بر خاستہ آمدم[2]

میر کے مذہب اور مشرب پر ان کی ابتدائی تربیت اور ماحول کا بھی اثر ہے۔ اپنے والد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں۔

روزے در خدمت شیخ (کلیم اللہ اکبر آبادی) سوال کرد کہ بندہ آنچہ عقائد خود
درست کردہ ام بخدمت عالی واضح است اما در حق حاکم شام چہ می فرمایند۔

---

[1] معرکہ حامیان قتیل و غالب۔ ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں (از خواجہ احمد فاروقی)، اردو، اپریل ۱۹۴۷ء
[2] ذکر میر ص ۱۰۳۔

شیخ نے کہا۔ "پھر بتاؤں گا۔"
کچھ مدت کے بعد منھ اندھیرے محرم خاں خواجہ سرائے شاہ جہانی کی مسجد میں تشریف لائے۔ میرے والد کے نوکر ان کے وضو کے لئے پانی لینے دوڑے۔ والد خود اٹھے اور آفتابہ لے کر وضو کرانے لگے۔ اس وقت شیخ نے فرمایا اے (علی متقی) اس کا نام آج تک میری زبان پر نہیں آیا ہے۔ کس منہ سے خدا کا شکر ادا کروں۔ والد کہتے تھے کہ اس کے بعد سے میں نے بھی اس کا نام (معاویہ) کبھی نہیں لیا۔[1]

حقیقت یہ ہے کہ میر وسیع المشرب، صلح کل اور فقیر دوست تھے۔ ان کو ابتدا سے آخر تک جب وہ اجمیر کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں، اولیائے کرام سے عقیدت رہی ہے۔ ان کی شیعیت اور صوفیت میں تضاد نہیں۔ لطیف ہم آہنگی ہے۔ یہ ربط ان کی ابتدائی تربیت اور فطری دردمندی نے پیدا کیا ہے جس کی وجہ سے ان کا کوئی فکری عقیدہ تنگ دائرہ میں محدود نہ ہوسکا۔ تصوف اس زمانے کی فکری اور اخلاقی بلندی کا معیار تھا۔ وحدت الوجود کا عقیدہ جذب اور سلوک اور معرفت کے لئے واحد بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیاقت، علمیت، بلند مذاقی اور بلند نظری سب میں یہی صوفیانہ طریق رچا ہوا تھا۔ ولی کے بعد میر و سودا کے آخر عہد تک یہی نظریہ مذہب، اخلاق اور شعر و ادب میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں بڑی وسعت کے ساتھ رائج رہا۔[2] چنانچہ میر نے بھی اس مسلک کو جس کی بنیاد محبت کے وسیع تر حقائق پر ہے، اپنی زندگی اور شاعری میں برتا۔ اس سے نہ صرف ان کی بے چینیوں کو رومان انگیز تسلی نصیب ہوگئی۔ بلکہ شاعری کی تاثیر بھی بڑھ گئی۔

---

[1] ذکر میر ص ۵۔ [2] کلیات ولی (طبع ثانی) مقدمہ ص ۱۵، انجمن ترقی اردو ہند

دہلی کا پہلا سفر

والد کے انتقال کے بعد میرؔ بالکل بے یار و مددگار ہو گئے۔ انھوں نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں لیکن کسی کے آگے دست سوال نہیں پھیلایا۔

زنہار بر در کس نہ ایستادم۔ لبم بحرف طلب آشنا نگردید۔ چشم من بہ ہیچ چیز ندوید۔ سایہ دست کسے نہ گرفتم۔ و سر دستے بمن کسے نگرفت یعنی خدائے کریم مرا شرمندۂ احسان کسے نکرد و دست نگر برادر کہ سر بسر من داشت، نساخت۔

انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنا قائم مقام بنایا۔ اور خود تلاش معاش میں نکل پڑے پہلے تو اطراف شہر میں پھرتے رہے۔ جب کوئی صورت نہ نکلی تو وطن کو خیرباد کہہ کر مسافرت پر کمر باندی۔ اور دہلی پہنچے۔ وہاں بھی کوئی شفیق اور دستگیر نہ ملا۔ آخر خواجہ محمد باسط[۵۱] نے جو صمصام الدولہ امیر الامراء کے بھتیجے تھے ان کی مدد کی اور ان کو امیر موصوف کے پاس لے گئے۔ انھوں نے پوچھا۔ یہ کس کا لڑکا ہے۔ کہا میر محمد علی کا۔ فرمانے لگے۔ کہ اس کے یہاں آنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ راہی عدم ہوئے۔ بہت افسوس اور رنج کرنے کے بعد کہنے لگے کہ اس شخص کے مجھ پر بہت سے حقوق ہیں۔ اس لڑکے کو ایک روپیہ روزنہ ہماری سرکار سے دیا جائے

---

[۵۱] تاریخ محمدی (قلمی) میں لکھا ہے (ص ۲۰۳۸) :-

خواجہ عبدالباسط خلف الصدق خواجہ جعفر و خواجہ جعفر برادر صمصام الدولہ خاں دوران است کہ در جنگ نادرشاہ ایران با محمد شاہ ہندوستان طرف بادشاہ ہند بکار آمد و خواجہ باسط از اجلہ مشائخ شاہ جہاں آباد نقش بندی بود و در لکھنؤ سفر آخرت پیمود ۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۴ء

میر نے عرض کیا کہ نواب صاحب از راہِ کرم تحریری حکم صادر فرما دیں تاکہ متصدیوں کو اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے جیب سے درخواست نکالی۔ فرمایا یہ قلمدان کا وقت نہیں ہے۔ میر لکھتے ہیں کہ یہ سُن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ نواب نے پوچھا۔ کیوں میاں کیوں ہنسے ؟ میں نے عرض کیا کہ میں ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھا۔ اگر یہ فرماتے کہ قلمدان بردار حاضر نہیں ہے تو مضائقہ نہ تھا یا یہ کہتے کہ یہ دستخط کا وقت نہیں ہے تو صحیح تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ وقتِ قلمدان نہیں ہے۔ نیا محاورہ ہے۔ قلمدان تو لکڑی کا ہے۔ وقت اور غیر وقت کو نہیں جانتا جس سے کہیے وہ اٹھا لائے۔ اس پر نواب ہنسنے لگے اور کہا ٹھیک کہتے ہو۔ قلمدان منگا کر عرضی پر دستخط کر دیے اور مجھے بہت لطف و عنایت کے ساتھ رخصت کیا۔

میر کو یہ روزینہ نادر شاہ کے حملے (۱۷۳۹ء) تک ملتا رہا:۔

"تا عہدے کہ نادر شاہ بر محمد شاہ کہ حالا بفردوس آرام گاہ ملقب است،

مسلط شد و نواب مذکور بسبب جنگی کشتہ افتاد[1]، آں روزینہ می یافتم،

نان و نمک می خوردم و بسر می بردم"[2]۔

عبدالباری آسی نے لکھا ہے کہ خواجہ باسط امیر الامرا کی خدمت میں کبھی ایک بچہ

---

[1] تاریخ محمدی (قلمی:۔ رام پور) میں لکھا ہے۔

خواجہ محمد عاصم مخاطب بہ اشرف خاں ثم بہ صمصام الدولہ امیر الامرا خان دوراں بہادر منصور جنگ ابن خواجہ قاسم نقش بندی از اعاظم امرائے عصر ۱۵ ذی قعدہ سنہ ۱۱۵۱ھ (۱۳ فروری سنہ ۱۷۳۹ء) در جنگِ نادر شاہ فرماں روائے ایران زخمی شدہ ۱۹ ماہ ذی قعدہ بہ ہماں زخمہا درگذشت عمرش شصت و ہشت سال۔ سپاہی پرور و خلیق و متدین بود۔ ص ۲۰۰۵

[2] ذکر میر ص ۶۳

کی درخواست پیش نہ کرتے۔ لامحالہ میر کی عمر سترہ برس کی تھی[1] یہ دلیل قطعی نہیں ہی۔ میر محمد علی سے امیرالامرا کو بڑی عقیدت تھی۔ بہت ممکن ہی کہ ان کی موت اور میر کی کم عمری ہی کا خیال کرکے، امیر موصوف نے میر کا ایک روپیہ روز مقرر کر دیا ہو۔ "وقت قلمدان نیست"، پر میر کا اعتراض اور امیرالامرا کا برا نہ ماننا یہ بھی ان کی کم عمری اور معصومیت کی دلیل ہے۔

گذشتہ صفحات میں میر کے دیوان چہارم کے نسخہ محمود آباد کا ذکر آچکا ہے۔ اسکے ایک صفحہ پر نوادر الکملا کے حوالہ سے لکھا ہے۔

> ـــــ بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت[2]

لیکن آسی کو اس "سترہ برس" کا یقین نہیں ہی۔ لکھتے ہیں۔

> سترہ نہ سہی، تو یہ اپنے والد کے انتقال کے وقت تیرہ چودہ برس کے ضرور تھے[3]

نوادر الکملا کے بیان سے دو نتیجے نکل سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ میر محمد علی کے انتقال کے وقت میر کی عمر سترہ برس کی تھی جیسا کہ آسی کو بھی گمان ہوا ہی۔ لیکن یہ صریحاً غلط اور میر کے بیان کے خلاف[4] ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ نکل سکتا ہی کہ میر محمد علی کے انتقال کے وقت میر کی عمر دس برس ہی کی تھی۔ جیسا کہ خود میر نے لکھا ہی[5] لیکن وہ سات برس آگرہ ہی کے قرب وجوار میں نوکری ڈھونڈتے رہے۔ یہ بھی درایت اور قیاس کے خلاف ہی۔ جو کچھ ذکر میر سے مستنبط ہوتا ہی وہ یہ ہے کہ باپ کے انتقال سے

---

[1] مقدمہ کلیات میر۔ آسی ص ۱۴ [2] دیوان چہارم میر قلمی:۔ محمود آباد بحوالہ نوادر الکملا۔

[3] کلیات میر:۔ مقدمہ آسی ص ۱۳۔

[4] و [5] ذکر میر ص ۵۴۔

ے کہ نادر شاہ کے حملے سے قبل تک میر اطراف اکبر آباد میں گھومے۔ دہلی میں نوکری تلاش کی اور کافی سرگردانی کے بعد صمصام الدولہ کے یہاں سے روزینہ مقرر ہوا۔ جو کچھ مدت تک اُن کو ملتا رہا۔

آسی کا بیان کہ دہلی آنے کے وقت میر کی عمر سترہ برس کی تھی[1]، درست نہیں انھوں نے ذکر میر کے تین اہم جملوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ میر محمد علی کے انتقال اور میر کے دہلی پہنچنے میں ایک وقفہ ہے وہ اپنے باپ کے انتقال کے فوراً بعد دہلی نہیں گئے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

تبلاش روزگار در اطراف شہر استخوان شکستم لیکن طرفے نہ بستم[2]۔

دہلی آنے کے بعد بھی میر کی رسائی امیر الامرا کے دربار میں فوراً نہیں ہوئی۔

بشاہ جہاں آباد دہلی رسیدم۔ بسیار گردیدم۔ شفیقے ندیدم[3]۔

تیسری بات یہ ہے کہ میر کو امیر الامرا کے دربار سے کچھ مدت تک یہ روزینہ بیک گونہ اطمینان کے ساتھ ملتا رہا۔ اس کے بعد یہ بساط الٹی ہے اور وہ بیروزگار ہوئے ہیں۔

آں روزینہ می یافتم۔ نان و نمک می خوردم و بسر می بردم[4]۔

اس لیے ہمارا خیال ہے کہ جب میر پہلی بار دہلی آئے اس وقت ان کی عمر سترہ برس سے کم تھی لیکن نادر شاہ نے جب دلی کو لوٹا ہے (۱۷۳۹ء) اس وقت وہ ضرور سترہ برس کے تھے۔ ہم نے ان کا جو سالِ ولادت قرار دیا ہے (۱۷۲۲ء / ۱۱۳۵ھ) اسکی رُو سے بھی وہ نادر شاہ کے حملے کے وقت (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) سترہ برس کے نکلتے ہیں۔

---

[1] کلیات میر: مقدمہ آسی ص ۱۴ [2] ذکر میر ص ۶۲ [3] ایضاً ص ۶۲ [4] ایضاً ص ۶۳۔

وطن کو واپسی نادر شاہ کے ہنگامہ کے بعد میر دلی سے پھر اکبرآباد آگئے لیکن وطن میں اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ خود لکھتے ہیں:۔

کسانیکہ پیش درویش خاکپائے مرا کحل بصری ساختند یکبار از نظرم انداختند

ص ۶۳۔

دہلی کا دُوسرا سفر اس لئے میر نے دوبارہ تقریباً (۱۱۵۲ھ) میں دلّی کا رخ کیا۔ اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے یہاں قیام کیا۔ کچھ دنوں ان کے پاس رہے اور بعض احباب سے کتابیں بھی پڑھتے رہے[۱]۔ اسی زمانہ میں ان کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے خان آرزو کو لکھا:۔

میر محمد تقی فتنہ روزگار است زنہار بہ ترتیب او نہ باید پرداخت۔

میر لکھتے ہیں کہ خان آرزو دنیا دار آدمی تھے۔ بھانجے کے لکھنے پر میرے درپے آزار ہوگئے۔

نظر بر خصومت ہمشیرزادۂ خود بد من اندیشید۔

تعلیم ابھی میر کی تعلیم نامکمل تھی اور وہ رسمی درسیات کی تکمیل بھی نہ کر سکے تھے کہ ان کے چچا اور باپ دونوں کا انتقال ہوگیا۔ اور وہ بالکل بے یار و مددگار رہ گئے۔ اس وقت ان کی عمر دس برس کی تھی[۲]۔ لیکن کم عمری میں بھی ان کو درست اور نادرست محاورہ کا احساس تھا۔ دہلی میں "وقتِ قلمدان نیست" پر ان کا اعتراض، ان کے تنقیدی شعور کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے اندر خود اعتمادی اور جراٴت پیدا ہوگئی تھی جو ہر اچھی تعلیم کا لازمی جزو ہے۔

---

[۱] ذکر میر ص ۶۳ [۲] ذکر میر ص ۵۴۔

میر جب دوبارہ دلی آئے تو اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے یہاں ٹھہرے۔ یہ علم وفضل میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور امام المتاخرین کے لقب سے مشہور تھے۔ لیکن میر کے سوتیلے بھائی محمد حسن کے لکھنے پر کہ "میر محمد تقی فتنہ روزگار است۔ زنہار بہ تربیت او نباید پرداخت"۔ ان کے درپے آزار ہو گئے۔ یہ جملہ خود اس کی غمازی کرتا ہی کہ خان آرزو نے ان کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی تھی۔ اس کے علاوہ بھائی کا خط بھی اس وقت آیا جب یہ کسی لائق ہو گئے۔ اور پڑھے لکھے آدمی انہیں اپنا مخاطب کر سکتے تھے۔

چوں قابل ایں شدم کہ مخاطب صحیح کسے می توانم شد۔ نوشتۂ اخوان پناہ رسید کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار است .... درپردۂ دوستی کارش باید ساخت۔

میر اور خان آرزو کی تصانیف کا اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہی کہ میر کے غنچۂ استعداد کی شگفتگی، خان آرزو کی مرہونِ منت ہی۔ میر نے محض استاد کے الفاظ و تراکیب ہی کی خوشہ چینی نہیں کی بلکہ زبان کے قواعد و ضوابط بھی خان آرزو سے سیکھے ہیں۔[ل۵]

میر نے نکات الشعرا میں خان آرزو کو استاد و پیرومرشد بندہ لکھا ہی۔ لیکن ذکر میر میں جو نکات الشعرا اور خان آرزو کے مرنے کے بعد لکھی گئی ہے انھوں نے خان آرزو کی "سلاخی اور حلاجی" کی شکایت کی ہی۔ اور تمام معاصر تذکروں کے خلاف میر جعفر عظیم آبادی، سعادت امروہوی اور "یارانِ شہر" سے فیض یاب ہونے کا ذکر کیا ہے۔

ل۵ قواعد میر: عشرت مرحوم ص ۹ طبع لکھنؤ۔

میر جب جنون سے صحت یاب ہوئے تو انھوں نے مکتوبات اور انشا کی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ (" و شروع بخواندن ترسل کردم" ص ۶۶) ایک روز وہ بازار میں ایک کتاب کا جزو لئے بیٹھے تھے کہ ایک شخص میر جعفر نام، ملک سیرت، آدم صورت ادھر سے گزرا۔ اس نے کہا معلوم ہوتا ہے تمھیں پڑھنے کا شوق ہے۔ اگر واقعی ہے تو میں پڑھانے کے لئے آجایا کروں۔ انھوں نے کہا میں آپ کی کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا۔ اگر آپ یوں ہی یہ زحمت گوارا فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ انہوں نے کہا مگر بغیر ناشتہ کے میرے لئے کہیں آنا جانا ممکن نہیں ہے۔ کہا " میں خود تنگدست ہوں مگر خدائے کریم یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔" میر نے لکھا ہے کہ "میر جعفر بڑی دماغ سوزی سے پڑھاتے اور مجھ سے بھی جہاں تک بن پڑتا ان کی خدمت کرتا۔ ناگاہ ان کے وطن سے ایک خط آیا اور وہ اسے دیکھتے ہی چل کھڑے ہوئے۔"

کچھ دنوں کے بعد میر کی ملاقات سعادت علی سے ہوگئی جو امروہہ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دلائی۔ اور میر نے بھی ایسی مشق بہم پہنچائی کہ شہر کے مستند شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

سعادت امروہوی

میر سعادت علی[1] سعادت امروہوی حضرت شاہ ولایت کی اولاد میں تھے قائم نے لکھا ہے کہ وہ اپنے اقران و امثال میں ممتاز تھے اور انھوں نے چالیس برس سے کم عمر میں بعارضہ تپ محرقہ انتقال کیا۔[2] میر حسن نے ان کی کم سخنی اور درویشی کے ساتھ ان کی ایہام گوئی کا بھی ذکر کیا ہے:۔ میل ایہام بندی بسیار داشت

۱؎ گردیزی نے سعادت اللہ خاں لکھا ہے۔ اور تذکرہ سرور میں والد کا نام میر غلام علی عشرت درج ہے۔
۲؎ مخزن نکات ص ۱۸۔

میر نے اسی ایہام گوئی پر ضرب لگائی تھی۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ سعادت نے ایک مثنوی لیلی مجنوں لکھی ہے[1] یہ دو عاشق و معشوق، نواب قمر الدین خاں کے زمانے میں دہلی میں گزرے ہیں۔ قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ سعادت امروہوی کا کلام اس وقت کے رواج کے مطابق ہے لیکن بے کیفیت نہیں ہے[2] نمونۂ کلام یہ ہے:-

کس سے پوچھوں دل گیا چوری مرا زلفوں میں رات
ایک جو شانہ ہے سو وہ تیل میں ڈالے ہے ہات

مثل آئینہ سادہ رویوں کی   منہ ہی دیکھے کی آشنائی ہے

ہوش کھو دیتی ہیں میرا اس کی آنکھیں مے پرست
بس کہ ہوں کم ظرف دو پیالوں میں ہو جاتا ہوں مست

سعادت کا ذکر قائم، میر حسن، مصحفی، لطف، نساخ، شیفتہ، باطن، قاسم، شیفتہ اور گردیزی وغیرہ نے کیا ہے لیکن کسی نے یہ نہیں لکھا کہ وہ میر کے استاد ہیں۔ میر نے بھی صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ میری شعر گوئی کے محرک ہوئے تھے۔

بعد از چندے با سعادت علی نام، سیدے کہ از امروہہ بود برخوردم[3]۔ آں عزیز مرا تکلیف موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی، بزبان اردوئے معلیٰ بادشاہ ہندوستان و در آں وقت رواج داشت، کرد۔ خود کشی کردم و مشق خود بمرتبۂ رسانیدم کہ موزونان شہر را مستند شدم۔ شعر من در تمام شہر دوید و بگوش خرد و بزرگ رسید[4]۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۱۱ نیز ملاحظہ ہو تذکرہ ابراہیم [2] مجموعہ نغز ص ۲۹۸، ۲۹۹ [3] برخوردن بمعنی با کسے پیوستن و رسیدن بوے۔ [4] ذکر میر ص ۶۷۔

شعرگوئی میر کا یہ بیان کہ "موزونانِ شہر را مستند شدم" حرف بہ حرف صحیح ہے۔ رضا لائبریری رام پور میں دیوان زادۂ حاتم کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس میں حاتم کی ایک غزل ہے جو انھوں نے میر کی طرح میں کہی ہے۔ اس غزل کے عنوان پر سن ۱۱۵۴ھ (مطابق ۱۷۴۱ء) درج ہے[۵]۔ حاتم کی اس غزل کے تین شعر یہ ہیں:۔

زمین طرحی میر ۱۱۵۴ھ

اس کی نظروں میں دوئی ہے جو کہ ہے نا آشنا
ایک ہے دونوں ہیں کیا بیگانہ و کیا آشنا

دوستی آپس کی ہے گی زندگانی کا مزا
ہے عجب صحبت جہاں باہم ہوں یکجا آشنا

گرم ہو ملنا ہے سب اہلِ جہاں کا بے ثبات
آشنا چاہے تو ہو حاتم خدا کا آشنا

میر نے اُردو میں شعر کہنا کب شروع کیے۔ یہ قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن حاتم کی اس غزل سے جو انھوں نے ۱۷۴۱ء ۱۱۵۴ھ میں میر کی زمین میں کہی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹ برس کی عمر میں میر کی شاعری کی شہرت خرد و بزرگ تک پھیل چکی تھی۔ اور اردو کے اکابر شعرا۔ ان کی طرحوں میں غزلیں لکھتے تھے۔

۱۷۴۸ء میں میر رعایت خاں کے نوکر ہو گئے۔ یہ عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کے بہنوئی تھے اور میر سے ان کو شعر گوئی کی وجہ سے عقیدت تھی۔ اس وقت میر کی عمر ۲۶ برس کی تھی اور ان کی شہرت بہ حیثیت شاعر کے دور تک پھیل چکی تھی۔ ۱۷۵۱ء میں انھوں نے تذکرہ نکات الشعرا لکھا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے کی ادبی محفلوں اور مراختوں میں شرکت کرتے اور خود بھی مشاعرے کرتے تھے۔ لوگ ان کے اشعار کی دل و جان سے قدر کرتے اور بطور تحفہ کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں بھیجتے تھے۔

---

۵ دیوان زادۂ حاتم (قلمی)، رام پور

۱۷۵۳ء میں میرؔ نے اپنے استاد اور پیر و مرشد خان آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں رہنے لگے۔ خان آرزو بھی شجاع الدولہ کے مسند نشین ہونے کے بعد لکھنؤ چلے گئے اور وہیں راہی عدم ہوئے (۱۷۵۵ء)۔ استاد کے مرنے کے بعد میرؔ کی عزت اور شہرت اتنی بڑھ گئی کہ راجہ جگل کشور جیسے صاحبِ ثروت خود انھیں اپنے گھر لے جاتے اور خاطر داری اور دلداری میں کسر نہ کرتے لیکن اسی کے ساتھ میرؔ کی تمکنت بھی بڑھتی گئی جس کے بہت سے نفسیاتی اسباب ہیں۔

میرؔ جب ۱۷۶۱ء میں آگرہ گئے ہیں تو لوگ انھیں سرآمدِ فن شاعری سمجھتے تھے اور ہر وقت ان کے پاس شاعروں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ان کے علم و فضل سے زیادہ، ان کے شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور یہ کمال حقیقتاً ان کو مبدارِ فیاض سے ملا تھا۔ لیکن ان کی تصانیف اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ انھوں نے فارسی میں ادیب کامل کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور عربی میں مطوّل تک استعداد بہم پہنچائی تھی۔ ذکر میرؔ اور فیض میرؔ کی زبان ادنیٰ درجہ کی لیاقت کو ظاہر نہیں کرتی اس کے لئے واقعی "خود کشی" اور "جہد بلیغ" کی ضرورت ہے۔ رہی اُردو، وہ ان کی اپنی زبان ہے اور سند ہے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں کے فیضان اور خمارِ چشم ساقی کی آمیزش نے اس میں گہر کی سی آبداری پیدا کر دی ہے:-

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف   تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

اس کے علاوہ میرؔ کی نظر، اردو زبان کے قواعد و ضوابط پر بھی بہت گہری تھی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سنگریزہ، اُن ہی کی کوششوں سے دُرِعدن بن گیا تھا۔ ورنہ اس "یچرسی زبان" کی طرف کون متوجہ ہوتا۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

الفاظ بے جان چیز ہیں۔ ان میں جان، دل کی گلابی سے پڑتی ہے۔ میر نے اس کا ڈھب اپنے داخلی اور خارجی ماحول کے مدرسہ میں اچھی طرح سیکھ لیا تھا یہی وجہ ہے کہ آج تک بزم سخن میں "میر کی میر مجلسی مسلّم ہے"۔

میر اور خان آرزو

میر اور خان آرزو کے تعلقات بحث و تجسس کا موضوع رہے ہیں، اس لئے ان پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے۔

میر نے نکات الشعرا میں سراج الدین علی خاں آرزو کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

آب و رنگ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزار معانی، متصرف ملک نو در طلب بلاغت پہلوان شاعر عرصہ فصاحت، چراغ دودمان صفائی گفتگو کہ چراغش روشن باد سراج الدین علی خاں آرزو سلمہ اللہ تعالیٰ ابداً۔ شاعر زبردست قادر سخن، عالم فاضل تاحال ہیچو ایشاں بہ ہندوستان جنت نشاں بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود .... حاصل کمالات اوشان از حیز بیان بیرون است ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگرداں آں بزرگوارند گاہے برائے تفنن طبع دو سہ شعر ریختہ فرمودہ ایں بے اعتبار را کہ اختیار کردہ ایم، اعتبار دادہ اند۔[1]

اس کے علاوہ میر نے موسوی خاں فطرت کے حال میں خان آرزو کو پیر و مرشد بندہ لکھا ہے[2]

لیکن میر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری ذکر میر میں جو بعد کی تصنیف ہے اس کے خلاف واقعات بیان کئے ہیں۔ اس میں نہ خان آرزو کے کمالات کا اعتراف

---

[1] نکات الشعرا ص ۳ [2] نکات الشعرا ص ۴

ہے اور نہ ان کے پیر و مرشد ہونے کا ـــــــــ ذکرِ میر ۱۱۸۵ھ / ۱۷۷۱ء[1] میں شروع ہوئی اور ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۸ء میں ختم ہوئی۔ تذکرہ نکات الشعرا اس سے قبل ۱۱۶۵ھ / ۵۲-۱۷۵۱ء میں لکھا گیا۔[2] یہ نہایت اہم سوال ہے کہ میر نے ذکرِ میر میں خان آرزو کی کیوں برائی کی جبکہ وہ تذکرہ نکات الشعرا میں ان کی اس قدر عقیدت اور محبت کے ساتھ تعریف کر چکے تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ تذکرہ ایک عام چیز تھی اور سب لوگوں کی نظر سے گزرنے والی۔ اس لئے میر نے خانگی اختلافات کو اس میں داخل نہیں کیا ذکرِ میر ایک حد تک پرائیویٹ چیز تھی اس لئے یہاں اختلافات کے چہرہ سے نقاب اٹھا دی ہے۔ یہ دلیل قطعی اور وزنی قرار نہیں دی جا سکتی۔ بالخصوص جبکہ ذکرِ میر میں بعض ان امور سے ابائے کلی برتا گیا ہے جن کا نکات الشعرا میں بڑے اہتمام سے ذکر ہے۔

میر باپ کے مرنے کے بعد تلاشِ معاش میں دلّی آئے اور امیر الامرا کے نوکر ہو گئے لیکن ۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء میں امیر الامرا نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارے گئے اس لئے میر بے روزگار ہو کر دلّی سے اکبر آباد آ گئے۔ لیکن یہاں لوگوں نے ان کے باپ کی محبت کا کچھ پاس اور لحاظ نہ کیا اور جو لوگ ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے تھے، انھوں نے یک بیک نظر سے گرا دیا۔[3]

ناچار میر دوبارہ دلّی گئے (غالباً ۱۱۵۲ھ / ۴۰-۱۷۳۹ء میں) لیکن یہاں خان آرزو نے بدسلوکی کی۔ حافظ محمد حسن جو میر کے سوتیلے بھائی تھے، انھوں نے خان آرزو کو لکھا کہ:-

میر محمد تقی فتنۂ روزگار است۔ زنہار بہ تربیت او نباید پرداخت و در پردۂ دوستی کارش باید ساخت۔ آں عزیز دنیادار واقعی بود، نظر بہ خصومت

---

[1] سید محمد ایم اے نے سالِ آغاز تصنیف ۱۱۸۶ھ لکھا ہے۔ [2] فہرست کتاب خانہ ہائے شاہ اودھ ص ۱۷۵ نیز مقدمہ نکات الشعرا طبع ثانی صفحہ ج۔ [3] ذکرِ میر ص ۶۳ -

ہمشیرزادۂ خود بدمن اندیشید ...... چہ بیاں کنم کہ ازو چہ دیدم چگویم کہ چہ حالت کشیدم۔ ہر چند بہ پیچیدہ دہانی اختیار کردم او از حلاجی دست نمی داشت با صد ہزار احتیاج یک لہ روپیہ از وئی خواستم۔ اا سلاخی نمی گزاشت خصمی او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید۔ دفترے جداگانہ می باید، خاطر گرفتہ من گرفتہ تر شد۔ سودا کردم۔ دل تنگم تنگ تر گردید۔ وحشتے پیدا کردم[1]

آخر یہ مجنونانہ حالت اتنی بڑھی کہ میر زندانی و زنجیری ہو گئے۔ یہ تعلقات دن بدن خراب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک روز

خالوے کذائی بر طعام طلبید۔ تلخی از و کشیدم بے مزہ شدم۔ دست در طعام ناکردہ برخاستم[2]

نواب بہادر کے قتل اور مہا نرائن دیوان کی ملازمت کے بعد میر نے خان آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی اور امیر خاں کی حویلی میں سکونت اختیار کر لی۔

درایں ایام من از نا مساعدت ایام، ہمسائیگی خالو گزاشتہ، نظر بریں کہ مرا بچشم کم خواہد دید، در حویلی امیر خاں مرحوم ...... سکونت اختیار کردم و بہ لطائف الحیل بسر بردم[3]

میر کا لہجہ تلخ تر ہوتا جاتا ہے۔ جب خان آرزو، نواب شجاع الدولہ کے یہاں چلے گئے تو میر اپنے طنز کا سارا ترکش ختم کر دیتے ہیں:۔

خالوے من بادیہ پیمائے طمع شد یعنی در لشکر شجاع الدولہ بہ ایں توقع رفت کہ برادران اسحاق خان شہید آں جا ہستند، نظر بر حقوق سابق رعائے خواہند کرد۔ جز باد بدستش نیامد۔ لکدِ زمانہ خورد و ہم آں جا مرد۔[4]

---

[1] ذکر میر ص ۶۳/۶۴ [2] ایضاً ص ۶۷ [3] ایضاً ص ۷۳، [4] ایضاً ص ۷۵۔

طرفہ لطیفہ یہ ہے کہ میر کو بھی خان آرزو کے ان ہی قدر دانوں نے لکھنؤ بلایا اور میر خط کو دیکھتے ہی دلّی سے چل کھڑے ہوئے اس لئے ان کی "پاکیٔ داماں" کی حکایت کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہیں۔

میر نے ذکرِ میر میں خان آرزو کو اپنا استاد بھی نہیں مانا ہے۔ حالانکہ "یارانِ شہر" (ص ۶۳) اور میر جعفر عظیم آبادی (ص ۶۶) سے فیض اٹھانے اور سعادت امروہوی کی تحریک و ترغیب (ص ۶۷) تک کا ذکر کیا ہے۔ نکات الشعرا میں سعادت امروہوی کا ذکر ہے (ص ۲۸) لیکن میر نے یہ نہیں لکھا کہ یہ میرے استاد ہیں۔ قدرت اللہ شوق سنبھلی کا طبقات الشعرا بھی اس ذکر سے خالی ہے۔ اس میں صرف اتنا لکھا ہے:

سعادت علی از سادات امروہہ، مردے سلیم الطبع، بہ کمال فضل و بلاغت آراستہ، نہایت خلیق و متواضع و از حلیہ فقر پیراستہ، ہرچند کم گو بود اما اشعارش خالی از دردمندی نیست [۱]

مصحفی نے بھی جو سعادت کے ہم وطن ہیں اپنے تذکرہ میں یہ نہیں لکھا کہ میر کو سعادت سے تلمذ ہے حالاں کہ یہ بات اگر واقعی اہم ہوتی تو لکھنے کی تھی۔

میر کے بیان کے خلاف ایسی بہت سی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ میر نے خان آرزو سے کسب فیض کیا تھا:

میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ

میر برادر زادۂ سراج الدین علی خاں آرزو و ہم از شاگرداں اوست

قائم لکھتے ہیں کہ

میر در خدمت خان آرزو کہ خالوے او بود لختے دانش اندوختہ

---

[۱] نیز سخن شعرا: نساخ (نول کشور) ص ۲۱۶۔

گلشن سخن میں لکھا ہی۔

میر محمد تقی میر شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو ست

مرزا علی لطف نے لکھا ہی کہ

(میر نے) خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ (ص ۲۰۹)

سعادت خاں ناصر نے "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" میں میر اور خان آرزو کے تعلقات پر زیادہ تفصیل سے لکھا ہی۔

(میر) یہ نقل خود فرماتے تھے کہ عنفوانِ جوانی میں جوش وحشت اور استیلائے سودا طبیعت پر غالب ہوا اور کام ودہن ہرزہ گوئی پر راغب، ترک ننگ و نام رسوائے خاص وعام پسند آئی۔ ہر کسی کو دشنام دنیا شعار اور سنگ زنی کاروبار تھا۔ خان آرزو نے کہا کہ اے عزیز دشنام موزوں، دعائے ناموزوں سے بہتر اور رخت کے پارہ کرنے سے تقطیع شعر خوشتر ہی۔ چونکہ موزونی طبع جوہر ذاتی تھی جو دشنام زبان تک آئی۔ مصرعہ یا بیت ہو گئی بعد اصلاح دماغ و دل کے مزہ شعر گوئی کا طبیعت پر رہا۔ کبھی کبھی دو چار شعر جو خان آرزو کی خدمت میں پڑھے، پسند فرمائے اور تاکید شعر و سخن زیادہ سے زیادہ کی۔

ایک دن خان آرزو نے کہا کہ آج مرزا سودا یہ مطلع اپنا نہایت مباہات کے ساتھ پڑھ گئے۔

چمن میں صبح جو اس جنگ جو کا نام لیا　　صبا نے تیغ کا آب رواں سی کام لیا

میر صاحب نے اس کو سن کر بدیہتہً یہ مطلع پڑھا۔

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہمنے تھام تھام لیا

خان آرزو اس کو سن کر فراموشی (کذا) سے اچھل پڑے اور کہا خدا چشم بد سے محفوظ رکھے[1]

مولوی کریم الدین نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔

مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد اور محمد تقی میر من جملہ فیض اندوزاں اس گیہاں خدیو سخن پردازی کے ہیں[2]

حکیم قدرت اللہ قاسم مجموعہ نغز میں لکھتے ہیں:۔

نسبت تلمذہم بہ جناب افادت انتساب خان مشارالیہ دارد امابنابر نخوتے کہ در سرش جا گرفتہ ازیں امر کہ فی الحقیقت فخر وے ست، ابائے کلی بہ میان آرد۔[3]

اس کے علاوہ میر اور خان آرزو کی تصانیف کا باہم مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر نے آرزو کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کی استعداد کی صیقل بڑی حد تک خان آرزو کی رہین منت ہے۔ میر نے بعض الفاظ اور ترکیبیں ایسی استعمال کی ہیں جو ان سے قبل بالعموم دوسرے شاعروں کے یہاں نہیں ملتیں۔ مثلاً طفلان تہ بازار[4] ۔ بے تہ[5]، بزآوری[6]، بزگیری[7]۔ یال وکوپال[8]۔ دریائے لنگردار، زیادہ سری[9]، سرنشین[10]۔ غنچہ پیشانی[11]، بے ہیچ[12]۔ شیشہ جان[13]۔ زرخ زن[14]۔

---

[1] تذکرہ معرکہ خوش زیبا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) نکلتا ہے۔

[2] تذکرہ کریم الدین (مطبوعہ)، ص ۷۳، وسخن شعرا ص۔ ۲ [3] مجموعہ نغز ص ۲۲۹، ۲۳۰۔

[4] آوارہ لڑکے جس کے گھر در نہ ہو [5] بے اصل سطحی بے حوصلہ۔ معمولی لیاقت والا [6] اُلٹا لٹکانا۔ سزا [7] چوری [8] کروفر [9] غرور [10] بے محل وکجاوہ سوار ہونیوالا۔ پیچھے چلنے والا [11] ترش رو [12] فرومایہ [13] نازک مزاج [14] بے ہودہ گو۔

مگر یہ وہ الفاظ ہیں جن کے متعلق خان آرزو نے چراغ ہدایت میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ فرہنگ جہانگیری، سروری اور برہان قاطع وغیرہ میں بھی نہیں ہیں اور صرف ان کی تلاش وتحقیق کا نتیجہ ہیں۔ میر کے یہاں ان کا ہونا اور آرزو کے دوسرے محاورہ دانوں کے یہاں ان کا نہ ہونا، اس کا ثبوت ہے کہ میر نے خان آرزو سے کسب فیض کیا ہے۔

میر اور خان آرزو کے اختلافات کی مختلف وجہیں بتائی گئی ہیں:۔

(۱) خان آرزو کے پاس انھوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی مگر خان صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ۔ اس پر نازک مزاجی غضب۔ غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔ (آب حیات ص ۲۰۳)

(۲) ڈاکٹر عبد الحق اور صاحب گل رعنا اسے تسلیم نہیں کرتے۔

(۳) سر شاہ سلیمان لکھتے ہیں کہ کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اس خیال کو بالضرور غلط قرار دیا جائے۔ (مقدمہ مثنویات میر، نظامی پریس)

(۴) تذکرہ قاسم نے اس کا سبب میر کی نخوت قرار دیا ہے۔

(۵) خود میر نے اس کا کوئی معقول اور موثر سبب بیان نہیں کیا۔ جس کا میر پر اتنا اثر ہو کہ وہ "زندانی و زنجیری" ہو جائیں۔ صرف یہ لکھا ہے:۔

نظر بہ خصومتِ ہمشیر زادہ خود بدمن اندیشید[1]

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ بد سلوکی صرف حافظ محمد حسن اور آرزو ہی نے نہیں کی بلکہ تمام معتقدین اکبر آباد نے:۔

کسانیکہ پیش درویش خاکپائے مراکحل بصری ساختند یک بار از نظرم انداختند۔[3]

---

[1] ذکر میر ص ۶۵ [2] ایضاً ص ۶۳ [3] ایضاً۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ محبت، عقیدت اور مروت کے سارے چشمے یکبارگی کیوں خشک ہو گئے؟

تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میر

بہ شہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق و میل خاطر داشت۔ آخر عشق او فاصحہ مشک پیدا کردہ ...... از ننگ افشائے راز از وطن و اقربا باد لے بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست وگریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ براندازیہا بہ شہر لکھنؤ رسیدہ ہمیں جا بہ صد حسرت جانکاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار، جان بہ جہاں آفریں داد تابقید رشتۂ حیات بود طوق محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت۔ از کلام عاشقانہ و دردانگیز ش پیدا است کہ صد آرزو بخاک بردہ۔

بہت ممکن ہے اہل اکبر آباد نے اسی لئے بے اعتنائی برتی ہو اور محمد حسن نے اسی وجہ سے میر کو فتنۂ روزگار لکھا ہو اور خان آرزو کو بھی اسی سبب سے شکایت پیدا ہوئی ہو۔ اور جواں سال میر کی نازک مزاجی اس شورپندِ ناصح کی تاب نہ لا سکی ہو۔
تذکرہ بہارِ بے خزاں کا لہجہ میر کے ساتھ نیاز مندانہ اور دردمندانہ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس داستانِ عشق کو صاحبِ تذکرہ کے تعصب یا عناد پر محمول کیا جائے۔

ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ میر کی انفرادیت بے انتہا بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سرسبز ہونے سے قبل کچھ مرجھا سی گئی۔ زندگی بھر وہ اسی انفرادیت کا جنازہ اٹھائے اٹھائے پھرے۔ غم عشق اور غم روزگار نے انہیں اندرون بین اور کم اختلاط بنا دیا تھا۔ ایڈلر نے لکھا ہے کہ بڑھی ہوئی انفرادیت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی حد سے زیادہ خوددار ہو جاتا ہے اور وہ اپنے سوا ساری دنیا کو ہوش سے بیگانہ سمجھنے

لگتا ہے۔ میر کو اپنے کمال فن کا غیر معمولی احساس تھا۔

اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شعر نے روئے زمیں تمام لیا

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا　　مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اسی لئے خان آرزو کی استادی کا ذکر انھوں نے مروتاً یا مصلحتاً ان کی زندگی تک روا رکھا اور اس کے بعد غیر ضروری سمجھ کر اس سے انحراف کیا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ خان آرزو کا انتقال ۱۱۶۹ھ ۱۷۵۵ء میں ہوا اور ذکر میر ان کے مرنے کے بعد ۱۱۷۰ھ ۱۷۵۶ء میں لکھنی شروع ہوئی۔

خان آرزو کو تمام نقادوں نے امام المتاخرین مانا ہے۔ اس زمانہ میں ایک طالب علم اپنے آپ کو کامل نہ سمجھتا تھا وقتیکہ وہ کسی نہ کسی طرح خان آرزو کے حلقۂ درس میں شامل نہ رہا ہو۔ طبقات الشعرا میں لکھا ہے۔

از فصحائے زمانہ و استاد یگانہ بود۔ در تمام خطۂ ہند ہجو او شاعر پرگو پرزور، و خوشگو و قادر سخن بہ ایں فضل و کمال پیدا نشدہ حاصل کمالات او از حیز تحریر و تقریر بیرون۔ اکثر استادان فارسی و ریختہ از تلامذہ او یند۔

دیوان چہارم میر کے قلمی نسخے میں نوادر الکملا کے حوالہ سے اس کی زیادہ صراحت ہے۔

بخانۂ سراج الدین علی خان آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ۔ بعد مرور دہور کہ جدائی فیما بین واقع شدہ، بہ روسائے عظام در خورد و برخورد۔

تذکرہ خوش معرکہ زیبا، نوادر الکملا، تذکرہ نکات الشعرا، تذکرہ میر حسن، تذکرہ مخزن نکات، اور تذکرہ قاسم کے بیانات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ میر نے دیدہ و دانستہ، خان آرزو کے مرنے کے بعد، ان کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔ ممکن ہے اب وہ اپنے آپ کو خان آرزو سے بڑا سمجھتے ہوں اور ان سے نسبت تلمذ کو دون مرتبت۔ اس زمانہ میں اکثر یہ ہوا ہے کہ اگر شاگرد کو شہرت کا موقع مل گیا تو استاد کا ذکر غیر ضروری سا ہو گیا۔ غالب کی تعلیم کے متعلق تذکرۂ گلستاں بے خزاں میں لکھا ہے کہ انھوں نے خلیفہ معظم اور نظیر اکبرآبادی سے کسب فیض کیا اور ان کی خوش گوئی کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ ان کو ایسے دو لائق استاد میسّر آسکے۔ لیکن آخر میں لکھا ہے:-

چونکہ وہ استاد مر گئے۔ یہ جد دہلی (آگرہ) سے ادھر گئے اب خواہ
خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار۔

بعد میں غالب نے اس پر زور دیا ہے کہ ان کو سوائے مبدء فیاض اور کسی سے تلمذ نہیں۔ گلستاں بے خزاں کی روش معاندانہ ہے اس کے بیانات قابل اعتماد نہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ جب "قاطع برہان" پر ہنگامہ ہوا اور معترضین ان کے خاموش کرنے سے بھی خاموش نہیں ہوئے تو انھوں نے "جاماسپ عہد" اور "بزرجمہر عصر" یعنی ملا عبدالصمد کا سہارا ڈھونڈا۔ حالاں کہ شیفتہ، کریم الدین، ذکار، باطن، محسن، سید احمد خاں یا کسی اور کتاب میں، جو قاطع برہان سے پہلے لکھی گئی ہے، عبدالصمد اور غالب کی شاگردی کا کوئی ذکر نہیں ہے، بعد کی کتابوں میں بھی جو کچھ ذکر ہے، وہ بھی غالب کے بیانات کی نقل ہے۔

حکیم غلام رضا خاں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس شخص کا جو "ساسان پنجم کی اولاد، یزد کا رہنے والا اور امیر زادۂ جلیل القدر تھا، کوئی وجود خارجی تھا ہی نہیں

یہ صرف غالب کا زائیدہ فکر ہے۱؎" حالی نے بھی ایک کمزور لہجہ میں اس کا مبہم اعتراف کیا ہے:۔

> کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ ...... عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چوں کہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے، ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔

میر نے بھی شروع میں خان آرزو کو استاد و پیرومرشد سمجھا لیکن جب وہ یہ کہنے کے قابل ہو گئے کہ

> اول تو میں سند ہوں، پھر یہ میری زبان ہے۔

اس وقت انھوں نے "یاران شہر" کے فیضان کا ذکر کیا۔ ممکن ہے اس پس منظر میں وہ اپنی صلاحیت اور ریاضت کو نمایاں کرنا چاہتے ہوں۔ لیکن خان آرزو کی زندگی میں نہ میر نے ان کی کوئی شکایت کی اور نہ معاصرین نے اس ناخوشگواری کی طرف کوئی اشارہ کیا۔ حد یہ ہے کہ خان آرزو نے مجمع النفائس میں میر کی بہت تعریف کی ہے۲؎ اور حکیم قدرت اللہ قاسم نے بھی اس ناگواری کا تذکرہ اس وقت کیا جب ذکر میر لکھی جا چکی تھی۔ خان آرزو کا انتقال ہو چکا تھا اور میر کی شہرت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

دیوانگی

غرض اس خصومت اور دل آزاری سے میر کو اتنا رنج پہنچا کہ وہ دروازے بند کئے پڑے رہتے تھے اور غم و غصہ کی وجہ سے ان پر جنون کی سی حالت طاری ہو گئی۔ ان کے ذہن میں جو الجھاؤ یا پیچیدگی، جنسی محبت کے دبانے سے پیدا ہو گئی تھی، وہ جیتے جی ختم نہ ہو سکی بلکہ اس نے نفس کے نہاں خانوں پر قبضہ کر لیا اور تخئیل کی گرم رفتاری نے ایک وہمی صورت یا خیالی پیکر چاند میں دکھینا

۱؎ غالب کا ایک فرضی استاد: قاضی عبدالودود۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۲؎ مجمع النفائس ص ۴۲،۴۳

شروع کر دیا۔ مثنوی خواب و خیال میں جو تصویر انھوں نے پیش کی ہے اس میں جنسی عوامل کو پورا دخل ہے اور جو آرزو حقیقت کی بے رحم دنیا میں پوری نہ ہو سکی تھی۔ اس نے تخیل کی آسان دنیا میں پورے ہونے کی راہ نکال لی۔

ذیل میں اس مثنوی کے چند مربوط اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

زمانے نے رکھا مجھے متصل
پراگندہ روزی پراگندہ دل

گئی کب پریشانیٔ روزگار
رہا میں توہم طالع زلف یار

وطن میں نہ اک صبح میں شام کی
نہ پہنچی خبر مجھ کو آرام کی

اٹھاتے ہی سر پہ پڑا اتفاق
کہ دشمن ہوئے سارے اہل وفاق

جلاتے تھے مجھ پر جو اپنا دماغ
دکھانے لگے داغ بالائے داغ

زمانے نے آوارہ چاہا مجھے
مری بیکسی نے بنایا مجھے

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی
غریبی نے اک عمر کی ہمرہی

بندھا اس طرح آہ بار سفر
کہ نے زادِ رہ کچھ نہ یارِ سفر

چلا اکبرآباد سے جس گھڑی
در و بام پر چشم حسرت پڑی

کہ ترک وطن پہلے کیونکر کروں
مگر ہر قدم دل کو پتھر کروں

دل مضطرب اشک حسرت ہوا
جگر رخصتانے میں رخصت ہوا

پس از قطع رہ لائے دلّی میں بخت
بہت کھینچے یاں میں نے آزار سخت

جگر جور گردوں سے خوں ہو گیا
مجھے رکتے رکتے جنوں ہو گیا

ہوا خبط سے مجھ کو ربط تمام
لگی رہنے وحشت مجھے صبح و شام

کبھو کف بلب مست رہنے لگا
کبھی سنگ در دست رہنے لگا

توہم کا بیٹھا جو نقش درست
لگی ہونے وسواس سے جان سست

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور و خواب میں

وہی جلوہ ہر آن کے ساتھ تھا — تصور مری جان کے ساتھ تھا
اسے دیکھوں جیدھر کروں میں نگہ — وہی ایک صورت ہزاروں جگہ
گل تازہ شرمندہ اس رو سے ہو — خجل مشکناب اس کے گیسو سے ہو
سراپا میں جس جا نظر کیجیے — وہیں عمر اپنی بسر کیجیے
کہیں مہ کا آئینہ در دست ہے — کہیں بادۂ حسن سے مست ہے
کہیں نقش دیوار دیکھا اسے — کہیں گرم رفتار دیکھا اسے
کبھی صورت دلکش اپنی دکھائے — کبھو اپنے بالوں میں منھ کو چھپائے
کبھو گرم کینہ کبھو مہربان — کبھو دوست نکلے کبھو خصم جان

طبیبوں کو آخر دکھایا مجھے — نہ بنیا جو کچھ تھا پلایا مجھے
دوا جو لکھی سو خلاف مزاج — کھنچا اس خرابی سے کار علاج
کہ سر رشتہ تدبیر کا گم ہوا — دل اوپر ہجوم توہم ہوا
جنوں آہ درپے ہوا جان کے — مجوز ہوئے یار زندان کے
کیا بند اک کوٹھری میں مجھے — کہ آتش جنوں کی مگر واں بجھے
وہ حجرہ جو تھا گور سے تنگ تر — در اس کا نہ کھلتا تھا دوپہر
جو اس میں کبھو میں سنبھل بیٹھتا — تو باہر بھی اک دم نکل بیٹھتا

کسے تھا مری زندگانی کا دھیان — و لیکن نہایت تھا میں سخت جان
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ — کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں — دیکھا پھر اس کو کبھو خواب میں
بہت بے خود و بے خبر ہو چکا — ہم آغوش طالع بہت ہو چکا

نہ دیکھا کبھو میرؔ پھر وہ جمال
وہ صحبت تھی گویا کہ خواب و خیال

میرؔ کو دیوانگی کا کچھ حصہ وراثت میں بھی ملا تھا۔ ان کے حقیقی چچا دیوانے تھے اور ان کا جوانی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ذکرِ میرؔ میں لکھا ہے۔

او (جد کلاں) دو پسر داشت۔ کلانے خالی از خلل دماغ نبود،
جواں مُرد و حکایت او پس سر شد۔[1]

اس موقع پر احباب واعزہ نے علاج معالجہ میں کوتاہی نہیں کی خصوصاً فخرالدین خاں کی بیوی نے جو میرؔ کی قریبی عزیزہ تھیں، تعویذ گنڈے جھاڑ پھونک اور دوا علاج کی پوری کوشش کی۔ ذکرِ میرؔ میں لکھا ہے۔

ہمسر فخرالدین خاں کہ مرید درویش بود، قرابت قریبہ داشت
زر بسیاری خرچ نمود۔ پری خوانان افسوں دمیدند، طبیباں خوں کشیدند

بالآخر وہ صحت یاب ہو گئے لیکن بقول صاحب بہارِ بے خزاں

تا بقید رشتہ حیات بود...... سلسلہ دیوانگی بپا داشت

میر کے بیان سے بھی اس کی توثیق ہوتی ہے۔ جب وہ خان آرزو کے یہاں سے خفا ہو کر اور کھانا کھاتے سے اٹھ کر حوض قاضی پہنچے تو وہاں علیم اللہ نام ایک شخص ملا، اس نے پوچھا آپ میر محمد تقی میر ہیں؟ فرمایا ہاں، تم نے کیسے پہچانا؟ کہا آپ کا طورِ سودائیانہ تو مشہور ہے[2] حقیقت یہ ہے کہ ان کی زنجیر پائی کا غل کہیں کہیں دیوان میں بھی سنائی دیتا ہے۔ جذب و جنون کے مضمون کو اس صداقت کے ساتھ کسی اُردو شاعر نے نہیں لکھا۔

---

[1] ذکرِ میر ص ۶۵ [2] ذکرِ میر ص ۶۷۔

میر اور دلّی (میر کا تاریخی ماحول)

میر اس زمانہ میں دلّی آئے جب کہ واقعی دونوں ہاتھوں سے دستار سنبھالنا مشکل تھی، ہر طرف نفسا نفسی، خود غرضی غارت گری اور ابتری کا عالم تھا۔ اس وقت شاعر تو شاعر، بڑے بڑے امرا اور رؤسا پریشان اور مضمحل تھے۔ بلندی اور نگوں ساری، تاجوری و نوحہ گری ساتھ ساتھ چلتی تھیں اس کارگاہ شیشہ گری میں اگر قدم بھی اٹھانا تھا تو احتیاط سے اور سانس بھی لینا تھا تو آہستہ۔ اس وقت بقول ڈاکٹر تاراچند:

> سلطنت مغلیہ پر بڑی حد تک زوال آچکا تھا۔ بادشاہوں کے جمع کئے ہوئے خزانے خانہ جنگیوں کی بدولت خالی ہو چکے تھے۔ سلطنت کے نظم و نسق میں ابتری مچی ہوئی تھی۔ مال گزاری مشکل سے وصول ہوتی تھی عہدہ داروں کی تنخواہیں چڑھی رہتی تھیں اور بادشاہوں کے بار بار بدلنے سے شاہی افسروں کی وفاداری میں خلل پڑنے لگا تھا۔ خانہ جنگیوں اور راجپوتوں، سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کے خلاف مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے پرانے امرا کا خاتمہ ہو گیا تھا، نہ فوج میں کارگزاری کی لیاقت اور مستعدی باقی رہی تھی، نہ اس کے سپہ سالاروں میں پشتینی بہادری اور وفاداری۔ بادشاہ سے لیکر ادنیٰ عہدہ دار تک پورے حکمراں طبقہ کی اخلاقی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ سلطنت کی بہبودی کا کسی کو خیال نہ تھا۔[۱]

دلّی خاص طور سے آفات کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ مرکزی سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ چاروں طرف بدامنی اور شورش کے آثار تھے، مرہٹے، روہیلے، جاٹ،

۱؎ تاریخ اہلِ ہند: ڈاکٹر تاراچند

افغان، سکھ، سب ہی فتنہ انگیزی پر تلے ہوئے تھے۔ محمد شاہ دلی میں بیٹھا ہوا داد عشرت دے رہا تھا اور اسے ہنگامۂ ناو نوش میں صبح و شام کی خبر نہیں تھی۔

نادر شاہ کا حملہ

اس وقت باہر والوں کو بھی لوٹ کھسوٹ کا اچھا موقع تھا۔ چنانچہ نادر شاہ ۵۰ دن دار السلطنت دہلی میں قیام کرنے کے بعد ہزاروں اونٹ ساز و سامان اور زر جواہر کے لاد کر ایران لے گیا۔ فریزر[1] نے مال غنیمت کا اندازہ ستر کروڑ کیا ہے۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں آٹھ پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی تھی۔ انندرام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے کم نہ ہوگی۔ اسی مال غنیمت میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی تھا اور تین سو ہاتھی، دس ہزار گھوڑے اور اتنے ہی اونٹ علاوہ تھے۔ جان کا نقصان اس سے کہیں زیادہ تھا۔ تاریخ جہاں کشا میں لکھا ہے کہ کرنال کی لڑائی میں سو امیر اور تیس[3] ہزار ہندوستانی سپاہی مارے گئے[2]۔ میر کے محسن صمصام الدولہ، خان دوران امیر الامرا بخشی الممالک بھی اسی ہنگامہ و آشوب میں ۱۵ فروری ۱۷۳۹ء کو قتل ہوئے۔ ذکر میر میں لکھا ہے:

نواب موصوف بہ سبب پیش جنگی کشتہ افتاد[3]

۱۱ مارچ کے قتل عام میں چاندنی چوک، دریبہ اور پہاڑ گنج کے علاقے بالکل صاف کر دیے گئے، خود ایرانی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس موقع پر تیس ہزار سے کم آدمی تہہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔ جو بچ گئے ان سے تاوان بڑے جبر اور ظلم سے وصول کیا گیا۔ وزیر قمر الدین خاں کو دھوپ میں کھڑا کر کے ایک کروڑ روپے کے جواہرات حاصل کیے گئے۔ اس کے دیوان مجلس رائے کا سر دربار کان کاٹ لیا

---

[1] فریزر: نادر شاہ [2] تاریخ جہاں کشائے نادری از مرزا مہدی بمبئی ص ۳۵۳ [3] ذکر میر ص ۹۳

اور اس نے مارے غیرت کے ۱۸ر اپریل ۱۷۳۹ء کو خودکشی کرلی۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ تقریباً دس ہزار مردوں اور عورتوں نے اسی طرح کنوؤں میں گر گر کر جان دے دی۔ جان و مال کے ساتھ عزت و آبرو بھی لٹی صمصام الدولہ کے بھائی مظفر خاں کی بیویوں اور بیٹیوں کی وہ بے حرمتی ہوئی کہ دشمن بھی تف کرنے لگے۔

نادر شاہ ۵ رمئی ۱۷۳۹ء کو دلّی سے رخصت ہوا۔ اس کے حملے سے سلطنتِ مغلیہ کی بنیادیں اکھڑ گئیں اقتصادی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی اور حکومت کا رہا سہا جاہ و جلال بھی ختم ہوگیا۔ نادر شاہ نے افغانستان اور سندھ پار کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اور کچھ دنوں میں پنجاب بھی مغلوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے جانشین احمد شاہ ابدالی کو دلّی کی حکومت پر حملہ کرنے میں آسانی ہوگئی۔ سکھ اور مرہٹے طاقتور ہوگئے اور اودھ اور دکن نے مرکز سے عملی طور پر آزادی حاصل کرلی۔

محمد شاہ

محمد شاہ سترہ برس کی عمر میں حکمراں ہوا تھا، بادشاہ ہونے سے قبل اس نے سات برس قید و بند میں گزارے تھے۔ اور کوئی معقول تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن وہ خداداد ذہانت اور فراست رکھتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح روز دلّی میں بادشاہ بنتے اور بگڑتے تھے۔ اور جس نے بھی ذرا سر اٹھایا وزیروں اور امیروں نے اسے دبایا۔ اس لئے اس نے عافیت اسی میں دیکھی کہ امور مملکت وزیروں پر چھوڑ دے اور خود کو غرق مے ناب کردے۔ ۲۸ برس کے زمانہ حکومت میں اس نے مشکل سے ایک دو دفعہ باہر قدم نکالا ہوگا۔ سارا وقت عیش و عشرت اور رامش و رنگ میں گذرتا تھا، آخر عمر میں اس کے قویٰ بالکل ہی مضمحل ہوگئے اور طبیعت پر ایک عجیب افسردگی سی چھا گئی تھی اس نے فقیروں اور جوگیوں کی صحبت میں جانا شروع کردیا۔ اور شاہ مبارک کو برہان الطریقت شاہ بدا کو برہان الحقیقت، اور شاہ رمز کو فصیح البیان کے خطابات عطا کئے۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ امرا اور عوام سب اسی درویش پرستی کے رنگ میں رنگ گئے۔[1]

بادشاہِ وقت کمزور، کاہل اور عیش پرست تھا اس لئے امرا کو پوری آزادی تھی۔ اور وہ اپنی خودغرضیوں اور ہوس پرستیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت امرا کی دو پارٹیاں تھیں ایک قمرالدین اعتمادالدولہ ثانی کی، جو ۱۷۲۴ء میں نظام الملک کے بعد وزیرالممالک مقرر ہوا۔ اس گروہ میں تورانی شامل تھے۔ دوسری پارٹی ایرانیوں کی تھی اور اس کا سرگروہ ابوالمنصور خاں صفدر جنگ تھا جو ۱۷۳۹ء میں اودھ کی صوبہ داری پر تعینات ہوا۔ آخر دورِ مغلیہ کی تاریخ ان ہی دو گروہوں کی رنجشوں اور لڑائیوں کی داستان ہے۔[2] ادب میں یہ لڑائی خان آرزو و حزیں اور قتیل و غالب کے معرکوں کی صورت میں نظر آتی ہے۔[3] بادشاہ بے دست و پا تھا اس لئے وہ اپنے معتمد مصاحبوں کی مدد سے حکومت کرتا تھا اور ان ہی کے عروج و زوال سے عوام کی قسمت وابستہ تھی۔ ۱۷۳۲ء سے ۱۷۳۹ء تک صمصام الدولہ خان دوران اور اس کے بھائی مظفر خاں کا طوطی بولتا رہا جب یہ دونوں نادر شاہ کے معرکے میں قتل ہو گئے تو عمدۃ الملک ثانی ابن امیر خاں اول میر میران امیر خاں کو عروج حاصل ہوا، اس کی حاضر جوابی، شعر گوئی، شیریں بیانی اور علم و فن کی قدردانی مشہور رہے۔

امیر خاں ثانی کی وساطت سے محمد اسحاق خاں اول کو بادشاہ کے حضور میں باریابی ہوئی۔ دونوں ایرانی شیعہ تھے۔ اس لئے آپس میں کامل اتحاد تھا۔ رفتہ

---

[1] زوال حکومت مغلیہ: سرکار ج اول ص۴۔ نیز ملاحظہ ہو ذکر میر ص ۵۵،۱۱ [2] سرکار ج ۱، ص ۱۴ و خاندان شجاع (سرکار) باب اول ص ۳،۱ [3] نگارستان فارس ص ۲۱۲ و غوامض سخن صہبائی ص ۶۸۳، ۷۳۱ و قول فیصل (لکھنؤ) ص ۳۵ و نیز معرکہ حامیانِ قتیل و غالب ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں از خواجہ احمد فاروقی: رسالہ اردو، اپریل

رفتہ اس کو بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل ہو گیا کہ محمد شاہ اس کو ایک منٹ کو بھی الگ نہ کرتا تھا۔ جب وہ نادر شاہ کے خلاف لڑائی میں ہار کر اور بے آبرو ہو کر بھاگا تو اسحاق خاں بھی اسی ہاتھی پر سوار تھا۔ وہ اسے برابر تسلی و تشفی دیتا رہا اس کی شائستگی، شعر گوئی، خوش گفتاری کی نادر شاہ نے بھی تعریف کی اور کہا کہ جب اسحاق موجود تھا تو تم نے قمرالدین خاں کو وزیر کیوں مقرر کیا۔ وہ چھ ہزاری ہوا، پھر مؤتمن الدولہ۔ آخر میں ماہی مراتب حاصل ہوئے۔ ۱۰ اپریل ۱۷۴۵ء کو انتقال کیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا مرزا محمد نجم الدولہ اسحاق خاں دوم، دیوان خالصہ مقرر ہوا۔ اور کچھ دنوں میں اس کو بھی دربارِ شاہی میں وہی قربت حاصل ہو گئی جو باپ کو حاصل تھی۔ محمد شاہ کے حکم سے اسحاق خاں اول کی بیٹی کی شادی صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ سے کر دی گئی (۱۷۴۵ء) یہی آصف الدولہ کی ماں ہیں اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وارن ہسٹنگز نے ان ہی کو اپنے مظالم کا ہدف بنایا تھا۔ امرا میں اسدیار خاں کا ذکر بھی ضروری ہے جس کی سفارش سے میر نواب بہادر (جاوید خاں خواجہ سرا) کے یہاں ملازم ہوئے۔ ذکر میر میں لکھا ہے:-

"تلاش روزگار بخانہ نواب بہادر کردم و نوکر شدم۔ اسدیار خاں بخشی فوج او احوال مرا نقل کردہ اسپ و تکلیف نوکری معاف کنانید[۱]"

محمد شاہی امرا میں ابوالمنصور خاں صفدر جنگ ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ وہ ۳۵ برس کی عمر میں سعادت خاں برہان الملک کا جانشین اور اودھ کا صوبیدار مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ ایسی فوج جمع کر لی جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنا مشکل تھی۔ شیعہ حضرات اسے اپنا رہنما اور سرگروہ سمجھتے تھے۔ محمد شاہ کی تاریخ ان امرا

---

[۱] ذکر میر ص ۷۱۔

کے عروج وزوال، ان کی صلح و دوستی اور آویزش و پیکار سے بھری ہوئی ہے۔ اس وقت سب سے بڑا فتنہ لاہور سے کھڑا ہوا۔ ۱۷۲۶ء میں زکریا خاں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کی شادی وزیر اعتماد الدولہ اول کی لڑکی سے ہوئی تھی اور اس کے بڑے بیٹے کی، اس کے لڑکے اعتماد الدولہ دوم کی بیٹی سے۔ اس طرح وہ دربار میں بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا ہی نہیں بلکہ اس نے اپنی نیکو کرداری سے عوام کے دلوں میں بھی گھر بیدا کر لیا تھا۔

پہلی جولائی ۱۷۴۵ء کو جب اس کا انتقال ہوا تو لاہور کے لوگ اس کے غم میں دھاڑیں مار مار کر روئے تین دن تک شہر میں چولھا اور چراغ نہیں جلا، لاہور کا کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو چلنے کی طاقت رکھتا ہو اور اس کے جنازہ کے ساتھ نہ ہو۔[1] اس کے دو بیٹے تھے ایک یحییٰ خاں، دوسرا شاہنواز خاں، دونوں میں باپ کے مرنے کے بعد جنگ ہوئی اور پنجاب کی عزت اور آبرو خاک میں مل گئی۔ اس لڑائی میں بالآخر شاہ نواز خاں کامیاب ہوا اور اس نے اپنے بھائی یحییٰ خاں صوبیدار پنجاب کے تمام مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ (۲۱ مارچ ۱۷۴۷ء) شاہنواز خاں نے محمد شاہ کے حضور میں خط بھیجا کہ میری خطا کو معاف کیا جائے اور مجھے پنجاب کی صوبیداری عنایت کر کے سرفراز کیا جائے۔

یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا، نادر شاہ ۹ جون ۱۷۴۷ء کو قتل کر دیا گیا اور احمد شاہ ابدالی اس کے تخت پر متمکن ہوا۔ (۲۱ جون ۱۷۴۷ء) اس کے سامنے سب سے بڑا کام یہ تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کر کے دولت حاصل کرے اور نادر شاہ کے مقبوضات کو اپنے تصرف میں لے آئے۔ اس وقت پنجاب کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ زکریا خاں کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کے بیٹے آپس میں لڑ رہے تھے۔ شاہنواز

---

[1] تذکرہ انند رام مخلص۔

خاں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ محمد شاہ اس کو پنجاب کا صوبہ دار مقرر نہ کرے گا، اس لئے کہ بخشی خاں اس منصب کا جائز وارث اور وزیر قمر الدین خاں اعتماد الدولہ دوم کا داماد تھا، شاہ نواز خاں اپنی ہوس سے مجبور ہو کر ادچھے ہتھیاروں پر اتر آیا اس نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور نادر شاہ کے مفتوحہ علاقوں پر قابض ہو جائے۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ شیعہ مذہب بھی اختیار کر لیا اور اپنی مہر پر بارہ اماموں کے نام کندہ کرلئے۔ اس طرح اسے توقع تھی کہ ایرانی سپاہی اس کی آڑے وقت میں مدد کریں گے۔

ابدالی کا حملہ ۱۷۴۸ء

احمد شاہ ابدالی ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور کے قریب پہنچ گیا اور اس نے سب سے پہلے اپنے مرشد بابا صابر کو شہر میں بھیجا اس کی ماں لاہور میں تھی اور وہ اس سے ملنا چاہتا تھا، لیکن عوام میں یہ مشہور تھا کہ بابا صابر بہت بڑا جادوگر ہے اور اسی کی مدد سے ابدالی کو غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اس لئے شاہنواز نے اسے گرفتار کروا لیا اور اگلے روز ایک معمولی افسر نے بغیر گورنر شاہ نواز کے حکم کے اُسے قتل بھی کر دیا۔

ابدالی کے لئے یہ حرکت ناقابل برداشت تھی۔ اس نے فوراً یلغار کا حکم دیدیا۔ شاہنواز اس کے آگے نہ ٹھہر سکا۔ اور رات کے بارہ بجے شہر سے نکل گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور افسر اور سپاہی بھی بھاگ کھڑے ہوئے (۱۱ جنوری ۱۷۴۸ء) زکریا خاں کے پرانے نمک خوار اور وفادار ملازم قید میں تھے انھوں نے شاہ نواز سے رہائی پا کر ابدالی سے درخواست کی کہ ۳۰ لاکھ روپیہ لے لیا جائے اور شہر کو غارت نہ کیا جائے، اسے تو روپے کی ضرورت تھی مان گیا۔ لیکن پھر بھی انتظام کی ابتری سے بہت سامالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ لاہور پر قبضہ ہو جانے سے احمد شاہ ابدالی

کی قوت دگنی ہوگئی اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ ۱۲ ہزار سپاہیوں کو لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا (۱۹؍فروری ۱۷۴۸ء) محمد شاہ کے دربار میں ابھی مشورے ہی ہو رہے تھے کہ کیا ہونا چاہیئے۔ پوتڑوں کے درباری اور رئیس جنھوں نے لڑائی کی شکل نہیں دیکھی تھی ان کا اصرار تھا کہ شہنشاہِ عالم و عالمیان بہ نفس نفیس لڑائی میں شریک نہ ہوں، ابدالی ایسا کہاں کا رستم ہے، بادشاہ کا کوئی بھی غلام جاکر اسے قید کرکے لے آئے گا (مجمل التواریخ) لیکن سمجھ دار امیروں کا اصرار تھا کہ بادشاہ کم سے کم پانی پت یا کرنال تک ضرور جائیں اس کا اچھا اثر پڑیگا محمد شاہ اس رائے کو معقول تو سمجھتا تھا لیکن اس پر عمل کرنے کی جرات نہیں رکھتا تھا۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ وزیر قمرالدین خان فوج کی کمان کریں۔ اور ایشوری سنگھ راجہ جے پور اور ناصر خاں سابق گورنر کابل ان کی امداد کے لئے جائیں۔ فوج کی روانگی کی تاریخ ۸؍جنوری ۱۷۴۸ء طے پائی لیکن چار پانچ دن توپ خانہ کے انتظار میں گذر گئے۔ ایشوری سنگھ نے رنتھمبور کا قلعہ مانگا تھا۔ بادشاہ نے اس کے دینے سے انکار کر دیا تھا اس لئے وہ بھی روانگی کی تاریخ کو ٹالتا رہا۔

یہ فوج مشکل سے ۱۶ میل گئی ہوگی کہ نریلا کے قریب اطلاع ملی کہ ابدالی نے لاہور لے لیا۔ اس خبر سے مغلیہ سرداروں کے اوسان جاتے رہے اور انھوں نے بادشاہ سے درخواست کی کہ شہزادہ احمد شاہ کو ہمارے ساتھ بھیج دیا جائے بادشاہ نے منظور کر لیا۔ اور وہ ۲۵؍جنوری ۱۷۴۸ء کو سرہند پہنچ گیا لیکن سرہند بھی افغانوں کے پنجے سے نہ بچ سکا، اور انھوں نے بڑی آسانی سے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ قلعہ دار تہِ تیغ کر دیے گئے۔ اور عورتیں قید کر لی گئیں، اب دہلی کا راستہ صاف تھا۔ دہلی والوں کو نادر شاہ کا حملہ یاد آگیا اور انھوں نے بادے

ڈر گئے اپنی عورتوں کو بھیس بدلا بدلا کر شہر سے باہر بھیج دیا۔

۱۱؍مارچ ۱۷۴۸ء کو مانو پور کے قریب لڑائی ہونے والی تھی۔ اور اس دن وزیر قمر الدین مغلیہ فوج کو لے کر میدان میں آتا۔ لیکن ایک گولہ اس کے خیمے پر آ کر گرا اور وہ ان زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس کے بیٹے معین الملک نے فوج کو سنبھالا اور بڑی بہادری کا ثبوت دیا لیکن راجہ ایشوری سنگھ جو پہلے ہی سے بد دل تھا اپنے حجام کے مشورہ پر میدان سے بھاگ نکلا اور ساری فوج میں کھلبلی مچ گئی۔ اس وقت صفدر جنگ نے بڑی ہمت سے کام لیا اور قدرت نے بھی مغلوں کی مدد کی، ابدالیوں کے گولہ بارود میں آگ لگ گئی اور اس سے تقریباً ایک ہزار افغان سپاہی جل کر راکھ ہو گئے۔ اس واقعہ کے بعد ابدالیوں کے پیر اکھڑ گئے اور میدان بادشاہ زادے کے ہاتھ رہا۔

میر اور رعایت خاں میر اس زمانہ میں رعایت خاں کے ملازم تھے۔ یہ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور قمر الدین خاں اعتماد الدولہ کا بہنوئی تھا۔ میر لکھتے ہیں کہ جب[1] شاہ درانی لاہور پہنچا تو شاہ نواز خاں پسر زکریا خاں جو وہاں کا صوبہ دار تھا بھاگ گیا اور صفدر جنگ اور ایشوری سنگھ پسر راجہ جے سنگھ جو بڑا زمیندار تھا، بادشاہ زادہ احمد شاہ کو لیکر جنگ کے لئے نکلے۔ سرہند کے اس طرف وزیر کے ایسی گولی لگی کہ وہ زندہ نہ بچے اور زمیندار مذکور بھاگ گیا۔ صفدر جنگ اور وزیر شہید کا بیٹا معین الملک بادشاہ زادہ احمد شاہ کو سوار کرا کے افغانوں کی لڑائی کے لئے آمادہ ہوئے۔

میر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

من دریں سفر با خان (رعایت خاں) منظور بودم و خدمتہا می نمودم۔ ہر گاہ شکست فاحشے بر لشکر افغاں افتاد و گریخت، معین الملک ناظم لاہور شد، خان مذکور چوں عنواز جا رفتہ، ترک رفاقت او گرفتہ با صفدر جنگ روانہ شہر شد۔[2]

---

[1] ذکر میر ص ۶۸ [2] ذکر میر ص ۶۸۔

یہ قافلہ پانی پت کے قریب تھا کہ محمد شاہ کے انتقال کی خبر پہنچی (۱۷۴۸ء) صفدر جنگ نے چتر اور تخت دونوں احمد شاہ کے حضور میں پیش کیے اور وہ بڑے کروفر کے ساتھ شہر دہلی میں داخل ہوا۔ میر نے لکھا ہے:[1]

این جا جاوید خاں خواجہ سرائے بادشاہ مرحوم بود بخطاب نواب بہادر مخاطب گشت و اختیار سلطنت بدست او افتاد ؎

ہر روز اختیار جہاں پیش دیگریست دولت گر گداست کہ ہر روز بردریست[2]

احمد شاہ بادشاہ دہلی

احمد شاہ محمد شاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ۲۲ سال کی تھی لیکن اس کو نہ انتظام سلطنت کا تجربہ تھا، نہ فوجی زندگی کا، اس کی شہزادگی کا زمانہ قلعہ کی بیگمات کے ساتھ گزرا تھا۔ جہاں نہ اس کی تعلیم ہوئی تھی اور نہ تربیت، باپ کا برتاؤ بھی اچھا نہیں تھا اس لئے اس کو یہ زمانہ سخت عسرت اور تنگدستی میں گذارنا پڑا تھا۔ اب ایک دم سے ساری پابندیاں اور سختیاں دُور ہو گئیں اور کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ رہا۔ طبیعت خام تھی اور مزاج میں شروع سے رنگینی، ابتذال اور نسائیت، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بُری صحبتوں میں پڑ گیا۔ اس کے بداطوار مشیر جو رائے دیتے تھے وہ اس کو قبول کر لیتا تھا اور وہ لوگ اُسے جان جان کر غلط راستوں پر ڈالتے تھے تاکہ عیش و آرام میں کمی نہ ہو اور سلطنت کے الجھاوؤں سے نجات ملی رہے۔

احمد شاہ جاوید خاں خواجہ سرا کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ وہ جس طرف چاہتا تھا اس کی نکیل پھیر دیتا تھا۔ اس میں اول تو سمجھ بوجھ تھی ہی نہیں اور جو تھی

---

[1] ذکر میر ص ۶۸ [2] ذکر میر ص ۶۹ -

وہ شاہد و شراب کی کثرت نے ختم کردی تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا یہ حال ہوگیا کہ محل کے ایک ایک کونے تک سوائے خوش رو اور جوان عورتوں کے کسی مرد کی صورت بھی نظر نہ آتی تھی اور وہ تمام وقت اِن ہی کے ساتھ باغوں اور مرغزاروں میں صرف کرتا تھا۔[1]

جب وہ ان ہوس رانیوں سے فرصت پاتا تو دل بہلانے کے لئے عجیب عجیب طفلانہ حرکتیں کرتا۔ ۱۷۵۳ء میں وہ شہزادہ محمود شاہ کو جھروکہ کے نیچے نرگس کے پھولوں کے قریب لے گیا اور تمام امراء اور رؤسا کے بچوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو نذر پیش کریں۔ اس کے بعد وہ اسے ملکۂ زمانی کے قریب لے گیا۔ اور اس سے بادشاہوں کے قاعدے سے سلام کروایا۔ اس بچہ کے لئے ایک چھوٹا سا خیمہ بنوایا، اور اسے مسند پر بٹھاکر دربار منعقد کیا۔ تمام امرا کے بچے اس کے گرد کھڑے ہوئے اور وہ خود بھی اُس کے دربار میں حاضر ہوا۔

یہ گڈّوں گڑیوں کا کھیل اسی جگہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس نے نومبر ۱۷۵۳ء میں اسی سہ سالہ بچہ کو پنجاب کا گورنر اور ایک سال کے شیر خوار بچے کو اس کا نائب مقرر کیا۔ اسی طرح کشمیر کی صوبہ داری ایک برس کے بچے کے سپرد کی گئی اور ایک پندرہ برس کے لڑکے کو اس کا نائب ناظم مقرر کیا گیا۔ یہ تقرر ٹھیک اُس وقت ہوئے جب ابدالی پنجاب اور کشمیر پر دستک دے رہا تھا۔

احمد شاہ میں وہ جرات اور شجاعت بھی نہ تھی جو خاندانِ تیموریہ کی خصوصیت رہی ہے۔ سکندر آباد میں اسے مرہٹوں کی شورش کی خبر ملی اور وہ اس طرح سر پہ پیر رکھ کر بھاگا کہ حرم کی بیگمات کو بھی ساتھ نہ لیا۔ وہ بیچاریاں بعد میں قید ہوئیں اور بے آبرو ہوئیں۔ اپنے زمانۂ حکومت کے آخری دو تین سالوں میں احمد شاہ نے

---

[1] سیر المتاخرین ۳ ص ۲۷

اُمورِ سلطنت کی طرف پوری توجہ کی اور وقت مقرر کر کے انتظامی اُمور میں لگا رہا۔ لیکن اسے تجربہ، کام لینے کا سلیقہ اور سُوجھ بُوجھ نہیں تھی اس لئے یہ کوشش بھی رائگاں گئی۔

احمد شاہ کے دربار میں خواجہ سراؤں اور عورتوں کا راج تھا۔ محمد شاہ کی بیگمات میں ایک رقاصہ ادھم بائی بھی تھی۔ اس کو اپنے شوہر کی حیات میں وہ عروج حاصل نہیں ہوا جو اس وقت ہوا، کوئی کام بغیر اس کے اشارۂ ابرو کے انجام پذیر نہ ہوتا تھا اور کوئی حکم ایسا نہ تھا جس پر اس کے دستخط نہ ہوں لیکن بادشاہوں کی صحبت نے اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور اس کی وہ تمام عامیانہ حرکتیں اُسی طرح قائم رہیں۔ جاوید خاں خواجہ سرا سے اس کا ربط وضبط اتنا بڑھا کہ تو کر بھی تھو تھو کرنے لگے۔ اور وہ راتوں کو بھی حرم سرا میں رہنے لگا۔ شاہی درباریوں کو اس کی بڑی ناگواری ہوئی۔ مہینوں سے وہ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بھرے بیٹھے تھے۔ ایک روز وہ ایک گدھا اور ایک کتیا پکڑ لائے، جو امیر آتا اس سے کہتے۔ یہ نواب بہادر ہیں۔ (گدھا) اور یہ حضرت قدسیہ ہیں (کتیا) پہلے ان کو سلام کیجئے پھر آگے بڑھیئے۔

غرض حکومت کا اقتدار اور رعب اور جلال بالکل اُٹھ گیا تھا اور ہر طرف بدتمیزی، بدمستی اور بدانتظامی پھیلی ہوئی تھی، سلطنت کی اقتصادی حالت اتنی گر گئی تھی کہ سپاہیوں کو مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی اور وہ روز بلوے کرتے تھے لیکن ان کے لئے دو لاکھ روپے بھی جمع نہ ہو سکے۔ ٹھیک اسی وقت حضرت قدسیہ نے اپنی سالگرہ کا جشن منایا اور اس میں دو کروڑ روپے صرف کئے[۱]

---

[۱] تاریخ احمد شاہی (قلمی)

بیٹے کی تخت نشینی کے بعد ادھم بائی کو نواب قدسیہ، صاحب الزمانی، صاحب جیو صاحبہ اور حضرت قبلۂ عالم کے خطابات اور اس کے بھائی مان خاں کو (جو گلیوں میں ناچتا اور گاتا پھرتا تھا) چھ ہزاری منصب عنایت ہوا۔ اسی طرح جاوید خاں خواجہ سرا کو جو اعزاز و اکرام ملا اس کی بھی کوئی حد نہیں رہی۔ ہفت ہزاری منصب تھا، ماہی مراتب تھے اور نواب بہادر کا خطاب تھا۔ یہ اعزاز آج تک کسی خواجہ سرا کو نہیں ملا تھا۔ پرانے اور پشتینی امیر اور رئیس اس کے عروج کو دیکھ دیکھ کر اپنی ہتک اور بے عزتی سی محسوس کرتے تھے۔

احمد شاہ پانی پت کے قریب تھا کہ اسے اپنے باپ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ میر نے لکھا ہے کہ:-

صفدر جنگ لشکر برابر زدہ چتر و تخت پیش احمد شاہ آورد[۱]

اس نے احمد شاہ کو بادشاہ ہونے کی مبارک باد دی اور اس نے جواب میں اسے وزیر ہونے کی، لیکن نظام الملک آصف جاہ کے ڈر سے باقاعدہ وزارت کا اعلان نہ ہو سکا۔ ۲۱ رمئی ۱۷۴۸ء کو نظام الملک کا برہان پور میں انتقال ہو گیا اس کے بعد صفدر جنگ کو وزارت کے پورے اختیارات حاصل ہو گئے اور بخشی گری کا عہدہ سادات خاں ذوالفقار جنگ کو مل گیا۔ نائب بخشی کا عہدہ انتظام الدولہ خان خاناں کو دیا گیا جو وزیر قمر الدین خاں کا بیٹا تھا اور خالصہ کی دیوانی اسحاق خاں نجم الدولہ کے سپرد کی گئی۔

میر نے لکھا ہے کہ:-

بخشی حال سادات خاں ذوالفقار جنگ نے راجہ بخت سنگھ کو جو ایک بڑا مشہور زمیندار تھا صوبہ اجمیر کی نیابت دے کر اس کے بڑے بھائی

---

[۱] ذکر میر ص ۶۸۔

ابھے سنگھ کے مقابلہ میں جو ریاست جودھپور کا راجہ تھا بھیجا۔ راجہ مذکور خاں[1] کو فوج کا سردار بنا کر اپنے ساتھ لے گیا، قصبہ سانبھر کے نواح میں جو اجمیر کے اس طرف بیس کوس کے فاصلے پر واقع ہے۔ دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور توپ خانہ کی لڑائی شروع ہوئی۔ طرف ثانی کے لوگ بھاگ نکلے۔ ناچار اس طرف کا رئیس ملہار راؤ جو دکن کے سرداروں میں نامور سردار تھا، بیچ میں پڑا اور صلح کرادی۔

اس وقت راجپوتانہ باہمی منافقات کا مرکز بنا ہوا تھا، مارواڑ کے راجہ ابھے سنگھ اور ناگور کے راجہ بخت سنگھ[2] میں لڑائی تھی۔ یہ جھگڑا ۱۷۴۹ء میں شروع ہوا۔ اور ۱۷۵۱ء تک چلتا رہا۔ بالآخر بخت سنگھ کامیاب ہوا اور اس کے قبضہ میں جودھپور اور اجمیر دونوں آگئے۔ (۱۷۵۱ء)

دلی کی حکومت بخت سنگھ کا ساتھ دے رہی تھی ۱۷۴۸ء میں اسے اس توقع پر گجرات کا صوبہ دار بھی مقرر کر دیا گیا کہ وہ مرہٹوں کے سیلاب کو روک سکے گا اسی امید موہوم پر میر بخشی نے اس سے جودھپور کے تخت کے حصول میں امداد دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

میر بخشی نے ۱۷۵۰ء سے ۱۷۵۱ء تک تمام وقت اس کوشش میں صرف کیا کہ راجپوتوں سے خراج وصول کر سکے اور دہلی کی شہنشاہیت منوا سکے۔ لیکن اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اسے بخت سنگھ پر بھی پورا اعتماد نہیں تھا۔ نہ معلوم کس وقت وہ دشمن سے جا کر مل جائے۔ اس کے علاوہ پانی کی سخت قلت تھی اور موسم دن بدن سخت ہوتا جاتا تھا۔ ۱۴ اپریل ۱۷۵۰ء کو دونوں فریقوں

---

[1] خان سے مراد رعایت خاں ہے جو اس وقت رسالدار تھے۔ [2] ڈاکٹر عبدالحق نے رخبیت سنگھ لکھا ہے۔ یہ غلط ہے (رسالہ اردو جلد ۷، ۱۹۲۷ء) خود میر نے بخت سنگھ لکھا ہے اور یہی صحیح ہے۔ (ذکر میر ص ۶۹، ۷۰) نیز سیر المتاخرین ص ۸۸۳۔

میں توپ خانہ کی جنگ ہوئی لیکن جلد ہی دونوں کو اس کا احساس ہو گیا کہ لڑائی کو جاری رکھنا فائدہ مند نہیں ہے۔ ۱۶ اپریل کو صلح ہو گئی اور میر بخشی نے پانچ مہینے اجمیر میں قیام کیا تاکہ وہ راجپوت راجاؤں سے روپیہ وصول کر سکے۔ لیکن اس رقم کی ادائیگی میں امروز فردا ہی ہوتا رہا۔ صرف ایشوری سنگھ راجہ جے پور سے ایک لاکھ روپے وصول ہوئے جو رام سنگھ جانشین ابھے سنگھ والیٔ جودھپور کا مددگار رہ چکا تھا۔ سنہ ۱۷۵۰ء میں ملہار راؤ ہلکر نے مل کر جے پور پر حملہ کر دیا اور ایشوری سنگھ نے اپنے اندر مقابلہ کی ہمت نہ دیکھ کر زہر کھا لیا (۱۲ دسمبر سنہ ۱۷۵۰ء) اسی ملہار راؤ نے صلح صفائی کی کوشش کی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رام سنگھ کے انتقال (۱۷۷۳ء) تک جودھپور اور ناگور کا جھگڑا چلتا رہا۔ اور ۱۷۵۱ء میں بخت سنگھ جودھپور اور اجمیر دونوں پر قابض ہو گیا۔

میر کا سفر اجمیر

میر نے لکھا ہے:

من پس از صلح (غالباً اپریل سنہ ۱۷۵۰ء) برائے حصول
سعادت زیارت فلک اشتباه خواجہ بزرگ[1] رفتم و سیر آں نواحی کردہ برگشتم

(ذکر میر ص ۶۹)

اس طرح میر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار پر بھی حاضر ہوئے اور یہ سعادت ان کو اپریل سے اگست تک کسی مہینہ میں حاصل ہوئی ہو گی۔

میر نے آگے چل کر لکھا ہے:-

کسی معاملہ میں خان[2] اور بخت سنگھ میں تیز گفتگو ہو گئی جو راجہ کو بہت ناگوار گزری

۱؎ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے کہ خواجہ بزرگ سے مراد جاوید خاں خواجہ سرا (نواب بہادر) ہے (رسالہ اردو جلد، ص ۲۱۰) یہ صریحاً غلط ہے خواجہ بزرگ سے مراد حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ ہیں (خ ۱۰ ف)، ۲؎ خان سے مراد رعایت خاں ہے

اور نوبت نزاع تک پہنچ گئی۔ خان (رعایت خاں) نے مجھے (میر کو) معذرت کے لئے بھیجا۔ میں گیا اور قسم کھائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا لیکن راجہ کا دل صاف نہیں ہوا۔ راجہ نے رسالہ کی تنخواہ بھیج کر، خان کو رخصت کر دیا خان شہر واپس آ گئے اور کچھ دنوں کے لئے خانہ نشین ہو گئے۔ (ذکر میر ص ۷۰)

سادات خاں میر بخشی، نومبر ۱۷۵۰ء میں دہلی واپس آیا لیکن اس طرح کہ اس کا بال بال قرض میں بندھا ہوا تھا۔ راجپوتانہ کی فوج کشی میں تقریباً ۶۰ لاکھ خرچ ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ مشکل سے پانچ لاکھ آئے تھے۔ فوج میں اٹھارہ ہزار سپاہی تھے جن کو ایک سال سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا تھا۔ ان کا تقاضا روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جاتا تھا۔ لیکن نہ شاہی خزانہ میں روپیہ تھا کہ اسے دیا جاتا اور نہ جاوید خاں اس مغرور عالی خاندان امیر کی امداد کے لئے تیار تھا جو اس کے آگے اپنا سر جھکانے میں توہین محسوس کرتا تھا۔

سادات خاں ذوالفقار جنگ میر بخشی نے روز کے تقاضوں سے تنگ آ کر دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا اور خانہ نشین ہو گیا۔ کوئی دوست آشنا پوچھتا تو کہہ دیتا کہ کوئی بادشاہ ہی نہیں ہے کس کے پاس جائیں۔ اُس خواجہ سرا کے پاس جا کے تو ہم سے عزت نہیں گنوائی جاتی۔

کسی نے یہ خبر جاوید خاں تک بھی پہنچا دی۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اور احمد شاہ سے کہا کہ میر بخشی تو حضور کو تخت سے محروم کرنے اور دوسرے شہزادے کو تخت نشین کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کی نگرانی ضروری ہے۔ سادات خاں نے ان بدگمانیوں سے بچنے کے لئے مناسب سمجھا کہ ایک روز خود حضور میں جا کر تمام واقعات کو بیان کرے اور ان بد انتظامیوں کی اصلاح کی کوئی صورت نکالے۔ لیکن جاوید خاں کے اشارہ پر دربانوں نے اسے اندر جانے سے روک دیا[۵]۔ اس پر

---

[۵] سیر المتاخرین ص ۸۸۶۔

سادات خاں کو بڑا غصہ آیا اور اس نے وہیں کھڑے ہو کر بادشاہ اور نواب بہادر کو خوب برا بھلا کہا۔ جاوید خاں تو یہ چاہتا ہی تھا۔ اس نے فوراً بادشاہ سے احکامات صادر کروائے کہ میر بخشی کو معزول کر دیا جائے اور اس کی جاگیر، خطابات اور حقوق ضبط کر لئے جائیں۔ (۷ رجون ۱۷۵۱ء) اور اس کے مکان کے چاروں طرف توپیں لگادی جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سادات خاں بالکل قید ہو گیا۔ اس نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز بیچ دی اور جہاں تک ہو سکا سپاہیوں کا قرض نمٹایا اور خود درویشانہ زندگی بسر کرنے لگا۔

جاوید خاں بدستور حرم سرائے سلطانی کا مختار تھا۔ اس نے میر بخشی کا عہدہ امیر الامرا غازی الدین خاں کو دلوایا اور انتظام الدولہ خاں خاناں کو اجمیر کا صوبہ دار مقرر کروایا۔ (۷ رجون ۱۷۵۱ء) اس طرح بساطِ سیاست پر تورانی پارٹی کے دو اہم مہرے آگے بڑھا دئے تاکہ صفدر جنگ کا زور گھٹ جائے اور ایرانی جماعت کو سر اٹھانے کا موقع نہ ملے۔ جاوید خاں ہی ان چالوں سے سارے دربار پر چھایا ہوا تھا۔

میر اس زمانہ میں رعایت خاں سے وابستہ تھے لیکن بعد میں جاوید خاں کے ملازم ہو گئے:۔

> ایک روز رعایت خاں نے مجھ سے اصرار کیا کہ اپنے چند اشعار اس قوال کے لڑکے کو یاد کرادیجئے۔ وہ بیٹھا گا رہا تھا۔ میں نے ان کے شدید اصرار سے مجبور ہو کر اسے چند اشعار یاد تو کرا دئے لیکن یہ بات طبع نازک پر اتنی گراں گذری کہ پھر آنا جانا چھوڑ دیا۔ بہتیرا بلایا لیکن میں نہ گیا۔ انھوں نے میری رفاقت کے خیال سے میرے بھائی محمد رضی کو گھوڑا دیکر نوکر رکھ لیا جب میں ایک مدت کے بعد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے بڑی معذرت کی۔ یہی نے

بھی گذشتہ پر صلوٰۃ بھیجی۔

میر نے رعایت خاں کی ملازمت ترک کر کے جاوید خاں خواجہ سرا کی نوکری کر لی جس کا اس وقت طوطی بول رہا تھا۔ میر لکھتے ہیں:

جاوید خاں کی ملازمت

تلاش روزگار بخانۂ نواب بہادر کردم و نوکر شدم اسد یار خاں بخشی فوج او احوال مرا نقل کردہ اسپ و تکلیف نوکری معاف کنانید پاس من از حد بیشتر می کرد و پہلوی داد خدایش خیر دہاد[1]

اسی زمانہ میں صفدر جنگ اور جاوید خاں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے اصل یہ ہے کہ نواب بہادر ایک لائق وزیر کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے تھا۔ ۱۷۴۸ء میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے در پردہ ناصر جنگ کو لکھا کہ وہ دلی آ کر قلمدانِ وزارت کو سنبھال لے۔

دو برس کے بعد معاملات اور نازک ہو گئے۔ ۱۵ ستمبر ۱۷۴۸ء کو علی محمد روہیلہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس نے بڑی دولت چھوڑی ہے۔ صفدر جنگ نے قائم خاں بنگش کو روپیہ کا لالچ دے کر اُسے روہیلکھنڈ کا فوجدار مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ وہ اپنے علاقہ میں مغلیہ نظم و نسق قائم کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قائم خاں بنگش اور حافظ احمد خاں روہیلہ میں لڑائی ہوئی اور قائم خاں مارا گیا۔

صفدر جنگ نے قائم خاں بنگش کے قتل پر مطلق افسوس نہیں کیا۔ بلکہ اس کی موت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس کی ساری جائداد اور املاک پر قبضہ کرنا چاہا

---

[1] ذکر میر ص ۷۱

لیکن قائم کی ماں بی بی صاحبہ نے اپنے سوتیلے بیٹے احمد بنگش سے مدد کی درخواست کی اور کہا، "اگر خدا تم کو عورت پیدا کرتا تو مجھے صبر آجاتا، تم مرد ہو بڑا افسوس ہے، مجھ پر یہ وقت پڑے اور تم بیٹھے دیکھتے رہو۔"

بی بی صاحبہ نے افغان کسانوں کے پاس اپنی چادر بھیجی اور اپنی بے کسی کا واسطہ دے کر فریاد کی۔ اس طرح سارے فرخ آباد میں آگ لگ گئی۔ صفدر جنگ کے آدمیوں نے بھی وہاں جور و ظلم کی انتہا کر دی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ سارے افغان کسان بھڑک اٹھے اور نول رائے جو صفدر جنگ کا نائب تھا، وہ افغانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ خود صفدر جنگ فوج لے کر آیا۔ لیکن اس کو بھی شکست ہوئی اسی لڑائی میں اسحاق خاں دوم بھی جو صفدر جنگ کا عزیز قریب اور دیوانِ خالصہ تھا مارا گیا۔

میر نے لکھا ہے کہ:

جس وقت قائم خاں پسر محمد خاں بنگش روہیلوں کی لڑائی میں مارا گیا اور صفدر جنگ اس کے گھر کی ضبطی کے لیے گئے تو میں بھی اسحاق خاں نجم الدولہ کے ساتھ اُس طرف کی سیر کی غرض سے چلا گیا۔ قائم خاں کے چھوٹے بھائی احمد خاں سے بڑی لڑائی ہوئی۔ وزیر کی فوج کو شکست ہوئی اور اسحاق خاں مارے گئے۔ میں بھی شکست خوردہ فوج کے ساتھ پھر شہر کو واپس آگیا۔ لیکن بے حد تکلیف اٹھائی

صفدر جنگ کی شکست

صفدر جنگ کی شکست، معمولی شکست نہیں تھی۔ یہ وزیر الممالک کی شکست تھی۔ تاریخ احمد شاہی میں لکھا ہے کہ صفدر جنگ زخمی ہوا اور ایک دن میں بھاگم بھاگ چالیس کوس کی منزل طے کر کے کول پہنچا۔ صفدر جنگ بُری طرح لُٹ چکا تھا۔

رات کو یوں ہی زمین پر پڑا رہا اور جو میسر ہوا وہی صبر شکر سے کھایا۔ ۲۲ شوال کو دہلی پہنچا لیکن دو مہینے تک دربار میں حاضر نہیں ہوا۔

مغلیہ تاریخ میں پہلی مرتبہ وزیر الممالک کو شکست ہوئی تھی اور وہ بھی ایک معمولی جاگیردار کے بیٹے کے ہاتھوں۔ جاوید خاں، صاحب الزمانی اور انتظام الدولہ نے تو یہ سمجھ کر کہ صفدر جنگ مر گیا ہوگا، اس کی ساری جائداد ضبط کرنے کی ٹھان لی تھی لیکن اس کی بیوی نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا۔ اور اپنے شوہر کی واپسی تک محل کی پوری نگرانی کی آخر ۲۰ ستمبر کو صفدر جنگ بھی آ پہنچا۔ وہ ہار چکا تھا لیکن اب بھی جاوید خاں کے مقابلہ کے لئے کافی تھا۔

دربار کے لوگ بھی کنپٹی بیٹھے والے تھے، وہ تیغ و تفنگ کے بجائے لگائی بجھائی اور کانٹ چھانٹ سے کام نکالتے تھے۔ چنانچہ انتظام الدولہ کے اکسانے پر بادشاہ نے صفدر جنگ کو لکھا کہ ہمارے خاندان کی یہ رسم ہے کہ اگر وزیر الممالک میدان سے بھاگ جاتا ہے تو اسے برطرف کر دیتے ہیں۔ اس لئے تم بھی دربار میں حاضر نہ ہو۔ صفدر جنگ نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے جاوید خاں سے ساز باز کیا۔ اور اُسے ستر لاکھ کی رشوت دینے کا وعدہ کیا۔ اس وعدے وعید سے جاکر کہیں بادشاہ کی خدمت میں سلام ہوا اور اس کا غصہ فرو ہوا۔[۱]

صفدر جنگ اس ہار کو بھولا نہیں تھا۔ اس نے مرہٹوں کی مدد سے روہیلکھنڈ کو فتح کرنا چاہا۔ لیکن مرہٹے اس وقت راجپوتانہ میں مصروف تھے۔ اور فروری ۱۷۵۱ء سے پہلے جے پور سے قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔

صفدر جنگ نے ملہار راؤ ہلکر اور سورج مل جاٹ کی مدد سے افغانوں پر حملہ کیا اور ان کو بُری طرح شکست دی۔

---

[۱] سیر المتاخرین ج ۳ ص ۳۶۔

میرؔ نے لکھا ہے:

وزیر بار دیگر لشکر کشید و افغاناں را مغلوب ساختہ بہ تسلط تمام در حضور آمد۔[۱]

ابدالی کا حملہ ۱۷۵۲ء

۱۷۵۲ء کے شروع میں احمد شاہ ابدالی کے حملہ کی خبر گونجی۔ اس لئے بادشاہ نے صفدر جنگ کو مجبور کیا کہ وہ جلد افغانوں سے صلح کر کے دہلی آ جائے۔ چنانچہ اپریل ۱۷۵۲ء میں صلح ہو گئی جس سے صفدر جنگ کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی یعنی جنوری ۱۷۶۱ء تک یہی صورت رہی۔ اس لڑائی میں چونکہ روہیلوں نے ابدالی کا ساتھ دیا تھا اور مرہٹوں کو بُری طرح شکست ہوئی تھی اس لئے روہیلوں کو پھر سے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کرنے کا موقع مل گیا اور انھوں نے ۱۷۵۲ء میں اپنی وہی حیثیت حاصل کر لی جو پہلے تھی۔[۲]

صفدر جنگ روہیلوں سے نمٹ کر اودھ چلا گیا اور اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ ٹھیک اسی زمانے میں ابدالی کے حملہ کی اطلاع آئی۔ ۶ مارچ کو اس نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۳ر کو اس کی اطلاع دہلی پہنچی اور یہاں اس خبر کے پہنچتے ہی آفت مچ گئی۔ بہت سے لوگوں نے، اپنی عورتوں اور بچوں کو متھرا بھیج دیا جو اس وقت جاٹوں کے قبضہ میں تھا۔ کئی دن تک دہلی کے بازاروں میں غلہ نظر نہیں آیا۔ اس لئے کہ کسی کو قرب و جوار سے شہر کے اندر آنے کی ہمت نہیں تھی۔

صفدر جنگ نے ابدالی سے بچنے کے لئے مرہٹوں سے "امدادی معاہدہ" کیا جس میں یہ طے پایا کہ بادشاہ مرہٹوں کی امداد کا پچاس لاکھ معاوضہ پیش کریگا۔ اور پیشوا آگرہ اور اجمیر کا صوبہ دار ہو گا۔

---

[۱] ذکر میر ص ۱۷ [۲] عماد السعادت از سید غلام علی نقوی (لکھنؤ)

لیکن اس معاہدہ پر عمل نہیں ہو سکا۔ صفدر جنگ کے پہنچنے میں دیر ہوئی اور بادشاہ نے مارے ڈر کے پنجاب اور سندھ کے صوبے ابدالی کے سپرد کر دیئے۔ اس بزدلانہ حرکت کی ذمہ داری جاوید خاں اور صفدر جنگ دونوں پر ہے۔ جاوید خاں لڑائی سے ڈرتا تھا اس لئے اس نے بادشاہ کو یہی مشورہ دیا کہ ابدالی کو یہ دونوں صوبے بخش دیئے جائیں۔ صفدر جنگ پر الزام اس وجہ سے ہے کہ بادشاہ اس وقت بالکل بے دست و پا تھا اور صفدر جنگ نے دیدہ و دانستہ اودھ سے دہلی تک کے راستے کو طے کرنے میں ۲۳ دن لگا دیئے جس کو چار دن میں طے کیا جا سکتا تھا۔

۲۵ اپریل کو صفدر جنگ ۵۰ ہزار مرہٹہ سپاہی لے کر دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ اگلے دن جاوید خاں نے اُسے مل کر بتایا کہ ابدالی سے صلح ہو گئی ہے اور اب ان مرہٹہ سپاہیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ صفدر جنگ کو اس بات پر بڑا غصہ آیا۔ اس لئے کہ وہ انھیں ۵۰ لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا سوال یہی تھا کہ یہ رقم کہاں سے دی جائے۔ مرہٹے دلی کے قریب آ کے رک گئے اور انھوں نے چالیس میل کے آس پاس لوٹ مار شروع کر دی۔ ہزاروں گاؤں تباہ اور برباد ہو گئے۔ اس وقت دہلی پر عجیب خوف و ہراس طاری تھا، ہر وقت یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ نہ معلوم کس وقت شہر میں آ دھمکیں اور لوٹنا شروع کر دیں۔ صفدر جنگ الگ کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا اس لئے جاوید خاں نے خود ملہار راؤ ہلکر سے گفتگو شروع کی۔ مرہٹوں نے بھی اس موقع کو غنیمت جانا۔ وہ اس پر راضی ہو گئے کہ مرہٹوں کو چند لاکھ روپیہ نقد دیا جائے اور وہ ۴ مئی کو چلے جائیں اس طرح پورے نو دن کے بعد دلی میں امن و امان قائم ہوا اور بھاگے ہوئے خاندان پھر دارالسلطنت میں آ گئے۔

جاوید خاں نے یہ تمام انتظامات بغیر صفدر جنگ سے پوچھے گچھے گئے تھے۔ اس لئے دونوں میں تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی دونوں میں اچھی خاصی کش مکش تھی۔ ۱۷۴۸ء میں جاوید خاں نے ناصر جنگ کو دعوت دی تھی کہ وہ آکر صفدر جنگ کو نکال باہر کرے۔ ۱۷۵۰ء میں وہ اس کے درپے تھا کہ وزیر الممالک سے استعفیٰ لیا جائے اس لئے کہ وہ احمد خاں بنگش سے ہار چکا تھا۔ یہ حکم کئی لاکھ کی رشوت کے وعدہ کے بعد منسوخ ہوا تھا۔

۲ر جولائی ۱۷۵۲ء کو ایک عجیب لطیفہ پیش آیا۔ جاوید خاں انگوری باغ میں مقیم تھا اور اس کا متوقع تھا کہ صفدر جنگ جو جمنا سے دہلی جا رہا تھا، اس کے حضور میں آداب بجا لائے گا۔ لیکن صفدر جنگ سیدھا گذرتا چلا گیا۔ یہ بات جاوید خاں کو بہت کھلی اور اس نے بڑائی جتلانے کے لئے صفدر جنگ کے دشمن بالو جاٹ کو بلا کر دربار کیا اور اس کو خلعت اور انعام سے سرفراز کیا۔ بالو اب اور شیر ہو گیا اور اس نے سکندر آباد میں جو دہلی سے صرف ۲۲ میل ہے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ سوداگروں کو الٹا لٹکوا دیا اور ان سے کوڑے مار مار کر روپیہ وصول کیا۔ سکندر آباد بادشاہ کے صرفِ خاص میں تھا۔ اس کی اطلاع بادشاہ کے کانوں تک پہنچی۔ اس کو اتنی ناگواری ہوئی کہ اس نے صفدر جنگ کو لکھا کہ جب تک جاوید خاں کا کانٹا راستہ سے دور نہیں ہوگا امن قائم نہیں ہو سکتا ہے (سرکار)

جاوید خاں کا قتل

صفدر جنگ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ۲۷ر اگست ۱۷۵۲ء کو جاوید خاں کو قتل کرا دیا، اُس کا سر وزیر کے محل پر لٹکا دیا گیا اور دھڑ جمنا کی ریتی پر پھینک دیا گیا۔

جاوید خاں کا قتل سیاسی اعتبار سے غلط تھا، اس سے صفدر جنگ کو فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ اس کے تعلقات بادشاہ اور ملکۂ الزمانی سے اور بگڑ گئے۔

اب تک عنانِ اختیار ایک کمزور، کم نسب اور بزدل خواجہ سرا کے ساتھ میں تھی جس کو سب بُرا جانتے تھے لیکن جس کو عہدہ اور جاگیر کی ہوس نہیں تھی۔ اس کے مرنے کے بعد تمام اختیارات انتظام الدولہ اور عماد الملک کے ہاتھ میں آگئے جو بڑے خاندان سے تو تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے جاہ و مال کی ہوس کی انتہا نہیں تھی۔ (سرکار)

انتظام الدولہ خانِ دوراں، محمد شاہ کے وزیر قمرالدین خاں کا بیٹا تھا۔ اور اپنی کاہلی اور بزدلی میں مشہور تھا۔ وہ مارچ ۱۷۵۳ء سے مئی ۱۷۵۴ء تک وزیر رہا۔ لیکن اس پندرہ مہینے میں اس نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے سلطنت کی گرتی ہوئی حالت سنبھلتی۔ اس کی ماں شولاپوری بیگم کو صاحب الزمانی کے مزاج میں بڑا دخل تھا اس نے اُن تمام سازشوں میں حصہ لیا جو قلعہ میں صفدر جنگ کے خلاف کی گئیں۔

عماد الملک، غازی الدین خاں فیروز جنگ (ابن نظام آصف جاہ) کا بیٹا تھا۔ اُس کا اصلی نام شہاب الدین تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کو عماد الملک، غازی الدین خاں بہادر فیروز جنگ، میر بخشی، امیر الامرا اور نظام الملک آصف جاہ کے خطابات اور مراتب حاصل ہو گئے۔ اور بالآخر جون ۱۷۵۴ء میں وہ وزیر الممالک بھی ہو گیا۔ شہاب الدین عماد الملک بڑا بہادر اور بلند ہمت شخص تھا۔ اُسے فن شعر اور انشا سے بھی خاص تعلق تھا لیکن جاہ و مال کی ہوس اور طبیعت کی بے رحمی اور سفاکی نے اس کے علمی محاسن کو چھپا دیا ہے۔ اور تاریخ میں صرف اس کے جور و ظلم کی داستان باقی رہ گئی ہے۔

میر نے لکھا ہے:

ذوالفقار جنگ میر بخشی، نواب بہادر کی خصومت کی وجہ سے معزول

ہو گئے (۷ جون ۱۷۵۱ء) اور امیر الامرائی کی خدمت آصف جاہ کے بیٹے غازی الدین خاں فیروز جنگ کو دی گئی وہ صوبہ دکن کے انتظام کے لئے جا رہے تھے کہ رستے میں ہیضہ سے انتقال کر گئے (۱۷۵۲ء) اُن کے بعد بخشی گیری کا خلعت ان کے بیٹے عماد الملک کو عنایت ہوا۔ (۱۲ دسمبر ۱۷۵۲ء) میں اس زمانہ میں عزیزوں کی ملاقات ترک کر کے (خان آرزو سے تعلقات خراب ہو چکے تھے) مطوّل کے پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔[1]

میر نواب بہادر کے ملازم تھے ان کے مرنے کے بعد بیکار ہو گئے۔ انھوں نے ذکر میر میں لکھا ہے:

ہو سے کہ صفدر جنگ نواب بہادر را بہ دغا کشت روزگار عالمے برہم خورد من نیز بیکار شدم۔[2]

مہانرائن دیوان کا سلوک

اس وقت صفدر جنگ صاحب اختیار تھا اور اس کا سب سے بڑا مخالف جاوید خاں قتل ہو چکا تھا۔ اب وزیر الممالک ہی کی سرکار سب سے بڑی سرکار تھی۔ خوش قسمتی سے میر بھی اسی سرکار کے دیوان کے متوسل ہو گئے۔ اُن میں ایک خاص قسم کی دنیاوی ہوشمندی اور فراست تھی۔ چنانچہ صمصام الدولہ رعایت خاں، جاوید خاں، غرض کسی مربی اور محسن کے انتخاب میں ان سے غلطی نہیں ہوئی۔

میر نے لکھا ہے کہ:

وزیر کے دیوان مہانرائن نے اپنے دیوان خانے کے داروغہ میر نجم الدین علی سلام۔[3]

---

[1] ذکر میر ص ۷۲۔

[2] ذکر میر ص ۷۲۔

[3] نکات الشعرا ص ۱۴۱۔

رخلف میر شرف الدین علی پیام[۵۱] کے ہاتھ کچھ بھیجا اور بہت اشتیاق سے مجھے بلایا
میں اس وقت ان کی سرکار کا متوسل ہو گیا اور چند مہینے فراغت سے گزر گئے۔[۵۲]

دست در دامن پہلو دار او زدم و چند ماہ بفراغت گزرانیدم۔

میر کے تعلقات میر نجم الدین سلام سے بڑی خصوصیت کے تھے۔ یہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے اور میر کو ان سے دلی اخلاص تھا۔ یہ باہم بیٹھتے، شعر کہتے۔ اور دل لگی کی باتیں کرتے۔ میر کی یہ تصویر ان خیالی تصویروں سے بالکل مختلف ہے جن میں اکثر یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ کسی سے بات کرنا اور ہنسنا بولنا گناہ سمجھتے تھے۔ سلام سے ان کے تعلقات کافی بے تکلفانہ تھے۔ نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ:- یہ آدمیت، حرمت، عظمت سب ہی اوصاف کے جامع ہیں اور مجھ میں اور ان میں بڑا اتحاد ہے۔

صفدر جنگ اب حقیقی معنوں میں وزیر اعظم تھا۔ اس وقت نہ کوئی فوری اندرونی خطرہ درپیش تھا اور نہ بیرونی۔ چنانچہ جاوید خاں کے قتل کے سات مہینے تک بالکل امن چین رہا۔ اگر صفدر جنگ دور اندیش ہوتا تو وہ اس فرصت کو غنیمت جانتا اور ملک فوج اور خزانہ کی حالت کو درست کرتا لیکن وہ اپنی حرص و ہوس میں مصروف رہا اور کوئی توجہ ملکی معاملات کی طرف نہیں کی بلکہ اس نے اپنے غرور اور تمکنت سے بادشاہ امراء اور عوام سب کو خفا کر دیا۔

---

۵۱ نکات الشعرا ص ۲۷، پیام کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے — کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا — ٹوپی والوں نیں قتلِ عام کیا

۵۲ ذکر میر ص ۲۷

صفدر جنگ کا بس نہیں چلتا تھا کہ جو کچھ ہے وہ اپنے ہی پیٹ میں بھر لے۔ جاگیروں اور خالصہ زمینوں کی ساری آمدنی وہ اپنے ہی اوپر خرچ کر رہا تھا۔ سرکاری عہدہ داروں، قلعہ کے چوبداروں اور توپ خانے کے سپاہیوں کو مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ روز چوری اور ڈاکہ کی خبریں آتی تھیں، فوجیوں کے بلوے معمول میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ سڑکوں پر شور مچاتے، افسروں کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور محل کے دروازوں کو بند کر دیتے، اس طرح کئی کئی دن تک اہل قلعہ کا پانی اور کھانا بند رہتا۔ مرہٹوں کی مصیبت مزید براں تھی، وہ دہلی کے گرد و نواح میں منڈلاتے رہتے اور موقع پا کر خوب لوٹ مار کرتے۔ یہی حال جاٹوں کا تھا، اُن کی جاٹ گردی آج تک مشہور ہے۔

بادشاہ کی فوج کمزور اور فاقہ زدہ تھی۔ لیکن خود صفدر جنگ کے پاس کافی بڑی فوج تھی۔ ان میں زیادہ تر وسط ایشیا کے ترک سپاہی تھے جو کلاہ پوش یا مغلیہ کہلاتے تھے۔ جب ۲۹ اکتوبر ۱۷۵۲ء کو غازی الدین خاں فیروز جنگ ثانی کے انتقال کی خبر دہلی پہنچی تو صفدر جنگ نے کوشش کر کے فوج کے میر بخشی کا عہدہ شہاب الدین عماد الملک کو دلوا دیا۔ (۱۲ دسمبر ۱۷۵۲ء) اسوقت اس کی عمر پندرہ برس کی تھی اور اسے فوج کا مطلق تجربہ نہیں تھا۔

یہ انتخاب ہر طرح غلط تھا۔ اس وقت سلطنت کی ناؤ ڈگمگا رہی تھی اور افغانوں اور مرہٹوں کا ہر وقت دھڑکا لگا ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ اس عہدہ کو کوئی تجربہ کار اور لائق آدمی سنبھالتا لیکن صفدر جنگ نے اس خیال سے کہ اس طرح تورانی پارٹی کا ایک آدمی ٹوٹ جائے گا۔ اور وہ ہمیشہ اس کا زیر بار احسان رہے گا عماد الملک ہی کا انتخاب کیا لیکن یہ حقیقتاً بڑی غلطی تھی۔ عماد الملک آستین کا سانپ نکلا اور اس سے نہ بادشاہ کو فائدہ پہنچا اور

نہ وزیر کو۔

صفدر جنگ کی ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس نے کبھی دوسروں کے حقوق اور جذبات کا خیال نہیں کیا بادشاہ کی مالی حالت دن بدن سقیم ہوتی جاتی تھی لیکن اسے اس کی مطلق پروا نہیں تھی۔ خود اس کے اخراجات دن دونے رات چوگنے بڑھ رہے تھے۔ اپنے بیٹے شجاع الدولہ کی شادی پر اس نے ۴۶ لاکھ روپے صرف کئے حالانکہ ایک صدی قبل خود شہنشاہ جم مرتبت کے چہیتے بیٹے کی شادی پر صرف ۳۰ لاکھ خرچ ہوئے تھے!

جاوید خاں کے قتل[1] نے بھی فضا کو خراب کر دیا تھا۔ بادشاہ کو اس وحشیانہ فعل پر بہت افسوس ہوا اور صاحب الزمانی نے تو جواہرات اور زیورات سب اتار پھینکے اور بیواؤں کی طرح سفید کپڑے پہن لئے۔ صفدر جنگ کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ کہیں صاحب الزمانی، جاوید خاں کا بدلہ لینے کے لئے میرے خلاف سازش نہ کرے اس لئے اُس نے حرم سرا پر سخت نگرانی رکھی اور وہاں اپنے آدمی تعینات کر دئے۔ حرم سرا کے اندر بھی اُس نے آٹھ ایسی عورتیں مقرر کیں جو ایک ایک بات کی نگرانی رکھتی تھیں اور ایک ایک خط کو پڑھتی تھیں۔ صاحب الزمانی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور اُس نے فوراً ان جاسوسوں کو نکال باہر کیا صفدر جنگ نے خفا ہو کر دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا ناچار شہنشاہِ عالم و عالمیان کو بہ نفسِ نفیس روٹھے ہوئے وزیر کے گھر اُس کے منانے کے لئے آنا پڑا۔ صاحب صاحب الزمانی بھی ساتھ تھیں۔ بادشاہ نے تمام اختیارات وزیر کو دینے کا وعدہ

---

[1] سیر المتاخرین ۳ ص ۸۹۰ - دہلی کرانیکل ص ۷۳، "تاریخ محمدی (قلمی)": در ماہ شعبان سنہ ۱۱۶۵ھ بہ اشارہ نواب وزیر ابو المنصور خاں بہادر بہ قتل رسید" ص ۲۰۳۲ -

کیا اور اس کا عہد کیا کہ آئندہ کوئی بھی تقرر بغیر اُس کی مرضی کے نہیں ہوگا اب کیا تھا، صفدر جنگ کو اور شہ مل گئی۔ اس نے قلعے کے اندر جانے پر بہت سی پابندیاں لگا دیں اس کی امرائے سلطنت کو بجا طور پر ناگواری ہوئی اور انھوں نے دربار کا آنا جانا کم کر دیا۔ ۱۴ر ستمبر ۱۷۵۳ء کو نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بادشاہ جمعہ کی نماز کو گئے تو ایک متنفس بھی اُن کے ساتھ نہ تھا۔ ۱۶ر اور ۱۷ر ستمبر دربار کی تاریخیں تھیں لیکن سوائے صفدر جنگ کے چند حواریوں کے اور کوئی بھی حاضر نہیں ہوا۔[1] اس وقت بادشاہ کی حیثیت بالکل ایک قیدی کی سی تھی۔ پیسہ پاس نہیں تھا۔ شاہی ملازمین کو دو سال سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں۔ جب ان کا تقاضہ بہت بڑھا تو خزانہ شاہی صرف چار مہینہ کی تنخواہ ادا کر سکا۔ یہ سب صفدر جنگ کی کرتوت تھی وہ روپیہ وصول کرتا اور خزانہ شاہی میں ایک حبہ بھی داخل نہ کرتا۔

۲۲ر اکتوبر ۱۷۵۲ء کو مرہٹے تال کٹورہ کے قریب آکر خیمہ زن ہو گئے اور لوٹ مار کرنے لگے۔ دہلی کی حکومت میں اتنی سکت کہاں تھی کہ مقابلہ کرتی۔ نومبر ۱۷۵۲ء میں ابدالی[2] کے کوچ کی خبر آئی اور لاہور سے دہلی تک سنسنی پھیل گئی۔ ۵ر فروری ۱۷۵۳ء کو یہ خطرہ بہت قریب آگیا اور افغان سفیر نے دہلی آکر یہ دھمکی دی کہ پچاس لاکھ روپے خراج کے داخل کرو ورنہ ابدالی کی فوجیں دہلی کو روند ڈالیں گی۔

بادشاہ غریب کے پاس نہ روپیہ تھا نہ فوج، صفدر جنگ کے پاس دونوں چیزیں تھیں لیکن اُسے صرف اپنی ذات سے دلچسپی تھی، نہ ملک سے تھی اور نہ بادشاہ سے۔

---

[1] تاریخ احمد شاہی [2] یہ ابدالی کا چوتھا حملہ تھا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اسلامک کلچر حیدرآباد دکن ج ۱۱ نمبر ۴ ص ۴۹۹۔

صفدر جنگ کی بغاوت

صاحب الزمانی نے یہ سوچ کر کہ اِن تلوں سے تیل نہیں نکلے گا، صفدر جنگ کے خلاف سازش کی (مارچ ۱۷۵۳ء) اور ابوتراب خاں قلعہ دار کو جو وزیر کی طرف سے متعین تھا، بھگا دیا۔ صفدر جنگ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور وہ بغاوت کے لئے آمادہ ہو گیا۔ یہ خانہ جنگی ۲۶ مئی ۱۷۵۳ء کو شروع ہوئی اور ۷ نومبر ۱۷۵۳ء تک جاری رہی۔

بادشاہ نے شجاع الدولہ کو برطرف کر کے میر آتش کا عہدہ صمصام الدولہ کو دے دیا یہ اسی صمصام الدولہ کا بیٹا ہے جو نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارا گیا تھا۔

بادشاہ نے ابوتراب خاں کو بھی برخاست کر دیا اور قلعہ دار کا عہدہ احمد آنگا کے سپرد کیا۔ صفدر جنگ کھلم کھلا لڑائی سے جھجک رہا تھا اس لئے اس نے سورج مل جاٹ کو اکسایا کہ دلّی پر حملہ کر دے۔ جاٹوں نے شہر پناہ تک خوب لوٹ مار کی اور لاکھوں روپیہ سمیٹ لیا، محلّے کے محلّے تباہ و ویران ہو گئے اور گھر کے گھر بے چراغ۔ تاریخ احمدی میں لکھا ہے کہ مرد عورت، بچہ کوئی بھی ان کے ظلم سے نہ بچ سکا۔ پرانی دلّی کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی جان کے ڈر سے ایک محلّے سے دوسرے محلّے اور ایک گھر سے دوسرے گھر بھاگے بھاگے پھرتے تھے، کوئی بازار کوئی گلی کوئی مکان ایسا نہیں تھا جو پناہ گزینوں سے پٹا ہوا نہ ہو[1]۔ بادشاہ نے مجبور ہو کر صفدر جنگ کو برطرف کر دیا اور اس کی جگہ

---

[1] ہرچرن داس مصنف گلزار شجاعی (قلمی نسخہ) نے جاٹوں کے حملہ کے وقت اہل دہلی کی جو حالت تھی اسے اُس ٹوٹے ہوئے جہاز سے تشبیہ دی ہے جو ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔

اعتماد الدولہ کو قمر الدین خاں بہادر اور اعتماد الدولہ کے خطابات دے کر وزارت کے عہدے پر مقرر کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے عماد الملک میر بخشی کو نظام الملک اور آصف جاہ کے خطابات عنایت کئے۔ صفدر جنگ نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ بادشاہ کے اختیار اور اقتدار کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی جگہ ایک نوجوان خواجہ سرا کو جس کو شجاع الدولہ نے ابھی حال میں خریدا تھا۔ اکبر عادل شاہ کا خطاب دے کر تخت نشین کیا اور خود کو اس کا وزیر اور سادات خاں ذو الفقار جنگ کو اس کا میر بخشی مقرر کیا۔ عماد الملک نے بڑی ہوشیاری سے صفدر جنگ کے ترک سپاہیوں کو توڑ لیا اور اس طرح ۲۳ ہزار کی جمعیت اکٹھا کر لی۔ اس نے تمام ایسے ایرانی لوگوں کے مکانات لوٹنے کا حکم دیدیا جو صفدر جنگ کے ساتھی تھے۔ اس حکم کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہزاروں گھر لٹ گئے اور ۲۹ ستمبر کو کھل کر لڑائی ہوئی۔ بادشاہ اور عماد الملک کی امداد کے لئے نجیب خاں روہیلہ بھی آگیا تھا اس لئے بادشاہ کا پلہ بھاری رہا، لیکن بادشاہ کی بزدلی اور عماد الملک اور وزیر انتظام الدولہ کی باہمی رقابت نے کوئی فیصلہ نہ ہونے دیا۔ دوسرے باوجود اس لوٹ کھسوٹ کے بادشاہ کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ اس وقت اس کے پاس ۸۰ ہزار سپاہی تھے، جن کو دینے کے لئے اس کے پاس تنخواہ نہیں تھی۔ اس نے اپنے جواہرات بیچے، محل کا ساز و سامان فروخت کیا، ماں کا اندوختہ صرف کیا۔ لیکن پھر بھی پورا نہ پڑا۔[لہ] تقریباً روزانہ بھوکے سپاہی دلّی کے کوچوں میں لوٹ مار کرتے تھے۔ اور جو مالدار ملتا اس کو زندہ نہ چھوڑتے تھے۔

اس وقت دونوں فریق لڑائی سے تنگ آگئے تھے اس لئے مادھو سنگھ

لہ اس وقت ہندوستانی سوار کو ۳۵ روپے، مغلیہ کو پچاس روپے اور معمولی پیادہ کو دس روپے ماہوار ملتے تھے: اودھ کے پہلے دو نواب از سری واستوا ص ۲۶۶۔

والیِ جے پور کے بیچ میں پڑنے سے صلح ہو گئی۔ صفدر جنگ اودھ چلا گیا اور اس کے جانے سے یہ افراتفری ختم ہو گئی۔

میرؔ نے ان حالات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

ابھی (جاوید خاں) خواجہ سرائے مظلوم کا قتل فراموش نہ ہوا تھا کہ دوسرا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا یعنی صفدر جنگ کے دماغ میں خلل پیدا ہوا اور وہ بادشاہ سے سرکش ہو گیا۔ ہر چند صلح کی کوشش کی گئی لیکن اس کا پرغرور سر کسی طرح نہ جھکا آخر لڑائی کی نوبت پہنچی (۱۷۵۳ء) ...... چھ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پرانا شہر (دہلی) بالکل غارت ہو گیا ...... بادشاہ کے آدمیوں نے ایسا استقلال دکھایا کہ سرکش وزیر کے پاؤں اکھڑ گئے اور اسے صلح کرتے ہی بنی۔ بادشاہ نے بھی اس صلح کو غنیمت جانا اور صفدر جنگ کو اس کے صوبہ اودھ کی دستوری بخشدی اور اس کی جگہ انتظام الدولہ کو وزیر مقرر کیا۔" (مارچ ۱۷۵۳ء)[۱]

صفدر جنگ کے جانے کے بعد احمد شاہ بادشاہ نے چھ مہینہ حکومت کی۔ یہ زمانہ بہت بد نظمی اور بے چینی کا تھا۔ عماد الملک اور انتظام الدولہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ بادشاہ ان میں سے کبھی ایک کو خوش کرتا، کبھی دوسرے کو، اور دونوں مل کر بادشاہ کو اپنے جور و ستم کا ہدف بناتے۔ صفدر جنگ سے لڑائی میں کافی روپیہ خرچ ہوا تھا، شاہی فوج میں ۸۰ ہزار آدمی تھے جن کا خرچ کم سے کم ۲۴ لاکھ روپیہ ماہوار تھا۔ لڑائی کا یہ سلسلہ، مہینہ تک لمبا۔

---

[۱] یہ تاریخ ہمارے لئے بہت اہم ہے میرؔ اسی زمانہ میں خان آرزو کی ہمسائگی چھوڑ کر امیر خان کی حویلی میں چلے گئے تھے تفصیل آگے آئے گی۔ یہ میرؔ کی عبارت کا لفظی ترجمہ نہیں ہے غیر ضروری جملے نکالدیئے ہیں: ذکر میر ص ۷۲، ۷۳۔

اس طرح ایک کروڑ ۶۸ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ اس روپے کی ادائیگی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ پرانے سپاہیوں کو دو برس سے تنخواہ نہیں ملی تھی اور بادشاہ کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے جسم کے جواہرات بیچ کر بھی دو لاکھ روپیہ نہیں جمع کر سکتا تھا۔ دلّی کے مہاجنوں نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس طرح احمد شاہ کے چھ مہینے بڑی مصیبت سے گذرے۔ روزانہ فاقہ کش سپاہی تنخواہ کا تقاضا کرتے تھے اور قلعہ کے قریب آکر شور مچاتے تھے۔ خود محل کے عہدہ داروں اور ملازموں کو ۲ ۳ مہینے سے ایک پیسہ بھی تنخواہ کا نہیں ملا تھا[له]۔ صفدر جنگ سے جو لڑائی ہوئی تھی اس میں روہیلوں اور مرہٹوں نے بادشاہ کی امداد کی تھی اور یہ دونوں اپنی امداد کا صلہ مانگ رہے تھے۔ اُسے ۲۵ لاکھ روپے روہیلوں کو دینا تھے۔ لیکن وہ ۱۶ ستمبر ۱۷۵۳ء کو بدقّت تمام ۴ لاکھ روپیہ دے سکا۔

بادشاہ نے صفدر جنگ کی بغاوت فرو کرنے کے لئے پیشوا سے بھی امداد مانگی تھی اور اس نے بروقت ۴ ہزار سپاہی بھیج دئے تھے۔ بعد میں ۶ ہزار کا اور اضافہ ہو گیا۔ اس وقت صفدر جنگ دہلی سے جا چکا تھا۔ انتظام الدولہ اور عماد الملک میں کھلی ہوئی رقابت شروع ہو چکی تھی۔ اور یہ دونوں اس فکر میں تھے کہ مرہٹوں کی امداد ہمیں حاصل ہو جائے۔ چناں چہ ۲۵ نومبر ۱۷۵۳ء کو وزیر انتظام الدولہ نے راجہ جگل کشور کو مرہٹوں کے پاس بھیجا اور اُن سے امداد کا طالب ہوا۔ لیکن مرہٹوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم تو میر بخشی

له یہ صورت بعد تک اسی طرح رہی ۲۱ فروری ۱۸۴۱ء کے دہلی اردو اخبار میں لکھا ہے "عرض ہوئی کہ تنخواہ دار اور روزینہ دار، باعث مسدودی تنخواہ کے بہت واویلا کرتے ہیں۔ صرف علاقہ خالی میں تین مہینے میں سے ایک مہینے کی تنخواہ تقسیم ہوئی ہے بعد استماع مرزا شاہ رخ بہادر کو حکم ہوا کہ ستانا غریب غربا کا مناسب نہیں۔"

کے پاس آئے ہیں اور کسی سے ہمارا کچھ واسطہ نہیں۔ بادشاہ بھی انتظام الدولہ سے ملا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی مالی دقتیں عماد الملک کی ہی وجہ سے ہیں۔ اس لئے اس نے انتظام الدولہ کے کہنے سننے سے پھر مرہٹوں کی خوشامد کی اور کھون دوجی کو ۲۲ ہزار اشرفیاں خلعت اور تحائف بھیجے لیکن اس مرہٹہ امیر نے یہ سب چیزیں بڑی حقارت کے ساتھ واپس کر دیں اور کہا "میں تو اپنے باپ کے حکم سے میر بخشی کے پاس آیا ہوں، بادشاہ کا نوکر نہیں ہوں جو اس کا خلعت قبول کروں" عماد الملک اپنی مالی دقتوں کو دور کرنے کے لئے یہ سمجھتا تھا کہ پہلے سورج مل جاٹ سے لڑے جس نے تمام زرخیز علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا لیکن یہ لڑائی بغیر مرہٹوں کی مدد کے نہیں ہو سکتی تھی۔ عماد الملک اور مرہٹوں کے خاندانی تعلقات تھے اس لئے میر بخشی کو ان پر بڑا بھروسہ تھا۔

لیکن انتظام الدولہ اور بادشاہ نے بھی کوئی کسر مرہٹوں کی خوشامد میں نہیں اٹھا رکھی۔ انھوں نے کھودوجی کے پاس آدمی پہ آدمی بھیجے اور آخر کار مجبور ہو کر عماد الملک نے لکھا کہ کم سے کم ایک مرتبہ مرہٹہ سردار کی ملاقات بادشاہ سے ضرور ہونی چاہیئے۔ آخر ۲۶ر دسمبر ۱۷۵۴ء ملاقات کی تاریخ مقرر ہوئی۔ خواجہ سرا نے اس کو اندر داخل کرنے سے پہلے پوچھا کہ آپ نذر بھی لائے ہیں؟ کھون دوجی نے کہا میں تو جمنا میں نہانے کے لئے آیا تھا۔ عاقبت محمود مجھے دھوکے سے یہاں لے آیا اس لئے میرے پاس نذر وغیرہ کچھ نہیں ہے خواجہ سرا نے اپنے پاس سے ۱۲۱ اشرفیاں نکالیں ان کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا اور زور سے کہا "کھون دوجی سوا اشرفیاں ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا بطور نذر پیش کرتے ہیں۔" خدام نے خلعت پہنانا چاہا لیکن کھون دوجی نے انکار کر دیا۔ بڑی خوشامد کے بعد اس نے خلعت پہنا مگر بادشاہ کے

حضور میں بجائے چار سلام کے دو سلام کئے۔ اسی طرح جب اس کو تلوار پیش کی گئی تو اس نے اس پر اصرار کیا کہ بادشاہ خود اُس کے باندھے۔ بڑی خوشامد کے بعد یہ بھی اس نے میر آتش کے ہاتھ سے قبول کی۔ چلتے وقت پھر اس نے دو سلام کئے۔ بالآخر بادشاہ نے رخصت ہوتے وقت کہا "میں نے تمھیں صفدر جنگ کے خلاف لڑنے کو بلایا تھا، وہ ضرورت ختم ہوئی اب ہماری اجازت ہے تم گھر جا سکتے ہو، جب ضرورت ہوگی پھر طلب کیا جائے گا۔" کھونڈوجی نے کہا "اب تو میں آپ کے قدموں میں آگیا ہوں اور یہیں رہنا چاہتا ہوں۔" بادشاہ نے بار بار جانے کی اجازت دی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کھونڈوجی ہر وقت شراب میں مخمور رہتا تھا، پھر اس کو اپنی فوج اور قوت کا بھی نشہ تھا اس لئے وہ بادشاہ سے نرمی سے بات نہ کر سکا۔ کچھ دیر کے بعد اسے وزیر کے مکان پر پہنچا دیا گیا جہاں رات گئے تک اس کی خاطر مدارات ہوتی رہی۔

سورج مل

سورج مل جاٹ نے راجہ جے پور سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے اور صفدر جنگ کی بغاوت کے زمانہ میں اپنی طاقت کو کافی بڑھا لیا تھا۔ مرہٹوں نے سورج مل جاٹ سے دو کروڑ روپے کا مطالبہ کیا۔ جاٹوں نے ۴۰ لاکھ پر سودا کرنا چاہا لیکن نہ ہو سکا اس لئے ملہار راؤ ہلکر نے ۱۶ جنوری ۱۷۵۴ء کو ڈیگ، بھرت پور اور کھمبیر پر حملہ کر دیا۔ سورج مل یہ دیکھ کر کہ مرہٹوں کی فوج بہت زیادہ ہے۔ کھمبیر میں قلعہ بند ہو گیا۔ مرہٹوں کے پاس محاصرہ کی توپیں نہیں تھیں۔ اس لئے انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ملہار راؤ ہلکر نے عماد الملک کے ذریعہ بادشاہ سے محاصرہ کی توپیں مانگیں لیکن وہ برابر ٹالتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عماد الملک ملہار راؤ ہلکر اور عاقبت محمود ان سب نے مل کر قلعہ لینے کی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہے۔ اس محاصرے میں کھانڈے راؤ ہلکر

مارا گیا (۵ ارمارچ ۱۷۵۴ء) اور اس کی نو بیویوں نے آگ میں جل کر جان دیدی۔

ملہار راؤ ہولکر اپنے بیٹے کے غم میں از خود رفتہ ہو گیا اور اس نے جاٹوں سے انتقام لینے کی ٹھان لی۔ اس کے غم میں اس کے دوست دشمن سب ہی شریک ہوئے سورج مل نے ماتمی لباس پہنا۔ بادشاہ نے راؤ اور اس کی بیوی کے لئے ماتمی کپڑے اور زیورات بھیجے لیکن اس کا غم کم نہ ہوا۔ ادھر لڑائی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ کھمبیر کی دیواریں تھیں تو مٹی کی لیکن ٹس سے مس نہ ہوئیں اور چار مہینہ تک محاصرہ جاری رہا۔ بالآخر صلح ہو گئی اور یہ طے پایا کہ جاٹ مرہٹوں کو تیس لاکھ روپیہ تین قسطوں میں ادا کریں گے اور وہ دو کروڑ روپیہ جو عماد الملک اور مرہٹوں نے بادشاہ کی طرف سے مانگا تھا وہ بوقت سہولت میر بخشی اور ہولکر کو پیش کیا جائے گا۔

اس وقت عماد الملک سب سے زیادہ طاقتور امیر تھا، وہی صفدر جنگ کی شکست کا باعث تھا۔ اسی نے جاٹوں کے زور کو کم کیا تھا اور ہولکر اسی کا مددگار و معاون تھا۔ لیکن اس کی بھی مصیبت یہ تھی کہ پیسہ پاس نہیں تھا جو کچھ بزرگوں کی جمع کی ہوئی پونجی تھی وہ سب صفدر جنگ سے لڑائی میں ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت خزانہ شاہی خالی تھا اور صوبوں کی آمدنی مفقود تھی۔ عماد نے مجبور ہو کر خالصہ زمینوں سے روپیہ وصول کرنا شروع کر دیا اور فروری ۱۷۵۴ء میں کول اور سکندر آباد پر قبضہ کر لیا اور عاقبت محمود کشمیری کو روا ڑی بھیجا کہ وہ وہاں تحصیل وصول کرے بادشاہ کو اس بات کی بڑی ناگواری ہوئی اس لئے کہ اس کا سہارا بس یہی زمینیں تھیں[۵] اس آمدنی کے بند ہو جانے سے محل کے رہنے

---

[۵] زوال سلطنت مغلیہ: سرکار ج ۲۔ نیز ملاحظہ ہو تاریخ عالمگیر ثانی قلمی ۲۸، ۲۹۔

والوں کو فاقے پر فاقے ہونے لگے۔ سپاہی الگ تنخواہ کا شور مچا رہے تھے۔ بادشاہ سخت پریشان تھا۔ اس نے بار بار بخشی کو لکھا کہ وہ سپاہیوں کی تنخواہیں نمٹا دے لیکن وہ برابر ٹال مٹول کرتا رہا۔

کھمبیر کے محاصرہ میں یہ تعلقات اور بگڑ گئے۔ عماد نے لگاتار بادشاہ کو لکھا کہ وہ محاصرہ کی توپیں عاریتاً دیدے لیکن وہ وزیر انتظام الدولہ کے کہنے سننے پر درخواست کو ٹالتا رہا۔ آخر عماد الملک نے عاقبت محمود کو مرہٹہ فوج کے ساتھ بھیجا اور اپنی درخواست کو دوبارہ پیش کروایا۔ عاقبت محمود ۱۶ مارچ ۱۷۵۴ء کو دہلی میں داخل ہوا۔ اس وقت دلّی کے سپاہی ۲۶ مہینے کی تنخواہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور ہر طرف بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ محمود نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور صاحبِ حیثیت لوگوں کو خوب دل کھول کر لوٹا۔ بدخشی سپاہیوں نے (جن میں زیادہ تر محمود کے ساتھی تھے) قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور لبنت خاں خواجہ سرا کے ساتھ جھروکے کے نیچے کھڑے ہو کر اپنی تنخواہ مانگی۔ ۸ اور ۹ اپریل کو حالات اور زیادہ نازک ہو گئے۔ فاقہ زدہ باغی سپاہیوں نے ہر گلی کوچہ میں لوٹ مار شروع کر دی اور اہلِ قلعہ کو کھانا تک میسر نہیں آیا۔ "خاص بازار" کھاری باؤلی اور لوہاری دروازہ کے قریب ہزاروں گھر ویران اور بے چراغ ہو گئے۔ اور جابجا لاشوں کے ڈھیر لگ گئے[۱]۔

وزیر انتظام الدولہ فوجی تجربہ تو نہیں رکھتا تھا مگر آدمی جوڑ توڑ کا تھا۔ وہ دراصل چاہتا یہ تھا کہ صفدر جنگ، جاٹوں اور راجپوتوں کی طاقت کو بالکل فنا نہ کیا جائے بلکہ ان کو قائم رکھا جائے تاکہ وہ مرہٹوں کے خلاف بخوبی استعمال کی جا سکیں۔ اسی لئے

---

[۱] تاریخ احمد شاہی ۷۵ مرہٹوں کی ہنگامہ آرائیوں اور زیادتیوں سے ہندوستان کے سبھی لوگ جاں بلب تھے: سرکار ج ۱ ص ۲۰ نیز ملاحظہ ہو شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی علی گڑھ ص ۱

اس نے کمھیر کے محاصرہ میں توپیں نہیں دی تھیں۔ اور اسی لئے اس نے صفدر جنگ کے دو بڑے افسروں یعنی راجہ لکشمی نرائن اور راجہ جگل کشور کو دسمبر ۱۷۵۳ء میں بادشاہ سے معافی نامے دلوا دئے تھے، ۱۷ ارمئی کو ان کی ضبط شدہ جائداد بھی واپس مل گئی تھی۔

یہ پالیسی کامیاب ہوجاتی اگر بادشاہ یا وزیر میں ہمت اور جرأت ہوتی لیکن دونوں بزدل اور عیش پسند تھے۔ اس لئے کچھ بھی نہ ہو سکا۔ عماد الملک کا دست راست عاقبت محمود، بدستور سکندر آباد اور غازی الدین نگر پر چھاپے مارتا رہا اور عذر یہ پیش کرتا رہا کہ ترک سپاہی اس کے قابو سے باہر ہیں وہ اپنی تنخواہیں وصول کرنے کے لئے لوٹ مار کرتے ہیں۔

ناچار احمد شاہ نے خود سکندر آباد جانا چاہا لیکن وہ جائے تو کس طرح؟ توپچیوں نے کہا کہ ہم اُس وقت تک قدم نہیں اٹھائیں گے جب تک پچھلی تنخواہیں بیباق نہ کردی جائیں۔ شاہی ہاتھی چار دن سے بھوکے تھے اور ان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ بوجھ اٹھا سکیں۔ ساز وسامان بھی برائے نام رہ گیا تھا اور جو تھا اس کے اٹھانے کے لئے کوئی قلی اور گاڑی تک میسر نہیں تھی اس لئے کہ کوئی بغیر نقد داموں کے اس خدمت کو انجام دینے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

خدا خدا کر کے یہ شاہی قافلہ ۲۷ ر اپریل کو روانہ ہوا۔ دو ایک دن کے بعد صاحب الزمانی اور دوسری بیگمات بھی پہنچ گئیں۔ اور سکندر آباد بادشاہ کے قبضہ میں آگیا۔

یہاں یہ خبر آئی کہ عماد اور مرہٹوں نے جاٹوں سے صلح کرلی ہے اور اب وہ بادشاہ پر حملہ کرنے ہی والے ہیں۔ بادشاہ بہت گھبرایا اور اس نے ۲۴ ر مئی

کو جمعہ کے دن خدا کے سامنے رو رو کر دعائیں مانگیں کہ یہ بلا کسی طرح ٹل جائے۔

اس عرصہ میں ہولکر کی فوجیں بالکل سکندر آباد کے قریب پہنچ گئیں، بادشاہ نے فوراً کوچ کا نقارہ بجوا دیا اور تخت رواں پر بیٹھ کر دلی بھاگ گیا لیکن اس پریشانی میں بیگمات کو ساتھ نہ لے سکا اور ملکہ زمانی اور صاحب محل وغیرہ کو مرہٹوں نے قید کر لیا۔ خاندانِ تیموریہ پر ایسی مصیبت کبھی نہیں آئی تھی کہ حرم سرا کی بیگمات اس طرح قید و بند کی مشقت اٹھائیں اور ان کا ننگ و ناموس یوں خطرہ میں پڑ جائے، مرہٹوں نے ان کے رتھوں کے پردے پھاڑ ڈالے، ان کے زیورات چھین لئے اور بعض کو بُری طرح بے حرمت کیا۔ کچھ تو بھاگ گئیں اور کچھ پا پیادہ اور سر برہنہ دہلی پہنچیں۔ ہلکر نے ملکہ زمانی کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ لیکن دوسری بیگمات کو اتنی تکلیفیں اٹھانی پڑیں کہ عماد الملک بھی شرموں میں ڈوب ڈوب گیا (سرکار)

اس وقت بادشاہ کی بے بسی قابل رحم تھی۔ اس نے مجبور ہو کر انتظام الدولہ کو برطرف کر دیا اور عماد الملک کو اپنا وزیر مقرر کیا۔

احمد شاہ کی معزولی

۲ جون ۱۷۵۴ء کو عماد الملک تاتیا گنگا دھر، (دیوان ہلکر) عاقبت محمود اور اس کا بھائی سیف الدولہ، بادشاہ کے حضور میں دہلی پہنچے۔ عماد الملک نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھائیں کہ وہ بادشاہ کا وفادار رہے گا اور جہاں اس کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہائے گا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے عالمگیر ثانی کو جو شاہ عالم بہادر شاہ کا بیٹا تھا تخت نشین کر دیا۔ احمد شاہ ڈر کے مارے رنگ محل کے پیڑوں میں چھپ گیا۔ احمد شاہ نے اس پریشانی اور مصیبت میں پانی مانگا۔ سیف الدولہ نے ایک مٹی کا ٹھیکرا پڑا تھا اس میں پانی ڈالکر

اس کے منھ کو لگا دیا، اور اس مظلوم نے وہی پی لیا۔

معزول بادشاہ کا نابینا کیا جانا

اس طرح عماد الملک کے ہاتھ میں سلطنت کی باگ ڈور تو آگئی لیکن اس کی پریشانیاں رفع نہ ہوئیں۔ مرہٹوں کو لاکھوں روپیہ دیا جا چکا تھا لیکن شاہی فوج فاقوں پہ فاقے کر رہی تھی۔ یہ مصیبت زدہ سپاہی روزانہ سوداگروں اور امیروں کے گھر لوٹتے تھے اور کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہیں تھا۔ ۲۱ر جون ۱۷۵۴ء کو توپ خانے کے سپاہیوں کا مطالبہ اتنا شدید ہو گیا کہ انھوں نے غصہ میں آکے عاقبت محمود خاں کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عماد الملک نے اس میں بڑی سبکی محسوس کی اور سارا الزام عاقبت پر رکھا۔ تین دن کے بعد اس نے محمود کو قتل کر کے اس کی لاش کو جمنا کی ریتی پر پھنکوا دیا۔ اسی روز احمد شاہ بادشاہ اور اس کی ماں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کے اندھا کر دیا گیا۔ عماد الملک نے بہانہ یہ ڈھونڈا کہ معزول بادشاہ نے انتظام الدولہ کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ راجپوتوں کی مدد سے اسے پھر تخت شاہی پر بٹھا دے۔ یہ خط بالکل جعلی تھا اور عاقبت محمود اور عماد الملک کے مشورہ سے لکھا گیا تھا۔

میر نے لکھا ہے:۔

صفدر جنگ کی بغاوت کے بعد میں نے زمانے کی ناسا عدت سے خان آرزو کی ہمسائیگی بھی چھوڑ دی۔ اور امیر خاں مرحوم کی حویلی میں رہنے لگا۔ یہ زمانہ میں نے بڑی بھلی طرح جیسے ممکن ہوا بسر کیا۔

تھوڑی ہی سی مدت میں عماد الملک نے یہ قوت بہم پہنچائی کہ سرداران دکن کو اپنے سے ملا لیا۔ اور سورج مل زمیندار نے صفدر جنگ کی

رفاقت کے الزام میں لشکر کشی کی۔ اور کسی حیلہ سو اس کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا ملہار راؤ کا بیٹا بھی اسی جنگ میں مارا گیا۔ سورج مل انتظام الدولہ سے خط وکتابت رکھتا تھا۔ اس وجہ سے انتظام الدولہ اور عماد الملک میں نفاق پیدا ہوگیا۔ بادشاہ نے سکندر آباد کے قریب خیمے لگائے ایک روز شام کو خبر پہنچی کہ عماد الملک اور سردارانِ دکن نے سورج مل جاٹ سے صلح کرلی اور بادشاہ کے لشکر کی غارت گری کے لئے پہنچا ہی چاہتے ہیں۔ احمد شاہ بادشاہ، میر آتش اور چند اور چند نمک حراموں کے مشورے سے ناموس سے قطع نظر کرکے سراسیمہ بھاگے۔ صبح تک دکن کی فوج بھی وہاں پہنچ گئی اور لشکر کو غارت کرکے تعاقب کیا اور دریائے جمنا کے اُس طرف خیمے لگا دئے۔ بادشاہی آدمیوں میں سے کوئی بھی قلعہ میں نہ رہا۔ عماد الملک نے آکر قلمدانِ وزارت پر قبضہ کرلیا۔ بیوقوف وزیر بھاگ گیا اور بادشاہ باغ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد غدار دوستوں نے بادشاہ کو گرفتار کرلیا۔ ان کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی[1] اور بہادر شاہ کے نواسے کو تخت پر بٹھا دیا۔ جس کا لقب "عالمگیر ثانی" ہوا بے تہہ لوگ با اختیار ہو گئے۔ عقل سے جو بے بہرہ تھا وہ امیر الامراء ہو گیا۔ میں اس وحشت اثر سفر میں احمد شاہ کے ساتھ تھا۔ واپس آکر گوشہ نشین ہو گیا۔

خان آرزو کا انتقال

اسی زمانہ میں صفدر جنگ کا انتقال ہو گیا اور اُن کی جگہ شجاع الدولہ اودھ کے صوبیدار

---

[1] یہ واقعہ ۱۷۵۴ء کا ہے میر کا ایک شعر ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی ۔۔۔ انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

ہوئے (۱۷۵۴ء) میرے ماموں "خانِ آرزو" بادیہ پیمائے طبع ہوئے۔ یعنی شجاع الدولہ کے لشکر میں اس توقع کے ساتھ گئے کہ اسحاق خاں شہید کے بھائی وہاں ہیں وہ پہلے حقوق کا خیال کر کے رعایت کریں گے لیکن بجز ناکامی کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ زمانہ کی ٹھوکر کھائی اور وہیں مر گئے۔ ان کی لاش کو دلّی لائے اور اس کو ان کی حویلی میں دفن کر دیا۔

راجہ جگل کشور کی قدردانی

دو مہینے کے بعد راجہ جگل کشور[۱] جو محمد شاہ مرحوم کے زمانے میں وکیل بنگالہ تھے اور بڑے امیرانہ ٹھاٹ سے رہتے تھے وہ مجھے خود اپنے گھر لے گئے اور اپنے اشعار اصلاح کے لئے دیئے میں نے اصلاح کی قابلیت نہ دیکھ کر ان کی اکثر تصنیفات پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔[۲]

عالمگیر ثانی

اس وقت عالمگیر ثانی دلی کا بادشاہ تھا۔ اس کی عمر پچپن برس کی تھی۔ تخت نشینی سے قبل اس کی ساری زندگی ڈیوڑھی سلاطین کی قید میں گذری تھی جہاں آسائش اور فراغت کا ہونا ناممکن تھا۔ اسے تاریخ اور ادب سے بڑی دلچسپی تھی اور اپنا سارا وقت اسی مطالعہ میں صرف کرتا تھا، وہ "اورنگ زیب" کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا۔ اسی کی طرح وہ بھی پانچوں وقت کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتا تھا اور ایک ایک سرکاری کاغذ کو خود پڑھتا تھا۔ ۱۷۵۳ء سے شیعی اثر دن بدن بڑھ رہا تھا عالمگیر ثانی

---

[۱] جگل کشور قوم کا بھاٹ اور پیشے کے لحاظ سے شراب فروش تھا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں بنگال کا وکیل ہوگیا۔ اپنے بیٹے کی شادی اس شان و شکوہ سے کی کہ دلّی میں اس جیسی نہیں ہوئی (مجموعہ نغز ص ۲۸۴)، راجہ جگل کشور کا تخلص ثروت تھا اور وہ میر سے اصلاح لیتا تھا (وقائع عالم شاہی ص ۱۳)

[۲] ذکر میر ص ۷۵

نے اسے کم کرنے کی کوشش کی اور صفدر جنگ کی وفات (۱۱ اکتوبر ۱۷۵۴ء) کے بعد اس نے وہ تعزیہ داری" بھی بند کر دی تھی جو فرخ سیر کے زمانہ سے جاری تھی لیکن اسے انتظامی اور فوجی تجربہ مطلق نہیں تھا نہ اس کے مزاج میں استقلال اور کردار میں مضبوطی تھی اسی لئے وہ عماد الملک کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنکر رہ گیا تھا۔

اس کے علاوہ اس میں کچھ اور تباہ کن کمزوریاں بھی تھیں۔ اس کے حرم کی تعداد دن بدن بڑھ رہی تھی پچپن برس کی عمر میں بھی اس کی شادیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اس نے فروری ۱۷۵۶ء میں محمد شاہ مرحوم کی لڑکی حضرت بیگم سے شادی کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر ساٹھ برس کی اور حضرت بیگم کی سولہ برس کی تھی۔ حضرت بیگم حسن وجمال میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی بادشاہ نے اس سے زبردستی شادی کرنا چاہی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر مجھے زیادہ دق کیا گیا تو میں زہر کھا لوں گی۔ اس پر عالمگیر ثانی نے خفا ہو کر اسے قید تنہائی میں ڈلوا دیا۔ یکم ستمبر ۱۷۵۵ء کو اس نے زینت افروز بیگم سے شادی کی۔ اس وقت قبلہ عالم کی صحت کا یہ عالم تھا کہ انھیں چکر پہ چکر آتے تھے اور سانس اندر کو نہیں بیٹھتا تھا اُکھڑا ہی جاتا تھا۔

بادشاہ کا وزیر بھی نا اہل تھا، وہ ساڑھے پانچ سال جس میں اس کی حکمرانی رہی دلّی والوں کے لئے قیامت سے کم نہ تھے۔ خود عماد الملک کو بھی وہ ذلتیں اور خواریاں اٹھانی پڑیں جو کسی نے نہ اٹھائی تھیں۔ اُسی پانی پت کی سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ (مئی ۱۷۵۵ء) اور اس کی بیگمات کو روہیلوں نے ذلیل اور بے حرمت کیا۔

عماد الملک وزیر تو ہو گیا تھا لیکن انتظام الدولہ کی طرف سے برابر

خطرہ لگا ہوا تھا، وہ اپنے باپ دادا کے محل میں رہتا تھا اور اکثر ہاتھی پر چڑھ کر دلّی کے بازاروں میں نکلتا تھا۔ ایسا طاقتور امیر بہت آسانی کے ساتھ عماد الملک کا تختہ اُلٹ سکتا تھا۔ انتظام الدولہ کے علاوہ بھی خطرے موجود تھے۔ سورج مل جاٹ شمالی ہندوستان میں بڑا طاقتور تھا اور عماد الملک اس سے اس وجہ سے خفا تھا کہ اس نے ۱۷۵۳ء میں صفدر جنگ کا ساتھ دیا تھا شجاع الدولہ جو اودھ کا صوبہ دار تھا وہ بھی وزیر الممالک کی جگہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ نجیب الدولہ کی طاقت بھی دن بدن بڑھ رہی تھی اور ابدالی کے حملے کے بعد[۱] (اپریل ۱۷۵۷ء) شمالی ہندوستان میں کسی کو اس کے مقابلے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لئے عماد الملک کے سامنے بھی بہت سی دقتیں تھیں اور اسکا یہ عہدہ پھولوں کی سیج نہیں تھا۔ قلعہ کی سازشوں، نجیب الدولہ کی مسلسل مخالفت اور مالی دقتوں نے اس کے کام کو اور زیادہ دشوار کردیا تھا۔

مارچ ۱۷۵۶ء میں عماد الملک نے پنجاب پر حملہ کیا۔ اس وجہ سے ابدالی اس کا دشمن ہوگیا۔ جولائی میں اُس نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا لیکن فاقہ کش سپاہیوں کی بغاوت کی وجہ سے اسے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اکتوبر ۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب لے لیا۔ اور جنوری ۱۷۵۷ء میں اس نے دہلی پر بھی قبضہ کرلیا۔ ابدالی نے عماد الملک کو برطرف کردیا، اور اس کی علی الاعلان توہین و تذلیل کی۔

مرہٹوں کا اقتدار

عماد الملک کو مرہٹوں کے مطالبات بھی پورے کرنے تھے جن کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی

---

[۱] یہ احمد شاہ ابدالی کا پانچواں حملہ تھا، عالمگیر ثانی نے اپنے وزیر عماد الملک کا زور توڑنے کے لئے نجیب الدولہ کی معرفت ابدالی کو بلایا تھا (فرحت الناظرین)

تھی، اس لئے وہ برابر ان کی خوشامد میں لگا رہا، دوسرے اُسے نجیب الدولہ کا ڈر تھا اور اس لئے بھی وہ مرہٹوں سے دوستی رکھنا چاہتا تھا۔ نجیب الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ عماد مرہٹوں سے مل گیا ہے۔ اس کے محل پر حملہ کر دیا اور اس کی بیویوں اور بچوں پر وہ وہ مظالم کئے کہ دشمن بھی تف کرنے لگے۔

ستمبر ۱۷۵۷ء میں مرہٹوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا۔ انھوں نے نجیب الدولہ کو نکال کر احمد خاں بنگش کو میر بخشی مقرر کیا۔ احمد خاں بنگش کی صحت خراب تھی اور اس کا عدم وجود برابر تھا، اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگست ۱۷۵۷ء سے مئی ۱۷۵۸ء تک تمام شمالی ہندوستان پر مرہٹوں کا راج رہا۔ ان پیہم ناکامیوں اور رسوائیوں نے اس کو حواس باختہ کر دیا اور اس نے اسی غصہ میں آ کر ۲۶ نومبر ۱۷۵۹ء کو عالم گیر ثانی کو قتل کر دیا۔ عالم گیر ثانی کے زمانہ میں سلطنت کی مالی مشکلات انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ سب سے بڑا مطالبہ مرہٹوں کا تھا انھوں نے صفدر جنگ کے خلاف بادشاہ کو مدد دی، بالخصوص سورج مل کا زور توڑنے میں ان کی امداد کو بہت دخل تھا۔ سکندر آباد کی لڑائی میں ان کے ہاتھ اور تو کچھ نہیں لگا، حرم سرا کی بیگمات قبضہ میں آ گئی تھیں۔ ملہار راؤ ہولکر نے انکو آزاد کرنے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ تمام اگلے پچھلے مطالبات پورے نہ کر دیے جائیں۔

عماد الملک اور عاقبت محمود نے چالیس لاکھ روپیہ ادا کرنے کا ذمہ لیا تب کہیں جا کر شاہی خاندان کی عزت بچ سکی۔

پیشوا کی ہدایت یہ تھی کہ دہلی کی حکومت سے کم سے کم پچاس لاکھ روپیہ وصول کیا جائے۔ عماد الملک نے ۲ جون ۱۷۵۴ء میں ۲۵ لاکھ روپیہ بطور نذرانے کے دینے کا وعدہ کیا۔ لیکن مرہٹوں کے مطالبات بڑھتے ہی گئے۔

انہوں نے ساڑھے بیاسی لاکھ روپے کا مطالبہ کیا جس میں سے چالیس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا گیا اور بقیہ کی ادائیگی کچھ دنوں کے بعد طے پائی لیکن اس وقت دہلی کی حالت ایسی تھی کہ ایک رقم بھی ادا نہیں ہو سکتی تھی۔

اس وقت عماد الملک کے سامنے دو کام تھے، ایک تو مرہٹوں کو چالیس لاکھ روپیہ دینا تھا اور دوسرے بادشاہ کے سپاہیوں کی تین سال کی تنخواہیں نمٹانا تھیں، شاہی خزانہ میں روپیہ نہیں تھا اور محل میں ایسا قیمتی سامان بھی نہیں تھا جس کو بیچ کر یہ رقم ادا کر دی جاتی۔ اس لئے صاحب الزمانی بیگم اور ان کی اولاد پر سختیاں کی گئیں اور ظلم کر کے روپیہ حاصل کیا گیا۔ ان کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور ان سے متعلق خواتین سے زیورات اور جواہرات چھین لئے گئے ان کو مجبور کیا گیا۔ کہ چھپے ہوئے خزانوں کے بھید بتائیں۔ جب اس سے بھی کام نہ چلا تو ان کو قلعہ سے نکال کر خواص پورے میں ڈلوا دیا جہاں سابق بادشاہوں کی رانڈ بیوائیں پڑی ہوئی تھیں۔ انتظام الدولہ کی تمام جاگیر ضبط کر لی گئی۔ اور اس کا قیمتی سامان جو بھی ہاتھ لگا وہ چھین لیا گیا لیکن اس تمام جبر و تشدد کے باوجود کل تین لاکھ روپے حاصل ہوئے جو راتوں رات مرہٹوں کو دے دئے گئے۔ لیکن یہ تین لاکھ کیا پکار کرتے اس وقت تو ضرورت ایک کروڑ کی تھی، اس لئے عماد الملک نے تمام امرا، عہدہ داروں، تاجروں اور عام آدمیوں سے جبری چندہ وصول کرنا چاہا، اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ بازار بند ہو گئے اور ہزاروں آدمی جھروکے کے پاس فریاد لے کر پہنچے بادشاہ بے دست و پا تھا۔ اس نے عماد الملک سے بہتیرا کہا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ آخر بادشاہ نے کہا کہ جب تک رعیت کی داد رسی نہیں ہو گی میں کھانے پینے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ اس دھمکی پر عماد الملک کچھ پگھلا اور چند دنوں کے لئے

یہ ظلم بند ہو گیا۔ اگست تک عماد الملک نے کسی نہ کسی طرح نو لاکھ روپے جمع کر کے مرہٹوں کو دے دیئے اور قسمیں کھائیں کہ سترہ لاکھ بھی جلد ادا کر دے گا، لیکن اب مرہٹے صبر کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

پیشوا کو روپیہ کی سخت ضرورت تھی اس لئے مرہٹوں کا مطالبہ سخت تر ہوتا گیا۔ وزیر نے مجبور ہو کر پھر رعیت پر ظلم و تشدد شروع کر دیا۔ بادشاہ نے بھی دبی زبان سے اجازت دے دی لیکن یہ شرط لگا دی کہ عوام کو دق نہ کیا جائے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ صنعت کاروں اور تاجروں پر بڑی سختیاں کی گئیں۔ بعضوں سے کئی کئی دفعہ روپیہ وصول کیا گیا پھر بھی ان کو پیٹا گیا۔ اور ذلیل کیا گیا۔

فاقہ کش سپاہیوں کی بغاوت

آخر عماد الملک نے ضلع سہارنپور کے ۲۲ گاؤں مرہٹوں کو دیدیے اور اس طرح رعایا کی جان چھڑائی لیکن اس سے صرف ایک مصیبت سے نجات ملی۔ مرہٹے تو چپ ہو گئے لیکن شاہی سپاہیوں کی تنخواہیں باقی تھیں، اور وہ اب خاموش بیٹھنے والے نہیں تھے، وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ مرہٹوں کو لاکھوں روپیہ دیا جا چکا ہے اور ان کو تین سالوں میں سے دو ہفتہ کی بھی تنخواہ نہیں مل سکی۔ ان کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا اور وہ کھلم کھلا حکومت کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ جو کھاتا پیتا ملتا اس کو لوٹ لیتے۔ توپچیوں نے عاقبت محمود کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور سپاہی عماد کے گھر دھنا دے کر بیٹھ گئے۔ ۱۰ اگست ۱۷۵۴ء کو پندرہ دن کی تنخواہ دینے کا اعلان کیا گیا لیکن وہ بھی ادا نہ کی جا سکی تو سپاہیوں نے راجہ ناگرمل دیوان کے پتھر مارنا شروع کر دئے۔ ۲۳ اکتوبر کو بدخشی سپاہیوں نے پھر وزیر کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اور بخشی کو پالکی سے گھسیٹ کر باہر پھینکدیا۔ ۱۸ نومبر کو مغلیہ سپاہیوں نے مٹھائی کی دکانوں کو لوٹنا شروع کیا۔ ۳ مئی ۱۷۵۵ء

کو وہ عماد الملک کو پانی پت کی سڑکوں پر گھسیٹے گھسیٹے پھرے۔ ایک روز اس کے گھر میں گھس گئے اور جو کھانا پکا ہوا رکھا تھا وہ اٹھا کر لے گئے۔[1]

۲۳ر جولائی ۱۷۵۶ء کو انھوں نے صمصام الدولہ میر بخشی کی لاش پر قبضہ کر لیا اور کہا جب تک ہماری تنخواہیں نہیں ملیں گی ہم تدفین نہیں ہونے دینگے ان باغی سپاہیوں نے قلعہ اور شہر کے دروازوں پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت بادشاہ لونی میں ٹھیرا ہوا تھا۔ اس نے دو بیگمات کو قلعہ سے بلایا۔ یہ بیچاریاں بہشتی عورتوں کا لباس پہن کر اور برقعہ اوڑھ کر قلعہ سے نکلیں اور اس طرح ہزار دقتوں کے ساتھ لونی پہنچیں۔ اگست ۱۷۵۴ء میں بدخشی سپاہیوں نے کشن چند سوت کو پکڑ لیا اور اس پر طرح طرح کے مظالم کیے کہ پانچ لاکھ روپیہ ادا کرے۔ یہ ظلم اس کے ساتھ پندرہ دن تک ہوتا رہا۔ لیکن اسے کسی نے رہائی نہیں دلائی۔ بڑی خوشامدوں سے اس کو رہائی ملی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اسے گھر کو چھوڑ کر مرہٹوں کے یہاں جے سنگھ پورہ میں پناہ لینی پڑی۔ عماد الملک اس کے مکان اور جائداد کو ضبط کر لیتا۔ لیکن مرہٹوں کی نگرانی کی وجہ سے کسی کو اس کی جرأت نہ ہوئی۔

اقتصادی بدحالی اس اقتصادی بدحالی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ خالصہ زمینیں جو بادشاہ کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھیں۔ بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ سہارن پور نجیب خاں روہیلے کے پاس تھا، آگرہ جاٹوں کے پاس اور نارنول مادھو سنگھ والئی جے پور کے پاس تھا اس طرح بادشاہ کے پاس ایک قطعہ بھی خالصہ زمین کا باقی نہیں رہا تھا۔

---

[1] سرکار: ج ۲، نیز اروِن: ہندوستانی مغلوں کی فوج ص ۲۹۶، ۲۹۹ و تذکرہ شاکر خاں قلمی ص ۴۲

اس کا نتیجہ یہ ہوا، بادشاہ کے پاس اپنے اور بیگمات کے کھانے پینے کے خرچ کے لیے بھی کوئی آمدنی نہیں رہتی۔ وزیر بھی ان زمینوں کو اپنے صرف میں لاتا رہتا تھا، کبھی وہ ان کو مرہٹوں کو دیدیتا اور کبھی ترک سپاہیوں کو، بادشاہ کے ذاتی ملازمین بھوکوں مر رہے تھے اور وہ اکثر کام کرنے سے انکار کر دیتے تھے اور طرح طرح سے بادشاہ اور وزیر کو ذلیل کرتے تھے۔

بادشاہ کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ اس کے پاس عیدگاہ جانے کے لیے سواری تک نہ تھی۔ ۱۰ مئی ۱۷۵۵ء کو وہ محل سے پتھر والی مسجد تک پاپیادہ گیا۔ اس نے اپنی سال گرہ کا جو پہلا جشن کیا تو دیوان عام میں وہ پہلی سی رونق نہیں تھی۔ اب وہاں تخت طاؤس کے بجائے ایک لکڑی کا تخت رکھا تھا۔ جس پر مختلف رنگوں سے پھول پتی بنادی گئی تھی۔ خزانے بالکل خالی تھے۔ احمد شاہ کے زمانے سے ملازموں کی تین سال کی تنخواہ باقی تھی اور عالم گیر ثانی کے زمانے میں تو کسی کو ایک حبہ بھی نہیں ملا تھا سپاہیوں نے اپنے گھوڑے اور کپڑے تک بیچ دئے تھے شاہی اصطبل کے جانور بہت لاغر اور کمزور تھے۔ اس لئے کہ ان کو کئی کئی دن تک چارہ اور دانہ میسر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے کہ بادشاہ باہر نکلا اور اس کی جلو میں ایک سپاہی بھی نہیں ہوا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن تک حرم سرا کے مطبخ میں آگ تک نہیں جلتی تھی۔ ایک روز شاکر خاں، شہزادہ

لہ تاریخ عالمگیر ثانی قلمی ص ۲۸، ۲۹ شہزادیوں پر تین تین دن کے فاقے گزرتے تھے (ملاحظہ ہو تاریخ عالم گیر ثانی قلمی ص ۱۹۰) میر فرماتے ہیں ؎

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

عالی گہر کے سامنے خیرات خانہ کا شوربا لے گیا۔ اس نے کہا یہ محل کی بیگمات کو دیدو۔ اس لئے کہ انھوں نے تین دن سے رزق کی صورت نہیں دیکھی ہے۔

تاریخ عالم گیر ثانی میں لکھا ہے کہ ایک روز قلعہ کی بیگمات بھوک سے بلبلا اٹھیں اور پردہ کا کچھ خیال نہ کر کے محل سے شہر کی طرف جانے لگیں لیکن قلعہ کے دروازے بند تھے اس لئے وہیں چپ ہو کر بیٹھ رہیں۔ اور ایک رات اور ایک دن اسی طرح بیٹھی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت امراء اور عوام سب ہی کی حالت سقیم تھی ۳ مئی کو فاقہ کش سپاہیوں نے پانی پت کے مقام پر عماد الملک[1] کی قیامگاہ

---

[1] عماد الملک کے خاندان کا شجرہ یہ ہے۔

شیخ شہاب الدین سہروردیؒ

عالم العلما شیخ اسمٰعیل

شیخ بہاؤ الدین — قلیچ خاں شیخ میر عابد

میر شہاب الدین فیروز جنگ غازی الدین خاں اول
بانی مدرسہ غازی الدین خاں واقع بیرون اجمیری دروازہ دہلی متوفی ۱۷۱۰ء

چین قلیچ خاں نظام الملک آصف جاہ متوفی ۱۷۴۸ء

امیر الامرا فیروز جنگ غازی الدین خاں ثانی (وفات ۱۷۵۲ء بمقام اورنگ آباد) — ناصر جنگ — صلابت جنگ — مظفر جنگ

عماد الملک غازی الدین خاں ثالث: میر کے محسن

کا محاصرہ کر لیا۔ جب عماد الملک پوچھ گچھ کرنے کے لئے باہر آیا تو انھوں نے اس کو پکڑ لیا۔ اور گالیاں دیتے ہوئے تمام سڑکوں پر لئے لئے پھرے۔ انھوں نے اسی پر بس نہیں کی، اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے اور خوب زدوکوب کیا۔ یہ تذلیل اور تشہیر دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ بعد میں اسے کسی نہ کسی طرح ہاتھی پر بٹھا کر گھر پہنچا دیا گیا۔ گھر آکے عماد الملک نے بہت عمدہ کپڑے پہنے اور گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس نے بلوچ اور روہیلہ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ ترک سپاہیوں کو لوٹ لیں ان کو گرفتار کر لیں یا مار ڈالیں اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ترک سپاہیوں کی جمعیت منتشر ہو گئی۔ اور عماد الملک کے پاس کوئی ایسی فوج نہ رہی جو آڑے وقت پر روہیلوں یا افغانوں کا مقابلہ کر سکتی۔

ابدالی کا حملہ ۱۷۵۶ء

۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور بہت جلد سرہند اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ لاہور سے دہلی پہنچنا کیا مشکل تھا، اس لئے عماد الملک بہت پریشان ہوا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ اس نے سادات خاں ذوالفقار جنگ کو اپنی طرف ملانا چاہا لیکن وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ ۶ جون ۱۷۵۶ء کو اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ اس نے روہیلوں سے امداد چاہی لیکن انھوں نے کہا کہ ہمارے سب مطالبات بیباق کر دو۔ تب مدد کریں گے۔ یہاں سب سے بڑی پریشانی پیسے ہی کی تھی۔ اس لئے نجیب الدولہ کی خواہش پوری نہ کی جا سکی اس کے بعد عماد الملک نے راجہ ناگر مل کی معرفت سورج مل جاٹ سے مدد چاہی۔ عماد الملک اور جاٹوں کے تعلقات اکتوبر ۱۷۵۳ء سے خراب تھے۔ لیکن سورج مل فوراً عماد الملک کے سفیر سے ملنے کے لئے آیا گفت و شنید ہوئی لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ سورج مل جاٹ یہ کہتا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے

روہیلوں، جاٹوں، مغلوں، راجپوتوں کو ملا کر مرہٹوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد افغانوں کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔ لیکن عماد الملک مرہٹوں سے بگاڑ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس لئے یہ گفتگو ناکامیاب رہی اب خطرہ قریب آتا جاتا تھا لیکن عماد الملک برابر سوچ بچار اور بات چیت کرنے میں لگا ہوا تھا بالآخر اس نے یعقوب علی خاں شش ہزاری منصب دار اور شاہ فنا ایک درویش کو ابدالی کے پاس بھیجا اور یہ درخواست کی کہ وہ دلّی پر حملہ نہ کرے لیکن افغان بہت قریب آ گئے تھے اور اس کی وجہ سے دلّی میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ خوش حال چند۔ لکشمی نرائن۔ راجہ ناگرمل اور دیوالی سنگھ نے اپنے بیوی بچوں کو متھرا بھیج دیا۔ عماد الملک نے بھی اپنے کنبہ کو راجپوتانہ منتقل کر دیا۔ عوام کا حال اس سے زیادہ گیا گذرا تھا وہ روز دلّی چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ اس لئے وزیر الممالک نے مرہٹوں کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو دلّی سے نہ جانے دیں اور ان کا راستہ روک لیں پناہ گزینوں نے واپس جانا چاہا لیکن مرہٹے سپاہیوں نے ان کو اس وقت تک جانے نہیں دیا۔ جب تک انھوں نے اپنی ساری مال و متاع دکھنیوں کے سپرد نہ کر دی اس طرح مرہٹہ سپاہیوں کو کافی مال اور دولت مل گئی۔ جو لوگ دلّی سے پہلے نکل لئے تھے وہ متھرا چلے گئے۔ اس لئے کہ نادر شاہ کے حملے کے وقت جاٹوں نے ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا لیکن اس مرتبہ جاٹوں نے ان سے قدم قدم پر روپیہ وصول کیا۔ متھرا کی آبادی بھی اتنی بڑھ گئی تھی کہ مکان کا ملنا ناممکن ہو گیا۔

۱۴ر جنوری ۱۷۵۷ء کو یہ اطلاع آئی کہ احمد شاہ ابدالی اس شرط پر واپس جا سکتا ہے کہ اُسے دو کروڑ روپئے نقد دئے جائیں، بادشاہ کی لڑکی سے

اس کی شادی کر دی جائے۔ اور سرہند تک سارا علاقہ افغانوں کے سپرد کر دیا جائے اس خبر کو سن کر دلی والوں کے اضطراب کی انتہا نہ رہی اسی دن راجہ جگل کشور کا خاندان مع پانسو آدمیوں کے دلّی سے متھرا چلا گیا۔

اب افغانوں کی فوج دلّی سے بالکل قریب تھی۔ لیکن لڑنے کی قوت نہ بادشاہ میں تھی اور نہ وزیر میں نجیب الدولہ افغانوں سے ملا ہوا تھا اور وزیر الممالک اس قدر خود غرض اور بزدل تھا کہ دلّی کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ کر سکا۔

عماد الملک ابدالی کی خوشامدیں کرتا رہا، کہ وہ دلّی پر رحم کرے اور آگے قدم نہ بڑھائے۔ آخر وہ خود اس سے ملنے کے لئے گیا۔ اور دلّی کی محافظت کے لئے منتیں کیں۔ احمد شاہ ابدالی نے کہا کہ "انتظام الدولہ نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں اسے وزیر بنادوں تو وہ مجھے دو کروڑ روپیہ دے گا۔ تم اگر صرف ایک کروڑ روپیہ دو تو اس عہدہ پر قائم رہ سکتے ہو" عماد نے کہا میں تو ایک کروڑ ٹھیکریاں بھی جمع نہیں کر سکتا۔ روپیہ کہاں سے لاؤں؟ ابدالی نے اسی وقت عماد الملک سے استعفا لے لیا۔ اور وزیر الممالک کا عہدہ انتظام الدولہ کے سپرد کیا۔ عماد الملک کو قید کر کے احمد شاہ ابدالی آگے بڑھا اس وقت اس کی فوج میں پچیس ہزار ہندوستانی بھی شامل ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر وہ سپاہی تھے جو دہلی کی فوج سے الگ ہو گئے تھے اس لئے کہ ان کو مہینوں سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں[۵]۔ اور ان کے

---

۵ اس زمانہ میں تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں۔ فقر و فاقہ میں چھوٹے بڑے سب ہی مبتلا تھے۔ میرنے "شہر آشوب" میں لکھا ہے: (باقی نوٹ ص ۱۷۵ پر ملاحظہ کیجئے)

اندر فاقہ کرنے کی زیادہ ہمت باقی نہیں رہی تھی۔
ابدالی کا راستہ بالکل صاف تھا ۱۹ جنوری ۱۷۵۷ء کو نجیب خاں ابدالی سے مل گیا۔ وزیر بھاگ گیا۔ مرہٹے پیچھے ہٹ گئے۔ اور راجہ ناگرمل دیوانِ خاص فرار ہو گیا۔ اگلے دن ابدالی کے صرف پانچ نسقچی دلّی میں داخل ہوئے اور

(بقیہ نوٹ ص ۱۵۶ ملاحظہ ہو۔)

شکل اپنی ہوئی جو بود و باش — آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش — ہے لب نان پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہر نہ چچہ آتش!

مرنے کے مرتبے میں ہیں احباب — جو شنا سا ملا سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحالِ خراب — جس کے ہے پال تو نہیں ہر طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال — کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال — ایک تلوار بیچے ہے اِک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

(کلیاتِ میر: شہر آشوب)

مصحفی کا ایک شعر ہے: ؎

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں
تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں

(کلیاتِ مصحفی قلمی نسخہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور
بحوالہ مصحفی از ڈاکٹر ابو اللیث ص ۵۸)

انھوں نے شہر میں امن وامان قائم کیا۔ ۱۲ر تاریخ کو جمعہ تھا اور بادشاہ عالم گیر ثانی محل کی مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔ لیکن عبدالاحد خاں، سیف الدین، محمد خاں کشمیری اور دوسرے علماء نے روشن الدولہ کی مسجد میں احمد شاہ ابدالی کا خطبہ پڑھوایا ایسا ہی جامع مسجد دہلی میں ہوا کسی ایک مفتی، فقیہہ اور عالم نے کھڑے ہو کر یہ نہیں کہا کہ بادشاہ کے ہوتے ہوئے یہ خطبہ کیوں پڑھا جا رہا ہے۔ بادشاہ نے یہ سنتے ہی رنگ محل اور خواب گاہ کا قیام چھوڑ دیا۔ اور محل کی کنجیاں نجیب الدولہ کے ایک ملازم کو دیدیں اب وہ شاہ برج میں رہنے لگا۔ لیکن دو دن کے بعد اسے یہ جگہ بھی چھوڑ کر ڈیوڑھی سلاطین میں منتقل ہونا پڑا۔ ابدالی کے لئے قلعہ صاف کیا گیا اور ایک ایک جگہ کو مزین اور آراستہ کر کے دلہن بنا دیا گیا۔ ۲۸ر جنوری کو وہ مع بیگمات کے قلعہ میں داخل ہوا۔ عالم گیر ثانی مہمان عزیز کے استقبال کے لئے پہنچا۔ لیکن اس کی بیکسی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ تخت رواں پر سوار اور پیچھے صرف ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا۔ وہ تیموری جاہ و جلال خواب و خیال ہو چکا تھا۔ ابدالی سمجھتا تھا کہ دلّی دارالخلافہ ہے یہاں صدیوں کی دولت گڑی ہو گی۔[1] اس لئے اس نے انتظام الدولہ سے کہا کہ دو کروڑ داخل کرو۔ عماد سے کہا کہ تم نے اس ڈھائی برس کے عرصہ میں جو کچھ جوڑا ہے وہ نکالو۔ جس نے تساہل یا انکار کیا اسی کو ذلیل کیا گیا۔[2]

انتظام الدولہ، عماد الملک، ساتگی بیگ۔ عبدالرحمان خاں اور نسبت خاں کو کوئی رسوائی ایسی نہ تھی جو برداشت نہ کرنا پڑی ہو۔ لوگوں کو نادر شاہ کا ظلم یاد آگیا۔[3]

---

[1] تاریخ عالم گیر ثانی [2] تاریخ حسین شاہی از امام الدین حسینی [3] واقعات دار الحکومت دہلی ص ۹۶ ج ۱۔

انتظام الدولہ کو دو کروڑ ادا کرنے تھے لیکن اس وقت اس کے پاس ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ جب اس کے اوپر بہت ظلم کیا گیا اور پوچھا گیا کہ چھپے ہوئے خزانے کہاں ہیں؟ تو اس نے کہا کہ اس کا علم مجھے نہیں۔ میری ماں شولاپوری بیگم کو ہے اس سے کہا گیا کہ اگر تم نے اس کا پتہ نہیں بتایا تو یاد رکھو کہ لوہے کی کیلیں تمھارے ناخنوں میں ٹھوک دی جائیں گی وہ غیرت مند یہ سنتے ہی بے ہوش ہو گئی لیکن جب ہوش آیا تو اس نے خزانے کا پتا بتایا۔ فوراً سو آدمی اس کے کھودنے میں مصروف ہو گئے۔ ۶ گھنٹے کی کھدائی کے بعد ۱۶ لاکھ روپے اور بہت سے قیمتی جواہرات اور ظروف برآمد ہوئے۔ انتظام الدولہ کی خانہ تلاشی بھی لی گئی اور شریف بیگمات کو برہنہ کر کے دیکھا گیا۔ اسی طرح صمصام الدولہ مرحوم کے محل کے حصے بھی کھودے گئے۔ اور کوتوال شہر کے پاس جو کچھ مال و اسباب تھا وہ سب چھین لیا گیا۔ جو غریب اپنی جان لیکر شہر سے بھاگ گئے تھے۔ ان کے گھروں کے تالے توڑ لئے۔ اور جو مل سکا وہ لے لیا۔ معین الملک کی بیوہ مغلانی بیگم ابدالی کو سب خبریں پہنچاتی تھی۔ اور اسی کے مشورے سے امرار کے مکانات کی تلاشی لی گئی تھی۔ خوب صورت عورتوں کے متعلق بھی اس نے معلومات فراہم کیں اور ابدالی کو حضرت بیگم کا جو اشتیاق پیدا ہوا وہ بھی مغلانی بیگم کی اطلاع پر۔ یہ شہزادی بھی بڑی بدقسمت تھی۔ پہلے عالمگیر ثانی اس سے شادی کا خواہشمند تھا۔ جو اس کے باپ کے برابر تھا اب ابدالی سے شادی ہوئی جو باپ سے بھی بڑا تھا۔ صورت اور شکل کے اعتبار سے نہایت خوفناک لیکن حکم حاکم، کون چوں کر سکتا تھا۔

ابدالی کا آنا بھی ایسا ہی تھا اور جانا بھی ایسا ہی، دہلی سے فرید آباد تک

گھر کے گھر بے چراغ تھے اور جابجا ننگی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سورج مل جاٹ سے اُسے خاص پرخاش تھی اس نے بلبھ گڈھ چھین لیا اور متھرا میں داخل ہو کر قتل عام کا حکم دے دیا۔ ہزاروں بے گناہ تہ تیغ ہو گئے۔ اور مال ومتاع ننگ وناموس سب ہی غارت ہو گیا۔ مکانات ڈھا دئے گئے۔ ان میں آگ لگا دی گئی جو بچ گئے ان کو جبراً ایک لاکھ روپیہ ادا کرنا پڑا۔[1] احمد شاہ ابدالی کے بعد نجیب الدولہ نے غارت گری کی اور وہ بھی بہت سا خزانہ اور خوبصورت کنیزیں اپنے ساتھ لے گیا۔ ہزاروں عورتیں اپنی عزت بچانے کے لئے جمنا میں کود پڑیں۔ اور بعض نے گھر کے کنوؤں میں گر کے جان دیدی۔[2]

۳ر مارچ کو ابدالی نے لوٹنے کا عام حکم دے دیا تھا اور یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو سپاہی جو سامان لوٹ کر لائے گا وہ اسی کا ہوگا۔ اور ایک دشمن کے سر کے پانچ روپے اس کے علاوہ ملیں گے سپاہی گھوڑوں کی دم سے گھوڑا باندھے ہوئے اور ان کی پیٹھ پر مال غنیمت لادے ہوئے پھرتے تھے۔ ان کے ساتھ بیسیوں غلام اور باندیاں ہوتی تھیں۔ اور نیزوں پر دشمنوں کے سر لٹکے ہوئے تھے۔ جن کے وہ فوراً دام کھرے کر لیتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس راہ سے اس کا لشکر گذرا وہاں ویرانی نے بسیرا کر لیا اور غلہ اور چارہ دونوں چیزیں یکسر معدوم ہو گئیں۔ ع

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

ابدالی کے مال غنیمت کا اندازہ ۹ کروڑ سے بارہ کروڑ تک کیا گیا ہے۔[3]

---

[1] تاریخ عالم گیر ثانی [2] زوال سلطنت مغلیہ (سرکار) ج ۲ ص ۱۰۲ [3] نادر نامۂ مرزا مہدی میں لکھا ہے کہ (اس سے قبل) نادر شاہ پندرہ کروڑ کی دولت سمیٹ کر لے گیا تھا۔

اس سامان کو لے جانے کے لئے اٹھائیس ہزار اونٹوں، ہاتھیوں، خچروں اور گاڑیوں کی ضرورت پیش آئی کہا جاتا ہے کہ کوئی گھوڑا اور گدھا ایسا نہیں تھا جو افغانوں کو ملا ہو اور وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے گئے ہوں۔

میر اس زمانے کے ادقات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس اثنا میں درانی جو سرہند سے شکست کھا کر بھاگا تھا ایک بڑا لشکر لے کر لاہور پہنچا۔ وہاں کے وضیع و شریف پر بڑے بڑے ظلم ہوئے چونکہ کوئی روکنے والا نہ تھا وہاں سے شہر دہلی کا قصد کیا اس کی آمد آمد کی خبر سُن کر لوگ سخت پریشان اور بدحواس ہوئے۔ بادشاہ اور وزیر سے کچھ نہ ہوا۔ آخر اس کے استقبال کو گئے اور قید ہو گئے۔ راجہ ناگرمل، بعض رؤسا مثل سعدالدین خاں خاں ساماں وغیرہ کے ساتھ اپنی حفاظت کے لئے سورج مل کے قلعوں میں چلے گئے قریب ایک ماہ کے لوگوں پر بڑی سختی گزری اس کے بعد وہ سلطنت عالم گیر ثانی کو بخش کر وزیر کو اپنے ساتھ لے گیا اور اکبر آباد کا رُخ کیا اس کی فوج نے غارت گری شروع کی۔ متھرا میں جو شہر سے اس طرف اٹھارہ کوس کے فاصلے پر ایک آباد و بارونق شہر تھا قتل عام ہوا۔ ہوا اس قدر متعفن ہو گئی کہ ابدالی نے طاعون کے خوف سے سورج مل کے خلاف فوج کشی کے ارادے کو ترک کر دیا۔ اور دفعتاً کوچ کیا وہ محمد شاہ کی بیٹی سے نکاح کر کے بالا بالا چلا گیا۔ عماد الملک اکبر آباد کے نواح میں رہا۔ نجیب الدولہ نے جو صفدر جنگ کی لڑائی میں وزیر کا نوکر ہو گیا تھا نمایاں ترقی کی اور میر بخشی اور مختار سلطنت ہو گیا۔"[۱]

نجیب الدولہ

نجیب الدولہ، ابدالی کا دستِ راست تھا اور اس وقت دہلی میں اس کے وکیل کی حیثیت سے مقیم تھا، وزیر سلطنت کی کوئی حیثیت

---

[۱] ذکر میر ص ۷۶

نہ رہی تھی اور بادشاہ پر پورا قبضہ نجیب الدولہ ہی کا تھا بادشاہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس سے عماد کی ہی سختیاں اچھی تھیں۔ اس میں کم سے کم خاندانی شرافت تو تھی اور وہ آئین و آداب کو تو ملحوظ رکھتا تھا۔ یہاں تو یہ بھی نہیں تھا۔ عماد الملک نے یہ دیکھ کر کہ مرہٹوں کے خلاف کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ان کے ساتھ صلح کر لی۔ اب عماد الملک اور مرہٹے یہ چاہتے تھے کہ نجیب الدولہ کو دہلی سے نکال دیں اور اختیارات پھر عماد الملک کو سونپ دیں چنانچہ رگھوناتھ راؤ راجپوتانہ سے دہلی کی طرف روانہ ہوا اس کے آتے ہی دلّی میں کھلبلی مچ گئی اور غلّہ میوہ کے مول بکنے لگا۔ نجیب الدولہ نے عماد الملک کے محل پر حملہ کیا اور اس کی عورتوں کو بے حرمت اور بے آبرو کیا۔ یہ ظلم ایسا تھا جس کی وجہ سے عماد کے دل میں زخم پڑ گئے اور پھر اس کی کبھی نجیب الدولہ سے دوستی نہ ہو سکی سیف الدین محمد خاں کشمیری نے بڑی مشکلوں سے ان بیگمات کو ڈولیوں میں بٹھا کر راجہ ناگرمل کے گھر بھیج دیا جن کے لئے ڈولیاں فراہم نہ ہو سکیں وہ غریب پا پیادہ بازار دل بازاروں پھریں۔

نجیب الدولہ کے جبر و ظلم نے سبھی کو اس سے خفا کر دیا تھا۔ بادشاہ بھی در پردہ عماد اور مرہٹوں سے ملا ہوا تھا۔ اس وقت دلّی میں قحط پھیلا ہوا تھا اور غلہ کسی قیمت پر دستیاب نہ ہوتا تھا بالآخر ۳ ستمبر ۱۷۵۷ء کو صلح ہو گئی۔

نجیب الدولہ اپنی جاگیر کو چلا گیا۔ جہاں سے وہ کھلّم کھلّا بادشاہ کی مخالفت کرتا رہا۔ اس کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کو بھی حملہ کرنے کی دعوت دیتا رہا۔ اب عماد الملک کے ہاتھ میں تمام اختیارات تھے اس نے نجیب الدولہ کے آدمیوں کو نکال باہر کیا۔ اور قلعہ میں اپنے آدمی مقرر کر دیئے۔ میر بخشی کا عہدہ احمد خاں بنگش کو دے دیا گیا۔

دلّی کا اجڑنا اس عرصہ میں دہلی کئی دفعہ اُجڑی اور لُٹی ۱۷۵۷ء میں دو دفعہ

تو ابدالی نے اسے غارت کیا۔ پانچ مہینے نجیب الدولہ کا اقتدار رہا اور اس نے اپنی جنگی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اہل دہلی سے خوب روپیہ وصول کیا۔ مرہٹوں کی لوٹ مار اس کے علاوہ تھی کھانے پینے کی چیزیں بہت مہنگی ہوگئی تھیں اور بعض اطراف میں تو مکمل قحط پڑا ہوا تھا۔ ستمبر اور اکتوبر ۱۷۵۷ء میں ایک وبائی بخار پھیلا جس میں بہت سے آدمی مر گئے۔ مارچ اور اپریل میں ایک نئی بیماری کن پھوڑا شروع ہوئی اس میں بھی بہت سے آدمی ہلاک ہوگئے۔ اشیائے خوردنی اتنی گراں ہوگئیں کہ عام آدمیوں کے لئے ان کا خریدنا تقریباً ناممکن تھا۔ غلّہ کا حصول آسان نہ تھا۔ مونگ کی دال دو روپیہ سیر تھی اور اپلی کے دام سو روپیہ سیر ہوگئے تھے۔ بیروزگاری دن بدن بڑھ رہی تھی چوری اور ڈاکہ زنی روز ہوتی تھی۔ نومبر میں زلزلہ آیا جس میں بہت سے آدمی مر گئے۔

اس وقت مرہٹوں کا ستارہ عروج پر تھا ان کی فوجیں پنجاب تک پہنچ گئی تھیں اور ان کے تمام دشمن مغلوب ہوچکے تھے لیکن بقول سر جادو ناتھ سرکار یہ فائدہ بس دیکھنے ہی کا تھا۔ انھوں نے یہ سب کچھ عماد الملک اور احمد خاں بنگش کی خاطر کیا تھا اور یہ دونوں ناقابل اعتبار اور نااہل تھے۔

میر نے اس زمانہ کے واقعات کی طرف اپنی سوانح عمری میں اشارہ کیا ہے:

> راجہ ناگرمل نے سردار دکن سے سازباز کرلیا اور وزیر اور احمد خاں بنگش اور مرہٹوں کو لے کر نجیب الدولہ پر چڑھ گیا۔ وہ شہر بند ہوگیا۔ توپ خانہ کی جنگ ہونے لگی بعض خود غرض سردار تھوڑے سے غلبہ سی شہر کی خرابی کے درپے ہوئے راجہ مذکور جس کا مدعا سوائے وزیر کی نیک نامی کے کچھ نہ تھا اس کی روک تھام کرنے لگے اور سمجھانے لگے کہ شہر پر حملہ کرنا ایک ناروا فعل ہے۔ دکن کی فوج ایک

عالم کے ناموس کو برباد کر دے گی تم واقف نہیں ہو، ایسا نہ ہو کہ شہر غارت ہو جائے اور بدنامی ہو مناسب یہ ہے کہ روہیلوں کو صلح سے باہر نکال لائیں اور شہر کو سلامت رکھیں آخر نجیب الدولہ شہر سے نکلا اور سہارن پور میں جہاں اس کی فوجداری تھی چلا گیا۔ وزیر وغیرہ شہر میں آئے دکن کی فوج کو رخصت کیا اور توپ خانہ کی داروغگی راجہ کے بیٹے کو دی احمد خاں بنگش میر بخشی ہو گیا۔

میر کی پریشانیاں میر کے لئے یہ زمانہ بڑی مصیبت کا تھا۔ نواب بہادر صفدر جنگ اور احمد شاہ بادشاہ کے بعد ان کا کوئی مستقل سلسلہ باقی نہیں رہا تھا۔ راجہ جگل کشور البتہ قدردانی کرتے تھے۔ اور جو ہو سکتا تھا وہ بطور امداد کے دیتے تھے لیکن اس سے کام نہ چلتا تھا ایک دن تنگ آکر انھوں نے راجہ جگل کشور سے روزگار کی شکایت کی ان کا چہرہ شرمندگی سے سرخ اور زرد ہو گیا۔ اور کہنے لگے کہ میں خود افلاس کے ہاتھوں مجبور ہوں ورنہ امداد سے دریغ نہ کرتا۔ (۱۷۵۲ء) ایک دن راجہ جگل کشور راجہ ناگرمل کے یہاں گئے اور میر کا تعارف کرایا اس کے بعد انھوں نے میر سے کہا کہ اب تم جا کر ان سے ملو۔ میر گئے اور راجہ ناگرمل ان سے بڑے لطف اور مہربانی سے پیش آئے۔ اور کہا دعوت شیراز حاضر ہے یعنی جو کچھ موجود ہے اس میں تمھارا بھی حصہ ہے۔ اس سے میر کو اطمینان ہوا اور وہ پھر دوسرے دن ان کی خدمت میں پہنچے۔ شعر و سخن کی محفل گرم ہوئی۔ راجہ ناگرمل کہنے لگے۔ آپ کا ہر شعر موتیوں کی لڑی ہے اور مجھے آپ کا انداز و اسلوب بہت پسند ہے۔ میر نے لکھا ہے کہ میں اسی طرح کچھ دنوں تک جاتا رہا۔ لیکن

ل ذکر میر ص ،، سے راجہ جگل کشور نژدت، شاگرد میر، وکیل بنگالہ، قوم کا بھاٹ اور پیشے کے لحاظ سے شراب فروش تھا (وقاع عالم شاہی ص ۱۱)

کچھ ہاتھ نہ آیا اور اضطراب حد سے گذر گیا۔ اس کے بعد وہ دربان کے مشورے سے راجہ کے بیٹے رائے بہادر سنگھ کے یہاں گئے دیوان خانہ میں ملاقات ہوئی۔ اور شعرو سخن کی صحبت گرم ہوئی۔ خواجہ غالب نے میر کا تعارف کرایا اور کچھ مقرر کرا دیا۔ جو انھیں ایک سال تک ملتا رہا۔ میر ایک شب کو راجہ ناگرمل کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے ایک سال کی تنخواہ دے کر کہا اکثر مجھ سے ملتے رہیئے۔ اس کے بعد سے یہ عشا کی نماز کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ملازموں کے قاعدے سے دو پہر رات تک وہاں رہتے۔ اس خدمت کا حاصل یہ تھا کہ یہ شگفتہ خاطری کے ساتھ بسر کرتے رہے[۱]

۱۷۵۸ء میں مرہٹے دوآب سے نمٹ کر پنجاب کی طرف متوجہ ہوئے۔

۲ مارچ کو انھوں نے لاہور اور ۲۴ مارچ کو سرہند لے لیا۔

میر نے لکھا ہے کہ مرہٹے دریائے اٹک تک قابض ہو گئے۔ اور انھوں نے وہاں کے نظم و ضبط کے لئے صاحبا نام ایک سردار کو مقرر کیا اس کے بعد وہ دکن چلے گئے۔

شہزادۂ عالی گہر

عالم گیر ثانی کے بیٹوں میں شہزادۂ عالی گہر سب سے زیادہ لائق تھا۔ ابدالی نے سب سے پہلے اسی کو بادشاہ دہلی کا وزیر مقرر کیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ اختیارات عماد الملک کو دے دئے۔ شہزادۂ عالی گہر نے بعض خالصہ زمینوں پر قبضہ کرنا چاہا۔ اور اس مقصد کے لئے اس نے دتل شیو دیو کو بھی اپنی طرف ملا لیا۔ عماد الملک نے خطرے کو محسوس کر کے فوراً ایک فوجی دستہ اس کے مقابلے کے لئے بھیجا۔ لیکن وہ ہار گیا۔ عماد الملک

---

[۱] ذکر میر ص ۷۹۔

کو اس شکست پر بڑی ناگواری ہوئی اور اس نے سارا الزام عالم گیر ثانی پر رکھا اس نے احتیاط کے خیال سے تمام شہزادوں کو قلعہ میں قید کر لیا۔ اور ان پر سخت نگرانی رکھی۔ عماد الملک نے مرہٹوں کو رشوت دے کر باغی شہزادے سے توڑ لیا اور ۱۹ مئی ۱۷۵۸ء کو اس کے خلاف فوج روانہ کی جس نے شہزادہ کو اودھ جانے پر مجبور کر دیا۔

شجاع الدولہ نے ۲ جنوری ۱۷۵۹ء کو شہزادہ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ یہی شہزادہ بعد میں شاہ عالم کے نام سے تخت نشین ہوا۔

میر نے اپنی خود نوشت میں ان سانحات کا اجمالی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے۔ کہ بدبختی سپاہیوں کا ہنگامہ، معین الملک کے اموال کا ضبط ہونا۔ اور مغلانی بیگم (زن صوبہ دار مذکور) کا شہر سے نکلنا، عاقبت محمود کاشمیری کا مارا جانا، بے تہہ لوگوں کی شرارت سے شہر دلی کی تباہی اور بربادی، شہزادہ عالی گہر کی بغاوت اور انتظام الدولہ خانخاناں کی گرفتاری اور قلعہ کے شہزادوں کی رسوائی یہ تمام واقعات اتنے دردناک ہیں کہ مجھ میں تفصیل سے تو کیا اجمال سے لکھنے کی بھی ہمت نہیں ہے[۵۱]

۲۶ دسمبر ۱۷۵۸ء کو دتاجی اور جن کوجی سندھیا نجف گڑھ کے قریب پہنچ گئے۔ اب شمالی ہند کی نگرانی ان کے سپرد تھی۔ ملہار راؤ جتنا زبان کا میٹھا اور طبیعت کا نرم تھا دتاجی اتنا ہی سخت تھا اس کو سب سے پہلا حکم یہ تھا کہ وہ نجیب خاں کا قلع قمع کرے اور مرہٹوں کا جو روپیہ باقی ہے اس کو سختی کے ساتھ وصول کرے نجیب الدولہ نے شکر تال کی محافظت کا پورا بندوبست کیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ ۱۵ دسمبر ۱۷۵۹ء کو بڑی گھمسان کی لڑائی ہوئی لیکن روہیلوں کا پلّہ بھاری رہا۔

---

۵۱ ذکر میر ص ۸۰

دتاجی نے سورج مل سے امداد چاہی اس نے پانچ ہزار سپاہی بھیج دئے۔ احمد خاں بنگش بھی مدد کے لئے پہنچ گیا۔ ۱۶ر نومبر ۱۷۵۹ء کو عماد بھی ان کی مدد کو چل کھڑا ہوتا لیکن اسے معلوم ہوا کہ ابدالی کی فوجیں پھر سرہند تک آگئی ہیں اور اب وہ دہلی پہنچا ہی چاہتا ہے اس لئے اس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ دہلی کو عالم گیر ثانی کے ہاتھ میں چھوڑ کر چلا جائے۔ ممکن ہو وہ ابدالی سے مل جائے اور اس کے ذریعہ وہی ظلم وستم روا رکھے جو اس پر دو برس پہلے ہو چکا تھا اس لئے وزیر نے ۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء کو عالم گیر ثانی بادشاہ دہلی اور اپنے حریف انتظام الدولہ دونوں کو قتل کروا دیا۔

ابدالی کا حملہ ۱۷۵۹ء

مرہٹوں نے اب یہ مناسب سمجھا کہ جلدی سے دلّی پر قبضہ کرلیں لیکن احمد شاہ ابدالی بھی بے خبر نہیں تھا وہ بہت جلد لونی پہنچ گیا۔ جو دہلی سے چھ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہاں اس کے دوسرے ساتھی حافظ رحمت خاں، دوندے خاں، نجیب الدولہ اور سعد اللہ خاں بھی آکر مل گئے ۹ر جنوری ۱۷۶۰ء کو براری گھاٹ پر گھمسان کی لڑائی ہوئی اس میں دتاجی مارا گیا اس کے سپاہی بدحواس ہو کر بھاگے۔ جن کوجی سندھیا بھی بُری طرح زخمی ہوا۔ افغانوں نے مرہٹہ فوج کا پیچھا کیا اور ہزاروں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ عماد الملک اپنے دوست مرہٹوں کی شکست کو دیکھ کر بھرت پور چلا گیا اب دہلی میں نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ کوئی وزیر اس کی حالت بیواؤں سے زیادہ دکھیاری تھی۔ اس لئے دُرانیوں نے اسے خوب دل کھول کر لوٹا۔ (ذکر میر ص ۸۵، ۸۶، ۸۷)

میر نے شہزادہ عالی گہر کی بغاوت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ: "ابھی یہ بلائیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ آسمان کی گردش نے ایک نیا فتنہ پیدا کیا یعنی جنکوجی راؤ سندھیا دکن سے ایک بڑی فوج لے کر دہلی کے قریب پہنچ گیا۔ اس خبر کو سُن کر

اکثر لوگوں کے دل ہل گئے اور قیامت برپا ہوگئی ۔ دتا جو اس سردارِ جگر دار کا مدار المہام اور جوان زور آور تھا نجیب الدولہ کے خلاف جنگ میں مشغول ہوگیا۔ دلّی والوں کو ڈر ہوا کہ کہیں یہ سنگین فوج وہاں سے نمٹ کر ہمارے اوپر نہ ٹوٹ پڑے اس لئے عماد الملک کی یہ رائے ہوئی کہ ہمیں مرہٹوں کی مدد کرنا چاہیئے یا دونوں میں صلح کرانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

بادشاہ کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی اس لئے اس نے ساتھ دینے میں پس و پیش کیا ۔ یہ لوگ بادشاہ کی طرف سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے سازش کرکے بادشاہ کے پاس گئے اور وہاں قسم کھائی کہ ہم وزیر کے خلاف ہیں لیکن زمانہ سازی کرتے ہیں خدا نے ایک فائدہ کی صورت دکھلائی ہے اگر خداوند مدد فرمائیں۔ پوچھا کیا ہے ؟ کہا ایک فقیر صاحبِ کمال جس نے دنیا کو چھوڑ دیا ہے دو تین روز سے قلعہ فیروز شاہ میں مقیم ہے کل چلا جائے گا۔ اگر اس سے رجوع کیا جائے تو امید ہے کہ اس کی دُعا سے یہ بلا ٹل جائے اور ہمیں وزیر پر غلبہ حاصل ہو۔

عالم گیر ثانی کا قتل

بادشاہ ان لوگوں کی منافقت سے بالکل بے خبر تھا اس نے وعدہ کرلیا اور شام کو سوار ہوکر پہنچا پٹھانوں نے اُسے چاقو سے ہلاک کر ڈالا اور اس کی لاش کو دیوار کے نیچے پھینک دیا۔ یہ لوگ شام کے بعد وہاں سے لوٹے اور نماز پڑھتے میں انتظام الدولہ خانخاناں کے گلے میں رسی ڈال کر اسے بڑی بے رحمی سے مار ڈالا اور اس کی لاش کو لوگوں سے چھپاکر دریا میں ڈبو دیا۔ بادشاہ کی لاش تمام دن زمین پر بڑی رسوائی کے ساتھ پڑی رہی، جو بھی دیکھتا تھا اس حرکت پر لعنت بھیجتا تھا۔ آخر اس کے وارثوں نے بے خوف ہوکر راتوں رات اسے دفن کیا لیکن وہ ان ظالموں کے ڈر سے ایک آنسو بھی نہ گرا سکے ۔ اگلے روز صبح کو ان ستم کیشوں نے

قلعہ میں آکر شاہ جہاں نام ایک شہزادے کو تخت پر بٹھایا اور نذریں پیش کیں۔"

میر لکھتے ہیں کہ "بادشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل سے فارغ ہونے کے بعد عماد الملک قطع منازل کرتا ہوا فوج دکن کے ساتھ مل گیا۔ اس طرح ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ یہ خبر پہنچی کہ ابدالی کی فوج اٹک کو پار کرکے مرہٹہ سردار صاحبا کو شکست دے چکی ہے۔ دکھنی سردار مجبوراً نجیب الدولہ کی لڑائی کو چھوڑ کر سراسیمہ افغانوں کا راستہ روکنے کے لئے دوڑے انھوں نے جمنا کو پانی پت کے قریب پار کیا (۲۰ دسمبر ۱۷۵۹ء) اور کرنال میں جہاں حضرت بوعلی قلندرؒ کا آستانۂ اقدس ہے۔ اپنی خیمہ گاہ بنائی۔" (ص ۸۳)

تھانیسور کے قریب سخت معرکہ ہوا جس میں جنکوجی سندھیا کو شکست فاش ہوئی۔ اب احمد شاہ ابدالی نے اپنے خیمے دوآب میں لگائے نجیب الدولہ اس کی قدم قدم پر رہنمائی کر رہا تھا اس کی وجہ سے اس کو رسد کی بڑی سہولت ہو گئی۔

اس کے بعد میر نے براری گھاٹ کی لڑائی کا ذکر کیا ہے جو دہلی کے شمال میں دس میل پر واقع ہے اس لڑائی میں دتاجی مارا گیا۔ (۹ جون ۱۷۶۰ء) افغانوں نے ۲۴ میل تک مرہٹوں کا پیچھا کیا۔ میر نے لکھا ہے:

درانیاں دنبال گریختگاں افتادہ اکثرے را علف تیغ بے دریغ

کردند عبرگشتہ انداز تاراج شہر نمودند۔ (ذکر میر ص ۸۵)

اب افغان اور روہیلے آزاد تھے انھوں نے خوب دل کھول کر دلی کو لوٹا۔ تباہی اور تاراجی کی داستان میر نے بہت تفصیل سے لکھی ہے۔ اور ایسے دردناک انداز میں کہ اس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنی تفصیلات دوسری تاریخوں میں نہیں ہیں۔ اس لئے اور بھی قابلِ قدر ہیں۔ میر خود اس قلزمِ خون

سے گذرے تھے اس لئے ان کے بیان میں جو صداقت اور دل برشتگی ہے وہ دوسری جگہ نہیں مل سکتی:

دلّی کی بربادی

راجہ ناگرمل[1] شام کو شہر سے چل کھڑے ہوئے اور سورج مل کے قلعوں میں حفاظت کے ساتھ پہنچ گئے میں حفظِ ناموس کے لئے شہر ہی میں رہا۔ شام کے بعد منادی ہوئی کہ شاہ ابدالی نے سب کو امان دے دی ہے رعایا میں سے کوئی پریشان نہ ہو۔ لیکن تھوڑی سی رات گذری تھی، کہ درآنیوں نے ظلم شروع کر دیا۔ شہر کو آگ لگا دی۔ گھر جلا دیے اگلی صبح، صبح قیامت تھی افغان اور روہیلے قتل وغارت میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے مکان کے دروازے توڑ ڈالے لوگوں کی مشکیں کس لیں اکثر کو جلا دیا یا ان کے سر کاٹ لئے۔ ایک عالم خاک درخون میں مل گیا۔ تین رات اور دن تک یہ ظلم جاری رہا درآنیوں نے کھانے اور پہننے کی کوئی چیز نہ چھوڑی انھوں نے چھتیں اور دیواریں توڑ ڈالیں اور لوگوں کے سینے زخمی کر دیئے۔ اعیان سلطنت فقیر ہو گئے، وزیر و شریف عریاں اور کتخدایاں بے خانماں ان میں سے اکثر مصیبت میں گرفتار اور کوچہ و بازار میں رسوا تھے لوگوں کے بیوی بچے قید تھے اور قتل وغارت کا سلسلہ تھا کہ بلا روک ٹوک جاری تھا۔ افغان ذلیل کرتے اور گالیاں دیتے تھے اور طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ جو چیز لوٹنے کی ملی لوٹ لی بعضوں نے تو ستر پوش تک نہ چھوڑے۔ نئی دلّی یعنی شاہجہاں آباد خاک کے برابر ہو گئی اس کے بعد یہ بے رحم پرانی دلّی کی طرف متوجہ ہوئے اور افغانوں نے بے شمار لوگوں کو ہلاک کر ڈالا۔ سات آٹھ دن تک یہی ہنگامہ گرم

---

[1] ذکر میر ص ۸۵۔

رہا کسی کے گھر پہننے کے کپڑے اور ایک دن کے کھانے تک کا سامان نہ رہا مردوں کے سر پر ٹوپی اور عورتوں کے سر پر دوپٹہ تک نہیں تھا ظالم لوگوں سے غلّہ چھین لیتے اور غریبوں کے ہاتھ قیمتاً بیچے "مصیبت زدوں کی فریاد آسمان تک پہنچتی لیکن ابدالی کے کان پر جوں نہ رینگتی بہت سے لوگ دلّی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے اور وہاں مر گئے۔

میر صاحب لکھتے ہیں کہ اس ہنگامہ میں میری حالت ابتر ہو گئی اور میرا تکیہ جو شاہراہ کے کنارے تھا خاک میں مل گیا۔

من کہ فقیر بودم فقیر تر شدم حالم از بے اسبابی وتہی دستی ابتر شد تکیہ کہ بر شاہ راہ داشتم بخاک برابر شد غرض کہ آں بے مروتاں تمام شہر را بار کردہ بردند عزیزاں ہمہ ذلیل شدہ جا ہا سپر دند۔[1]

ذکرِ میر میں لکھا ہے کہ ابھی یہ قتل وغارت ختم نہیں ہوا تھا کہ یہ خبر مشہور ہوئی کہ دکن کی ہزیمت خوردہ فوج میوات کی مرہٹہ فوج سے مل گئی ہے اور اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتی ہے۔ احمد شاہ ابدالی فوراً متوجہ ہوا اور نواح میوات میں پہنچ گیا اس وقت عماد الملک سورج مل کے قلعوں میں آکر بیٹھ رہا تھا اور مرہٹوں کی ہمراہی چھوڑ دی تھی مرہٹوں نے یہ دیکھ کر کہ ابدالی کے خلاف میدان میں لڑنا آسان نہیں ہے۔ جنگ گریز شروع کر دی۔ لیکن ہلکر کی فوج کو سکندر آباد کے قریب شکست ہوئی۔ ابدالی کی فوج نے مرہٹوں کا علی گڑھ تک پیچھا کیا اور لوٹ مار میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی (فروری ۱۷۶۰ء)

میر کی مصیبتیں

میر نے لکھا ہے کہ: "یہ جھگڑے اور لڑائیاں جاری تھیں کہ میں ایک دن راجہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ

---

[1] ذکر میر ص ۸۸۔

میں نے بہت کچھ تکلیف اٹھائی ہی چاہتا ہوں کہ اس شہر سے نکل جاؤں اور کسی دوسری جگہ چلا جاؤں ممکن ہی آسودگی میسر آجائے انھوں نے اجازت دیدی۔ میں لواحقین کو ساتھ لے کر نکل کھڑا ہوا کوئی جگہ مدنظر نہیں تھی۔ توکلت علی اللہ چل دیا تمام دن چلنے کے بعد بڑی مصیبتوں سے آٹھ نو میل طے ہوئے رات ایک پیڑ کے نیچے گذاری صبح کو راجہ جگل کشور کی بیوی اس طرف سے گذریں اور وہ ہم بیکسوں کو اپنے ساتھ برسانہ تک لے گئیں۔ یہ مشہور قصبہ اور ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہے ان سب نے ہماری بڑی دلدہی اور خاطرداری کی ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو وہ کاماں چلی گئیں یہ راجہ جے سنگھ کی سرحد پر ایک مشہور شہر ہے۔ میں بھی اہل وعیال کے ساتھ ایام عشرہ میں وہیں رہا۔ عاشورہ کے دوسرے روز وہاں سے نکلا[1] کمہیر پہنچا یہاں

---

[1] میر نے ایک مخمس میں بھی ان مصائب کا ذکر کیا ہے:

کاماں سی تلخ کام اٹھایا مرے تئیں — دلّی میں بے دلانہ پھرایا مرے تئیں
ہم چشموں کی نظر سے گرایا مرے تئیں — حاصل کہ پیس سرمہ بنایا مرے تئیں

میں مشتِ خاک مجھ سے اسے اس قدر غبار

لشکر میں مجھ کو شہر سے لایا پئے تلاش — یاں آکے گذری میری عجب طور سی معاش
پانی کسو سے مانگ پیا ہیں کسو سی آش — اس واقعے سی آگے اجل پہنچی ہوتی کاش

ناموس رہتی فقر کی، جاتا نا اعتبار

مدت رہا تھا ساتھ جنھوں کے خراب حال — دانستہ ان سبھوں نے کیا مجھ کو پائمال
آخر کو آیا مجھ میں انھوں میں بہت ملال — یہ زندگی سہل ہوئی جان کی وبال

اس جمع میں کسو کو نہ پایا میں دستیار

جانا جہاں نہ تھا مجھے سو بار واں گیا — ضعف قوی سی دست بدیوار واں گیا

(آثار ج ۱ ص ۱۶۳ بہ اختصار)

بہادر سنگھ فرزند لالہ رادھا کشن جو پہلے صفدر جنگ کا خزانچی تھا۔ اور ان دنوں راجہ کے ساتھ تھا شام کے وقت مجھے ملا۔ بڑی مروّت سے پیش آیا اور میری دستگیری کی میں اس کا بہت احسان مند ہوں حالانکہ اس سے محض میری شناسائی تھی یہاں چند روز میں نے فراغت اور اطمینان کے ساتھ بسر کئے۔"

میر نے لکھا ہے کہ ایک روز میں سامانِ معیشت کے نہ ہونے سے پریشان

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۷۲ ملاحظہ فرمائیں)

محتاج ہو کے نان کا طلبگار واں گیا　　چارہ نہ دیکھا، مضطر و ناچار واں گیا
اس جانِ ناتواں پہ کیا صبر اختیار

در پر ہر اک دنی کے سماجت مری گئی　　نالائقوں سے ملتے لیاقت مری گئی
کیا مفت ہائے شانِ شرافت مری گئی　　ایسا پھرایا ان نے کہ طاقت مری گئی
مشہورِ شہر اب ہوں سبکسار و بے وقار

عرصہ تھا مجھ پہ تنگ اٹھا ہو کے نیم جاں　　پوچھا نہ مجھ کو یک لبِ ناں سو کہیں نے یاں
کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں　　آشفتہ خاطری نے پھرایا کہاں کہاں
برسوں کا راز مجھ سے ہوا آخر آشکار

برداخت میری ہو نہ سکی اک امیر سے　　عقدہ کھلا نہ دل کا دعائے فقیر سے
فتنے ہمیشہ آتے رہے سر بہ تیر سے　　ہر چند التجا کی صغیر و کبیر سے
لیکن ہوا نہ رفع مرے دل کا اضطرار۔۔۔۔۔

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں میرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ بے دماغی نے پایا ہے اشتہار

بیٹھا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ چلو، اعظم خاں پسر اعظم خاں کلاں سے جو فردوس آرامگاہ کے عہد میں شش ہزاری امیر تھا اور معقول اور فیاض شخص تھا ملاقات کروں، ممکن ہے دو گھڑی وقت اچھا کٹ جائے۔ میں گیا اور اس سے سورج مل کے طویلہ میں جو خانہ خرابان دہلی کی تازہ اقامت گاہ تھی، ملاقات کی۔ خدا بخشے اس عزیز نے میری خیر و عافیت پوچھی۔ میں نے اپنی سرگزشت بیان کی تو سننے والوں کے ہوش جاتے رہے۔ جب حقہ سامنے آیا تو میں نے یہ شعر پڑھا۔

امروز کہ چشم من و عرفی بہم افتاد
باہم نگرستیم و گرستیم و گذشتیم

میں نے چند شعر اسی قبیل کے پڑھے اور آبدیدہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ خاں موصوف متفکر ہے۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے۔ کہا کچھ نہیں۔ میں نے پھر کہا: "آخر کیا بات ہے؟" کہا کہ جس وقت آپ شہر میں آتے تھے تو قسم قسم کی مٹھائیاں اور حلوے ساتھ بیٹھ کر کھاتے تھے آج عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے گھر میں شکر تک نہیں کہ آپ کے لئے شربت ہی بنالیں۔ میں نے کہا یہ سب باتیں تو انبساط کے لئے تھیں آپ خوب جانتے ہیں کہ میں شکم بندہ نہیں ہوں زمانہ بدلتا رہتا ہے وہ شکر و شیرینی کا وقت تھا۔ یہ زمانہ تلخی کا ہے۔ آپس میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک عورت سر پر خوان رکھے ہوئے دروازے سے داخل ہوئی۔ اور کہا کہ سعید الدین خاں خانساماں کی بہن نے آپ کو دعا کہی ہے اور کچھ حلوۂ نزاکت اور شیرینی شبنہ بھیجی ہے۔ خاں موصوف کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور مجھ سے کہنے لگے کہ یہ روسیاہ اپنی قدر خوب جانتا ہے ایک مدت فاقہ کشی میں گذری ہے۔ پانی کا گھونٹ اور روٹی کا ٹکڑا تک میسر نہیں آیا۔ شیرینی اور حلوہ کا کیا ذکر ہے آپ میرے مہمان ہیں۔ یہ آپ کا ہے مجھے میرا حصہ

دے دیجئے۔ اور باقی اپنے گھر بھیج دیجئے۔ میں نے کہا بہت ہے میں اتنا کیا کروں گا کہا آپ کے بیٹے میر فیض علی کے کام آئے گا۔ غرض اس نیک مرد نے بہت اصرار سے حلوہ کی قاب اور شیرینی کا خوان میرے گھر بھیج دیا۔ دو تین دن اسی پر گذر اوقات ہوئی۔ تیسرے دن راجہ کے چھوٹے بیٹے نے مجھے بلایا اور میرا احوال پوچھا اور کہا کہ راجہ صاحب کے آنے تک آپ میرے پاس رہیئے۔ میں نے کہا معیشت کا سامان تو ہے ہی نہیں کیسے رہوں؟ کہا آپ خاطر جمع رکھیں یہاں سب کچھ موجود ہے۔

خدا اسے خوش رکھے اس نے بڑی شگفتہ دلی سے میرے لئے تمام ضرورت کا سامان مہیا کیا،،[۱]

۱۳ر فروری ۱۷۶۰ء کو پیشوا کے احمد نگر کیمپ میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ نظام کو شکست فاش دی جا چکی تھی اور اس کی سلطنت حیدرآباد بیجاپور کے علاقوں تک سمٹ گئی تھی۔ نظام مجبور تھا کہ اپنی آمدنی کا ۱/۲ حصہ مرہٹوں کو دیتا رہے۔ پیشوا کے درباری اس کی خوشامد میں لگے ہوئے تھے اور یہ کہہ رہے تھے، حضور کا وہ مرتبہ ہے جو سکندر اعظم کا تھا۔ آپ کے غلاموں کے غلاموں نے جس کو بھی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لیا اسے خاک میں ملا دیا۔

لیکن یہ مسرت دیر پا نہیں تھی۔ شمالی ہندوستان سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ احمد شاہ ابدالی نے پھر ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے۔ پنجاب مرہٹوں سے خالی ہو چکا ہے۔ اور دتاجی سندھیا۔ روہیلوں کو شکست دینے میں ناکام رہا ہے وہ نہ ان سے تاوان جنگ وصول کر سکا اور نہ شکرتال ہی لے سکا۔ اس کے بعد یہ خبر آئی کہ احمد شاہ ابدالی دوآب تک آگیا ہے اور دتاجی دلی پر حملہ کرنے والا ہے۔

---

[۱] ذکر میر ص ۹۳۔

لیکن اس کے بعد خاموشی چھاگئی اور شمالی ہندوستان سے تین ہفتہ تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔ اس کے بعد اطلاع آئی بھی تو یہ کہ دتاجی مارا گیا۔ اور جنکوجی راجپوتانہ بھاگ گیا۔ گویا مرہٹہ فوج کا نام ونشان شمالی ہندوستان سے مٹ گیا ہے۔ اس ایک شکست نے پیشوا کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً سداشیو بھاؤ کو جو نظام کا فاتح تھا، ایک بڑی فوج دے کر شمالی ہندوستان بھیجا۔

ابدالی کا حملہ ۱۷۶۰ء

اس وقت دلی کے تخت پر شاہ جہاں ثانی حکمراں تھا۔ لیکن وہ عالمگیر ثانی سے بھی زیادہ بے دست وپا اور مجبور محض تھا۔ عماد الملک نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قلعہ کو خوب لوٹا اور پچاس لاکھ کا ساز وسامان لے گیا۔ اس وقت مرکز ثقل دلی سے دوآب منتقل ہو گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے دوآب میں اپنا کیمپ بنا لیا تھا وہاں اس کو رسد کے حاصل کرنے کی بھی آسانی تھی اور ہندوستان کے معاملات کی طرف توجہ کرنے کی بھی۔ مئی ۱۷۶۰ء میں یہ خبریں بھی آرہی تھیں کہ شاہ عالم ثانی انگریزوں سے ہار چکا ہے۔ اور وہ ابدالی کی دعوت پر بہار سے دلی آیا ہی چاہتا ہے۔

دلّی پر مرہٹوں کا قبضہ

جون کے آخر میں مرہٹوں کی فوج آگرہ تک پہنچ گئی لیکن جمنا میں طغیانی آنے کی وجہ سے دلی اور دوآب کا تعلق منقطع ہو گیا۔ مرہٹوں نے یہ دیکھ کر کہ شاہی فوج مقابلہ کی تاب نہیں رکھتی اور ان کو افغانوں سے پوری مدد نہیں مل سکتی، ۲ر اگست ۱۷۶۰ء کو دلّی پر قبضہ کر لیا۔

اس زمانہ میں شجاع الدولہ نے اس کی کوشش کی کہ پیشوا اور ابدالی میں بھاؤ اور نجیب کے ذریعہ صلح ہو جائے لیکن اس کی شرط یہ تھی کہ شاہ عالم کو دلّی

کا بادشاہ اور اس کے بڑے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنایا جائے اور شجاع الدولہ کو وزیر الممالک۔ اسی کے ساتھ یہ شرط بھی تھی کہ مرہٹے دکن کو اور درانی اپنے گھر کو چلے جائیں اس تجویز کو سنتے ہی عماد الملک اور سورج مل جاٹ آگ بگولا ہو گئے اور وہ بغیر بھاؤ سے اجازت لئے بلبھ گڑھ آ گئے۔ مرہٹوں کو سورج مل کی علیحدگی سے بڑا نقصان پہنچا اب شمالی ہندوستان میں ان کا کوئی دوست نہیں رہا۔ صاحب عماد السعادت نے اس کی وجہ بھاؤ کی تمکنت قرار دی ہے۔ بھاؤ نے سورج مل سے کہا کہ تم تو نرے زمیندار ہو۔ فوج کشی کیا جانو۔ بھاؤ نے ملکر کو بھی بد دل کر دیا اور کہا کہ وہ سٹھیا گیا ہے اور اس کی کوئی بات عقل کی نہیں ہوتی اس طرح سداشیو بھاؤ نے اپنے اور بیگانے سب کو خفا کر دیا اس نے دلی تولے لی تھی اور اس سے یقیناً مرہٹوں کا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی ذمہ داریاں بھی بہت تھیں ایک تو وہ جاٹوں کے سرسبز اور شاداب ملکوں سے دور ہو گیا تھا۔ اور اس کی غذائی دقتیں بہت بڑھ گئی تھیں دوسرے اب وہ بادشاہ اور اہل قلعہ کے خرچ کا بھی کفیل تھا اس کے لئے کم سے کم ایک لاکھ روپیہ ماہوار کی ضرورت تھی لیکن اس وقت بے سروسامانی اور تہی دستی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے آدمی فاقے کر رہے تھے[1] گھوڑوں کو چنا میسر نہ آتا تھا گھوڑے اور سپاہی دونوں لاغر اور کمزور[2]

---

[1] بقول حضرت شاہ ولی اللہ ملازمین شاہی تک کی یہ حالت تھی کہ "کاسۂ گدائی در دست گرفتہ" شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۱۵ [2] سودا نے گھوڑے کی ہجو میں لکھا ہے ؎

نہ استخواں نہ گوشت، نہ کچھ اس کے پیٹ میں — دھونکے ہر دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لہار

میر نے لکھا ہے ؎ فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس — بھوک سے عقل گم، نہیں ہیں حواس

ہوگئے تھے، چاول بڑی دشواریوں اور مصیبتوں سے ملتا تھا۔ ایک سپاہی اور اس کے گھوڑے کا خرچ دو سو روپیہ مہینہ کا تھا لیکن ان کو ادا کرنے کے لئے رقم نہیں تھی۔ اس لئے بھاؤ نے ان کو تین مہینہ تک تنخواہ نہیں دی۔ قلعہ سے کچھ وصول نہیں ہو سکتا تھا اس کو نادرشاہ، احمد شاہ ابدالی اور عماد الملک نے اتنا لوٹا تھا کہ کسی بڑی رقم کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ عماد الملک نے تو دیوان خاص کی چاندی تک نکلوالی تھی بھاؤ نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور جو کچھ چاندی رہ گئی تھی اس کو ۶ اگست ۱۷۶۰ء کو گلوا لیا۔ اس سے نو لاکھ روپیہ حاصل ہوئے۔ لیکن مشکل سے ایک مہینہ کا خرچ چل سکا۔

بھاؤ نے اپنی مالی حالت کو بہتر کرنے کے لئے اور ابدالی کے سلسلہ رسل و رسائل کو بند کرنے کے لئے "کنج پورہ" پر حملہ کر دیا اس لڑائی میں عبد الصمد خاں اور میاں قطب شاہ مارے گئے۔ اور بھاؤ کو پوری فتح حاصل ہوئی۔ (اکتوبر ۱۷۶۰ء) اس خبر کو سن کر احمد شاہ ابدالی کی فوجیں آگے بڑھیں اور پانی پت کے میدان میں آکر بھاؤ کی فوجوں سے مقابل ہوئیں۔

اس وقت مرہٹے اور افغان دونوں یہ چاہتے تھے کہ شجاع الدولہ کی امداد حاصل کرلیں بھاؤ نے شجاع کو خط پہ خط لکھے اور کئی سفیر بھیجے اُسے یقین دلایا کہ مرہٹوں کا مقصد صرف دہلی کے شاہی خاندان کو مستحکم کرنا اور انتظام سلطنت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے۔ انھوں نے شجاع الدولہ کی ماں سے بھی مدد کی درخواست کی اور اس محبت کے واسطے دئے جو مرہٹوں میں اور اس کے شوہر میں تھی۔ لیکن شجاع الدولہ یہ جانتا تھا کہ مرہٹے برابر عماد الملک کی مدد کرتے رہے ہیں۔ اور عماد الملک صفدر جنگ کے خاندان کا سخت دشمن تھا۔ دوسرے وہ یہ بھی جانتا تھا کہ افغان لوٹ مار کرنے آئے ہیں روپیہ

ے کر چلے جائیں گے۔ مرہٹے اگر جیت گئے تو وہ اس کی جاں کا عذاب بن جائیں گے۔
اس طرح نجیب الدولہ کی کوشش سے شجاع الدولہ بھی احمد شاہ ابدالی کے ساتھ مل گیا۔ ابدالی نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور اُسے "فرزند خاں" کا خطاب دیا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی

۱۷۶۱ء میں پانی پت کی مشہور لڑائی ہوئی مرہٹوں کو سب سے بڑی دقت رسد اور روپے کی تھی۔ پیشوا نے یکم جنوری ۱۷۶۱ء کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ بھیجا اس نے پان پان سو روپیے سپاہیوں کی کمر سے باندھ دئے تھے۔ لیکن یہ سب لوگ غلطی سے ابدالی کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ درانیوں نے ان سب کو تہ تیغ کردیا۔ صرف ایک آدمی بچ کر نکل سکا۔ اس طرح مرہٹوں کے راستے بند ہو گئے اور ان کی پریشانیاں انتہا کو پہنچ گئیں نہ سپاہیوں کے لئے کھانا تھا اور نہ گھوڑوں کے لئے چارہ۔ ۱۳ جنوری ۱۷۶۱ء کو فاقہ کش مرہٹہ سپاہی بھاؤ کے پاس پہنچے۔ اور اس سے کہا: "آج دو دن ہوئے کہ ہم میں سے کسی کے منہ میں کھیل تک اڑ کے نہیں گئی ہم یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اجازت دیجئے کہ مرجائیں یا دشمن کو مار بھگائیں۔"

چنانچہ ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو بڑا زبردست رن پڑا چاروں طرف سے ہر ہر مہادیو، یا علی یا علی کی آوازیں آتی تھیں۔ مرہٹوں کی طرف سے ابراہیم گردی میر آتش ایسی بہادری سے لڑا کہ دشمن بھی تعریف کرنے پر مجبور ہوئے لیکن مرہٹوں کی توپیں اتنی بڑی تھیں کہ وہ آسانی سے حرکت نہیں کر سکتی تھیں۔ ابدالی کی ہلکی اور سبک تھیں۔ دوسرے افغانوں کی فوج کا نظم و نسق بہت اعلیٰ تھا۔ اور وہ اس وقت بلاشبہ ایشیا کی سب سے اچھی فوج تھی۔ اس لئے مرہٹے اس کے آگے نہ ٹھہر سکے۔ سہ پہر تک

ساری مرہٹہ فوج کافور ہوگئی اور ان کا اتنا زبردست نقصان ہوا کہ اس کا صحیح اندازہ کرنا آسان نہیں ہے۔ ۳۲ تو صرف لاشوں کے ڈھیر تھے اور ہر ڈھیر میں تقریباً ۱۰۰۰ مقتول تھے۔ اس طرح مرنے والوں کی تعداد اندازاً ۳۲ ہزار ہوگی۔ بعض ایسے بھی تھے جو بیماری اور قحط کی نذر ہوگئے تھے ہزاروں بھاگتے میں مارے گئے۔

جو لوگ قید ہوئے ان کی تعداد بائیس ہزار بتلائی جاتی ہے ان میں خوش رو غلام اور کنیزیں سب ہی شامل تھیں ہر افغان کے ساتھ دس بیس اونٹ سامان سے لدے ہوئے تھے۔ گھوڑے جو ان کے ہاتھ لگے وہ پچاس ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ روپیہ اور جواہرات کا تو ذکر ہی کیا[1]

مہاراشٹر کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جہاں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ اسی لڑائی میں وشواس راؤ جو پیشوا کا سب سے بڑا لڑکا تھا مارا گیا۔ بھاؤ کا سر قلم کر دیا گیا۔ اور دو دن کے بعد جا کر کہیں اس کی لاش مل سکی۔ جسونت راؤ تکوجی سندھیا، جنکو سندھیا، ابراہیم خاں گردی، شمشیر بہادر، انتیاجی یہ سب ہلاک ہوگئے۔ سنتاجی کے چالیس زخم آئے اور مہادجی سندھیا کے پیر میں ایسی چوٹ لگی کہ عمر بھر یہ زخم ٹھیک نہ ہو سکا۔ سداشیو راؤ بھاؤ کو تقریباً تمام مورخین نے اس شکست کا ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ لیکن اس کی جاں فروشی، اولوالعزمی اور غیر معمولی شجاعت وہمت میں شبہ نہیں——

مرہٹہ فوج اب بالکل منتشر ہو چکی تھی اور افغان انکا پیچھا کر رہے تھے۔ ان بھاگنے والوں کی ہمت ایسی چھوٹ گئی تھی کہ جس دیہات سے گذرے وہاں کی عورتوں تک نے ان کو لوٹ لیا۔ گاؤں والوں نے ان کے ساتھ

---

[1] سیر المتاخرین (نول کشور)

نرم دلی کا برتاؤ نہیں کیا اس لئے کہ یہی وہ لوگ تھے جو ان کو ہر سال دق کیا کرتے تھے بعض مرہٹہ سپاہیوں کی پگڑی، ان کی شال، انگوچھا ہر چیز چھین لی گئی سورج مل جاٹ نے بڑی انسانیت اور مروّت دکھلائی اور ان ظلم رسیدوں کی جو مدد بن پڑی وہ کی ——

پانی پت کی تیسری لڑائی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ ہندوستان میں ان کا اقتدار تقریباً ختم ہو گیا۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کے پاس کیا نہیں تھا؟ لیکن اس کے باوجود وہ غیر ملکی فوجوں کے آگے نہیں ٹھہر سکے۔ اس طرح تمام ہندوستان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مرہٹوں کا ساتھ بہت کمزور ساتھ ہے اور ان کی دوستی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔

اس کے علاوہ مرہٹوں کے بڑے بڑے افسر اس لڑائی میں کام آگئے تھے اور ان کے یہاں ایسے آدمیوں کی کمی ہو گئی تھی جو ان غیر معمولی حالات میں مرہٹہ قوم کی رہنمائی کر سکیں۔

ابدالی کا داخلۂ دہلی

اس فتح کے اگلے دن احمد شاہ ابدالی بہت قیمتی پوشاک پہن کر اور کوہ نور ہیرا لگا کر حضرت بو علی قلندرؒ کے مزار پر حاضر ہوا اور وہاں اس فتح یابی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو وہ دہلی میں داخل ہوا دہلی پر تین مہینہ سے موت کی کیفیت طاری تھی۔ اب احمد شاہ ابدالی کے آتے ہی وہ غلّہ جو کمیاب تھا نایاب ہو گیا۔ ابدالی نے محل میں رہنا شروع کیا اور اس کی بیگمات نے ممتاز محل کے کمروں پر قبضہ کر لیا۔ تین مہینہ کی محنت شاقہ کے بعد اب اس نے آرام کی طرف توجہ کی لیکن اس عیش میں درانی سپاہیوں کی بغاوت کی وجہ سے کھنڈت پڑ گئی ان کی تنخواہیں دو سال سے ادا نہیں ہوئی تھیں اور وہ لوگ گھر جانے کے لئے بے چین تھے۔ اس لئے احمد شاہ ابدالی نے ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء کو کوچ کا حکم دیدیا۔ لوٹتے ہوئے

انھوں نے تین دن تک دلّی میں خوب لوٹ مار کی۔

میر نے سردار بھاؤ کے غرور اور سورج مل جاٹ سے اس کے اختلاف کا حال لکھا ہے وہ لکھتے ہیں: "رئیس دکن نے جو استقلال واقعی رکھتا تھا اور اس کے پاس بے شمار لشکر و اسباب و آلات تھے سورج مل جاٹ اور عماد الملک کی جمعیت کی مطلق پروا نہ کی اور کہا یہ کیا چیز ہیں؟ ان کی دولت کا چراغ ایک پھونک سے بجھا دوں گا۔ میں ان کے بھروسے پر دکن سے نہیں آیا ہوں۔ بھاؤ نے صمد خاں کو قتل کر کے اس جمعیت کو منتشر کر دیا۔ اس سے دکھنیوں کا دماغ اور پھر گیا۔ اور وہ پانی پت کے قریب لڑنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ جس وقت دریائے جمنا پایاب ہوا تو شاہ مشرق کی طرف سے عبور کر کے پہنچا۔ دونوں فوجیں صف آرا ہوئیں تو خبر پہنچی کہ مرہٹہ عہدیدار گووند پنڈت (گووند بلال بندیلہ) ایک جم غفیر کے ساتھ دکھنیوں کی مدد کے لئے آ رہا ہے۔ ایک سردار شاہ کے لشکر سے جدا ہو کر اس کے سر پر جا پہنچا اور اس کی جمعیت کو پریشان کر دیا۔ (۱۷ ستمبر ۱۷۶۰ء)

"اس وقت راجہ (راجہ ناگر مل) کمہیر میں تھا جو سورج مل کے قبضہ میں ہے میں بھی وہیں تھا۔ میں نے جا کر عرض کی کہ ایک عرصہ سے آپ کا انتظار کر رہا تھا اب اگر اجازت ہو تو کسی طرف چلا جاؤں فرمایا آپ کا ارادہ بیابان مرگ کا معلوم ہوتا ہے میں ایسی حالت میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا اس روز سے حسب سابق دستخط کر کے میرا روزینہ مقرر کر دیا۔ کیونکہ شاہ جہاں آباد اس وقت ویرانہ سے بڑھ کر تھا میں نے ان کی دیوار کے سائے میں رہنا غنیمت سمجھا۔"

میر نے مرہٹوں کی شکست اور ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ قرار دیا ہے کہ انھوں نے جنگ گریز کا قدیم طریقہ ترک کر دیا تھا ذکر میر میں لکھتے ہیں:

اگر دکھنیاں بجنگِ گریز کہ طورِ قدیم آنہا بود می جنگیدند اغلب کہ غالب

می گردیدند۔

"وہ توپ خانہ کے حصار میں بیٹھ گئے۔ شاہی فوج ان کے درپے ہو گئی اور رسد کی آمد بند کر دی آخر مجبور ہو کر نکل پڑے۔ بہت ہی سخت لڑائی ہوئی دونوں طرف کے بہادروں نے دادِ مردانگی دی لیکن فتح شاہ ہی کی رہی۔ بہت قتل اور خوں ریزی ہوئی اور دکنی بُری طرح مارے گئے۔ بھاؤ غیور اور بہادر جوان تھا وہ اپنی آنکھ سے یہ سماں دیکھ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ اب میں دکن جاکر کیا منہ دکھاؤں گا وہ جان بوجھ کر فوج کے قلب پر ٹوٹ پڑا اور دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیا۔ جو سردار بچے وہ فقیروں کی طرح آوارہ ہو گئے سپاہی گھوڑے اور سامان چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دیہات کے لوگ ان بے چاروں کو ایک مٹھی بھنے ہوئے چنے دیدیتے تھے، اس پر بھی بہت سے بھوکوں مر گئے یا سردی سے اکڑ کر رہ گئے۔ جو فوج قلعہ میں تھی وہ ابدالی کے ڈر سے بھاگ گئی۔ افغان لشکریوں اور مشرق کے سرداروں کو کروڑوں روپیہ کی جنس ہاتھ لگی۔ افغان جو فقیر تھے مالامال ہو گئے شاہ ابدالی کر و فر کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا اور اطراف و جوانب کے سرداروں کے نام احکام بھیجے کہ آکر ملازمت حاصل کریں۔ راجہ کے نام بھی پیغام پہنچا (غالباً راجہ ناگرمل) راجہ نے احمد شاہ ابدالی کی ملازمت اس کے وزیر شاہ ولی خاں کے توسل سے حاصل کی یہ وزیر با تدبیر ان سے بہت خوش ہوا۔ اور اپنی مُہر ان کے حوالہ کی اور نیابتِ وزارت کے عہدے سے سرفراز ہوا۔

"وزیر نے ایک بار کہا کہ شجاع الدولہ کے باپ سے تمھاری (راجہ ناگرمل کی) بڑی دوستی تھی۔ مگر یہ (شجاع الدولہ) بچے ہیں زمانہ کو نہیں پہچانتے بہتر ہے کہ تم اور نجیب الدولہ انھیں جاکر سمجھاؤ ورنہ کل کو کچھ ہوا تو ہم ذمہ دار نہیں۔

ان کو ہزار بہانوں سے لائے شکر ہے کہ وزیر سے ان کی صحبت موافق ہوئی۔ اور شجاع الدولہ اور وزیر درانی کے دلوں کی کدورت رفع ہوئی۔ میں اس سفر میں راجہ ناگرمل کے ساتھ تھا۔ ایک روز شہر کو نکلا۔ چلتے چلتے شہر کے ایک تازہ ویرانے میں پہنچا۔ ہر قدم پر آبدیدہ ہوتا اور عبرت پکڑتا جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا میری حیرت بڑھتی گئی۔ مکان پہچانے نہیں جاتے تھے۔ مکینوں کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ مکان ٹوٹے ہوئے۔ دیواریں بیٹھی ہوئی خانقاہیں بے صوفی کے اور خرابات بے مست کے ویران پڑے تھے۔"

دلی کی خرابی کی پُردرد داستان

میر لکھتے ہیں کہ بازار کہاں جن کا ذکر کروں، اطفال تہہ بازار کہاں، حسن کہاں جس کو پوچھوں، جوانانِ رعنا چل بسے، پیران پارسا گذر گئے محلے خراب کوچے برباد، ہر طرف وحشت ہویدا اور انس ناپیدا، ایک استاد کی رباعی یاد آگئی:

افتاد گذارم چو بویرانۂ طوس
دیدم چغدے نشستہ برجائے خروس
گفتم چہ خبرداری ازیں ویرانہ
گفتا خبر ایں است کہ افسوس افسوس

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "ناگاہ اس محلہ میں پہنچا جہاں میرا گھر تھا دن رات صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ شعر پڑھتا تھا اور عاشقانہ بسر کرتا تھا راتوں کو روتا تھا اور حسینوں سے عشق کرتا تھا۔ وہاں کوئی شناسا تک نہ ملا کہ دو گھڑی باتیں کرلوں کچھ دیر کھڑا حیرت سے تکتا رہا۔ سخت صدمہ ہوا۔ اور عہد کیا کہ اب پھر نہ آؤں گا اور جب تک زندہ ہوں شہر کا قصد نہ کروں گا۔"

میر آگے لکھتے ہیں کہ: "شاہ ابدالی کی فوج کو وطن سے نکلے ہوئے بہت دن ہوگئے تھے۔ لشکریوں نے یک زبان ہوکر کہا: "کہ ہم تو وطن جاتے ہیں۔ ابدالی

اگر چاہے تو رہے۔ ہمیں نہ بیوی کی خبر ہے نہ بچوں کی۔" ابدالی نے یہ خیال کر کے کہ بے فوج کے غیر ملک میں رہنا عقل مندی کے خلاف ہے۔ ناچار اپنے دارالسلطنت قندھار کا رخ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے وزیر شاہ ولی خاں کو واپس بلا لیا۔ وہ اس وقت ملک گیری کی مہم پر نکلا ہوا تھا اس نے پہلے شجاع الدولہ اور راجہ ناگرمل کو رخصت کیا اس کے بعد شہزادہ جوان بخت کو شاہ عالم کا ولی عہد مقرر کر کے اور دہلی کو نجیب الدولہ کی نگرانی میں دے کے دلی سے کوچ کیا۔ چونکہ افغانوں کا غرور حد سے گذر گیا تھا اس لئے غیرت الٰہی نے انھیں سکھوں کے ہاتھوں ذلیل کیا سکھوں کی جمعیت چالیس پچاس ہزار تھی۔ انھوں نے اس لشکر پر چھاپا مارا اور اس قدر دق کیا کہ یہ بھاگے بھاگے پھرتے تھے اور کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ غرض انھوں نے ان بے ناموسوں کو اس قدر رسوا کیا کہ امیروں اور سرداروں کی نظر میں ان کی عزت گر گئی افغانوں نے جان سلامت لے جانے کو غنیمت سمجھا اور اس شہر کی نظامت ایک ہندو کو دے کر آگے بڑھ گئے سکھ ان کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے اٹک تک پہنچے۔ اور اس صوبہ پر جس کا محاصل دو کرور روپیہ تھا منصرف ہو گئے۔ چند روز کے بعد انھوں نے اس اجل رسیدہ ہندو کو قتل کر کے لاہور بھی لے لیا۔"[۱۵]

اسی سال سورج مل نے شاہی امرا کی سستی اور غفلت دیکھ کر اکثر محالات لے لئے اور قلعہ دار	آگرے کی بربادی

کی نمک حرامی سے اکبر آباد پر بھی قبضہ کر لیا۔ (۱۲ جون ۱۷۶۱ء)

---

۱۵ ذکر میر ص ۱۰۲۔

اس وقت آگرہ سلطنت کے سب سے مالدار شہروں میں سے تھا۔ اکبر کے کے زمانے سے اس میں خزانے اور دفینے موجود تھے۔ جن کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ دوسرے دلی کی بربادی سے بہت سے مالدار اپنی جان و مال کو لے کر وہاں چلے گئے تھے اس لئے آگرہ کی غارت گری میں فائدہ ہی فائدہ تھا کہا جاتا ہے کہ سورج مل کے ہاتھ پچاس لاکھ کی رقم آئی۔ آلاتِ حرب اور نقد و جنس کا شمار آسان نہیں ہے یہ سب سامان بھرت پور اور ڈیگ منتقل کر دیا گیا۔

شاہ عالم بادشاہ اپنے وزیر شجاع الدولہ کے کہنے پر بے شمار لشکر لے کر آگے بڑھا اور سب میں یہ مشہور ہو گیا کہ وہ سورج مل کو سزا دینے کے لئے آرہا ہے۔ سورج مل اپنے شہر اور قلعہ کی حفاظت کے لئے تیار ہو گیا۔ اور جنگ کا ارادہ پختہ کر لیا۔ اس نے راجہ ناگرمل کو لکھا کہ اس وقت آپ کا آنا ضروری ہے۔ راجہ نے جو بڑے موقع شناس تھے اور آشنائی پیدا کرنے میں کمال رکھتے تھے بادشاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا اور اس فوج کو واپس کر دیا۔

میر کا آگرہ جانا

میر لکھتے ہیں: "میں اس وقت راجہ ناگرمل کے ساتھ تھا اس تقریب سے تیس سال کے بعد اکبرآباد پہنچا اور اپنے والد اور عم بزرگوار کے مزاروں کی زیارت کی۔ وہاں کے شعرا مجھے استادِ فن سمجھ کر اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ میں صبح و شام دریا کے کنارے جا بیٹھتا ایک طرف باغات تھے اور دوسری طرف قلعہ اور امراء کی حویلیاں۔ بیچ میں گویا نہر بہشتی بہتی تھی۔ میں اکثر جاتا میری شعر گوئی اور معنی نزاشی کی شہرت عالم میں پھیل گئی تھی۔ چنانچہ شرگیں معشوق، خوش ترکیب اور جامہ زیب حسین اور بہت سے پاکیزہ طینت اور موزوں طبیعت میرے گرد

جمع رہتے اور میری عزت کرتے دو تین بار شہر بھی گیا اور وہاں کے علماء، فقرا اور شعرائے ملا لیکن کوئی ایسا مخاطب جس سے دلِ بےتاب کو تسلّی ہوتی، نہیں ملا میں نے دل میں کہا سبحان اللہ یہ وہ شہر ہے جس کے ہر گلی کوچہ میں عارف کامل فاضل، شاعر، منشی، دانشمند، فقیہہ، متکلم، حکیم، صوفی، محدّث، درویش اور خانقاہ، مہمان سرائے مکان و باغ ملتے تھے آج وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ملتی کہ کچھ دیر خوشی سے بیٹھوں اور کوئی آدمی ایسا نہیں ملتا کہ اس سے باتیں کر کے لطف اٹھاؤں۔ سارا شہر ایک ویرانہ ہے جس سے ایک وحشت ٹپکتی ہے۔ میں چار مہینہ آگرہ میں رہا۔ چلتے وقت بڑی حسرت ہوئی وہاں سے پھر سورج مل کے قلعوں میں واپس آگیا"[۵۱]

شاہ عالم ثانی عالم گیر ثانی کو ۲۹ر نومبر ۱۷۵۹ء کو قتل کیا گیا تھا اس وقت اس کا بڑا بیٹا شہزادہ شاہ عالم مارا مارا پھر رہا تھا اور اس کو اس کی اجازت نہیں تھی کہ وہ دہلی آسکے۔ پورے بارہ برس کے بعد اس کی یہ گردش ختم ہوئی۔ اور وہ بادشاہ کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہو سکا۔ لیکن اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان ۲۲ر دسمبر ۱۷۵۹ء کو ہی کر دیا تھا۔ صرف نو مہینہ یعنی ۳۰ر نومبر ۱۷۵۹ء سے لے کر ۱۰ر اکتوبر ۱۷۶۰ء تک۔ البتہ عماد الملک کا نامزد کیا ہوا بادشاہ شاہ جہاں ثانی حکمراں رہا۔ لیکن اس کے بعد میدان خالی تھا اور کوئی اس کا حریف مقابل میں نہیں تھا۔

مرزا عبد اللہ جو عالی گہر اور شاہ عالم کے خطابات سے بھی مشہور ہے۔ عالم گیر ثانی کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ باپ کے انتقال کے وقت اس کی عمر

---

۵۱ ذکر میر ص ۱۰۴۔

تیس برس کی تھی۔ اس میں کوئی ایسی غیر معمولی لیاقت وقابلیت تو نہیں تھی جو گرتی ہوئی سلطنت کے سنبھالنے میں مددگار ہوتی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس وقت دہلی کے شہزادوں میں سب سے زیادہ لائق اور قابل تھا۔ اس کی عمر کے پچیس برس باپ کے ساتھ قید و بند میں گذرے تھے۔ وہاں اس کو انتظامی معاملات کا تجربہ تو نہ ہو سکا۔ لیکن وہ بُری صحبتوں میں بھی گرفتار نہ ہوا باپ کے تخت نشین ہونے کے بعد بھی اس کی مشکلات کم نہیں ہوئیں۔ عماد الملک کی مخالفت کی وجہ سے اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ مارا مارا پھرنا پڑا اس مصیبت اور تکلیف نے اسے ضبط و نظم سکھلایا۔ اور اس کو کچھ تھوڑا سا تجربہ انتظام سلطنت اور فوج کشی کا بھی ہو گیا۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت[۱] اور ہندوستانی زبانیں اچھی طرح جانتا تھا۔ اور بڑے بامزہ شعر[۲] کہتا تھا۔ اسے ادب، انشاء، مذہب اور تاریخ کی بہت اچھی واقفیت تھی اور وہ اپنا کچھ وقت روزانہ پڑھنے لکھنے میں صرف کرتا تھا۔ اگر اس کو سازگار حالات ملتے تو وہ اپنی بادشاہت کے اقتدار کو قائم رکھتا۔ لیکن اس وقت سیاسی انحطاط کے ساتھ ساتھ اخلاقی بدحالی بھی انتہا کو پہنچ چکی تھی کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کے دل میں

۱؎ مجموعۂ نغز میں سنسکرت جاننے کا ذکر موجود ہے۔ ۲؎ شاہ عالم کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی وہ اردو اور فارسی میں آفتاب اور بھاشا میں شاہ عالم تخلص کرتا تھا۔ فارسی میں اس نے مرزا محمد فاخر مکین سے مشورہ سخن کیا ہے (نشتر عشق ۶۵۵ الف و ب) آزاد کا بیان ہے کہ اردو میں سودا کی اصلاح لی (آب حیات ص ۱۴۹) لیکن سودا شاہ عالم کے دلی آنے سے پہلے فرخ آباد جا چکے تھے اس لئے یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا، شاہ عالم کے ہندی فارسی اردو اور پنجابی شعروں کا مجموعہ "نادراتِ شاہی" رام پور سے شائع ہو گیا ہے۔

سلطنت کی یا ملک کی محبت ہو ہر آدمی اپنی حرص و ہوس میں مبتلا تھا۔ کسانوں، غریبوں اور مزدوروں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جاتا تھا اور کوئی یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ ان کی خوش حالی سلطنت کی بہتری کے لئے ضروری ہے۔[۵۱]

اس وقت امراء میں سب سے بڑا رتبہ عماد الملک کا تھا وہ تعلیم یافتہ تھا، شعر و سخن سے دلچسپی رکھتا تھا اور فن انشاء کا ماہر تھا لیکن اپنی غرض کا بندہ تھا اس کی ہوس کاری خود غرضی اور سفاکی کی مثال نہیں ملتی۔ ژین لا نے لکھا ہے کہ ہر وقت تسبیح اس کے ہاتھ میں رہتی تھی لیکن یہ بھی دراصل اس کی ریاکاری اور مکاری تھی اس نے کبھی ان لوگوں کے قتل میں تامل نہیں کیا جو اس کے محسن اور

---

[۵۱] شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ سلطنت کی تباہی کا ایک سبب کاشتکاروں بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ جو بے چارے حکومت کے مطیع اور اس کے حکم کو مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نادہند ہیں وہ اور سرکش ہو رہے ہیں" باب سیاست المدینہ شاہ صاحب نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب کا بڑی قابلیت اور دیدہ وری کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ اور اقتصادی تباہی کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔ اسی باب میں لکھتے ہیں:
"لوگوں کو یہ عادت ہو گئی ہے کہ کسی محنت کے بغیر خزانہ سے روپیہ اس دعویٰ سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں، جن کا حق اس خزانے کی آمدنی میں ہے یا ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام دیا کرتے ہیں جیسے زاہد پیشہ صوفی اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک و سلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی ایسے طریقے سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔ یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کر دیتے ہیں اور ملک پر بوجھ ہیں۔"

محروم تھے۔ شاہ عالم کی یہ بھی بدقسمتی تھی کہ اس کا پشتینی وزیر اس کا جانی دشمن تھا اور اس وزیر کو ہندوستان کی بہت بڑی طاقت پیشوا نے نامزد کیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے بھی چلتے وقت یہ ہدایات دی تھیں کہ شاہ عالم کو بادشاہ بنایا جائے عماد الملک اس کا وزیر ہو اور نجیب الدولہ اس کا میر بخشی۔ وہ اس کا بھی خواہش مند تھا کہ عماد الملک اور نجیب الدولہ میں دوستی ہو جائے اور دونوں مل کر شاہ عالم کی خدمت کریں لیکن عماد اور شاہ عالم میں دوستی کا ہونا ناممکن تھا اس وقت دلّی میں شہزادہ جوان بخت ولی عہد تھا۔ اور شاہ عالم کی ماں زینت محل سلطنت کے کاموں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ نجیب الدولہ نے ان دونوں کو سمجھایا کہ اگر عماد الملک پھر آگیا تو تم دونوں کی خیر نہیں ہے وہ پھر کسی شاہ جہاں ثانی کو تخت پر بٹھلا دے گا۔ اس لئے شہزادہ جوان بخت نے نجیب الدولہ کو لکھا کہ آپ آکر دلی کو سنبھالیئے۔ عماد الملک متھرا میں تھا کہ نجیب الدولہ دلّی پہنچ گیا۔ (۷ / اپریل ۱۷۶۱ء)

اس نے وہاں پہنچتے ہی تمام انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شہر کا فوجدار اپنے بیٹے ضابطہ خاں کو مقرر کیا جس نے انصاف اور ایمان داری کے ساتھ امن وامان قائم کیا۔

میر نے اس زمانے کے واقعات مختصر لیکن دلچسپ انداز میں لکھے ہیں ذیل کے بیانات زیادہ تر ان ہی سے ماخوذ ہیں۔[1]

شاہ عالم کو مئی ۱۷۵۸ء میں دلی سے بھاگنا پڑا تھا ۱۷۵۹ء میں اس نے

---

[1] ہم نے ذکر میر کے اس اُردو خلاصے سے بھی مدد لی ہے جو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے رسالہ اُردو ج ۷ میں شائع کیا تھا۔

بہار پر پہلا حملہ کیا۔ اگلے سال اس نے بہار اور بنگال دونوں پر یورش کی ۱۷۶۱ء
میں اس نے بہار پر تیسری بار حملہ کیا لیکن کرنل کارناک Carnac
نے اسے شکست فاش دی اور اس کے فرانسیسی ساتھی ژین لا کو گرفتار کر لیا۔
اس وقت شاہ عالم کے پاس نہ روپیہ تھا اور نہ سپاہی وہ بالکل انگریزوں
کے رحم و کرم پر تھا لیکن انگریز بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے ان کا مقصد
یہ تھا کہ کسی طرح انگریزی مقبوضات کو آئینی حیثیت حاصل ہو جائے۔

اس وقت پانی پت کی تیسری لڑائی ہو چکی تھی۔ مرہٹے دلّی سے جا چکے
تھے۔ اور احمد شاہ ابدالی شاہ عالم کو دلّی آنے کی دعوت دے چکا تھا۔
اس لئے شاہ عالم ۱۲ر اپریل ۱۷۶۱ء کو پٹنے کے قلعہ سے روانہ ہوا انگریز
بہار کی مغربی سرحد تک پہنچانے کے لئے آئے اور اس کے بعد رخصت ہو گئے
شجاع الدولہ اس سے سرائے بیدرازی پر ملا۔ اور اس کا بڑے جوش و خروش
کے ساتھ خیر مقدم کیا (۱۹ر جون ۱۷۶۱ء) شاہ عالم نے ۱۵ر جنوری ۱۷۶۲ء
کو قلمدان وزارت شجاع الدولہ کے سپرد کیا لیکن اسی سبب سے احمد خاں بنگش
حافظ رحمت خاں اور نجیب الدولہ کے شیعہ اور سنی لشکریوں میں جھگڑا ہو گیا
اور احمد بنگش اور نجیب الدولہ روہیلہ اور شجاع الدولہ والئی اودھ متحد
ہو کر شاہ عالم کو دلّی نہ پہنچا سکے۔ اس لئے شاہ عالم بھی الہ آباد لوٹ
آیا۔

میر قاسم

میسر لکھتے ہیں کہ آگرے سے سورج مل کے قلعہ میں آنے
کے بعد میں نے سنا کہ قاسم علی خاں ناظم بنگالہ اور تجارت
پیشہ نصرانیوں میں جو وہاں مدت سے سکونت رکھتے ہیں جنگ ہوئی وہاں کی
رعایا نے جو ظلم و ستم سے تنگ آگئی تھی قاسم علی خاں کی کچھ مدد نہ کی انجام یہ

ہوا کہ وہ اپنے شکست خوردہ لشکر، تمام زر و جواہر اور مال و متاع کے ساتھ عظیم آباد میں آگیا۔ (۱۷۶۳ء) یہ صوبہ بھی اس کی مملکت میں تھا۔ وہاں شہر بند ہو کر لڑائی کی ٹھانی لیکن یہاں بھی اسے شکست ہوئی تمام مال و اسباب لے کر نو دس ہزار آدمیوں کے ہمراہ شجاع الدولہ کی سرکار کا رخ کیا جب بنارس کے متصل پہنچا تو خیمے لگا کر ٹھہر گیا۔ اور وزیر کو لکھا کہ میں آپ کی اعانت کی امید پر آیا ہوں اگر آپ نصرانیوں کی جنگ میں میری مدد فرمائیں تو میں سپاہ اور ملازمین حضور کا تمام خرچ ادا کروں گا۔ یہاں سے یہ جواب ملا کہ اول آپ یہاں آیئے اور بادشاہ سے ملازمت حاصل کیجیے۔ اس کے بعد جو کچھ حضور فرمائیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔ وہ فلک زدہ انجام سے غافل تمام اسباب و آلات اور پانسو ہاتھیوں کے ساتھ چند نابکاروں کے اعتبار پر جو درمیان میں واسطہ تھے دریا کو عبور کر کے لشکر میں داخل ہوا۔ اس طرف کے تنگ چشم لوگوں کی نظر اس کے شاہانہ اسباب پر پڑی انھوں نے چند مکار آدمیوں کو اس کے پاس بھیج کر دام میں پھنسا لیا اور دو چار روز کے بعد اپنے ناعاقبت اندیش مصاحبوں کے کہنے پر وزیر نے اس کا تمام زر و جواہر، ہاتھی گھوڑے خیمہ و فرش غرض جو کچھ اس کے پاس تھا سب کچھ لے لیا۔ اور ایک چیز نہ چھوڑی۔ اور وہ بدعہد جو درمیان میں تھے سب عہد و پیمان بھول گئے انجام یہ ہوا کہ وہ وزیر کا دست نگر ہو گیا۔ اور بیگم یعنی شجاع الدولہ کی والدہ کی سرکار سے اس کا یومیہ مقرر ہو گیا۔

جواہر سنگھ کی دست درازی

سورج مل کا بڑا بیٹا جواہر سنگھ بڑا جری سرشار تھا اور مدت سے ریاست کا خیال اس کے سر میں چکر کھا رہا تھا۔ چنانچہ وہ اس سے پہلے بھی اپنے

باپ سے لڑ چکا اور بہت کچھ خونریزی کر چکا تھا۔ اس میں دو تین بڑے بڑے زخم بھی اس کے آئے تھے۔ ان دنوں وہ فرخ نگر گیا۔ یہ شہر شاہ جہاں آباد سے مغرب رویہ تین منزل پر واقع ہے۔ اور اس کی سرحد اس کے باپ کے ملک کی سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ وہاں کے زمیندار سے جس کا باپ بیرون شہر دہلی کا فوجدار تھا جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اس جھگڑے کو طول ہوا۔ زمیندار نے بھی اطاعت نہ کی اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ جب اس طرح دو مہینے گذر گئے۔ تو سورج مل نے ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کا قصد کیا۔ (۱۷۶۳ء) کوچ سے پہلے راجہ کے گھر رخصت ہونے کے لئے آیا راجہ نے کہا کہ آپ کا جانا مناسب نہیں مبادا ہنگامہ وفساد کا باعث ہو وہاں نجیب الدولہ بھی قریب ہے۔ ممکن ہو کہ وہ ان کی رعایت کرے اور جنگ ہو جائے۔ سورج مل نے اس معقول مشورہ کی طرف مطلق التفات نہ کیا اور چلا گیا وہاں (فرخ نگر) کے رئیس کو قید کر لیا اور اس کے سپاہیوں نے لوٹ مار اور جبر و تعدی شروع کر دی اور بعض شرفا کے گھرانے تباہ کر دئے۔ ان لوگوں کے بھائی بند نجیب الدولہ کے یہاں تھے وہ بہت روئے دھوئے اور اپنی پگڑیاں زمین پر پھینک دیں۔ اس نے ان کی خاطر سورج مل سے التجا کی کہ جو کچھ ان لوگوں نے کیا تھا اس کی سزا ان کو مل گئی اب ان کی تقصیر معاف کر دیجئے۔ سورج مل نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ اور دلیرانہ شاہ جہاں آباد کی طرف بڑھا۔ نجیب الدولہ نے شہر کے دروازے بند کر لئے۔ اس پر اس نے بہت پیچ و تاب کھایا اور اپنے زور میں دریا عبور کر کے اس کے سر پر آپہنچا اور فتنہ وفساد کا موجب ہوا۔ نجیب الدولہ کی انسانیت میں کوئی شبہ نہیں۔ سو بار پیغام بھیجا کہ میں تم سے لڑنا نہیں چاہتا اور اسی لئے میں اپنی فوج کو باہر نہیں نکالتا۔ شہر کے غریبوں کو مفت میں

تکلیف ہوگی۔ یہاں لڑائی مناسب نہیں، اس نے انسانیت کا ایک جواب نہ دیا بلکہ کمینہ پن سے یہ کہلا بھیجا کہ میں نواب کی فوج دیکھ کر جاؤں گا۔ اگر جلد تشریف لائیں تو احسان ہوگا کہ مجھے دوسرے کام بھی ہیں۔ ورنہ فوج میرے تحت میں ہے۔ وہ صبح و شام میں حملہ کرنے والی ہے ——— نواب نے کہلا بھیجا کہ بہت اچھا میں بھی صبح کو حاضر ہوتا ہوں۔

میرؔ لکھتے ہیں کہ "جو شخص درمیان میں تھا وہ مجھ سے کہتا تھا کہ نواب نے آدھی رات کے وقت فوج کو دریا سے عبور کرنے کی اجازت دی اور خود لیٹ رہا۔ گھڑی بھر کے بعد اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک درخت پر ایک کوا آبیٹھا ہے۔ اور بہت سے کوّے اس کے گرد جمع ہیں۔ اور شور مچا رہے ہیں۔ اس نے ایک تیر مارا اور وہ کوا زمین پر آگرا۔ دوسرے کوّے اُسے مرا ہوا دیکھ کر یکبارگی اڑ گئے۔ اس سے اس نے قیاس کیا کہ میری فتح ہوگی۔ پو پھٹتے ہی لڑائی شروع ہوئی اور نواب ہاتھی پر سوار ہوکر دریا کے پار اترا اور بڑے استقلال سے حریف کا مقابلہ کیا۔ غرض دونوں طرف سے خوب حملے ہوئے اُدھر روہیلے تیغ بازی میں مصروف تھے ادھر سورج مل اس لشکر پر حملہ کر رہا تھا جو شہر کی سمت تھا۔ اتنے میں ایک شور اٹھا اور قلب کے سردار مدد کے لئے دوڑے اس گرد و غبار میں سورج مل کے زخم لگا اور وہ گھوڑے سے زمین پر آگرا اور رُوح پرواز کر گئی لیکن کسی کو یہ خبر نہ ہوئی کہ سورج مل

سورج مل کا ہلاک ہونا ۱۷۶۳ء

ہے اس کے سپاہی آپس میں یہ ذکر کر رہے تھے کہ وہ جس وقت ہنگامہ آرا ہوگا تو ایک قیامت برپا ہو جائیگی اس وقت سے شام تک جنگ بند رہی۔ اس طرف یہ ڈر تھا کہ رات آپہنچی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ شب خوں مارے اور ہمیں نیست و

نابود کردے اس ڈر کے مارے روہیلوں کی فوج آدھی رات تک ہاتھی گھوڑوں پر تیار کھڑی رہی لیکن سب حیران تھے کہ اس طرف سے کوئی آواز نہیں آتی ایسا تو نہیں کہ حریف فوج کو غافل رکھ کر ہم پر حملہ کرنا اور ہنگامہ برپا کرنا چاہتا ہو لشکر کے جاسوس دو دو تین تین کوس تک ادھر اُدھر گئے کسی ایک متنفس کو بھی نہ پایا۔ صبح ہوتے واپس آئے اور کہا کہ دیہات کے لوگوں سے یہ معلوم ہوا کہ مخالفوں کی ایک جماعت بڑی پریشانی کے ساتھ جا رہی تھی اور وہ لوگ افسوس کرتے جاتے تھے کہ سورج مل جیسا سردار قتل ہو جائے اور ہم بے موت اپنی جان کے ڈر سے اس کی لاش میدان جنگ میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آخری یورش میں مارا گیا اور اس کا لشکر بھاگ گیا[۱]۔ یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ صبح نمودار ہوئی اور ایک سوار ایک کٹا ہوا ہاتھ لے کر آیا اور کہنے لگا کہ یہ سوکھا ہوا ہاتھ اسی کا ہے اور اس پر ناسور بھی ہے دوسروں نے بھی اس کی شناخت کی اور پھر خوشی کے نقارے بجنے لگے۔ جب یقین ہو گیا تو بھاگتوں کا تعاقب کیا۔ اگر دریا سے پار ہو جاتے تو بڑی خرابی اور فساد کا باعث ہوتے لیکن راجہ نے لکھا کہ جیسی کچھ فتح تمھیں نصیب ہوئی ہے اُسے غنیمت سمجھو اور واپس ہو جاؤ۔ یہاں لاؤ لشکر بہت ہے اگر مقابلہ کروگے تو کام دشوار ہو جائے گا۔ نجیب الدولہ ایک صائب الرائے اور دانشمند شخص تھا اس رقعہ کے پہنچتے ہی واپس آ گیا۔ جواہر سنگھ یہ خبر سن کر خوشی کے مارے جامے میں نہ سماتا تھا ریاست کی گدی پر بیٹھا اور فوج جمع کرنے لگا۔ اب بادشاہ شجاع الدولہ کے لشکر کی حقیقت حال سنیئے۔ ناکسوں اور ناتجربہ کاروں کے مشورے سے ان کے دل میں صوبہ عظیم آباد کی فتح

---

[۱] سیر المتاخرین ج ۳ ص ۸۲۔

کی ہوس پیدا ہو گئی تھی۔ شجاع الدولہ نے بادشاہ کو ساتھ لے کر اس طرف کا قصد کیا (۱۷۶۴ء) عیسائیوں کے رئیس یعنی فرنگیوں کے سرادر نے شہر کو محکم کر کے لکھا کہ ہماری جس سے عداوت تھی اسے ہم نے ملک سے باہر نکال دیا ——— نواب اور بادشاہ سے ہمیں کچھ سروکار نہیں ہے۔ اس لشکر کشی کا کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا اس کا کیا منشا ہے اور اس فتنہ و فساد کا محرک کون ہی؟ اگر اطاعت مقصود ہی تو ہم مطیع و منقاد ہیں۔ اس زحمت و رنج کی ضرورت نہیں، اور اگر بعض نافہم مشیروں کی رائے کے بموجب ہمارا استیصال مقصود ہے تو کوئی چارہ نہیں۔ بزرگوں کا مزاج تند سیلاب کی طرح ہوتا ہے جدھر آگیا آگیا۔ ہم جو خس کے مانند ہیں کیوں کر سدِّ راہ ہو سکتے ہیں سرداروں کی طبیعت بادِ صرصر کی طرح ہے۔ ہم جو مشتِ خاک ہیں کیا مجال ہی کہ اس کا مقابلہ کریں۔ حضور کے نامعاملہ فہم لوگوں نے جو عقل سے بے بہرہ تھے اسے مکر پر محمول کیا۔ اور کوچ کرنے پر اصرار کرنے لگے جب اس شہر کے باہر دونوں فریق آمنے سامنے آئے اور فرنگی بندوقیں لے کر حملہ کرنے لگے تو بے غیرت مغل اپنے آقا کے خزانے پر ٹوٹ پڑے۔ نصرانی بڑی جرأت سے لڑتے رہے۔ نواب کے ایک سپاہی عیسیٰ نامی نے بڑی بہادری دکھائی اور جان دیدی بادشاہ مثل تماشائیوں کے کھڑے رہے۔ نواب نے جو ایک طرف لڑ رہے تھے ٹھہرنے میں مصلحت نہ دیکھی اور کچھ آدمی ساتھ لے کر صوبے کی راہ لی۔

بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء

اتنی بعید مسافت ڈیڑھ دن میں طے کی اور اپنے دار الحکومت میں پہنچ گئے۔ وہاں سے نقد و جنس حسب ضرورت لے کر فرخ آباد روانہ ہوئے۔ اگرچہ یہ عالم سبب کا دار الجزا نہیں ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہی۔ یہ شکست فاش جو اس لشکر کو ہوئی (۱۷۶۴ء) یہ اس برتاؤ کی سزا تھی جو انھوں نے قاسم علی خاں سے کیا تھا۔

وہاں نصرانی خیموں اور آلاتِ حرب وغیرہ پر قابض ہو گئے۔ اور بادشاہ کو اپنے ساتھ لیا اور اطمینان سے اس طرف کا عزم کیا اور سات آٹھ روز میں اودھ پہنچے اس فتح کے شکرانہ میں جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ انھوں نے کسی شخص کو ایذا نہ پہنچائی ایک ہفتہ کے بعد بادشاہ کا دو لاکھ روپیہ ماہانہ مقرر کر کے انھیں الہ آباد رخصت کر دیا کہ حضرت اطمینان سے بسر کریں اور ہم جانیں اور ملک ——— (۱۷۶۵ء)

"اس اثنا میں جواہر سنگھ ملہار کے ساتھ ایک لشکر غدار لے کر اپنے باپ کے خون کے دعوے سے نجیب الدولہ پر جا چڑھا اور دہلی میں مقیم ہو گیا۔ لوگ غلہ کی گرانی سے تنگ آ گئے تھے۔ یہ قتل و قتال اور جنگ و جدال قریب دو ماہ کے رہا۔ عماد الملک قلعہ بھرت پور سے نکلا زاید آدمیوں کو فرخ آباد بھیج دیا۔ اور جواہر سنگھ کا شریک ہو گیا۔ آخر شاہ ابدالی کی آمد آمد سے جو اس سال شاہ آباد تک آیا اور سکھوں کی تشویش سے بے سر و پا واپس ہو گیا۔ تمام مسودے باطل ہو گئے۔ اور اس لڑائی کا خاتمہ باہم صلح پر ہو گیا۔

عماد الملک

"عماد الملک ملہار کے ساتھ احمد خاں بنگش کے پاس چلا گیا۔ جواہر سنگھ اپنے ملک میں جا کر دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اور اپنے باپ کے ایسے سرداروں کو جو اُسے خاطر میں نہیں لاتے تھے، قتل کر دیا یا قید میں ڈال دیا۔ نواب عماد الملک اس سِن و سال میں یگانۂ عصر ہیں۔ ان میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ چنانچہ پانچ چھ طرز کے خط بہت خوبی سے لکھتے ہیں۔ فارسی اور ریختے میں بامزہ شعر کہتے ہیں اور بندے کے حال پر عنایت فرماتے ہیں۔ اور جب کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو بہت محظوظ ہو کر آتا ہوں۔"

میر لکھتے ہیں:

شجاع الدولہ

"اب شجاع الدولہ کے حال کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ جن لوگوں کی حمایت کی امید پر فرخ آباد میں مقیم تھا اُن سے سوائے طعن اور تشنیع اور بے مروتی کے کچھ نہ پایا ناچار ملہار سے ساز باز کیا اور ایک انبوہ جمع کرلیا دونوں فرنگیوں سے جنگ کرنے کے لئے چلے دکھنی فوج نے بڑی بہادری دکھائی اور توپ خانہ کے منہ پر بڑی جرأت سے نیزہ بازی کی عیسائی اپنے حصار سے آہستگی سے نکل کر توپ خانے کو اس طرح باہر لے آئے کہ دکھنی دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے اور اس طور سے سراسیمہ بھاگے کہ گویا تھے ہی نہیں اور دو تین روز میں گوالیار (جو ان کا علاقہ تھا) جا پہنچے۔ وہاں اپنی شکستہ حالی کو درست کرکے جواہر سنگھ سے لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

شجاع الدولہ اب بے بس اور بے سہارا رہ گئے ناچار فرنگیوں کے پاس گئے انھوں نے لحاظ کرکے ہر چیز سے دست برداری کی اور ان کے صوبے ان کو واپس کر دیئے اور خود عظیم آباد چلے گئے۔ جب حجاب رفع ہو گیا تو خلعت وزارت پہن کر اپنے مستقر (اودھ) میں آ گئے۔

یہاں دکھنی بہت سی فوجیں لے کر جواہر سنگھ کی سرحد پر پہنچے اور بہت سے دیہات تباہ و برباد کر ڈالے۔ جواہر سنگھ جو بہت دلیر آدمی ہے قلعوں سے نکلا اور آٹھ دس ہزار سکھوں کو جو ان دونوں ضلعوں میں آئے ہوئے تھے۔ نوکر رکھا اور مقابلہ میں آیا بدبخت دکھنی شکست کھا کر فرار ہوئے ان کے تقریباً پانسو آدمی اور ایک سردار گرفتار ہوا، ملہار غیرت مند تھا اُسے جو شکست ہوئی تو فرط اندوہ و غم سے تین چار منزل جا کر مر گیا۔" (ذکر میر ص ۱۱۴)

"اسی عرصہ میں رگھوناتھ راؤ جو دکھنیوں کا ایک بڑا سردار ہے بہت سی

فوج لے کر پہنچا اور جواہر سنگھ کی سرحد کے اس طرف ایک زمیندار سے جا بھڑا۔ اور اس علاقہ میں فتنہ و فساد برپا کر دیا۔ زمیندار نے جواہر سنگھ کو لکھا کہ اگر دکھنیوں نے مجھے پائمال کر دیا تو یقین ہے کہ تمھارے ملک پر بھی دست درازی کریں گے۔ آپ کو اپنی سرحد پر جانا واجب ہے اور میری بھی بھلائی اسی میں ہے۔ یہ جوان ایک بڑا لشکر لے کر دریائے چنبل کے اس طرف آیا۔ ابھی دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑے تھے کہ شاہ ابدالی کے آنے کی خبر مشہور ہوئی۔ شاہ کے نام سے دکھن کے سرداروں کے اوسان خطا ہوتے تھے۔ فوراً صلح کر لی، اور اپنے وطن کو چل دئے۔ جواہر سنگھ نے بعض نمک حراموں کی جو دکھنیوں سے مل گئے تھے واجبی گوشمالی کی اور اس کے بعد اکبر آباد چلا آیا۔ راجہ ناگرمل اپنے قلعوں سے اس کی ملاقات کے لئے آیا اور اس تقریب سے مجھے اپنے

میر کی اپنے والد اور عم بزرگوار کے مزارات پر حاضری

والد اور عم بزرگوار کے مزارات کی زیارت کا موقع مل گیا۔ وہاں پندرہ روز رہ کر واپس آ گئے۔ اس دفعہ بھی شاہ ابدالی ستلج کے اس طرف سکھوں کے ہاتھوں پریشان ہو کر واپس چلا گیا۔"

اس کے بعد میر صاحب نے جواہر سنگھ اور مادھو سنگھ پسر جے سنگھ کی کی لڑائی کا حال لکھا ہے کہ کس طرح دکھنی راجپوتوں کی طرف ہو گئے۔ اور جواہر سنگھ نے سکھ نوکر رکھ لئے اور آپس کی لڑائی سے ملک تباہ ہوا۔

جواہر سنگھ کا قتل ۱۷۶۸ء

اسی زمانہ میں جواہر سنگھ اکبر آباد گیا۔ وہاں کسی ناکس نے تلوار کے ایک ہی ہاتھ میں اس کا کام تمام کر دیا (۱۷۶۸ء) اس کا بھائی راؤ رتن سنگھ جانشین ہوا، لیکن وہ

بہت بدکار اور شراب خوار تھا۔ خلق خدا پر بہت ظلم کرتا تھا۔ آخر ایک مہوس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا خورد سال بیٹا کھیری سنگھ سردار ہوا۔ اور کاروبار نوکروں کے ہاتھ میں رہا۔ مبیر لکھتے ہیں: "کارپردازوں نے سورج مل کے بھائی نول سنگھ کو اس لڑکے کا نائب بنا دیا ہے۔ کام بہت بے اسلوبی سے چل رہا ہے دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔"

نول سنگھ اور اس کے چھوٹے بھائی رنجیت سنگھ میں نفاق پیدا ہوا۔ نوبت لڑائی تک پہنچی لیکن پندرہ سولہ روز تک جنگ ہونے کے بعد نول سنگھ کو مجبوراً صلح کرنی پڑی - یہ صلح ظاہری تھی دلوں میں کینہ بھرا ہوا تھا رنجیت سنگھ نے کچھ دنوں بعد دکھینوں کو اپنے سے ملا لیا۔ مگر وہ ایسے کم ہمت اور ہراساں ہو رہے تھے کہ کچھ لے لوا کے چل دیئے۔ لیکن نول سنگھ کے ناتجربہ کار سردار ایسے وقت پر کہ دکھنی متھرا جانے کا قصد کر رہے تھے آ کر ان سے لڑنے لگے اور لڑے ایسی بے ترتیبی اور پریشانی کے ساتھ کہ سو کہیں دو سو کہیں جو جہاں تھا تنہا تھا اور کوئی کسی کی داد کو نہ پہنچتا تھا۔ آخر شکست کھائی اور بہت سا سامان اور آلات حرب اُن کے ہاتھ آیا۔ اُن لوگوں نے اسی کو غنیمت سمجھا اور نول سنگھ کے قلعوں کا رُخ نہ کیا بلکہ دریا سے گذر کر دوآبہ میں آ پہنچے اور خیمے لگا دیئے جب اُن کے قیام کو طول ہوا تو نجیب الدولہ کو خیال ہوا کہ یہ بلا بالا بالا نہ جائے گی ایسا نہ ہو کہ شہر کو کچھ نقصان پہنچے اس نے فوج وغیرہ کی تیاری کی اور عزم کر لیا کہ دکھینوں کو نکال کر رہوں گا۔ اور شہر کی طرف نہ جانے دوں گا مگر اتنے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ (۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء)

نجیب الدولہ کا انتقال

جب جاٹوں کی فتنہ پردازی اور شرارت حد سے گذر گئی اور بود و باش

کا لطف جاتا رہا۔ تو راجہ ناگر مل نے ارادہ کیا کہ تمام بیس ہزار گھروں کے ساتھ جو ان کی وجہ سے آباد ہیں اور اکثر انہیں کے دامن دولت سے وابستہ ہیں یہاں سے اٹھ کر چلے جائیں اس طرف (جاٹوں) سے اجازت چاہی کیونکہ یہ مردم آزار تھے اور فساد کا اندیشہ تھا اور جب یقین ہوگیا کہ یہ اجازت نہیں دیتے اور سدِّ راہ ہوتے ہیں تو خدا پر نظر کر کے جرات کے ساتھ مع اپنے دو بیٹوں کے قلعے سے باہر آئے اور سارے قافلہ کو ہمراہ لے کر کاماں میں داخل ہوئے۔ یہ راجہ پرتھی سنگھ پسر مادھو سنگھ کا سرحدی شہر ہے۔ ہم تلخ کام بھی بوجہ نوکری کے اس شہر میں اقامت گزیں ہیں۔ دیکھئے آب و دانہ کہاں کہاں لے جاتا ہے۔ ان دنوں یہ مشہور ہے کہ رایاتِ اقبالِ بادشاہی فرخ آباد میں سایہ افگن ہیں۔ راجہ نے مجھے حسام الدین کے پاس بھیجا۔ اسے بادشاہ کے مزاج میں دخل تھا۔ میں گیا اور بہت عہد و پیمان کئے لیکن یہاں راجہ کا چھوٹا

میر کا بطور ایلچی بادشاہ کے لشکر میں جانا

بیٹا مجھ سے خوش نہ تھا اس لئے کہ مجھ سے اور بڑے بیٹے سے بہت ربط ضبط تھا۔ اس نے اس کے برخلاف باپ کو یہ سمجھایا کہ دکھنیوں کے پاس جانا بہتر ہے۔ چنانچہ وہ بادشاہ کے لشکر میں نہ گئے اور شہر کی طرف روانہ ہوگئے ناچار میں بھی بہت رسوائی کے ساتھ ان کے ہمراہ ہولیا۔ جب شہر پہنچا تو زن و فرزند کو عرب سرائے میں چھوڑا اور ان سے جدا ہوگیا۔"

اس اثنا میں سندھیا جو دکن کے بڑے سرداروں میں سے ہے پیشوائی کر کے بادشاہ کو اپنے ساتھ لایا اور شہر میں داخل ہوا۔ (۱۷۷۲ء)

شاہ عالم کا قلعہ دہلی میں داخل ہونا ۱۷۷۲ء

شاہ عالم ثانی کے آنے سے دہلی والوں کو صحیح معنوں میں عید ہوگئی (۱۷۷۲ء) اس لئے کہ وہ اس ظلم و ستم اور بدانتظامی سے تنگ آگئے تھے

جس کا دردر دورہ دہلی میں بارہ برس سے تھا اب انھیں امید تھی کہ نئے بادشاہ کے زمانہ میں پھر نظم و نسق قائم ہوگا۔ اور دہلی کی شاہانہ عظمت لوٹ آئے گی۔

لیکن بادشاہ کے پاس نہ خزانہ تھا نہ خالصہ زمینیں تھیں۔ دس مہینہ سے جو فوج اس کی امداد کر رہی تھی اس کو تنخواہ نہیں ملی تھی پھر مرہٹوں سے وعدہ کر لیا تھا کہ اگر وہ دہلی پہنچا دیں گے تو ان کو معقول معاوضہ ملے گا۔

امرا اور وزرا میں کوئی ایسا نہیں تھا جو مدد کرتا غازی الدین عماد الملک کو بارہا آزمایا گیا تھا اب اس کو آزمانا بیکار تھا۔ شجاع الدولہ دہلی سے غیر حاضر رہتا تھا۔ اور اس نے ساری توجہ اودھ پر مرکوز کر رکھی تھی۔ بادشاہ کے ساتھی منیر الدولہ اور حسام الدولہ ہوشیار تھے لیکن اچھے سپاہی نہیں تھے۔ اور نہ ان میں وہ سوجھ بوجھ تھی کہ ایک گرتی ہوئی سلطنت کو سنبھال لیتے۔

اس دور میں مرزا نجف علی خاں اور عبدالاحد خاں نے بہت ترقی کی لیکن بدقسمتی سے دونوں آپس میں لڑتے رہتے تھے جس سے سلطنت کو بہت نقصان پہنچا نجف خاں غیر معمولی قابلیت کا شخص تھا اور ایرانیوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اپنی سیاسی بصیرت اور فوجی قابلیت سے بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن اول تو اس کے مخالفوں نے اسے کچھ نہ کرنے دیا۔ اور جب ذرا اطمینان ہوا تو بے وقت موت نے اس کی زندگی ہی کو ختم کر دیا وہ مغلیہ تاریخ کا آخری بڑا سپاہی اور دانشمند مدبر تھا۔

شاہ عالم نے ضابطہ خاں کو میر بخشی بنا دیا تھا لیکن وہ باپ کی دولت پا کر بہت خود سر ہو گیا تھا۔ اس لئے سرداروں میں باہم یہ قرار پایا کہ بادشاہ کو لے کر ضابطہ خاں (پسر نجیب الدولہ) پر حملہ کریں بادشاہ نے ہر چند لیت و لعل کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس تقریب سے میں بھی بادشاہ کے ہمراہ اس طرف روانہ ہوا۔

ضابطہ خاں بے لڑے بھاگ گیا اس کا مال و اسباب اور خانہ و ناموس ؛ اس کے ہاتھ آیا بادشاہ کو سوائے دو سو دبلے گھوڑوں اور چند پرانے خیموں کے کچھ نہ دیا۔ بادشاہ کو یہ حرکت بہت ناگوار گذری لیکن کرتے کیا؟ نہ زور تھا نہ زر۔ جب ان پر زور نہ چلا تو حضور کے متصدیوں نے بعض اعزہ کی جاگیریں ضبط کر لیں میں گدائی کے لئے اٹھا، لشکر شاہی کے ہر سر کردہ کے در پر جاتا تھا چونکہ شاعری کے سبب میری شہرت بہت تھی۔ سب لوگ میرے حق میں بہت کچھ رعایت کرتے تھے میں نے حسام الدولہ کے چھوٹے بھائی وجیہہ الدولہ سے ملاقات کی اس نے میری شہرت اور اہلبیت پر نظر کر کے میرے لئے کچھ مقرر کر دیا اور بہت دل دہی کی۔

میر کی تکلیفیں

"چونکہ بادشاہ دکن کے سرداروں کی سرکشی سے خوش نہ تھے۔ ان کی مرضی کے بغیر شہر چلے گئے اور قلعہ میں داخل ہو گئے یہاں آکر نجف خاں نے جو اپنے کو بادشاہی لشکر کا ایک سپاہی سمجھتا تھا بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ جاٹوں کے محالات پر متصرف ہو جانا چاہیے۔ آخر بہت اصرار اور تقاضے سے حسام الدولہ کے مشورہ کے بغیر کہ ان میں اور دکھنیوں میں بہت ربط ضبط تھا اس بڑے کام کی اجازت لی اور شہر اور بیرونجات کے دس پندرہ ہزار مفلوک الحال شخصوں کو لے کر اس مہم کا آغاز کیا اور شہر کے نزدیک کے بارہ محالات پر قابض ہو گیا اس پر اسے بڑا غرہ ہوا۔ چونکہ ناتجربہ کار اور کم عمر تھا۔ بعض ناعاقبت اندیش مشیروں کے کہنے سے دکھنیوں سے لڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اب انھوں نے (دکھنیوں نے) باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ اس وقت مثل ایک گدا کے ہے۔ اور اس نے اس درد طاقت سے ہمارا مقابلہ کیا ہے اگر اسے واقعی قوت بہم پہنچ گئی تو ہمارا حال ابتر ہو جائے گا لہذا بہتر یہ ہے کہ شہر کی طرف کوچ کریں۔ اگر لڑائی میں مارا گیا تو ہمارا بھائی

ورنہ اس گروہ کو پراگندہ کر کے اسے فقیروں کی طرح اپنی نگرانی میں رکھیں گے کہ روٹی کھاتا رہے اور ہمارا دست نگر رہے۔

"جب یہ مشورہ ہو گیا تو ضابطہ خاں بخشی گری کے عہدے اور سہارن پور کے وعدے پر (جو اس سے کر بادشاہ کو دے دیا گیا تھا) خوشی خوشی ان کا رفیق ہو گیا۔ اور اس طریقہ سے جاٹ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اب وہ ان سب کو ساتھ لے کر چلے اور ایک ہفتہ میں فرید آباد کے برابر آ گئے اور دریا کو جو اس وقت پایاب تھا عبور کر کے اس طرف آ پہنچے۔ دو تین روز پڑے رہے۔ آخر ایک روز جنگ ہوئی۔ ادھر نجف خاں بلوچیوں اور مدک (Madec) فرنگی نے جو جاٹوں کی نوکری چھوڑ کر اس فلک زدہ فوج سے آ ملے تھے مقابلہ کیا جب نمک حرام مغلوں نے دکھنیوں کی فوج کی کثرت دیکھی تو بھاگ نکلے بیچارے غریب فوجی ناحق مارے گئے۔ حسام الدین خاں چند آدمیوں کے ساتھ ایک گھڑی رات تک ریتی میں کھڑا رہا۔ اور اس کے بعد وہاں سے بادشاہ کے پاس چلا آیا۔ آدھی رات کے قریب نجف خاں بھی اپنی حویلی میں چلا آیا۔ پرانا شہر جو جستہ جستہ آباد تھا اس واقعہ سے پھر برباد ہو گیا۔ ہم غریبوں کو حافظ حقیقی نے اپنی حفاظت میں رکھا صبح کو اس طرف کے بہادر مقابلہ کی تاب نہ لائے اور شہر پناہ کی برابر مورچال تیار کی۔ وہ دن اس طرح کی لڑائی میں گذرا۔ اقبال بادشاہی نے کام کیا ورنہ قلعہ بھی اڑ جاتا۔ اس روز اس طرف والوں کی جنگ کی استعداد اور سلیقہ معلوم ہوا لیکن جب دکھنیوں کی فوج کی آمد آمد سنی۔ تو ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ توپ خانے والے آلات حرب مثلاً توپ، رہکل، بارود وغیرہ کی تیاری میں مصروف ہوئے متصدیوں نے میر آتش کی جو برف سے زیادہ ٹھنڈا تھا سو روپیہ تنخواہ کر دی۔ اس کی ہیئت

اور قوت کو دیکھو تو معلوم ہو کہ آدمی ایسے ہوتے ہیں لیکن وہ اس روز سے ایسا کسی کو نہیں جا چھپا کہ جب تک جنگ رہی کسی نے اُسے نہیں دیکھا۔ آخر تیسرے روز حسام الدولہ سوار ہو کر گئے اور ان کی مرضی کے موافق صلح کر کے آئے۔ نیا شہر سلامت رہا۔ اب دکھنی مختار کے اشارے سے نجف خاں اور نمک حرام مغلوں کے باہر نکالنے کے درپے ہیں۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ القصہ سندھیا، جو دکھنیوں کا تیسرا سردار ہے جے پور کی طرف چلا گیا۔ دوسرے سردار دریا کے اس طرف جانے کا قصد رکھتے ہیں۔ اغلب ہے کہ فرخ آباد کی راہ سے جھانسی جائیں اور شجاع الدولہ کے ملک میں شور مچائیں۔

"چونکہ عام طور پر یہ افواہ تھی کہ جب دکھنی کوچ کر جائیں گے تو نجف خاں وغیرہ سردار اور شورہ پشت مغل تنخواہ کا دعویٰ کریں گے اور بادشاہ کے دروازے پر دھرنی دے کر متصدیوں کو تنگ کریں گے، لہٰذا حسام الدولہ نے دکھنیوں سے کہا کہ ان ہنگامہ پردازوں اور نمک حراموں کو جس طرح ممکن ہو یہاں سے نکال باہر کرو۔ اب دکھنیوں کے سردار اس کے درپے ہیں کہ اس قوم کو شہر سے نکال دیں چنانچہ یہ تاکید کر دی گئی کہ کوئی مغل شہر میں نہ رہنے پائے جب اس معاملہ میں طول ہوا اور حضور کے متصدی قلعہ میں جا کر بیٹھ رہے۔ اور شہر کے لوگ بند ہو گئے تو یہ گروہ (مغل) بظاہر لاہوری دروازے تک فتنہ و فساد کرنے لگا۔ اور بباطن دکھنیوں سے ملا رہا۔ کہ ان سے مقابلہ کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ جب ہنگامہ آرائی سے کام نہ چلا اور دیکھا کہ ٹھہرنے میں جان کا اندیشہ ہے تو ناچار باہر نکلنے پر آمادہ ہوئے اور دکھنیوں سے عہد و پیمان کئے۔ دو تین روز بعد نجف خاں اور مغلوں کے دوسرے سرغنے اپنے رفیقوں سمیت ان کے لشکر میں چلے گئے اہل دکھن نے جو صاحب سلوک ہیں اور ظاہری مراعات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں ان کی عزت و توقیر میں کوئی کمی نہیں کی لیکن جو عزت کہ بادشاہ کی نوکری میں تھی وہ کہاں؟

چند روز میں یہ جماعت بے حقیقت پراگندہ ہوجائے گی اور جہاں جس کے سینگ سمائیں گے چلا جائے گا۔ مشہور یہ ہے کہ دکھنی اس جمِ غفیر کو اکبرآباد تک اپنے ساتھ لے جائیں گے اور وہاں پہنچ کر اجازت دے دیں گے کہ جہاں جس کا جی چاہے چلا جائے غرض کہ وہ وقت قریب ہے کہ مغلانِ شرارت بنیاد اور دکھنیانِ سرمایہ فساد یہاں سے چلے جائیں گے اور حضرت ظلِ سبحانی بذاتِ قدسی صفات دو تین محرروں کے ساتھ بے کھٹکے قلعۂ مبارک میں تشریف رکھیں گے اگر دن میں سو بار حصار کے کنگرے پر سیر کے لئے برآمد ہوں تو کون ہے جو ان کے حجاب کا مانع ہو اور اگر بازار میں پیادہ پا تشریف لے جائیں تو حاجب کہاں ہے جو دورباش کہے آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ اہلِ حرفہ صحرا میں مارے مارے پھریں گے، اور سپاہی گدائی کا پیشہ اختیار کریں گے۔"

میر لکھتے ہیں۔

تازہ واقعہ یہ ہے کہ جب دکھنی نجف خاں کو لے کر دریا کے اس پار پہنچا تو وزیر حال (شجاع الدولہ) نصرانیوں کی مدد سے اپنے صوبے یلغار کر کے فرخ آباد پہنچا دکن کے سردار مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے تھے تین ماہ قیل و قال میں گذار دئے اور آخر صلح کے خواہاں ہوئے وزیر نے جو حقیقت میں ایک دلیر شخص تھا اسے غنیمت سمجھا اور ان کی درخواست قبول کر لی. بالآخر نجف خاں کو حضور کا مختار مقرر کر کے اپنے صوبہ کو چلا گیا۔ دکھنی اور مشرقی دونوں اپنے اپنے اقتدار اس کے سپرد کر کے روانہ ہو گئے ۔ جب نجف خاں شہر میں داخل ہوا تو حسام الدولہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا دو تین روز تک گھر میں بیٹھا رہا اس کے بعد بادشاہ نے اسے بلا بھیجا۔ اور چند سالہ حساب کے کاغذات طلب کئے۔ اور قلعہ ہی میں رکھا۔ مجد الدولہ عبد الاحد خاں پسر عبد المجید خاں کو جو خاص بادشاہی کارپردازوں میں سے تھے۔ راجہ ناگرمل کی تبدیلی سے

خلعت دیوانی خالصہ عنایت ہوا اور وہ بادشاہی کام پر مقرر کیے گئے حسام الدین خاں کو جو مختار الملک تھے بادشاہی رقم اور مغلوں کی تنخواہ کی علت میں آٹھ لاکھ روپیہ کے عوض فتح خاں درانی کے حوالہ کر دیا۔ اب مغل مختار ہیں چاہے ماریں چاہے زندہ رکھیں۔[1]

رضا لائبریری رام پور میں کلیات میر کا ایک قلمی نسخہ ہے جو شیخ لطف علی حیدری نے ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں لکھا ہے۔ اسی جلد میں ذکر میر کا مخطوطہ بھی ہے جس میں مندرجہ ذیل

ذکر میر: مخطوطۂ رام پور

عبارت مطبوعہ نسخہ سے زیادہ ہے۔ حسام الدین خاں کے ذکر میں "وہ ابں شامت اعمال قیامت بسر آورد"[2] کے بعد مخطوطۂ رام پور میں لکھا ہے:

انچہ ظاہر است حسام الدین خاں درحقیقت از میاں رفت چراکہ بدست دشمناں جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گذاشت بیشتر اختیار خدا است کہ او برہمہ چیز قادر است۔

اس کے فوراً بعد میر نے اپنا حال لکھا ہے جو بڑا دردناک ہے اور مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے۔

میر کی عسرت

احوال فقیر از سہ سال آں کہ چوں قدر دانے درمیان نیست دعرصہ روزگار بسیار تنگ است توکل بہ خدائے کریم کہ او رزاق ذی القوۃ المتین است کردہ بخانہ نشستہ ام۔ ظاہراً از اسباب با اعزہ چند مثل ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں و بیرم خاں حسب منا خلف الصدق بہرام خاں کلاں کہ در آدمی روشی یکتائے روزگار خود اند و قطب الدین خاں پسر سعدالدین خاں۔

---

[1] ذکر میر ص ۱۲۸ [2] ذکر میر مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ص ۱۲۸۔

خانساماں اگرچہ سنش کم است...... وخالی از سعادت مندی نیست وقایمٔ لطف علی خاں کہ آدمیانہ می زید، اگاہ گاہ ملاقات کردہ می آید۔ خواہ از دست ایشاں انتفاعے برسد یا نرسد۔ مایہ توکل ہمیں صاحبان اندو گاہے ایں چنیں ہم اتفاق می شود کہ کسے فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزے می فرستد محل شکر است۔ اکثر قرض دار می باشم، و بہ عسرت تمام بسری کنم۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ جانے سے پہلے میر کے سر سے موج خون گزر چکی تھی اور عسرت اور تنگدستی کی کوئی تکلیف ایسی نہیں تھی جس سے وہ دوچار نہ ہوئے ہوں۔ اس نسخہ کے آخر میں یہ بھی لکھا ہے: " اکنوں کہ پیری رسید یعنی عمر بہ پنجاہ کشید اکثر اوقات بیمار می باشم[1]" مطبوعہ نسخہ میں یہ عبارت اس طرح ہے: " اکنوں کہ پیری رسید یعنی عمر عزیز بشصت سالگی کشید، اکثر اوقات بیمار می باشم[2]"۔ اس سے ظاہر ہے کہ رام پور کا نسخہ پہلا ہے۔ میر نے نظر ثانی کرتے وقت پنجاہ کو شصت میں بدل دیا ہے اور وہ حصہ جس میں اپنی عسرت اور تنگدستی کا ذکر ہے، نکال دیا ہے۔

اس کے بعد میر نے نجف خاں اور عبدالاحد خاں کے حالات اور جاٹوں کی شورش کا ذکر[3] تفصیل سے کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

روہیلیوں سے لڑائی ۱۷۷۴ء

اس وقت وزیر اعظم امیر معظم نواب شجاع الدولہ کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ حافظ رحمت خاں سے خصومت رکھتا تھا۔ اس لئے لڑائی پر آمادہ ہو گیا...... گورنر بہادر[4] پہلے پرخاش کے ارادہ سے آیا تھا، لیکن نواب وزیر تنہا اس کے پاس چلا گیا اور کہنے لگا کہ

---

[1] ذکر میر مخطوطہ رام پور [2] ذکر میر مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۱۵۲ [3] ذکر میر ص ۱۲۸، ۱۳۲۔
[4] وارن ہسٹنگز ۱۷۷۲ء میں گورنر ہوا اور ۱۷۷۴ء سے ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل رہا۔

میں تمھارا پاس کرتا ہوں اور کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ خواہ اس میں کچھ ہو جائے یا تو تم مجھے اپنے ہمراہ کلکتہ لے چلو یا میرا ملک میرے حوالہ کر دو۔ فرنگیوں نے جو وزیر کا یہ سلوک دیکھا تو وہ کڑہ اور الہ آباد بھی اس کو دے کر چلے گئے (۱۷۷۰ء) اب زمانہ کا رنگ بدلتا ہے۔ فرنگی اس کے ساتھ ہو گئے اور دونوں نے مل کر روہیلوں پر یورش کی۔ ضابطہ خاں اور چند سردار دس بارہ ہزار کی جمعیت لے کر حاضر ہوئے کہ ہم آپ کے دولت خواہ ہیں اور کسی حال میں سرتابی نہیں کر سکتے۔ ان کو فوج کے پیچھے کھڑے رہنے کا حکم دیا۔ ہر چند بعض سرداروں نے کہا کہ یہ لوگ غدار ہیں انھیں پیچھے نہ رکھنا چاہیئے لیکن وزیر بڑا دلاور تھا اس نے پروا نہ کی۔ بڑا سخت معرکہ ہوا، ہزاروں مارے گئے۔

حافظ نے سر دیا زر نہ دیا

اُس جنگ میں صاحبزادہ آصف الدولہ نے جواب وزیر اعظم ہیں بڑی مستعدی اور جرأت سے کام کیا۔ حافظ رحمت خاں بڑی بہادری سے لڑا اور آخر عین میدانِ جنگ میں کام آیا۔ وزیر نے اس کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ نجف خاں اس جنگ میں وزیر کے ساتھ تھا۔ جنگ ختم ہونے پر پھر اکبر آباد واپس چلا گیا۔"

میر کی خانہ نشینی

میر لکھتے ہیں:

"فقیر ان ایام میں خانہ نشین تھا۔ بادشاہ اکثر طلب فرماتے تھے۔ مگر میں نہ گیا۔ ابو القاسم خاں صوبہ دار کشمیر ابو البرکات خاں کا بیٹا اور عبد الاحد کا چچا زاد بھائی میرے ساتھ بہت سلوک کرتا تھا۔ میں کبھی کبھی اس کی ملاقات کو جاتا تھا اور بادشاہ بھی کبھی کبھی کچھ بھیج دیتے تھے۔

"اس فتح عظیم کے بعد نواب وزیر بڑی شان و شوکت کے ساتھ صوبہ میں داخل ہوا۔ مگر آتے ہی آب و ہوا کے تغیر سے ایسا بیمار پڑا کہ مر کے اٹھا۔ ہر چند

اطبار اور فرنگیوں نے معالجہ میں بے حد سعی کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا (۱۷۷۵ء)

آصف الدولہ کی تخت نشینی

آخر خلف الصدق آصف الدولہ بہادر کو مسندِ وزارت پر بٹھایا اور خود اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ لوگوں نے بہت ماتم کیا۔ اگر آسمان ہزار سال چکر کھائے تو بھی ایسا صاحبِ جرأت، اور سراپا مروت سردار پیدا نہ ہوگا۔

"مختار الدولہ جس کے ہاتھ میں وزارت اور صوبہ کا کاروبار تھا ایک خواجہ سرا بسنت نامی کے ہاتھوں مارا گیا اس کی جگہ حسن رضا خاں سرفراز الدولہ بہادر مقرر ہوئے یہ سردار بہت باتمکین، صاحب اخلاق، متواضع اور کریم النفس ہے مجھ ہی پر نہیں بہت سوں پر اس کے الطاف وعنایات ہیں۔

"بادشاہ مختار کے روپیہ طلب کرنے پر ناخوش ہو گئے تھے نجف خاں ذوالفقار الدولہ کو لکھا کہ جس طرح ہو سکے تم یہاں حاضر ہو جاؤ۔ وہ بادشاہ کی ایما سے دلیرانہ حضور کی طرف روانہ ہوا عبدالاحد خاں کشمیری نے جو یہ سنا کہ امیر الامرا آتا ہے تو فوراً بادشاہ زادے اور سکھوں کے ساتھ دوڑ آیا۔ اور نجف خاں سے دو روز پہلے شہر میں پہنچ گیا۔ اور قلعہ میں بندوبست کر کے بیٹھ گیا ایک شور مچ گیا کہ نجف خاں ذوالفقار الدولہ آ گیا۔ بادشاہ نے اسی مختار کو اس کے استقبال کے لئے بھیجا۔ بڑے ترک و شان سے ملاقات ہوئی دونوں ایک ہی ہاتھی پر سوار ہوئے اگرچہ نجف خاں جانتا تھا کہ عبدالاحد خاں منافق ہے مگر اچھی طرح پیش آیا۔ اور باتوں میں لگائے رکھا۔ جب قلعہ کے دروازے پر پہنچا تو اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ توپ رہکلہ، اور میری فوج بے تحاشا قلعہ میں آجائے اور جابجا کھڑی ہو جائے دونوں میں دو انگل کا بھی فرق نہ تھا۔ وہ چاہتا تو مختار کا کام تمام کر دیتا۔ مگر بادشاہ کا خیال کیا کہ یہ بھی انہی کا بندہ ہے۔ جب تک بادشاہ کی مرضی نہ معلوم ہو کچھ نہ کرنا چاہیئے۔

جب اس ہنگامہ سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ملازمت حاصل کی تو بادشاہ کو اس سے بھی زیادہ بزدل پایا۔ معلوم ہوا کہ ان کا منشا یہ ہے کہ اُسے چھوڑا جائے وہاں سے اٹھ کر بازار میں آکر ٹھہر گیا۔ اور عرضی بھیجی کہ میں نے حضور کے لحاظ سے دست اندازی نہ کی اب میں جب تک عبدالاحد خاں کو ساتھ نہ لے جاؤں گا یہاں سے نہ جاؤں گا۔ بادشاہ نے بظاہر گفت وشنود شروع کی لیکن باطن میں یہی چاہتے تھے کہ وہ اسے لے جائے جب مختار کے آدمی چھوڑ کر چل دئے اور سکھ بھی بے مروتی کر گئے اور اس نے ناچار قول وقسم دئے کہ نجف خاں میرے ساتھ برائی نہ کرے اور میری عزت کا خواہاں نہ ہو بادشاہ نے کہا: میں ضامن ہوں تم بے کھٹکے چلے جاؤ۔ جب اس نے کوئی چارہ نہ دیکھا اور زمانہ کا رنگ بدلا ہوا پایا تو ہاتھی پر سوار ہو کر قلعہ سے نکلا۔ امیرالامرا بازار میں انتظار کر رہا تھا۔ اپنا ہاتھی اس کے ہاتھی کے برابر کر لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ اور اپنی نگرانی میں رکھا۔ چند روز لیت ولعل کرتا رہا کہ بادشاہ کے پاس آج جاتا ہوں کل جاتا ہوں اس کے بعد کہنے لگا کہ وہاں جا کر کیا ہوگا بہتر یہی ہے کہ میرے پاس رہیئے۔ اس کے مال واموال میں دست اندازی نہ کی بیس روپیہ روزانہ اپنے یہاں سے مقرر کر دیئے اور چند نوکر خدمت کے لئے متعین کر دئے۔ اور خود حضور کے مالی وملکی امور میں مصروف ہو گیا۔ رفتہ رفتہ نجف خاں کا رتبہ اتنا بڑھا کہ بڑے بڑے امیروں کو سلام اور مجرے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ جس روز وہ حضور میں آتا تو دربار ہوتا ورنہ بادشاہ چند مصاحبوں کے ساتھ بسر کرتے تھے چوں کہ جوان تھا اور دہلی طلسم خانہ، یاروں نے اسے عیش وعشرت اور شراب نوشی پر لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ قوت زائل ہو گئی اور سل کے مرض میں مبتلا ہو گیا بہت کچھ علاج ہوا مگر کچھ فائدہ نظر نہ آیا (۱۷۸۲ء) جب مایوس ہو گیا تو حسرت سے کہتا تھا

کہ میں سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتا کہ زندہ رہوں اور بس۔"

میر لکھتے ہیں:۔

میر کی روانگی لکھنؤ

اس زمانہ میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جاؤں لیکن بے سامانی کی وجہ سے معذور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میر میرے پاس چلا آئے تو اچھا ہو میری طلبی کے لئے نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ نواب اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے سوتیلے ماموں کے ساتھ تھے، کہا کہ اگر نواب صاحب ازراہ کرم کچھ زادراہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آسکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا، اور انھوں نے سرکار سے زادراہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والاجاب یاد فرماتے ہیں جس طرح ہوسکے آپ یہاں آجایئے۔ میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔

"چوں کہ خدا کا یہی منشا تھا، میں بے یار و مددگار بغیر قافلے اُدھر کے فرخ آباد کے راستے سے گذرا۔ وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے انھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہ کیا دو ایک روز کے بعد روانہ ہوکر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا۔ پہلے سالار جنگ کے یہاں گیا۔ خدا انھیں سلامت رکھے انھوں نے میری بڑی عزت کی اور جو کچھ مناسب تھا بندگانِ عالی کی جناب میں کہلا کے بھیجا چار پانچ روز کے بعد اتفاقاً نواب عالی جناب مرغوں کی لڑائی کے لئے تشریف لائے میں بھی وہاں تھا۔ ملازمت حاصل کی۔ فراست سے تاڑ لیا اور پوچھا کہ میر تقی ہو؟ نہایت لطف و عنایت سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ نشست

کے مقام پر لے گئے۔ اپنے شعر مجھے مخاطب کر کے سنائے سبحان اللہ۔ کلام الملوک ملوک الکلام۔ اس کے بعد فرط مہربانی سے مجھ سے فرمائش کی اس روز میں نے اپنی غزل کے صرف چند شعر عرض کیے۔

"رخصت کے وقت نواب سالار جنگ نے کہا کہ اب میر صاحب حسب الطلب حاضر ہو گئے ہیں بندگانِ عالی مختار ہیں، انھیں کوئی جگہ عنایت کر دی جائے جب مرضیٔ مبارک ہو یاد فرمائیں کہنے لگے کہ میں کچھ مقرر کر کے آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ دو تین روز بعد یاد فرمایا۔ حاضر ہوا۔ اور جو قصیدہ میں نے مدح میں کہا تھا پڑھا، سماعت فرمایا۔ اور کمال لطف کے ساتھ اپنے ملازموں کے سلسلہ میں شامل کیا۔ وہ برابر میرے حال پر عنایت اور مہربانی فرماتے ہیں"[۱]

میر لکھتے ہیں:

نجف خاں کا انتقال

"میرے یہاں (لکھنؤ) آجانے کے بعد نجف خاں جو بیمار تھا انتقال کر گیا (۱۷۸۲ء) حضور کے کاروبار میں درہمی واقع ہوئی۔ اس کے غلام نجف قلی خاں افراسیاب خاں اور دوسرے سردار سب اس کوشش میں تھے کہ ہم مختار بن جائیں۔ کچھ دنوں یہ کشاکش جاری رہی۔ آخر حضور نے مرزا محمد شفیع کو جو اس کے بھائیوں میں سے تھا اور سکھوں کی تنبیہہ کے لیے لشکر کشی کر رہا تھا، طلب فرمایا۔ (۱۷۸۲ء) اس نے عبدالاحد خاں کو قید سے رہا کیا۔ اور دیوانیٔ خالصہ دلوائی اور خود مسند ریاست پر متمکن ہوا۔"

لیکن اس وقت اقتصادی بدحالی اس درجہ تھی کہ سپاہی اور بادشاہ پر

---

[۱] ذکر میر ص ۱۴۰۔

بعض اوقات فاقے گذر جاتے تھے۔ اور گھوڑوں اور ہاتھیوں کو چارہ تک میسر نہیں آتا تھا۔[1]

"رفتہ رفتہ مرزا شفیع کا تسلط بیٹھ گیا۔ اور وہ شہر سے نکل کر ملک گیری کی طرف متوجہ ہوا چوں کہ لوگوں کو اس کی طرف سے دلجمعی نہ تھی۔ وہ افراسیاب ہمدانی کو لے کر آیا اور یہ قرار پایا کہ مرزا ہمدانی کی دل دہی کے لئے اس کے خیمے میں آئے۔ خیمہ میں لاکر غداری سے اُسے قتل کر ڈالا اس کے قتل کے بعد افراسیاب خاں کا دور دورہ ہوا۔ اور ریاست کا کام اس کے سپرد ہوا ہمدانی پھر اپنے مقام پر چلا گیا۔ یہ امیر الامراء ہو کر بادشاہی مختار ہو گیا۔"

وارن ہسٹنگز کا لکھنؤ آنا

میر لکھتے ہیں:

"یہاں وزیر اعظم امیر بکرم گورنر بہادر (وارن ہسٹنگز) کے استقبال کے لئے جو کلکتہ سے آرہے تھے روانہ ہوئے کیونکہ یہ تمام ملک وزیر ہی کا تھا اس کے ساتھ بے شمار لشکر تھا۔ یہ سفر الٰہ آباد تک ہوا۔ صاحب مذکور کی آمد آمد کی خبر سُن کر اس ضلع کے سردار بھی ان کے دیکھنے کے لئے آئے ایک منزل آگے نواب گردوں جناب سے ملاقات کی وہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لے کر آئے اور ہر منزل پر نئی نئی ضیافتیں نئے نئے خیمے اور خرگاہ، طرح طرح کے بیش بہا تحفے نظر آتے تھے جب لکھنؤ پہنچے تو دولت خانہ میں داخل ہوئے اس کی آرائش و تکلف، فرش فروش، ساز و سامان کی افراط ایسی تھی کہ عقل دنگ ہوتی تھی۔ دن کو ضیافتیں اور رات کو پری وش حور لقا عورتوں کا ناچ اور گانا۔ آتش بازی اور چراغاں کا لطف رہتا تھا۔

---

[1] سرکار: ج ۳ ص ۲۲۴۔

غرض یہ شاہانہ اور پُرتکلف دعوت چھ مہینے تک رہی اور یہ مدت باہم گفت وشنود، مشورت وصحبت میں کٹی۔

"جس وقت یہ خبر حضور میں پہنچی تو امراء میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوئی عبدالاحد خاں نے اپنے بیٹے یہاں بھیجے اور فرنگیوں سے سازباز شروع کیا۔ افراسیاب خاں وغیرہ کو گمان ہوا کہ فرنگی یہاں بھی آئے گا چوں کہ زبردست ہے بادشاہ کو اپنی نگرانی میں رکھے گا اور پھر ہماری خبر لے گا۔ مصلحت اس میں ہے کہ بادشاہ کو اکبرآباد لے جائیں اور لشکر جمع کر کے مرہٹوں کو جو راناے گوہد والا کے تابع ہیں اپنے ساتھ ملالیں اور پھر فرنگی کو پیغام دیں اگر جنگ کا اتفاق ہو تو خیر جنگ بھی ورنہ اس وبدلے سے ہم جہاں اور جیسی حالت میں ہیں اس میں تو کچھ فرق نہ آئے گا۔ چناں چہ بادشاہ کو لے کر اکبرآباد چلے اور رستہ میں عبدالاحد خاں کو قید کرلیا۔

جواں بخت کا بھاگ کر لکھنؤ آنا
۱۷۸۴ء

"جس وقت اکبرآباد پہنچے۔ بادشاہ زادہ جواں بخت (جہاندار شاہ) وہاں سے بھاگ کر نواب وزیر اور فرنگی کے پاس آگیا۔ (۱۷۸۴ء) انھوں نے مضطربانہ مرہٹوں سے عہد وپیمان کیے، اور مرہٹوں نے ان کی طرف داری کی۔ شہزادہ کے بھیجنے کی گفت وشنود درمیان میں آئی یہاں فرنگی زبانی باتوں سے خوش کرتا رہا۔ کیوں کہ اسے اپنے ملکی کاموں کے لئے کلکتہ جانا مقصود تھا۔ چند روز بعد بادشاہ زادے کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ وزیرالممالک سے رخصت کے وقت نواب والاجناب کے ملازموں کو اس قدر بے حساب انعام دیا گیا جو قیاس میں نہیں آسکتا۔ ہر ایک کو ہاتھی گھوڑے، قبائیں خلعت عنایت کیے۔ چوں کہ صاحب دریا کے رستے جارہے تھے۔ اس لئے وزیر اپنے دارالحکومت

کو چلے آئے مرہٹوں اور افراسیاب نے محمد بیگ ہمدانی سے جھگڑا شروع کیا۔ وہ کبھی ان سے نہیں دبا۔ اور لڑنے مرنے کو آمادہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں میرزا شفیع کے بھائی میر زین العابدین نے خنجر سے افراسیاب خاں کا کام تمام کر دیا۔ (۱۷۸۴ء) اب حضور میں کوئی سردار نہیں ہے۔ بادشاہ بے زور ہیں اور غالباً مرہٹوں کا دور دورہ ہو جائے گا۔

ان سانحات کے بعد مرہٹوں اور احمد بیگ ہمدانی میں لڑائی چھڑ گئی۔ جب اس پر قابو نہ پایا تو دھوکے سے قید کر لیا۔ اس عرصہ میں صاحب نے بادشاہ زادے کو جسے وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے واپس کر دیا۔ ان اطراف میں رہیں گے یا بادشاہ کے پاس چلے جائیں گے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال تو نواب عالی جناب کے زیر سایہ رہتے ہیں اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں[۱]۔"

شکار نامے

میر لکھتے ہیں:

"فقیر یہاں نواب عالی منزلت کے ساتھ ہے اور دعا گوئی میں بسر کرتا ہے۔ بندگان عالی شکار کے لئے بہرائچ تک گئے میں بھی ہم رکاب تھا۔ شکار نامہ موزوں کیا۔ دوسری دفعہ پھر شکار کے لئے سوار ہوئے اور کوہ شمالی کے دامن تک تشریف لے گئے۔ اگرچہ لوگوں کو اس دور دراز کے سفر کے نشیب و فراز سے بہت تکلیف ہوئی لیکن ایسا شکار، ایسی فضا اور ایسی ہوا کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ تین ماہ کے بعد دارالحکومت کو واپس آئے۔ میں نے دوسرا شکار نامہ کہہ کر حضور میں پڑھا

---

[۱] ذکر میر ص ۱۴۷۔

شکارنامہ کی دو غزلیں انتخاب فرما کر خود بدولت نے لیطور مخمس تضمین فرمائیں اور خوب تضمین کیں، ایک غزل کی زمین بہت پسند آئی۔ دوسری غزل لکھنے کی فرمائش کی وہ بھی میں نے بفضل الٰہی کہی۔ زبانِ مبارک سے تعریف فرمائی اور سخنوری کی داد دی"

آصف الدولہ کی علالت اُن دنوں تغیرِ آب وہوا سے عشرہ محرم کے بعد مزاج عالی ناساز گار ہو گیا۔ علاج معالجہ ہوا۔ مرض نے طول کھینچا بہت کچھ خیر خیرات ہوئی اور ہر شخص صحت کے لئے دست بدعا تھا۔ حکیم مطلق اور شافیٔ برحق نے شفا دی، اور ہم سب پر احسان کیا۔

مرہٹوں کا تسلّط جب بادشاہ کے حضور میں نجف خاں کے غلاموں میں سے جو مسلط تھے کوئی نہ رہا تو مرہٹے جو قریب تھے مسلّط ہو گئے۔ بادشاہ نے مرہٹوں کو مختار کر دیا اور نجف خاں کے آدمیوں کو ذلیل کیا اکثر انھیں سے مشورہ کرتے ہیں۔ اور تمام امور انھیں کے حوالے کر دیے ہیں۔ مرہٹوں کی فوج شاہجہاں آباد بھی گئی اور مشہور ہے کہ وہاں بھی تسلّط حاصل کیا۔ سکھ جو اطرافِ شہر میں تاخت وتاراج کرتے رہتے تھے وہ بھی دم بخود ہیں کیونکہ مرہٹوں سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے۔ بادشاہ شہر اکبر آباد کے باہر خیمہ زن تھے۔ چند روز کے بعد دہلی چلے گئے۔ عبدالاحد خاں کو نلی گڈھ میں جو نجف خاں کی بہن کے تسلط میں ہے اور جہاں نجف خاں کے آدمی جمع ہیں، مقید کر دیا۔ مرہٹے مالک الملک ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ بادشاہ کو کچھ دست برداشتہ دیتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں۔ چناں چہ شہر میں صرف ایک مہینہ رہے پھر علی گڑھ لے گئے۔ وہاں دس پندرہ روز جنگ

رہی آخر بیگم سے عہد و پیمان کر کے اور نجف خاں کے مال میں سے کچھ لے کر وہاں سے چل دیئے۔ وہاں سے بادشاہ کو راجپوتوں کے پاس لے گئے۔ چند روز کے بعد راجپوتوں سے صلح کر کے بادشاہ دہلی آگئے۔ اور مرہٹے شہر اکبر آباد میں رہ گئے۔

چوں کہ راجپوتوں کا خیال مرہٹوں کے سر سے نہیں گیا تھا انھوں نے پھر اس طرف فوج کشی کی راجاؤں نے ہمدانی کو جو نجف خانی سردار تھا اپنا رفیق بنا لیا لڑائی ہوئی ہمدانی بڑی دلیری سے لڑا اور مارا گیا۔ اس کی جگہ اس کا ہمشیر زادہ مرزا اسماعیل سردار ہوا یہ بھی بڑی بہادری سے لڑا اور مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کا سامان اور آلاتِ جنگ سب رکھے رہ گئے۔ وہ اپنی جان کو غنیمت سمجھ کر اور بھاگ کر اکبر آباد پہنچے۔ یہاں بھی مرزا اسماعیل نے پیچھا کیا اور انھیں شہر سے نکال کر خود قلعہ بند ہو گیا۔ قلعہ کی جنگ کو طول ہوا، مرہٹوں نے اپنا فائدہ دوسری طرف دیکھا اور چلے گئے۔ بادشاہ شہر سے نکل کر نجف قلی خاں کی طرف جو حصار کی جانب تھا چلے۔ بڑی جنگ ہوئی۔ آخر نجف قلی خاں سے کچھ لے کر شہر آگئے۔ ان ایام میں غلام قادر پسر ضابطہ خاں نے، جو اپنے باپ کے بعد سہارن پور پر متصرف تھا بہت زور پکڑا اور سکھوں کی فوج ہمراہ لے کر اکثر محالات شاہی پر جو دوآبہ کے درمیان تھے قابض ہو گیا اور قریب آ پہنچا۔ بادشاہ سے بھی کچھ طلب کیا مگر بادشاہ نے صاف جواب دے دیا۔ وہ دریا کے اس پار مورچے باندھ کر لڑنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ کچھ اوپر ایک مہینہ تک لڑائی رہی۔ بادشاہ کے پاس نہ فوج تھی اور نہ زور تاہم بڑی جرأت سے اڑے رہے۔ اور اس بلا کو دفع کیا وہ وہاں سے اٹھا اور اکبر آباد کے اطراف تک اپنا تسلط جما لیا۔ یہاں مرزا اسماعیل بیگ قلعہ میں محصور تھا۔ مرزا نے جو اس کی قوت دیکھی تو اس سے دستار بدلی اور باہم عہد و پیمان ہوئے کہ مل کر

مرہٹوں سے لڑائی کریں گے۔ چند روز کے بعد مرہٹے جو چنبل کے اس پار کا ارادہ رکھتے تھے یلغار کرکے پہنچے ان دنوں شہزادہ صاحبِ عالم وہیں تھے لیکن انھوں نے تغافل کیا اور جنگ تنہا مرزا اسماعیل کے سر پڑی۔ یہ اس دلیری سے لڑا کہ مرہٹے بھاگ کر گوالیار چلے گئے۔ چند روز کے بعد ایک دوسری فوج لے کر پھر لڑنے کے لئے آ پہنچے۔ اور دس پندرہ روز تک اکبرآباد کے باہر لڑائی ہوتی رہی۔ اس لڑائی میں مرزا اسمٰعیل کو شکست ہوئی۔ غلام قادر خاں تماشائی رہا۔ مرزا بھاگ کر غلام قادر کے پاس آیا۔ دیکھا کہ یہ اپنی احتیاط میں مصروف ہے۔ اور میری طرف متوجہ نہیں۔ چند روز رہ کر اپنے ملک کی طرف چلا گیا۔

بادشاہ کے ناظر منظور علی خاں نے جو غلام قادر کو بیٹا کہتے تھے لکھا کہ بادشاہ میرا کہنا نہیں سنتے اور مرہٹوں کا ساتھ نہیں چھوڑتے تم یہاں آجاؤ۔ یہ دونوں شہر گئے۔ بادشاہ بے زور تھے انھوں نے ناظر نمک حرام کے مشورے سے قلعہ کا انتظام کرکے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جو نہیں کرنا چاہیئے تھا۔"

غلام قادر کے مظالم
۱۷۸۸ء

مولوی خیرالدین خاں نے تاریخ عبرت افزا میں لکھا ہے:

"تمام محل سرا میں آہ وزاری کے سوا اور کچھ نہ تھا نواب غلام قادر خاں یہ کیفیت معلوم کرکے حضور میں گیا بادشاہ نے خوشامد سے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کے کان میں کہا کہ مبلغ بیس لاکھ روپیہ ہم بہم پہنچا سکتے ہیں وہ تم لے کر جنوبیوں کی لڑائی میں صرف کرو اور کوئی ایسی حرکت مت کرو جس سے بدنامی تمھاری قیامت تک رہے ——

نواب غلام قادر خاں نے منہ پھیر کر کہا کہ تمھارا مجھے مطلق اعتبار نہیں رہا ہے

اس کے بعد ...... مرزا بیدار بخت کا ہاتھ پکڑ کے بجائے بادشاہ کے بٹھادیا اور اپنے آپ مگس رانی کرنے لگا۔ اور سرداروں نے بھی اس کے حکم سے نذریں دکھائیں ......
وہ اپنی وادی ملکہ زمانیہ اور صاحبہ محل کی کارسازی سے اس مقصد کو بہ حمایت نواب غلام قادر خاں پہنچا تھا اور ناصر الدین جہاں شاہ اپنا لقب کیا ......

"بیدار بخت نے نواب ناظر کو حکم بھیجا کہ پانچ گھوڑے طویلہ شاہی سے ہمارے بھائیوں کی سواری کے لئے بھیجدو۔ اس نے جواب دیا کہ بدون اجازت نواب غلام قادر خاں ممکن نہیں ہی۔ نواب غلام قادر خاں نے یہ استدعا سن کر کہا کہ جب تک مبلغان موعودہ نہ آجائیں گے تب تک آپ امورات سلطنت میں دخل نہ دینے پائیں گے روہیلوں نے شاہ عالم اور اس کے بیٹوں پر ظلم کرنا شروع کیا۔ بدن کے کپڑے تک اتار لئے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھانے پینے سے محروم کردیا۔ شاہ عالم دادو فریاد کرتا تھا اور کہتا تھا کہ اگر جرم کیا ہی تو میں نے کیا ہی۔ ان بچوں کی کیا خطا ہے۔ نواب غلام قادر خاں مطلق التفات نہ کرتا تھا .... بعد دو روز اور دو راتوں کے جب بچے بھوک اور پیاس سے مرگئے تب لالہ بنہار سنگھ نے خوشامد درآمد سے اٹھائیس روٹیاں اور دو بہنگی پانی بھیج دیا۔ چوں کہ متعلقات شاہ عالم صدہا سے متجاوز تھے اس لئے فی کس ایک ٹکڑا روٹی کا اور ایک ایک قطرہ پانی کا بھی نہیں پہنچا۔ اس سے ان کی اور بھی بھوک پیاس کی بیکلی بھڑک گئی۔ مرزا مینڈھو نے نواب سے چھپاکر چودہ روٹیاں اور ایک گھڑا پانی کا شاہ عالم کے پاس بھیجا۔ وہ گرفتار ہو کر نواب کے پاس آیا اور نواب کے حکم سے کتوں کے سامنے ڈال دیا گیا۔ اور مرزا مذکور کی بہت کچھ گوشمالی کی ....

مرزا اکبر شاہ کے مکان میں سے چار ہزار اشرفیاں اور چودہ ہزار روپیہ اور ایک من برتن سونے کے اور چار من برتن چاندی کے اور ستیس من تانبے کے اور

دس تختہ دوشالے اور پندرہ گٹھڑ پارچہ کمخواب کے برآمد ہوئے اور تمام مرشد زادوں کے مکانوں میں سے حسب حیثیت اسباب برآمد ہوا۔ نواب تاج محل و نواب شاہ آبادی و مبارک محل و رانی جے پور بیگمات کا مال ضبط کیا۔ نواب شاہ آبادی کے مکان سے دو صندوق بڑے بڑے سربمہر۔ اور دس ہزار اشرفیاں اور چالیس ہزار روپیہ اور ایک صندوقچہ جواہرات اور ایک من برتن سونے کے پانچ من برتن چاندی کے اور ایک صندوق زیورات طلائی سادہ اور مرصع اور چند تختہ دوشالہ و کمخواب کے برآمد ہوئے اور اس طرح سے تینوں محلوں سے کم زیادہ جو کچھ میسر آیا جمع کر کے اور چاروں بیگموں کو مع کرتے اور پاجامے کے رتھوں پر سوار کر کے ہمراہ پرستاران نواب غلام قادر خاں کے سلیم گڑھ میں بھیج دیا۔ بیلداروں نے رانی جے پوری کے مکان کی ایک دیوار کو توڑا تو تیس ہزار روپیہ اور دو ہزار اشرفیاں نکلیں بیدار بخت نے سرفراز اور تمکین خواجہ سرا کو حکم دیا کہ شاہ عالم کے محلوں کی نوکر عورتوں کو لکڑی سے باندھ کر کوڑے سے ماریں ہر ایک محل سے آواز رونے پیٹنے کی آنے لگی کوئی ان مظلوموں پر رحم نہیں کرتا تھا جو کچھ ان سے دستیاب ہوا وہ لے لیا اور ان کو برہنہ سر و بے ستر نکال دیا۔ بجز ایک کرتہ و ازار کے ان کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد اپنے باپ کی چھوکریوں کو مال و اسباب کی نشان دہی کے لئے مارا پیٹا۔ انھوں نے دو جگہ کے نشان دیئے۔ جب وہ کھولے گئے تو اس میں سے دو صندوق بھرے ہوئے چاندی کے برتنوں کے اور جواہرات وغیرہ برآمد ہوئے اور دو درج سربمہر کر کے سیتل داس کے حوالے کیے کہ مال خانہ میں داخل کرے۔

پانچویں تاریخ ذی قعدہ کی نواب غلام قادر خاں سلاطین میں گیا اور ایک ایک کو طلب کر کے کہا کہ روپیہ لاؤ تا کہ اس ظلم و ستم سے بچو انھوں نے

نالہ و فریاد کرکے جواب دیا کہ ہم نانِ شبینہ کو بھی محتاج ہیں ہمارے پاس روپیہ کہاں سے آیا ہے جو دیں...... شاہ عالم سے کہا کہ نقدی بتاؤ ورنہ اکبر شاہ کو الٹا لٹکا کر کوڑے ماروں گا اور گدھی پر چڑھاکر شہر میں پھراؤں گا۔ شاہ عالم نے جواب دیا کہ جو کچھ ہے وہ انھیں مکانات میں ہے میرے پیٹ میں نہیں ہے۔ نواب نے جواب دیا کہ مکان کی تلاشی کے بعد تمھارے شکم کی بھی تلاشی لی جائے گی نواب غلام قادر خاں اس کے پاس بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا اور دھواں اس کی طرف چھوڑتا جاتا تھا۔ ساتویں تاریخ ذیقعد مہینے کی۔ یعقوب خاں خانساماں، کرامت النسا بیگم ہمشیرہ شاہ عالم بادشاہ کو الٹا لٹکا کر تیل گرم اس پر ڈالا اور کوڑے مار کر اسباب کا پتہ دریافت کیا اس نے چند دفینوں کا پتہ بتایا۔ وہاں سے صندوق سونے اور چاندی کے برتنوں کے اور زیور مرصع اور سادہ، لاکھوں روپیہ کا مال اور دو لاکھ روپیہ نقد اور اجناس پوشاکیں وغیرہ برآمد ہوئیں......

"موتی محل میں شاہ عالم کو مع شہزادوں کے مثل قیدیوں کے گرم اینٹوں پر کھڑا کیا اور مرزا اکبر شاہ اور سلیمان شکوہ کو لکڑی سے باندھ کر مارنے کا حکم دیا........ اسی وقت شاہ عالم کے محل کی چھوکریوں کو الٹا لٹکا کر گرم تیل ان کے پیروں پر ڈالنا شروع کیا۔ انھوں نے چند دفینے بتائے وہاں سے صندوق سونے کے اور چاندی کے برتنوں کے اور زیور مرصع اور ظروف مٹی وغیرہ کے نکلے ان کو دیکھ کر نواب بہت خوش ہوا اور کہا کہ میرا اقبال اور طالع قابلِ ملاحظہ ہے کہ آسمان و زمین سے مال برستا ہے۔ شاہ عالم دھوپ میں لب خشک اور چشم تر بیٹھا ہوا تھا اور فریاد کرتا تھا اور گالیاں دیتا تھا نواب نے افاغنہ دیو سیرت کو حکم دیا کہ اس کو زمین پر گرا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دو۔ وہ لوگ اس کو چمٹ گئے اور بے چارے کو زمین پر گرا کر اس کی آنکھوں میں

سلائی پھیردی وہ زمین پر تڑپنے لگا، پھر اس کو لکڑیاں مار کر بٹھا دیا۔ نواب نے ازراہِ تمسخر اس سے دریافت کیا کہ کچھ نظر آتا ہے اس نے جواب دیا کہ بجز اس قرآن مجید کے جو درمیان میں ہوا تھا اور کچھ نظر نہیں آتا ——— نواب غلام قادر خاں نے اٹھ کر اس کے سینے پر ایک لات ماری۔ وہ چت گر پڑا۔ یہ چھاتی پر چڑھ بیٹھا قندھاری خاں نے شاہ عالم کے ہاتھ پکڑ لئے اور ہمراہیوں نے پاؤں پکڑے۔ نواب قادر خاں نے چھرے سے اس کی ایک آنکھ اور قندھاری خاں نے دوسری آنکھ نکالی[1] شاہ عالم مثل مرغ بسمل کے تڑپتا تھا .... (نواب نے) مصوّر کو طلب کر کے حکم دیا کہ تصویر اس وضع سے کہ میں شاہ عالم کے سینہ پر بیٹھا ہوا اور چھری ہاتھ میں لئے ہوئے آنکھیں نکالتا ہوں کھینچ دے۔ چند اشخاص شاہ عالم پر مامور کئے کہ اس کو اور اس کے بچوں کو ہرگز آب و دانہ نہ دیں۔ آواز رونے پیٹنے کی سن کر دریافت کیا کہ کیا غل ہے۔ حاضرین نے جواب دیا کہ شاہ عالم کی وجہ سے مستورات گریہ وزاری کرتی ہیں۔ اسی وقت حکم دیا کہ جو روئے گا وہ بھی مثل شاہ عالم کے اندھا کر دیا جائے گا۔ وہ سب اپنا اپنا خون جگر کھا کر چپ رہیں شاہ عالم ادھ موا تڑپا کیا اور کوئی اس کی خبر نہ لیتا تھا اور کوئی

---

[1] شاہ عالم نے آنکھوں کا مضمون سو سو طرح باندھا ہے ؎

دلبر سے مل کے آہ اِن انکھیوں نے کیا کیا
کی لیے بُت سے چاہ ان انکھیوں نے کیا کیا

؎ کرتی ہیں میرے دل پر جو کچھ بلا سو آنکھیں
تقصیر نہیں کسو کی جو ہیں بلا سو آنکھیں

؎ مجھ سو سلوک آنکھوں نے کیا کچھ کیا ہی ہائے
دل میرا دامِ عشق میں پھنسوا دیا ہائے

؎ دلبر سے دل لگایا ان آنکھوں کا بُرا ہو
جی مفت میں پھنسایا ان آنکھوں کا برا ہو

؎ لاچار ہوں میں اپنی آنکھوں کے ہات یارو
کرتی ہی دشمنی نت یہ میرے ساتھ یارو

اس پر رحم نہ کرتا تھا۔ وہ العطش العطش کرتا تھا اور کوئی اس کو جواب نہ دیتا تھا۔

"نواب غلام قادر نے شاہ عالم کے پاس جاکر اس کی داڑھی پکڑ کر کہا۔ کہ میں نے یہ غوث گڑھی کی بدسلوکی کا بدلہ لیا ہی خدا کے خوف سے جان چھوڑ دی ورنہ تم اس لائق تھے کہ ہر عضو تمھارا جدا جدا کر کے چیل کوؤں کو کھلاتا۔

دوسرے روز بیدار بخت کو ہمراہ لے کر نواب ملکہ زمانیہ اور صاحبہ محل کے پاس گیا اور کہا کہ نذر موعودہ اب تک نہیں پہنچا ہے۔ ان دونوں نے کہا کہ تم جو ہم سے امید رکھتے ہو محض وہم و خیال ہے۔ اس بات سے خفا ہو کر دائی چنبیلی کو حکم دیا کہ محل میں جاکر دونوں کو مع لباس بدن کے علیحدہ کر کے کل اسباب کی ضبطی کرے اور ان کی چھوکریوں وغیرہ کو مع اس ملبوس کے محل سے نکال لائے۔ اس کی حکم کی تعمیل پوری پوری ہوئی ملکۂ زمانیہ اور صاحبہ محل کو رتھ میں سوار کر کے اور ان کے متعلق مستورات سہ صد نفر کو باہر محل سے نکال کر موتی محل میں پہنچا دیا۔ بیلداروں کو ان کے مکان کی چھتیں اور دیواریں توڑنے کا حکم دیا گیا چوں کہ نادر شاہ اور احمد شاہ اور بھاؤ وغیرہ کی لوٹ کے وقت ان کا اسباب نہیں لٹا تھا اور پچاس ساٹھ برس سے برابر نادر شاہ اور احمد شاہ اور تیمور شاہ اور شاہ عالم اور وزیر الممالک وغیرہ سب تحائف اور پیشکش حسب حال اپنے اپنے دیتے چلے آتے تھے اس واسطے نقد و جنس اس قدر ان کے یہاں سے نکلا جو حساب اور شمار سے بیرون اور افزوں ہی۔ وہ سب چھتوں اور دیواروں میں سے نکال لیا وہاں سے غلام قادر خاں نواب ناظر کے پاس آیا اور کہا کہ اتنے عرصہ سے تم مختار سلطنت تھے تم کو بھی دفائن کے حال سے ضرور واقفیت ہوگی تم کو بھی کچھ دینا چاہیئے .... القصہ نواب ناظر کا کل اسباب ضبط کیا گیا۔ چالیس ہزار روپیہ اور پانچ ہزار اشرفیاں اور چند صندوق

سونے چاندی کے برتنوں کے اور چند صندوق زیورات مرصع و سادہ کے، اور تیس من برتن تانبے کے اور دو تختے دوشالوں کے اور چالیس جامدانی اور بٹاپے کمخواب اور پارچہ سفید الوانی اور دکھنی کے کہ مال لاکھوں روپیہ کا تھا ضبطی میں آیا۔۔۔
"چھبیسویں ذی قعدہ کو مرزا اکبر شاہ و سلیمان شکوہ وغیرہ، ۲۹ شہزادوں کو اپنے پاس طلب کر کے رقص و سرود کا حکم دیا وہ عذر کرنے لگے نواب نے جواب دیا کہ میں نے عرصہ سے تعریف سنی تھی اگر حقیقت میں ایسا نہ ہوتا تو میں یہاں تک کیونکر آتا یہ کہہ کر حکم دیا کہ اگر آیندہ۔ یہ عذر کریں تو ان کے چابک مارو اور ناک کان کاٹ لو۔ بہ مجبوری جو کچھ اور جیسا ان کو آتا تھا وہ گائے اور ناچے نواب بہت محفوظ ہوا اور کہا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے باپ اور بچوں کو آب و دانہ کی اجازت ہو جاوے نواب نے حکم دیا کہ بقدر سدِ جوع اور رفع عطش کے آب و دانہ دیا جائے۔ نواب سب اپنے متعلقین کو باہر کر کے اور سر اپنا مرزا اکبر کے زانو پر رکھ کر سو رہا اور اپنی تلوار اور چھری اس کے پاس رکھ دی۔ بعد تھوڑی دیر کے ایک سیلی اس کی گردن پر ماری اور کہا کہ اس حوصلہ سے خیال سلطنت کا اپنے جی میں رکھتے ہو اگر کچھ بھی ہمت اور حوصلہ تم کو ہوتا تو اس وقت کام میرا تمام کر دیتے۔ تم سے کون مواخذہ کر سکتا تھا۔
"ایک خواجہ سرا نے آکر اطلاع دی کہ شاہ عالم کی دس سالہ لڑکی بھوک اور پیاس سے مر گئی نواب نے حکم دیا کہ جہاں پڑی ہے وہیں ان ہی کپڑوں میں دفن کر دو۔
"چھٹی ذی الحجہ کو بیدار بخت نے کہلا کر بھیجا کہ محمد شاہ کی حرم خاص مر گئی ہے اس کی تجہیز و تکفین کے واسطے کیا حکم ہے نواب نے بہت گالیاں دے کر

کہا کہ وہیں پڑی رہنے دو۔ جب بدرجۂ غایت تعفن آنے لگا تو تیسرے روز مصاحبین کی سفارش سے دفن کرنے کا حکم ہوا۔

غلام قادر خود کہتا تھا کہ میں قہرِ خدا ہوں خدا نے تمھاری بداعمالی کے سبب مجھے تم پر مسلط کیا ہے۔

اس نے دائی چنبیلی کی زبانی مرزا ہینگا اور جھنگا کی لڑکیوں کی خوبصورتی کی تعریف سنی تو ان کو موتی محل میں طلب کیا اور بے پردہ و بے حجاب ان کو برابر بٹھا لیا ان کی صورت کی تعریف اپنے مصاحبین سے کی اور اختلاط کیا[1]۔

یہ مظالم کی انتہا تھی چور اچکے اور لیٹرے بھی مغل شہزادیوں کی عزت کرتے تھے اور کبھی ان کو نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ ٹامس ٹوائنگ (Thomas Twining) نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کے چھ برس کے بعد میں بلند شہر کے قریب سے گذر رہا تھا کہ ڈیڑھ سو گوجر ڈاکوؤں نے میری پالکی پر حملہ کا ارادہ کیا۔ میرے ساتھ مشکل سے بیس آدمی تھے انھوں نے پالکی پر پردے ڈال دیئے اور زور سے کہنا شروع کیا کہ بادشاہی حرم کی بی بی صاحبہ کی سواری جاتی ہے۔ لیٹرے فوراً سلام کر کے ہٹ گئے۔ اور کسی نے تعرض نہیں کیا[2]۔

آگے کے واقعات جو میر نے لکھے ہیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:-

"جب (غلام قادر کا) پورا تسلط ہو گیا تو ناظر کو بھی قید کر لیا۔ شہر پر آفت آگئی۔ مرزا اسمٰعیل نے غلام قادر سے خفا ہو کر مرہٹوں سے صلح کر لی۔

---

[1] تاریخ عبرت افزا ص ۲۶ تا ۶۶ [2] Travels In India by T. Twining p. 269 نیز سرکار: ج ۳ ص ۴۵۸۔

اس اثنا میں مرہٹوں کی فوج قریب آپہنچی اور بعض سردار تو شہر میں بھی داخل ہو گئے۔ روہیلہ (غلام قادر) قلعہ بند ہو گیا اور رات کے وقت خضری دروازے کے راستے سے اپنی فوج و اسباب، زر و مال، بادشاہ زادوں ناظر اور اس کے ساتھیوں کو ساتھ لے کر نکل گیا اور شاہدرے کے نزدیک حصار باندھ کر مقیم ہوا۔ مرہٹوں نے یہ بے حیائی دیکھ کر دریا کے اس پار لڑائی شروع کی کبھی یہ غالب آتے اور کبھی وہ ملعون، جب اس طرح ایک مہینہ کا عرصہ گذر گیا تو دکن سے ایک سردار علی بہادر نامی آیا اور روہیلوں سے سرگرم پیکار رہا۔ دو تین لڑائیوں کے بعد بڑی جرأت سے اسے گرفتار کیا بادشاہ اسی شاہ عالم (نابینا) کو مقرر کیا اور قلعہ جاٹوں کے حوالے کر دیا۔ مرہٹے بادشاہ کو سورو پیہ روز دیتے ہیں اور سارے ملک پر قابض ہیں اس ملعون (غلام قادر کو) بڑی ذلت سے قتل کیا۔ اب بادشاہ مرہٹے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ دیکھیے۔ یہ رنگ کب تک رہتا ہے"۔[۱]

شاہ عالم ثانی نے ایک غزل میں ان حالات کی طرف اشارہ کیا ہے:

صرصر حادثہ برخاست پے خواری ما — داد بر باد سر و برگ جہانداری ما
آفتاب فلک رفعت و شاہی بودیم — برد در شام زوال آہ سیاہ کاری ما
چشم ما کندہ شد از دست فلک بہتر شد — مانہ بینیم کہ برد غیر جہانداری ما
مادھوجی سندھیا فرزند جگر بند من است — ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

مادھوجی سندھیا نے اس دردناک قصہ کو سن کر مرہٹہ فوج بھیجی اور غلام قادر کو بہت سی ایذائیں پہنچا کر ۱۷۸۸ء میں مار ڈالا۔ مرہٹوں نے نابینا شاہ عالم ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا اور اس کے خرچ کے لئے نو لاکھ روپیہ سالانہ مقرر کر دیے۔ پامر نے چھ لاکھ لکھے ہیں لیکن ایک روایت ہے کہ حقیقتاً

---

[۱] تاریخ عبرت افزا ص ۸۹، ۹۱۔

۷۰۰۰ سے زیادہ نہیں ملے[1]

یہ حالات تھے جن میں میر کی شاعری پروان چڑھی۔ اس وقت ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام نزع کی آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ دیہی معیشت روز بروز ختم ہو رہی تھی[2] بنگال اور کرناٹک کے خزانوں نے انگلستان میں صنعتی انقلاب تو برپا کر دیا تھا[3] لیکن ہندوستان میں ابھی سرمایہ داری نے کوئی واضح شکل اختیار نہیں کی تھی۔ خالصہ زمینیں سب باغی جاگیرداروں کے پاس چلی گئی تھیں، پرانا فوجی، زرعی اور صنعتی نظام بوسیدہ ہو چکا تھا لیکن نہ ملک میں ایسی بڑی تبدیلی ہوئی تھی جو اس کو جاگیرداری کے دائرے سے باہر نکال سکتی۔ اور نہ عوام میں کوئی ایسا انقلابی شعور پیدا ہوا تھا جو ان کی حالت کو بدل دیتا۔ سیاست کے سمندر میں بہت سی موجیں اٹھیں، لیکن وہی امیرانہ کلچر اور رئیسانہ تمدن پھر دوسری شکل میں براجمان ہو گیا۔ کچھ نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکیں بلبلوں کی طرح ابھریں اور غائب ہو گئیں لیکن نہ وہ جاگیرداری کی اصلاح کر سکتی تھیں، نہ امیرانہ

---

[1] بحوالہ ٹو ای لائٹ آف دی مغلز

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجوں نے دہلی کو مرہٹوں سے چھین لیا اور شاہ عالم کی پنشن صرف ایک لاکھ کر دی۔ ۱۸۰۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ فراقی نے وقائع عالم شاہی میں اس کی بے بسی اور بیچارگی کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں ص ۲۲، ۲۳، ۲۸۔

[2] شورشوں اور خانہ جنگیوں کے علاوہ ۱۷۶۱ء میں دہلی کے قریب نہروں کا انتظام خراب ہو گیا۔ اور ۱۷۸۵ء میں زبردست قحط پڑا۔ ایشیاٹک سالانہ رجسٹر (۱۸۰۰ء) ج ۲ ص ۳۷

[3] ملاحظہ ہو "جنگ پلاسی اور انگلستان کا صنعتی انقلاب" از خواجہ احمد فاروقی، مطبوعہ ہمایوں لاہور خاص نمبر جنوری ۱۹۴۳ء۔

قوت سے ٹکرا سکتی تھیں اور نہ ایک نئی دنیا بنا سکتی تھیں۔

یہ سارا ماحول میر کی غزلوں میں سما گیا ہے۔ انھوں نے شعر نہیں کہے، دل اور دلی کے مرثیے لکھے ہیں، اور اپنے اشاراتی انداز میں خارجی حقیقتوں کی روح کو اس طرح جذب کیا ہے کہ موضوع و معروض کی دوئی مٹ گئی ہے۔ جس طرح "شراب کھچ کر تلوار" ہو جاتی ہے اسی طرح میر کا تاریخی ماحول ان کی غزلوں میں ڈھل گیا ہے۔ انھوں نے علامتی اور سماجی محرکات کی مدد سے جو نئی دنیا تخلیق کی ہے، اس میں فکر اور جذبہ، عقل اور وجدان اور شعور اور تحت الشعور کی ہم آہنگی اور ہم آمیزی ہے۔ اسی لئے ان کی غزل کا ہر شعر ایک فضا رکھتا ہے اور اس میں سخن سے زیادہ ایک ماورائے سخن بات بھی ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے:

> بہادر شاہ اول کی وفات سے لے کر برطانوی حکومت کے قیام تک اہلِ دہلی کو جن مسلسل ہولناک مصائب کا سامنا کرنا پڑا ان کے مقابلہ میں تیمور کا قتل عام کچھ بھی نہ تھا[1]

لیکن اس زمانہ کی تاریخ محض شورش پسندی یا عیش کوشی کی داستان بھی نہیں ہے۔ سماجی انحطاط کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں بھی غیرت و شجاعت اور ایثار و کرم کی حیرت انگیز مثالیں مل جاتی ہیں۔ ٹھیک اس زمانہ میں جب دہلی کے عوام سیاسی آندھیوں کے رحم و کرم پر تھے اور ان کی حیثیت پرکاہ سے زیادہ نہیں رہی تھی، میر اپنی جگہ چٹان کی طرح مضبوط رہے حالاں کہ

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات: صفحہ ح

انھوں نے یہ واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے، یا ان کے زخم برداشت کئے تھے، وہ آسودۂ ساحل نہیں، اس قلزمِ خون کے شناور تھے پھر بھی، انھوں نے غمِ عشق اور غمِ آفاق کو مردانہ وار اٹھایا اور زمانہ کی بے مہریوں کے آگے گردن نہیں جھکائی۔ میر نے زندگی کا وہ سلیقہ پیدا کیا ہے جو ساری غم ناکامیوں سے کام لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا غم المیہ کی بلندی کو پہنچ گیا ہے۔ ان کے یہاں جو سوز و الفت ہے وہ لازمۂ انسانیت ہے، جو دردمندی ہے، اس کے بغیر زندگی ویران اور بے رونق ہے۔ ان کے غم میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت، رکھ رکھاؤ، ضبط اور خودداری کا احساس اور مقابلہ کی ہمت اور توانائی ہے۔ ان کا غم روایت نہیں، زندگی کی حکایت ہے۔ انھوں نے جس غم کا اظہار کیا ہے وہ صرف اپنی بے رونقی کا نہیں، بلکہ اپنے طبقہ اور تمدن کی بے رونقی کا بھی غم ہے:

صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

تو ہے بیچارہ گدا، میر تیرا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

تڑپ کے خرمنِ گل پر کہیں گرا اے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے　　یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا
کہے تو میرؔ بھی ایک بلبلا تھا پانی کا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشان
مشتِ غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

میرؔ کے کلام میں سماجی شعور، اور غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی اتنی صحیح آمیزش ہے کہ ان کے اشعار میں واقعی "ایک آگ کی سی لپیٹ" اور "قیامت کا سا ہنگامہ" نظر آتا ہے۔ شیفتہؔ نے صحیح لکھا ہے:

صدآہ دردناک بتاثیر یک مصرع اونیست[1]

یہ اشعار صرف شاعر کے انفرادی تجربہ ہی کے ترجمان نہیں، بلکہ عوام کی دکھی ہوئی زندگی کی فریاد بھی ہیں:

اے بتو اس قدر جفا ہم پر
عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گویا جنسِ ناروا ہیں ہم

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں
اس غم کدہ میں آہ! دلِ خوش کہیں نہیں

کچھ کچھ کہوں گا روز یہ کہتا تھا دل میں میں
آشفتہ طبع میرؔ کو پایا اگر کہیں
سو کل ملا مجھے وہ بیاباں کی سمت کو
جاتا تھا اضطراب زدہ سا ادھر کہیں
لگ چل کے میں برنگِ صبا یہ اسے کہا
اے خانماں خراب ترا بھی ہے گھر کہیں
آشفتہ جا بجا جو پھرے ہے تو دشت میں
جاگہ نہیں ہے شہر میں تجھکو مگر کہیں

---

[1] گلشن بے خار (نول کشور) ص ۲۱۰۔

آسودگی سی جنس کو کرتا ہے کون سوخت — جانے ہے نفع کوئی بھی، جی کا ضرر کہیں
موتی سے تیرے اشک ہیں غلطاں کسو طرف — یاقوت کے سے ٹکڑے ہیں لختِ جگر کہیں
تا کے یہ دشت گردی و کب تک یہ خستگی — اس زندگی سے کچھ تجھے حاصل بھی مر کہیں
کہنے لگا وہ ہو کے پُر آشفتہ یک بیک — مسکن کرے ہے شہر میں مجھ سا بشر کہیں
آوارگاں کا ننگ ہے سننا نصیحتیں — مت کہیو ایسی بات تو بارِ دگر کہیں
تعیین جا کو بھول گیا ہوں پہ یہ ہے یاد — کہتا تھا ایک روز یہ اہلِ نظر کہیں
بیٹھے اگرچہ نقش ترا تو بھی دل اٹھا — کرتا ہے جائے باش کوئی رہگزر کہیں
کتنے ہی آئے لے کے سر پُر خیال میر — ایسے گئے کہ کچھ نہیں ان کا اثر کہیں
کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سروپا کی ہو — اب بڑھ گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بوئے گل اور رنگِ گُل دونوں ہیں دل کش اے نسیم
لیک بقدرِ یک نگاہ، دیکھیے تو وفا نہیں
شکوہ کروں ہوں بخت کا، اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجھ کو خدا نخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں
چشم سفید و اشک سُرخ، آہ دل حزیں ہے یاں
شیشہ نہیں ہے، مے نہیں، ابر نہیں، ہوا نہیں

اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش   جی ہی نکل گیا جو کہا ان نے ہائے گُل

نہ خوں ہو آنکھوں سے بہا اور نہ ہوا داغ   اپنا تو یہ دل میرؔ کسی کام نہ آیا

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

اب خرابہ ہوا جہاں آباد   ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں   تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دلّی میں اب کی آکر اُن یاروں کو نہ دیکھا
کچھ وے گئے شتابی، کچھ ہم بھی دیر آئے
بن جی دیئے نہیں ہے امکاں یاں سے جانا
بسمل گہِ جہاں میں اب ہم تو میرؔ آئے

میرؔ نے ان اشعار کی بلیغ رمزیت میں خارجی حقیقتوں کو سمو لیا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خارجی حقیقت جب غزل کے شعر میں جلوہ گر ہوتی ہے تو صرف "اندازِ قد" سے پہچانی جاتی ہے اس کے ذریعہ بے ربط چیزوں میں ربط اور مانوس چیزوں میں تازگی پیدا کرنا ہوتی ہے:

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں   یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرزبس　　ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ترے خیال میں جیسے خیال مفلس کا　　گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

زیرِ فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

میر کے کلام میں ہمہ گیر اداسی ہے جو بے رحم خارجی حالات کا فطری ردِ عمل ہے لیکن اس جگہ جاکی کے باوجود میر نے اپنے وقار کو نہیں کھویا۔ ان کی ذات خارجی حقیقت سے کہیں زیادہ اہم ہے، ان کی محبت، سیاسی تغیرات سے کہیں زیادہ دیرپا ہے۔ ان کے یہاں اچھی قدروں کا احترام اور انسان کی عظمت کا یقین ہے۔ ان کا دل خلش آشنا اور ان کا عشق، شباب کی معصوم آرزوؤں سے آباد ہے، وہ اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا چاہتے ہیں۔ "بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست" اور حالات کا اپنے "اندرونی قلعہ" تک مقابلہ کرتے ہیں۔ رہی شکست و فتح، سو وہ "نصیبوں سے ہے"، لیکن تسکین کے لئے یہ کیا کم ہے کہ

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!

حالات کا رخ بدلنے اور تاریخ کو موڑ دینے کی ہمت میر میں کیا، اس وقت کسی میں بھی نہیں تھی۔ ان سے اس قسم کی توقع رکھنا خارجی عوامل سے ناواقفیت کا

ثبوت دیتا ہے۔ اس وقت پرانا نظام پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ پرانی تہذیب کے صحیفے کے ورق بکھرے پڑے تھے۔ میرؔ نے ان کو کلیجہ سے لگایا، آنکھوں سے چوما، اور ان کو دل و جگر کے خون سے پھر جوڑا۔ یہ بغاوت یا سرکشی نہیں ہے۔ لیکن ان نامساعد حالات میں جن کا اجمالی ذکر اوپر آ چکا ہے غیر معمولی جرأت اور ہمت کا کام ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کی سیرت بلند، اور استوار ہو، یہ کس بل، یہ تیور، یہ توانائی دیکھئے:-

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی
اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

میں گریۂ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ
یک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

راہ دمِ تیغ پہ ہو کیوں نہ میرؔ   جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے

اس منزل پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے "سنگِ گرانِ عشق" اٹھا لیا ہے اور دلِ پُرخون کی گلابی سے جینے کا ایک نیا ڈھنگ نکال لیا ہے۔ یہ اشعار بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان میں بے کرانی اور بے پایانی ہے۔ اور سطح کے نیچے بلا کی شورش ہے:

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

زیرِ شمشیرِ محبت میر تڑپا کیا
سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

سعیٔ طوفِ حرم نہ کی ہرگز
آستاں پر ترے مقام کیا

مرے تغیرِ حال پر مت جا
اتفاقات ہیں زمانے کے

حصول کام کا دلخواہ یاں ہوا بھی ہے
سماجت اتنی بھی سب سے، کوئی خدا بھی ہے

میر مت عذر گریباں کے پھٹے رہنے کا کر
زخمِ دل، چاکِ جگر تھا کہ سلایا نہ گیا

میر کو الفاظ میں تحویل کرنے ہی سے ان کا شاعرانہ آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے
اس میں ان کی شخصی اور اجتماعی زندگی کا سوز و ساز موجود ہے۔ گویا
دنیا سمٹ آئی ہے مرے دیدۂ تر میں

انھوں نے یہ لب ولہجہ مسرت والم کے سطحی امتیازات کو مٹاکر اور رفتار و گفتار و کردار کی ہم آہنگی سے پیدا کیا ہے۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ شاعری میں بیتا ثیر اور تیزی انجربات کے شیشہ میں پڑنے ہی سے آتی ہے:

در دل ما غم دینا، غم معشوق شود
بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ، ما

میر زندگی کے ہر نشیب و فراز سے گزرے تھے انھوں نے اسے دیکھا ہی نہیں، چکھا تھا۔ یہ روایت کہ انھوں نے اپنے پائیں باغ پر بھی نظر خوار نہیں کی اور ہمیشہ گوشہ گیری اور مردم بیزاری کی زندگی بسر کی، صیحح نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اگر ان کے کلام کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک سماجی شعور ہے۔ اس میں تاریخی سچائیاں جھلکتی ہیں۔ ان کی شاعری، معاشرتی فرائض کا احساس رکھتی ہے۔ اور جہاں انھوں نے اپنے انفرادی جذبات کا اظہار کیا ہے، وہاں بھی اجتماعی حقیقتیں الفاظ کے جھروکوں سے جھانکتی ہیں، انھوں نے جن سچائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ذہنی تجرید نہیں ہیں بلکہ جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی اور انسانی ہیں۔ ان کے یہاں دیوار کے سائے، راہ کے کانٹے۔ مکڑی کے جالے، بجھتے ہوئے دیئے اور لٹے ہوئے نگر کا ذکر رسمی نہیں ہے۔ اور نہ ان کی شاعری کا تعلّق جامع مسجد کی سیڑھیوں سے روایتی قسم کا ہے۔ اس کے پیچھے ادب اور سماج مواد اور ہیئت، جذبہ اور فکر کا وہ گہرا رشتہ ہے جو تاریخی سچائیوں میں حُسن اور زندگی پیدا کر دیتا ہے۔

تلاشِ معاش

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ میر کی زندگی کا نیا دور اس وقت سے شروع ہوا جب وہ اپنے خالو سے خفا ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ ذکرِ میر میں لکھتے ہیں:

یک روز خالوے کذائی بر طعامم طلبید، تلخی از و کشیدم۔ بے مزہ شدم دست در طعام ناکردہ برخاستم۔ چوں پائے چراغے نہ داشتم۔ شام از خانہ اُو برآمدم [1]

ارادہ تھا کہ جامع مسجد جائیں۔ لیکن راستہ بھول کر حوضِ قاضی پہنچ گئے وہاں علیم اللہ نے اُن کے طورِ سودائیانہ سے پہچان لیا کہ یہ میر ہیں۔ وہ ان کو رعایت خاں کے پاس لے گیا وہ بڑے تپاک سے پیش آیا اور زمرۂ مصاحبین میں ملازم رکھ لیا:

تمتعے از دستم واز قیدِ تنگ دستی رستم۔[2]

شہرت

اس اقتباس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں میر کی شہرت دُور تک پھیل گئی تھی اور لوگ ان کے کمال کے معترف تھے وہ خود فرماتے ہیں:

یہ میرِ ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا | اندازِ سخن کا سبب شور و فغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا | منھ تکئے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا
جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا | ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

میر دریا ہے، سنے شعر زبانی اس کی | اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہے عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج | اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

---

[1] ذکرِ میر ص ۶۷ [2] ذکرِ میر ص ۶۸۔

مرثیے دل کے کئی کہہ کے دیے لوگوں کو　　شہر دلّی میں ہے سب پاس نشانی اس کی

میرؔ کی شہرت دلّی سے نکل کر دکن تک پہنچ گئی تھی۔ خود لکھتے ہیں:

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میرؔ　　یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک　　ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

لوگ میرؔ کی غزلوں کی نقل لیتے تھے۔ چیدہ چیدہ اشعار یاد رکھتے تھے، امراء کی محفلوں میں ان کی غزلیں پڑھی جاتی تھیں اور خانقاہوں میں اہل دل کو ان پر وجد آتا تھا:

مطرب سے غزل میرؔ کی کل میں نے پڑھائی　　اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں　　وہ آج میں سنا تو ہے میرؔ ا کہا ہوا

ذکر میرؔ میں لکھا ہے کہ ایک روز رعایت[1] خاں مہتابی پر بیٹھا تھا اور قوال کا لڑکا گا رہا تھا۔ اتنے میں میرؔ جو ان کے ملازم تھے، آ پہنچے۔ رعایت خاں نے اصرار کیا کہ اپنے ریختے کے دو چار شعر اسے یاد کرا دیجیے۔ میرؔ نے اصرار سے مجبور ہو کر یاد تو کرا دیے لیکن یہ بات انھیں ایسی ناگوار گذری کہ ایک مدت تک ادھر کا رُخ نہیں کیا۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ امرا ان کی ناز برداری کرتے تھے اور معروف شعرا ان کی غزلوں پر غزلیں کہتے تھے۔ حاتمؔ نے ۱۷۴۱ء میں ان کی زمین میں غزل کہی ہے۔[3] اس وقت میرؔ کی عمر ۱۹ برس کی تھی۔ ان کی شاعری کا سب سے پُرکیف زمانہ دہلی

---

[1] مولوی عبدالحق نے سادات خاں لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ رعایت خاں ہونا چاہیے۔ (ذکر میر، مقدمہ ص ی)
[2] ذکر میر ص ۱۰۰، ۱۰۱ [3] دیوان زادہ قلمی رام پور۔

میں گزرا ہے۔ وہ اپنے یہاں مشاعرے کرتے اور دوستوں کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ تذکرہ نکات الشعراء (۱۷۵۱ء) کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۹ برس کی عمر میں ان کی شہرت بوئے گل کی طرح چاروں طرف پھیل گئی تھی اور ان کا طرزِ سخن روز بروز مقبول ہو رہا تھا۔ ۱۷۵۵ء میں ان کی شہرت اتنی بڑھ گئی کہ راجہ جگل کشور خود انہیں اپنے گھر لے گئے اور قدردانی میں کسر نہ کی لیکن میر نے ان کے کلام کو اصلاح کے قابل نہ سمجھا اور سب پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ یہ واقعہ خان آرزو کے انتقال کے بعد کا ہے۔

میر کی ہر محفل میں شاعری کی وجہ سے قدر ہوتی تھی اور ہر چھوٹا بڑا ان کے کمال فن کا احترام کرتا تھا۔ ان کا یہ کہنا کہ "پہ میرے شعر نے روئے زمین تمام لیا" شاعرانہ تعلی نہیں، امر واقع ہے۔ مصحفی نے عقدِ ثریا میں لکھا ہے:

صیت سخنوریش تمام اطراف ہندوستان را فرا گرفتند۔ شعر ریختہ اش از کہنہ تا مہ بر زبان دارند۔ وصادر و وارد بارے بہ دیارے بطریق ارمغاں برند[1]

یہی نہیں بلکہ مصحفی نے ان کی تقلید پر فخر کیا ہے:

دلی کے سب مشاعرے دیکھے   اور ہم طرح میر کا میں رہا[2]

میر کی شاعری دلی ہی میں پلی اور بڑھی، امیر و فقیر، شاہ و گدا ہر ایک سے ملاقات کی تقریب یہی شعر و شاعری تھی۔ میر کے کمال فن کا اعتراف ہر چہار طرف ہوا ہے لیکن وہ یہی سمجھتے رہے کہ میرے فن کی صحیح داد نہیں ملی۔ بلکہ جیسے جیسے ان کا

---

[1] عقد ثریا ص ۵۳، ۵۴   [2] کلیات مصحفی قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، بحوالہ مصحفی: ابو اللیث صدیقی۔

احساسِ کمال ترقی کرتا گیا وہ اپنے ہم عصر شعرا کو حقیر اور ہیچ دپوچ سمجھنے لگے اور لوگوں کی داد کو رسمی اور معمولی۔

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہنچے ہیں یار　　ورنہ ہر مصرع میں معشوق شوخ و شنگ ہے
بات بنا نا مشکل سا ہے شعر سبھی یاں کہتے ہیں　　فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

اژدر نامہ میں اس احساس کمال کی انتہا ہو گئی ہے اس نظم میں اپنے آپ کو ایک اژدر ثابت کیا ہے اور معاصرین کو مسکین و خوار حیوانات سے تشبیہ دی ہے۔ میاں محمد امانؔ نثارؔ نے سرِ مشاعرہ اس کے جواب میں غزل پڑھی، اس کا مقطع یہ ہے:

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثارؔ　　ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر[1]

بقاؔ نے بھی چوٹ کی ہے:

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ　　اور بستی نہیں، یہ دلی ہے

خانہ نشینی اس زمانہ میں معاصرین کی مخالفت، معیشت کی فکر اور دلی کی تباہی و بربادی نے میرؔ کو دل برداشتہ اور خانہ نشین بنا دیا تھا۔ شجاع الدولہ اور روہیلوں کے درمیان لڑائی ہو چکی تھی اور حافظ رحمت خاں مارا گیا تھا:

چوں یقیں شد کہ اُو کشتہ افتاد　　شکرانہ ایں فتح وزیر سر بسجدہ نہاد
لشکرش بغارت رفت و ناموس بگیر آمد　　ملک بسیر حاصل او ہمہ در تصرف زیر آمد

میرؔ صاحب لکھتے ہیں:

فقیر دراں ایام خانہ نشین بود۔ بادشاہ اکثر تکلیف کرد۔ نہ رفتم ابوالقاسم خاں پسر ابوالبرکات خاں کہ صوبہ دار کشمیر بود و بنی عم عبدالاحد خاں مختار است، مراعات گونہ بکار می برد۔ گاہ گاہ باو ملاقات می شد گاہے بادشاہ ہم چیزے بہ چیزے می فرستاد۔

مصرعے گاہ گاہ می گویم　　کار دنیائے من ہمیں قدر است[2]

---

[1] مجموعہ نغز ص ۲۳۰　[2] ذکر میر ص ۱۳۵۔

یہ شعراء کی حالت کا آئینہ دار ہے:

کیا کہیں میر جی ہم تم سے معاش اپنی غرض
غم کو کھایا کریں ہیں لوہو پیا کرتے ہیں

آصف الدولہ کا بلانا

اس وقت میر کی حالت نہایت سقیم تھی، خوش قسمتی سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر کو، جو شجاع الدولہ کے تخت پر متمکن تھے، میر کے بلانے کا خیال آیا اور نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں موتمن الدولہ اور ان کے برادر خرد اسحاق خاں نجم الدولہ سے میر کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میر محمد تقی میر اگر یہاں آجائیں تو اچھا ہے، یہ لوگ خان آرزو مرحوم کے مربی اور قدردان تھے اور انہیں کی وجہ سے میر سے بھی تعلقات تھے لہذا فوراً زاد راہ اور خط بھیجا کہ لکھنؤ چلے آیئے، میر دل برداشتہ بیٹھے ہی تھے۔ اس خط کو دیکھتے ہی لکھنؤ چل کھڑے ہوئے۔

راستہ میں فرخ آباد کے رئیس مظفر جنگ نے میر صاحب سے چند روز قیام کی درخواست کی لیکن وہ نہ مانے، سیدھے لکھنؤ چلے آئے اور نواب سالار جنگ کے یہاں ٹھہرے۔ وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اور موقع دیکھ کر نواب آصف الدولہ سے بھی عرض کی کہ میر صاحب حسب الطلب آگئے ہیں۔ ذکر میر میں لکھا ہے کہ اتفاقاً چار پانچ دن کے بعد نواب عالی جناب، مرغوں کی لڑائی دیکھنے کے لئے تشریف لائے یہ وہاں موجود تھے۔ خدمت میں باریاب ہوئے۔ انھوں نے فراست سے تاڑ لیا کہ یہ میر تقی میر ہیں۔ فوراً بغل گیر ہوئے اور خود نشستگاہ خاص تک لے گئے اور اپنے اشعار انہیں مخاطب کرکے سنائے۔ سبحان اللہ کلام الملوک ملوک الکلام۔

نواب آصف الدولہ نے ازراہ قدردانی میر سے بھی پڑھنے کے لئے کہا۔ انھوں نے چند شعر سنائے۔ جب نواب صاحب کے اٹھنے کا وقت آیا اس وقت سالار جنگ نے کہا: "اب میر آپ کے حکم کے مطابق آگئے ہیں۔ بندگانِ عالی مختار ہیں۔

کوئی جگہ ان کے لیے تجویز فرمائیں۔" فرمایا "عن قریب کچھ مقرر کر کے اطلاع دی جائے گی۔"
دو تین دن کے بعد یاد فرمایا۔ میر حاضر ہوئے اور یہ قصیدہ جو مدح میں لکھا تھا پڑھا۔
ہوا کئے ہیں زبس شکوہ فلک تحریر   سیہ ہے کاغذ مشقی کے رنگ لوح ضمیر

میر لکھتے ہیں؛

قصیدہ کہ در مدح گفتہ بودم، خواندم، شنیدند و بہ لطف تمام در سلک
بندگان منسلک گردانیدند عنایت و مہربانی بحال من مبذول دارند۔[1]

آزاد نے تذکرہ آب حیات میں لکھا ہے کہ میر نے ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء میں دلی چھوڑی۔[2] لیکن گلشن ہند (اور گلزار ابراہیم) میں ان کے لکھنؤ جانے کی تاریخ ۱۱۹۷ھ/۱۷۸۲ء لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت سودا کا انتقال ہو چکا تھا۔[3] سودا کی تاریخ وفات ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء ہے۔ اس لئے گلشن ہند ہی کا بیان صحیح ہے۔ اس کی تصدیق احد علی یکتا کے بھی بیان سے ہوتی ہے؛

نواب آصف الدولہ..... بعد رحلت مرزا.... میر را از شاہ جہاں
آباد فخریہ طلب داشت۔[4]

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس وقت میر دلی ہی میں موجود ہیں۔ میر حسن کا تذکرہ ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء میں مرتب ہوا ہے اس لئے آزاد کی دی ہوئی تاریخ (۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتی۔

آب حیات میں لکھا ہے کہ جب میر لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس

---

[1] ذکر میر ص ۱۴۲ [2] آب حیات ص ۲۰۵ [3] اصل عبارت یہ ہے؛ "جب سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دار فانی سے عالم باقی کو سدھارے تو میر مذکور شاہ جہاں آباد میں تھے ۱۱۹۷ھ میں رایات عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔" گلشن ہند ص ۲۱۰ [4] دستور الفصاحت ص ۲۵۔

نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور لکھنؤ پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرا میں اترے۔[1] لیکن خود میر کا بیان یہ ہے کہ وہ عزت اور احترام سے زادِ راہ بھیج کر بلائے گئے:

ایشاں (نواب سالار جنگ) چیزے از سرکار گرفتہ خطے بمن نوشتند کہ "نواب والاجناب شما را می خواہد۔ باید کہ بہر طوریکہ دانند، خود را ازایں جا برسانند۔"[2]

احد علی یکتا نے لکھا ہے:

نواب آصف الدولہ ۔۔۔ میر را ۔۔۔ فخریہ طلب داشت[3]

شوق رام پوری نے بھی تکملۃ الشعرا میں اس کی تائید کی ہے:

از چند سال در بلدۂ لکھنؤ بطلب وزیر الممالک آصف الدولہ رفتہ است

نوادر الکملا میں بھی اس بات کو دہرایا گیا ہے:

آخر کار بہ ایمائے نواب وزیر حضرت دہلی را کہ بجائے وطن مالوف بود وداع کردہ بہ بلاد شرقی شتافتند۔

میر کی لکھنؤ میں بڑی قدر کی گئی اور ان کی تین سو روپئے ماہوار تنخواہ مقرر ہو گئی لیکن وہ خوش نہیں رہے۔ یہ اتنی بڑی رقم ہے کہ غالب کو باوجود ثنا گوئی اور مدح گستری کے دہلی اور رام پور سے میسر نہ آ سکی۔ ذوق کو شروع میں چار روپئے مہینہ وظیفہ ملتا تھا۔ بعد میں پانچ اور سات روپئے ہو گیا اور آخر میں سو روپئے ملنے لگے۔ جو ۱۸۵۴ء یعنی سال وفات تک ملتا رہا۔ مصحفی کے اخلاص کا حال اس قطعہ سے معلوم ہو گا جو انھوں نے دیوان ہفتم کے مطابق کسی امیر کی خدمت میں پیش کیا تھا؎

---

[1] آب حیات ص ۲۰۵ [2] ذکر میر ص ۱۳۹ [3] دستور الفصاحت ص ۲۳، ۲۶

چالیس برس کا ہی ہر چالیس کے لائق — تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق!
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے — ہم بھی تھے کسی روز دنوں پچیس کے لائق

باوجود اس تین سَو روپے ماہوار تنخواہ اور حکومتِ اودھ کی قدردانی کے میرؔ لکھنؤ سے "متاعِ ہنر" پھیر کر لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن سے آئندہ صفحات میں بحث ہوگی۔

آزاد کا یہ بیان کہ آخری عمر میں میرؔ کی تنخواہ بند ہوگئی تھی، صحیح نہیں۔ تذکرہ گلشن ہند میں لکھا ہی:

نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سَو روپئے مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے اُن کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہدِ وزارت میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہی، وہی حال ہی جو اُوپر مذکور ہوا[۱]

دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات بھی اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ لکھنؤ نے ان کی قدردانی میں کمی نہیں کی۔
مصحفی نے لکھا ہی:

در سرکار نواب آصف الدولہ اعتبار و امتیاز تمام دارد۔

شوق رام پوری نے بھی تکملۃ الشعرا میں یہی لکھا ہی:

نواب (آصف الدولہ) با او (میر) برعایت پیش آمد۔ تا حال کوس سخن وری در لکھنؤ می نوازد[۲]

۱؎ گلشن ہند ص ۲۱۰ ۲؎ تکملۃ الشعرائے جام جمشید: قلمی رام پور۔

شیفتہ نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے:

در لکھنؤ می گزرانید و مایحتاج از سرکار نواب وزیر الممالک بہادر می یافت[1]

احد علی یکتا نے زیادہ صراحت سے لکھا ہے:

نواب آصف الدولہ..... میر را..... بمنصب عالی ملازم ساخت

و از خاطر داری و پاس مشار الیہ ہیچ دقیقہ فرو می گزاشت[2]

امکان ہے کہ آصف الدولہ سے بگاڑ ہوا ہو لیکن بقول لطف تنخواہ میں کبھی قصور نہیں ہوا۔ ذکر میر اور کلیات میر میں ہر جگہ آصف الدولہ کی تعریف کی گئی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے نواب سعادت علی خاں سے بھی، گرفتہ مزاجی کی وجہ سے رنجش پیدا ہوئی ہو لیکن عزت اور احترام میں کمی نہیں آئی۔ آزاد نے لکھا ہے:

نواب سعادت علی خاں مرحوم ان کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔

نوادر الکلام میں قیام لکھنؤ کے متعلق لکھا ہے:

شہرۂ حسن کلام زمین و زماں را بر گرفت۔ ذرہ ذرہ روشناس و قطرہ قطرہ محو سپاس۔ چہ تعظیم ہا کہ نہ دیدند و چہ آفریں ہا کہ نکشیدند۔

بہر حال ان بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میر خود دلی چھوڑ کر گدایانہ لکھنؤ نہیں گئے، اور لکھنؤ میں ان کو عام طور پر مالی پریشانیاں لاحق نہیں تھیں۔

لکھنؤ کو روانگی

محمد حسین آزاد نے آب حیات میں میر کے لکھنؤ جانے کا واقعہ ان الفاظ میں لکھا ہے:

اگرچہ دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی محفلوں میں ادب ہر وقت

---

[1] گلشن بے خار: شیفتہ [2] دستور الفصاحت: یکتا۔

ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہر کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ ۱۷۷۶ء میں دلّی چھوڑنی پڑی۔ جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دیر آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منھ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بےشک گاڑی میں بیٹھئے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق؟" اس نے کہا: "حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے، باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔" میر صاحب بگڑ کر بولے کہ "خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرا میں اترے معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ۔ کھڑکی دار پگڑی۔ پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا، ایک رومال پڑی دار تہ کیا ہوا اس میں آویزاں مشروع کا پاجامہ، جس کی عرض کے پائیچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع۔ انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بےچارے غریب الوطن۔ زمانہ کے ہاتھ پہلے ہی دل شکستہ

اور بھی دل تنگ ہوئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے۔ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔[1]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ میر بہت بیکسیانہ لکھنؤ میں وارد ہوئے اور وہ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر نہیں بلکہ خود لکھنؤ گئے تھے۔ ان دونوں باتوں کی ذکرِ میر سے بخوبی تردید ہو جاتی ہے۔ رہا میر صاحب کا حلیہ اور ان کی وضع، اس کی تصویر کشی آزاد نے اپنے تخیّل کی رنگ آمیزی اور گلکاری سے اس خوبی کے ساتھ کی ہے کہ اس پر واقعہ کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ یہ تصویر اس تاریخی مرقع میں کھپ گئی ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کو خواہ مخواہ غلط سمجھا جائے دوسرے آزاد نے یہ باتیں ان بزرگوں سے سنی ہیں جنھوں نے میر کو دیکھا تھا۔

---

[1] آب حیات ص ۲۰۵، ۲۰۶

مندرجہ بالا اقتباس میں آزاد نے گاڑی کا واقعہ بھی لکھا ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ لازمی طور پر غلط ہو۔ بلکہ اس کی ایک حد تک تصدیق تو تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے بیان سے بھی ہوتی ہے:

> جب میر صاحب اکبر آباد سے پورب کو چلے۔ حسب اتفاق ایک بنیئے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئے مگر وقت سوار ہونے کے کچھ رات باقی تھی جب روز روشن ہوا اور صورت اس کی دیکھی منھ اپنا ادھر سے پھیر لیا اور لکھنؤ تک اس کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھے۔ سبحان اللہ کیا عالی دماغ لوگ تھے کہ ضرورت میں بھی ناگوار کو گوارا نہ کرتے تھے۔[1]

اس زمانے میں آزاد کی پہنچ جن تذکروں اور شہادتوں تک تھی آج ہماری نہیں اس لئے اس کے ہر بیان کو بلا استثنا "خیالی طوطے مینا" کہہ کر رد کر دینا مناسب نہیں ہے۔

لکھنؤ کا قیام آصف الدولہ کے دربار میں میر کی بڑی عزت اور وقعت تھی اور وہ ان کو اتنے عزیز تھے کہ سفر میں بھی ساتھ رکھتے تھے ان کے شکارنامے وغیرہ اس کے گواہ ہیں۔ ذکر میر میں انھوں نے گورنر کے لکھنؤ آنے، اس کے استقبال اور مہمان داری کا حال اس تفصیل سے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ ان جلسوں میں شریک تھے۔ اسی طرح کھیل تماشے اور شادی بیاہ کی محفلیں بھی ان سے خالی نہ تھیں۔ ہولی اور کتخدائی کی مثنویاں محض تخیل کے زور سے اور بغیر قریبی مشاہدہ کے نہیں لکھی جا سکتیں۔

لیکن بقول آزاد" انھوں نے بد دماغی اور نازک مزاجی کو جو ان کے ذاتی

---

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا: سعادت خاں ناصر۔ (قلمی)

مصاحب تھے، اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔۔۔۔ ایک دن نواب مرحوم نے غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میر صاحب ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا، جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمائش کی، آج غزل حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا خیر میر صاحب، جب طبیعت حاضر ہوگی۔ کہہ دیجیے گا۔"

"ایک دن نواب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا۔ آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا، آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات ناگوار گزری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا: "بازار میں باتیں کرنا آدابِ شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے!"

آزاد کے بعض بیانات پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا ہر بیان غلط ہی ہو۔ اسی قسم کا ایک واقعہ احد علی یکتا نے بھی لکھا ہے جس سے آزاد کے بیان کو تقویت پہنچتی ہے:

ایک روز میر صاحب ایک نیا قصیدہ لکھ کر نواب[۵۱] وزیر کی خدمت میں لے گئے۔ اتفاقاً اس روز ملا محمد مغلی بھی ایران سے آیا تھا اور چاہتا تھا کہ نواب وزیر الممالک کی مدح میں کچھ پڑھے۔ لیکن میر کا قصیدہ اتنا طولانی تھا کہ وقت باقی نہیں رہا۔ ملا محمد نے جل کر کہا کہ میر صاحب قصیدہ خوب ہے لیکن طویل ہے اگر نواب صاحب کو اتنا تحمل نہ ہوتا تو اسے کون سنتا۔ میر صاحب نے غصہ میں آکر بیاض پھینک دی اور بدمزہ ہو کر کہا کہ اگر نواب صاحب کو اتنا تحمل نہیں تو مجھے کب ہے۔ نواب صاحب خلقِ مجسم تھے ملا محمد کی بالکل پروا نہ کی اور میر کا بقیہ قصیدہ کمال مہربانی سے سنا اور داد دی[۵۲]

سعادت خاں ناصر نے بھی میر کی نازک مزاجی کا ذکر کیا ہے:

جب سرکار آصف الدولہ بہادر میں میر صاحب صیغۂ شاعری میں نوکر ہوئے، ایک دن وہ آصف جاہ کتاب خانہ میں جلوہ گر تھا اور دواوین زیر و بالا رکھے تھے۔ ایک جلد نواب نامدار کے ہاتھ سے دور اور میر صاحب کے نزدیک تھی، فرمایا "مجھے اٹھا دیجئے"۔ میر صاحب نے ایک خادم سے کہا "سنو! تمھارے آقا کیا فرماتے ہیں"۔ نواب نے راست ہو کر اٹھایا مگر یہ میرزائی نہایت ناگوار گزری۔ بعد ایک لمحہ کے فرمایا کیوں میر صاحب مرزا سودا کیسا شاعر مسلم الثبوت تھا۔ میر صاحب نے کہا بجا ع

ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است

حضور پرنور نے فرمایا کہ "ہم عیب پسند ہیں؟ یک نہ شد دو شد" اتنے میں میر سوز کہ استاد حضرتِ عالی کے تھے واسطے مجرے کے حاضر ہوئے۔ حضور نے فرمایا "کچھ پڑھو"۔ حسب الحکم میر سوز نے دو تین غزلیں پڑھیں۔ نواب فلک جناب

---

[۵۱] نواب آصف الدولہ [۵۲] دستور الفصاحت ص ۲۵، ۲۶

نے تعریف میں ان کی مبالغہ کیا۔ دلیری میر سوز صاحب کی اور تعریف نواب کی میر صاحب کو بہت ناگوار گزری۔ میر سوز سے کہا "تمھیں اس دلیری پر شرم نہ آئی"۔ میر سوز نے کہا: "صاحب، بندہ کیا ہی۔ میں شاہ جہاں آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا"۔ کہا "بزرگی اور شرافت میں تمھاری کیا تامل ہی مگر شعر میرے کیا کسی کہ ہمسری؟ موقع اور محل تمھاری شعر خوانی کا وہ ہی جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کلیاں پکتی ہوں، نہ کہ میر تقی کے سامنے"۔ میر سوز سے تو یہ کہا اور وہ شقہ کہ میر کی طلب کو حضور پُر نور نے لکھا تھا جیب سے نکال کر، حضور کے آگے رکھ دیا اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے خانہ آباد، دولت زیادہ۔ نواب نے فرمایا "خدا حافظ"

دو مہینے کے بعد تحسین علی خاں خواجہ سرا نے ذکر اس کی عسرت اور غریب الوطنی کا تقریباً حضور میں گزارش کیا۔ اس حاتم زماں نے اول شکایت اس کی بے اعتنائی کی بہت سی کی، بعدہٗ شفاعت خواجہ سرا قبول فرمائی۔ خواجہ سرا خوشا خوش میر صاحب کے پاس آیا اور وہ ذکر سنایا۔ میر صاحب نے دربار میں خواجہ سرا کی معرفت جانا ننگ مردی سمجھ کر انکار کیا۔

ایک دن وہ جوہر شناس ہنرمندان عتیق اللہ کے امام باڑے کی طرف آیا اور تحسین کو اشارہ سے کہا کہ میر صاحب کو لے آ۔ خواجہ سرا نے میر صاحب سے کہا: "چلو تمہارے لینے کو حضور آئے ہیں" سبحان اللہ کیا قدر شناس تھا کہ اپنے نوکر کی رئیسوں کی سی خاطر تھی"۔[۱]

مولوی محمد حسین آزاد نے لکھا ہی:

---

[۱] تذکرہ خوش معرکہ زیبا: سعادت خاں ناصر (قلمی)

جب نواب آصف الدولہ مرگئے، سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا۔ عرض کی جناب عالی! یہ وہی گدائے متکبر، جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا۔ اور کہا کہ "مسجد میں بھجوایئے۔ یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔" سعادت علی خاں جواب سن کر متعجب ہوئے مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت لے کر گئے۔ اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر، بلکہ عیال پر رحم کیجیے۔ اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے اسے قبول فرمایئے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں، میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف، میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپئے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے۔ مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔ سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی بات پیش جاتی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا۔ اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔

لیکن اس واقعہ کے بیان کرنے میں آزاد سے سہو ہوا ہے۔ انشا، ۱۸۰۰ء کے قریب لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کے نوکر ہوئے ہیں اور

اس وقت تک بقول لطف ان کی تنخواہ میں قصور نہیں ہوا تھا[۱]

بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ میر باوجود قدر و منزلت کے لکھنؤ میں خوش نہیں رہے اور برابر دلّی کو یاد کرتے رہے۔ یہاں کی درباداری، بدمستی، اور شائیدہ ماحول جو خندہ و قہقہہ ٹٹے سے عبارت تھا، میر کو پسند نہیں آیا۔ بعض جگہ انھوں نے زمانہ کی ناقدری کی شکایت کی ہے۔ اور لوگوں کی تعریف کو تحسین سخن ناشناس ٹھہرایا ہے۔

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خریدار لیکن نہ پایا گیا

متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو
بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

کیا قدر ہے ریختہ کی گو میں
اس فن میں نظیری کا بدل تھا

لکھنؤ سے انھیں خاص قسم کی نفرت تھی۔ وہ خرابۂ دلّی کو لکھنؤ سے دس گنا اچھا سمجھتے تھے۔[۲]

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیران کیا

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا
مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

گو لکھنؤ ویران ہو ہم اور آبادی میں جا
مقسوم اپنا لائیں گے خلق خدا ملک خدا

---

[۱] تذکرہ گلشن ہند ص ۲۱۰ [۲] جادو ناتھ سرکار نے لکھا ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب انگریزی ہی تھی اور پوری طرح ہندوستانی۔

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

میرؔ آخر وقت تک لکھنؤ میں رہے لیکن دلّی کی یاد ان کے دل سے محو نہیں ہوئی:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں دلّی سے بھی دیار ہوتے ہیں

ہر روز ایک نیا تماشا دیکھا ہر کوچے میں سو جوان رعنا دیکھا
دلّی تھی طلسمات کہ ہر جاگہ میرؔ ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

دل و دلّی دونوں ہیں گرچہ خراب پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں ہیں

میرؔ نے حضرت علی مرتضیٰ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دلّی جانے کا کیسا ارمان تھا۔ قطعہ کے شعر ہیں:

گر بھی کرے نہ تک بھی اعانت تری تو پھر
آجائے پختگی پہ میرا یہ خیالِ خام
یعنی کہ دیکھوں حضرت دہلی کی جانواح
معلوم ہے سوائے ترے حاصل کلام

میرؔ بہت نازک مزاج، ماضی پرست اور وضع دار واقع ہوئے تھے۔ لکھنؤ کے نئے انداز اور نئی تراشیں ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ اسی لئے وہ باوجود اہل لکھنؤ کی قدر دانی کے دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہے کہ اُجڑی ہوئی دلّی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔

اس کے علاوہ شعر و ادب محض قدر و منزلت سے ترقی نہیں کرتے۔ ان کے لئے کچھ تہذیبی قدروں کا ہونا ضروری ہے لکھنؤ میں ان کو جو قدریں ملیں وہ سطحی تھیں یا مصنوعی۔ میر ان میں سے ایک کو بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ لکھنؤ کی تہذیب خوب صورت تھی، پُر رونق تھی لیکن اس میں نہ گرمی تھی۔ نہ گداز۔ اس کا حُسن، نظر کو فریب دے سکتا تھا، لیکن۔ دل کو نہیں۔ اسی لئے میر جب تک رہے، لکھنؤ میں غریب الوطن اور جنسِ ناروا ہی رہے۔ اُن کے اثرات، لکھنؤ کی عصری فضا میں نظر ہی نہیں آتے۔ ایک پیڑ اگر غلط آب و ہوا میں لگا دیا جائے تو وہ پنپ نہیں سکتا اور اگر مصنوعی نگہداشت سے اس پر کوئی پھل آبھی جائے تو اس کا ذائقہ اور اس کی تازگی معلوم۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے دل کے مرثیے، لکھنؤ میں جرأت کی "چوما چاٹی" میں تبدیل ہو گئے اور وہ آخر وقت تک یہ شکایت کرتے رہے کہ:

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا   خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر کر لے چلو   بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

جرأت کی شاعری کے متعلق میر کی یہ رائے آزاد کی حاشیہ آرائی نہیں، واقعہ ہے تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے:

> مجلس شعرا مرزا محمد تقی خاں ترقی کے گھر منعقد ہوئی۔ جرأت کی بہت تعریف ہوئی۔ جرأت، میر تقی میر سے داد خواہ اپنے اشعار کا ہوا۔ میر نے دو چار بار خاطر داری کی جب کہ دیکھا کہ مغز اس کا چل نکلا ہے، کہا کہ جب تم بدیں جد و کد پوچھتے ہو، لاچار کہتا ہوں (میر کے مقولے کو بعینہٖ لفظ لکھتا ہوں، وے یہ ہیں)، کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو، اپنی چوما چاٹا کہہ لیا کرو۔[۱]

۱؎ تذکرہ کریم الدین ص ۲۰۶، ۲۰۷ (ترجمہ جرأت)

حکیم قدرت اللہ قاسم نے جرأت کو "سرآمد شعرائے بلدۂ لکھنؤ" لکھا ہے اور اس کے ترجمہ میں اس واقعہ کو بھی نقل کیا ہے۔[1]

لکھنؤ میں میرؔ کی عزت سب نے کی لیکن ان کے طرز اور ان کی زبان کی پیروی کسی سے نہ ہو سکی۔ میرؔ کی سی سادہ و معصوم مگر تازہ کار داخلیت ان کے بس کی نہیں تھی۔ جس تقلید کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ان کی زندگی سے زیادہ عہد جدید کا واقعہ ہے۔ تذکرۂ جلوۂ خضر تک عام خیال یہی تھا کہ

> دہلی کی زبان میر تقی میرؔ کی روش پر رہی اور بڑھ نہ سکی مگر اس کو درست کیا تو ناسخ نے لکھنؤ میں درست کیا اور تصرفات لائقہ سے اس کو بھر دیا۔[2]

میرؔ کے لیے لکھنؤ جانا ایک تہذیبی سانحہ سے کم نہ تھا۔ دلّی لاکھ اجڑ چکی تھی، لیکن وہ ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ چوں کہ سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں رہ چکا تھا اور اسی کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبوں کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے اس لیے دلّی ہی ہر شہر اور قریہ کی معاشرت کا مرجع اور اصولِ تہذیب کا مرکز تھی۔ سلطنت مغلیہ کے کمزور ہو جانے اور دولت مندی کے مٹ جانے سے، لکھنؤ کو ترقی کرنے کا موقع ملا۔ اور دلّی کی ساری رونق وہیں سمٹ آئی لیکن اودھ نے بادشاہت کے اعلان کے ساتھ تمدن و معاشرت میں اپنے

---

[1] مجموعہ نغز ص ۱۵۶، ۱۵۷۔ جرأت اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں ہوئی اور مجموعہ نغز ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں مکمل ہوا۔

[2] جلوۂ خضر ج ۲ ص ۱۷۔ ناسخ نے اس مصرع میں "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں" جس عقیدت کا اظہار کیا ہے اس کی شہادت ان کے کلام سے نہیں ملتی۔

مذاق کے مطابق اصلاحیں کیں اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ دہلی کی تہذیبی قیادت سے بھی چھٹکارا مل جائے چناں چہ لباس، وضع قطع، تراش خراش، نشست و برخاست آداب و اخلاق، اور شعر و ادب میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کی تفصیل شرر کے مضامین[1] میں مل جاتی ہے۔ میرؔ جس زمانہ میں لکھنؤ گئے ہیں دلّی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں گھری ہوئی تھی اور عالم یہ تھا کہ ع

ہر روز بنا قافلہ پورب کو رواں ہے![2]

لکھنؤ میں ایک نئی بساط بچھائی جا رہی تھی۔ نئی روایتیں قائم ہو رہی تھیں وہ فارغ البال و با اثر طبقہ جس کی سماجی حیثیت اچھی تھی، اس کی زندگی سوقیت اور نسائیت سے خالی نہیں تھی۔ اس صورت حال سے مفاہمت آسان نہیں تھی۔ میرؔ کی ذہنی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی اور اس کی تہذیبی قدریں ان کی روح میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس لئے ان کے یہاں لکھنوی ماحول کے خلاف ردعمل بھی سخت ہے۔ لیکن یہی حال بعض دوسرے شعرا کا بھی تھا۔ مصحفی نے لکھنؤ کو "خرابہ" کہا ہے اور اپنے آپ کو "بن کا گل" ان کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے

میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

---

[1] دل گداز ج ۱۹ ش ۱ تا ۱۱ [2] مصحفی کے اس شہر آشوب کے چند شعر ملاحظہ ہوں

[2] کہتی ہے اسے خلق جہاں سب شہ عالم شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

اطراف میں دلی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور جو آوے ہے باہر کو وہ لشکستہ دہاں ہے

ہر وقت تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں ان کے بس قلعہ کے نیچے ہی ٹک ایک امن و اماں ہے

دیوان قصائد مصحفی۔ نسخہ رام پور

ان لوگوں کو اپنی زبان پر بھی ناز تھا۔ مصحفی لکھنؤ والوں پر اعتراض کرتے ہیں:

دلی نہیں دیکھی ہے، زباں داں یہ کہاں ہیں

ایک اور موقع پر کہتے ہیں ؎

صحرائیان پورب کیا جانتے ہیں اس کو — اے مصحفی جدا ہے انداز اس زباں کا

میر فرماتے ہیں:

ع — اول تو میں سند ہوں پھر یہ میری زباں ہے

ع — یہ ہماری زباں ہے پیارے

اسی طرح یہ لوگ لکھنؤ کے طرز ادا پر بھی معترض تھے:

کیا چمکے اب فقط میرے نالے کی شاعری

اس عہد میں ہے تیغ کی، بھالے کی شاعری

(مصحفی)

مصحفی نے لکھنؤ کے ایک مشاعرہ کے متعلق لکھا ہے:

بزم نامحرم و مردم ہمہ بیگانہ تمام

یہی حال میر کا تھا۔ ایک جگہ نہایت درد انگیز لہجے میں ہوا کے ہاتھ دلی والوں کو پیام بھیجتے ہیں۔ ؎

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار — کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حال زار

خاک دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی — آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار

منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر — شاعری زاغ و زغن کا ہو نہ ہووے اب شعار

بعض جگہ تو لکھنؤ سے شکایت کی وجہ صاف ظاہر ہو گئی ہے:

کس کس ادا سے ریختے میں نے کہے ولے — سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

میر کی وفات

میر کی تاریخ وفات میں اختلاف نہیں ہے۔ ناسخ کی تاریخ مشہور ہے:

واویلا مرد شہ شاعراں

اس سے ۱۲۲۵ ہجری نکلتی ہے[1]۔ یہی تاریخ میر کے شاگرد محمد محسن محسن نے اپنے ہاتھ سے میر کے چوتھے دیوان پر لکھی ہے جس کا نسخہ راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

بروز جمعہ بستم شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار و دو صد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب این دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھی بعد طئی نہ عشرہ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم کہ قبرستان مشہور است۔ نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ہم ازاں جملہ است۔ بہ محرر سطور محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاٰتہ در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد[2]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کا انتقال ۲۰ شعبان المکرم ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کو جمعہ کے دن شام کے وقت ہوا۔ اور ان کو اگلے روز ہفتہ کے دن دوپہر کے وقت دفن کیا گیا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر نوّے برس کی تھی وہ محلہ سٹھی[3] میں رہتے تھے یہ محلہ ڈالی گنج کے محاذ میں دریا کے جنوبی کنارے آباد تھا۔ میر انیس کا مکان بھی اسی محلہ میں

---

[1] نیز ملاحظہ ہو اسپرانگر: فہرست کتب خانہ اودھ۔ بلوم ہارٹ: ہندوستانی مخطوطات کی فہرست (انڈیا آفس) کلیات ناسخ ص ۲۲۱ و نساخ: گنج تواریخ [2] دیوان چہارم میر قلمی (محمود آباد) [3] رسالہ اُردو دہلی: جنوری ۱۹۳۸ء۔

تھا۔ یہیں اسی نام کا ایک بازار بھی تھا جہاں سوت وغیرہ کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔ لکھنؤ کے مشہور شاعر جان صاحب نے ایک شعر میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جہاں جاتی ہوں مردوں کی وہاں ٹھٹھی سی لگ جاتی
یہ مجھ بڑھیا کا کاتلا ہے، جوانوں کا تماشا ہے

میر کو اکھاڑہ بھیم میں دفن کیا گیا یہ قبرستان گولہ گنج میں ریل کی پٹڑی کے برابر دور تک چلا گیا ہے۔ میر کی قبر بھی یہیں ہے لیکن اب بہت سی قبروں کے نشان مٹ گئے ہیں۔ میر کو شاید آیندہ باتوں کی خبر تھی یہ شعر بالکل حسب حال ہے ؎

مت تربتِ میرؔ کو مٹاؤ رہنے دو غریب کا نشاں تو

میر کے جس قلمی دیوان کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ میر کے داماد میر حسن علی تجلّی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ انھوں نے اپنے شاگرد محمد حسن کو اپنی وفات سے دس بارہ برس پہلے دیا تھا اس پر شاہان اودھ کے کتب خانوں کی مہریں بھی ہیں۔ جو اس کے مستند ہونے کا کافی ثبوت ہیں۔

اس دیوان کے آخر میں کسی نے نوادر الکلام کی عبارت بھی نقل کی ہے جو میر کی زندگی۔ سیرت اور وفات کے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرتی ہے۔ اسی لئے ہم اسے بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔

اصلش از اکبر آباد۔ در اواخر یک ہزار و یک صد و بیست و پنج ہجری ولادت واقع شدہ بعد واقعہ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفدہ سالگی در دہلی رفت و بخانۂ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ[1] بعد ...... کہ جدائی فیما بین واقع شد بہ رؤسائے عظام

---

[1] یہ جملہ قابلِ غور ہے۔ خان آرزو سے علیحدگی علوم عقلی و نقلی کی تکمیل کے بعد ہوئی ہے۔

درخورد و برخورد و بفراغت تام و خوبی مالاکلام بہ اعزہ و اقربا زندگی بسر می برد۔ تا زمانے کہ آشوب عظیم و فتنۂ نمایاں بروئے کار آمد ہنگامۂ دزدہ گرم شد کاروبار مردم درہم و برہم شد۔ خانمانہا بہ تاراج او باشاں رفت و بر نجبا و شرفا عرصۂ حیات تنگ۔ مردمان شاہجہاں آباد از ہر درے کہ یافتند ازجا بیروں رفتند و رو بہ صحرائے غربت نہادند میر صاحب تا زمانہ بجا برجا (ماندند؟) حیراں و پریشاں سراسیمہ و سرگرداں نہ انیسے کہ یاری کند و نہ رفیقے کہ غمگساری کند۔ کلفتہا دیدند و کربہا کشیدند آخر کار بایمائے نواب وزیر حضرت دہلی را کہ بجائے وطن مالوف بود وداع کردہ بہ بلادِ شرقی شتافتند و در بلدۂ لکھنؤ طرح اقامت انداختہ مورد عواطف آصفی شدند۔ شہرۂ حسن کلام زمین و زماں را برگرفت۔ ذرّہ ذرّہ روشناس و قطرہ قطرہ محو سپاس۔ چہ تحسین ہا کہ ندیدند و چہ آفریں ہا کہ نہ کشیدند[۱] گردون بے مدار فتنہ اساس و زمانہ غدار و ناسپاس است کسے را بیند کہ بیازارد جگر میر را بحوادث گوناگوں فگار ساخت و آسودہ را شکار آزار کرد۔ درسالے مایۂ ناز، پروردۂ آغوش ناز، دخترے، و در سالے دیگر، مرہم جگر افکار، خلف کامگار، و در سالے دیگر اہلیۂ عفت شعار۔ بہ کنج عافیتِ مزار آسودند۔ قیامت آشکار و محشر بپا بدار شد۔ در حواس و مزاج اختلال کلی راہ یافت برداشتگی خاطر از دنیائے ناپائیدار از حد افزوں و شوق جاں سپردگی از اندازہ بیروں رفت۔ داماں عزلت مستحکم گرفتند مجالس و محافل را

---

[۱] لکھنؤ میں بھی فارغ البالی سے زندگی بسر کی۔

وداع نمودند مدتے ہمیں نوع گذشت آں چہ گزشت۔ آخر در شہر ربیع الثانی عوارض مزمنہ رو بہ ترقی آوردند درد قولنج کہ جلیس قدیم و ہمراز و ندیم بود ساعتے نگذاشت وجع مفاصل قوائے جسمانی را معطل ساختہ پزشکاں (؟)، شاہی کہ شناسائے قدیم بودند بجوم آوردند۔ رائے ہمگناں براں قرار یافت کہ چارۂ کار قرار واقعیٔ باید نمود۔ و دار وئے باید باستعمال آورد کہ قبض طبیعت برطرف شود۔ تلینے دادند اسہال بود کہ پیام مرگ جثۂ نحیف مضنحۂ ضیف وا سہال یک روزہ یک صد و پنجاہ وا ویلا آہ آہ دو سہ روز ہمیں نوبت بود تا آزار برگ انجامید فرشتۂ موت جام ہلاہل کل من علیہا فان پیش نمود بیا شامید انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ثم انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم مردے بود متوکل۔ سپاہی پیشہ، رقیق القلب پابند وضع جہاں دیدہ، سرد و گرم زمانہ چشیدہ۔ سرآمد سخن وران ماضی و حال و در سخن سنجی بے مثال کم اختلاط و با دوستاں سراسر ارتباط[1] سنجیدہ از حرص و ہوائے دنیا آزاد۔ و کسے را کہ بنیاز دے ہرگز ہرگز۔ جملہ براں بنیاد دوے کسے را بدنمی گفت و بدنمی شنفت استغنائے بیش از بیش بہ تعظیم و تکریم ہر کہ دمہ پیشا بیش۔ مراختہ و مطارحہ را ترک نمودہ بود۔ تاہم سخن گوئی را مدار حیات خویش انگاردہ تا دم واپسیں گرفتار طرۂ سخن بود۔ حرف ہامی زد و کلام ہا می گفت۔ و در دم آخریں ہمیں مطلع غزل کہ گفتۂ او بود، بود ؎

---

[1] کم اختلاط و با دوستاں سراسر ارتباط۔ یہ رائے بالکل صحیح ہے دوسرے شواہد سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

ساز بسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے، اب کے ہماری باری ہے

قریب بہ چہار صد کس حاضر جنازہ اش بودند۔ و بعد ازاں شنوندگان وعقیدت مندان جوق جوق نماز غائبانہ گزاردند۔ ہر صنف کلام یادگار اوست۔ مثنوی و غزل و مدح و ذم گرمیٔ بازار اوست پس اللّٰھم اغفرلہ ولکاتبہ .... از نوادر الکملا نقل گرفتہ شد و زیب دیوانش نمودہ آمد۔

میر کی آخری علالت کا زمانہ طویل تھا۔ وہ ربیع الثانی میں بیمار ہوئے اور شعبان تک چھ مہینے بستر پر پڑے رہے[1]۔ وجع مفاصل اور دردِ قولنج میں ترقی ہوگئی اور موت کے آگے شاہی طبیبوں کی بھی پیش نہ گئی۔ بالآخر ۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ ۱۸۱۰ء کو اس اقلیم سخن کے تاجدار نے دنیا کو خیرباد کہا۔

میر کی اولاد

میر کے دو بیٹے تھے ایک میر عسکری جن کا عرف میر کلّو تھا اور تخلص عرش۔ لیکن نسّاخ کا خیال ہے کہ وہ پہلے زار تخلص کرتے تھے[2]۔

راقم الحروف کو آگرہ میں عرش مرحوم کی ایک مطبوعہ واسوخت دستیاب ہوئی جس کی ابتدا میں چند تعارفی جملے لکھے تھے۔ ذیل میں وہ پوری عبارت

---

[1] تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے: "جب مرض موت سے میر صاحب بیمار ہوئے وصیت کی: میرے جنازہ کے اٹھانے میں تعجیل نہ کرنا۔ جو سنے گا میر نے انتقال کیا ہے خواہ مخواہ نقد اور سامان پہنچے گا۔" جب بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی، کہیں سے کچھ نہ آیا، آخر دفن کر دیا۔" [2] سخن شعرا ص ۳۲۳۔

اور واسوخت درج کی جاتی ہی تاکہ ان کے کلام کا بھی اندازہ ہوسکے۔

"عرش تخلص ہی جناب سید حسن عسکری صاحب عرف میر کلو صاحب کا خلف الرشید ہیں۔ جناب ملک الشعراء بلبل ہند میر محمد تقی صاحب دہلوی میر تخلص کے صاحب دیوان ہیں شاگرد ہیں اپنے والد مرحوم کے۔ بعد ان کے پھر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے فقط ان کو اپنی طبیعت سے مشورہ رہا۔ مولد و مسکن ان کا لکھنؤ ہے۔ مرد قانع۔ فیاض باخدا ہیں طبیعت کی جودت ذکاوت ذہن خداداد ہی۔

واسوخت عرش

یار صورت بھی نہیں اب مجھے دکھلاتا ہی　　　دل مرا آتش ہجراں سے جلا جاتا ہے
طائر جاں قفس تن میں جو گھبراتا ہے　　　سیر گلزار عدم ہی کا خیال آتا ہے
اور اک دم نہ وہ صیاد اگر آئے گا
بلبل روح قفس میں نہ نظر آئے گا

آئینہ سال کسی رخسار کا حیراں ہوں میں　　　مثل سنبل کسی گیسو کا پریشاں ہوں میں
ہے یہ وحشت کہ بس اب قابل زنداں ہوں میں　　　بخدا عشق بتاں سے یہ پشیماں ہوں میں
مرض عشق سے گر بچ گئی جان محزوں
ہو پری بھی تو نہ میں آنکھ اٹھا کر دیکھوں

آہ سوزاں نے جلائے ہیں ہزاروں شب گھر　　　شور نالے کا ہی ہنگامۂ روز محشر
تجھ بن اے آفت جاں ہی یہ قیامت دل پر　　　ملک الموت کو بھی جان کا آتا ہی خطر
ڈر کے بھاگے ہے وہیں موت اگر آئی ہی
لحد تیرہ سے بھی بدتر شب تنہائی ہی

وحشت دل نے یہ حالت مری پہنچائی ہے　　　کہ ہر اک شخص مجھے جانتا سودائی ہے

پاؤں میں آبلے ہیں بادیہ پیمائی ہے
دل وحشی ہے و یا آہوئے صحرائی ہے

اب جو لے غیرت لیلیٰ نہ تجھے پاؤں گا
بید مجنوں کے تلے جیسے گذر جاؤں گا

کون سا شہر ہے جس میں مرا چرچا نہ ہوا
کون سا دشت ہے جو اشکوں سے دریا نہ ہوا
کون سا خار قدمبوس کف پا نہ ہوا
کون سا رنج نصیب دل شیدا نہ ہوا

فرق آجائے نہ کیوں صبر و شکیبائی میں
کوئی ہمدرد نہیں عالم تنہائی میں

اے پری اب دل دیوانہ یہ گھبراتا ہے
بات کرتا ہوں تو دل منہ کو چلا آتا ہے
رنگ رخ ہوش کے مانند اڑا جاتا ہے
ہر نفس سینہ سے پیغام اجل لاتا ہے

کشتۂ وصل بھی فرقت میں کوئی بچتا ہے
دم نکل جائے گا اک دم میں یہ غل مچتا ہے

رنگ اک روز نیا وحشت دل لاتی ہے
شام سے صبح تلک نیند نہیں آتی ہے
صبح ہوتی ہے تو شب ہوتی مری چھاتی ہے
دل یہ کہتا ہے کہ اب جان حزیں جاتی ہے

جتنے احباب ہیں تدبیر کفن کرتے ہیں
اس طرح جیتے ہیں سب کہتے ہیں اب مرتے ہیں

آپ کہتے تھے کہ ہے ہم کو بھی الفت تجھ سے
صاف بھی رہتے ہیں آئینے کی صورت تجھ سے
دو گھڑی مل کے بہلتی ہے طبیعت تجھ سے
بات کا تجھ سے مزا رنج میں راحت تجھ سے

یا تو اب برسوں ملاقات نہیں ہوتی ہے
اور جو دیکھا بھی تو اب بات نہیں ہوتی ہے

جانتے تھے کہ مرا عاشق و شیدا ہے یہ
جان دیتا ہے تن صاف پہ مرتا ہے یہ
منہ سے کچھ مطلب دل کہہ نہیں سکتا ہے یہ
اس سمجھنے پہ بھی اے یار تماشا ہے یہ

غیرِ ہم خواب ہو موت آئے جو آنا ہوئے
پائنتی گور کے یا اپنا سرہانا ہوئے

دشمنوں کو جو کسی دوست کا غم ہوتا تھا   آپ کو روتے ہوئے دیکھ کر میں روتا تھا
جب تلک جاگتے تھے آپ نہ میں سوتا تھا   ڈھونڈھ کر مطلب دل کو خفقاں کھوتا تھا
باتیں سن سن کے مری آپ کو خواب آتا تھا
آگے کیا عرض کروں مجھ کو حجاب آتا تھا

جانتا دل میں تو ہوگا اسے اے غیرت حور   کہ اطاعت میں نہیں مجھ سے ہوا کوئی قصور
اس پہ بھی ترک ملاقات اگر ہے منظور   اختیار آپ کا ہے بندہ ہے اس میں مجبور
غیر کے کہنے سے ہم کو تو جدا کرتے ہو
اتنا کہتے ہیں کہ پچھتاؤ گے کیا کرتے ہو

گنہ عشق ہوا کچھ مری تقصیر نہیں   اور جز ہجر اگر موت ہی تقدیر نہیں
وصل منظور تجھے اے بتِ بے پیر نہیں   لاکھ تدبیر کروں خواہش تقدیر نہیں
شر تو منظور نہیں وصل نہ ہو خیر نہ ہو
خوش رہیں آپ خفا آپ سے بھی غیر نہ ہو

کبھی آزردہ مری جان جو ہو جاتے ہم   اور دلجوئی کیا کرتے تھے تم بھی ہر دم
بلکہ کہتے تھے عبث ہی تجھے اس بات کا غم   غیر سے ترک ملاقات کی کھاتے تھے قسم
بستر خواب پہ اک دن بھی نہ تڑپاتے تھے
چھپ کے تم دو دو پہر رات گئے آتے تھے

اے صنم بہرِ خدا چاند سا مکھڑا دکھلا   کہ ہے زنداں لحد جاں مسافر کی سرا
خفقان ہوتا ہی اور سینے میں دم ہی رکتا   اول عشق میں ہی کام بھی آخر اپنا
انتظار اتنا کیا ہی کہ دم اب رکتا ہی
رہروِ ملکِ عدم روکے سے کب رکتا ہی

دل نازک سے نہیں رنج اٹھایا جاتا — دم خفا ہے نہیں ہر لحظہ منایا جاتا
ضعف سے پاس ترے بھی نہیں آیا جاتا — اے پری اب ترے سودے کا ہی سایا جاتا
پاؤں پڑ کر ملک الموت کے اس سر کی قسم
دل لگا لیں گے کسی حور سے فردوس میں ہم

ہو گی اس حور سے جب صحبت ہم آغوشی — تجھ کو ساقی نہ بنائیں گے دم مے نوشی
تو پڑے پاؤں تو موقوف نہ ہو سرگوشی — کچھ تجھے بات بن آئے گی نہ جز روپوشی
رنگ فق منہ پہ عرق دل میں پشیماں ہوگا
رشک سے حور کی جنت تجھے زنداں ہوگا

ترے کوچہ کا خیال آئے گا جس دم دل کو — باغ فردوس میں دکھلائیں گے عالم دل کو
حرکاتوں[1] کا تری ہوگا اگر غم دل کو — صحبت حور کرے گی وہیں خرم دل کو
دل سے اے سرو قد آزاد کریں گے تجھ کو
بھول کر بھی نہ کبھی یاد کریں گے تجھ کو

کبھی یاد آیا جو بھولے سے ترا حسن و جمال — دل کو اے ماہ جبیں رنج و قلق ہوگا کمال
روح کو آئے گا جنت سے نکلنے کا خیال — پر کسی حور سے ہو جائے گا جب رفع ملال
تیری صورت سے تصور میں بھی نفرت ہوگی
حور سے بادۂ گلرنگ سے صحبت ہوگی

اے پری ہوگا جو ہنگامۂ محشر برپا — تو ہر اک عضو پہ اک راز کرے گا افشا
دل بھی اس وقت گلہ کرنے لگے گا تیرا — اس میں مجبور ہوں اٹھ جائے گا از خود پردہ
مجھ کو جنت میں بھی اے حور ترا غم ہوگا
کیوں جلاتا ہی سزاوار جہنم ہوگا

---

[1] حرکاتوں (کذا)

مجھ سا عاشق ترا واللہ نہ پیدا ہوگا — کوئی آگے بھی نہ تھا اور نہ اب ایسا ہوگا
جاں بدن پر تری یوں کوئی نہ دیتا ہوگا — ایک بھی تجھ پہ حقیقت میں نہ مرتا ہوگا

تو سمجھتا ہی جو تھی مجھ کو محبت تجھ سے
حرکاتوں سے تری ہوگئی نفرت تجھ سے

قصہ کوتاہ اگر اب بھی ہی منظور وصال — نہ کوئی بیچ ہے صاحب کو نہ بندے کو ملال
نہ کسی حور کا یاں خواب تک آئے گا خیال — رشک جنت ترا گھر حور بھی ہی اک تمثال

ترے آئینہ رخسار کا حیراں ہی عرش
تو سلیماں ہے ترا تابع فرماں ہی عرش"

خم خانۂ جاوید میں لالہ سری رام نے لکھا ہے :۔

سید محمد عسکری عرف میر کلو : عمر بھر نہ کسی رئیس کی دربار داری کی نہ کسی کی شان میں قصیدہ لکھا فقر وفاقہ میں بسر کردی باپ کی طرح نازک مزاج تھے حضرت عشرت لکھنوی اپنے تذکرۂ آب بقا میں لکھتے ہیں کہ ناسخوں نے عرش سے مخالفت کی اور ان کو ناسخ کا شاگرد مشہور کر دیا۔ تو عرش نے ناسخ کے تمام سرقے کھول دیئے اور اپنے شاگرد میر تراب علی عرف نجھو صاحب معروف بہ سپہر الدولہ ولد میر اکرام علی کے نام سے یہ الزام مشہور کیئے۔ جو آب حیات میں درج ہیں۔ ان کے چند مخصوص شاگرد تھے۔ انسب میر ابو طالب ۔ انیخ میر تراب علی ،۔ انجم مرزا بندہ رضا عیش شیخ فدا علی ،۔ فلک میر سجاد حسین ،۔ قمر شیخ سرفراز علی ،۔ شاد شیخ محمد جان بلہ

لہ شیخ محمد جان شاد ع پیرو میر ہوں میں میری زباں ہے کچھ اور۔
شاد کے متعلق ملاحظہ ہو نگار ج ۲۴۴ ش ۲

غدر کے بعد تباہی آئی اور عرش کا گھر لٹ گیا وہ مفتی گنج میں اٹھ گئے اور میاں الماس کے امام باڑے میں قیام کیا ایک روز کلام سن کر میر لکڑ باز بانکے نے سر برہنہ ہو کر کہا کہ الٰہی عرش کو میر کا رتبہ عطا کر۔ آپ کہنے لگے کیا کہتے ہو عُسرت تو مجھے میر سے زیادہ ملی۔ رتبہ شاعری میں میر سے کم نہیں۔ ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا اور رکاب گنج لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ قاعدے کی پابندی اور زبان کی صحت کا خیال مزاج پر بہت حاوی تھا باپ سے زیادہ بیٹے نے شائقین سخن کو فیض پہنچایا۔ عرش کا دیوان نول کشور پریس سے شائع ہوا تھا۔ مگر اب کمیاب ہے یہ چند شعر تذکرۂ آب بقا سے بطور نمونۂ کلام نقل کئے جاتے ہیں:

ہوں وہ روشن دل کے مرنے پہ بھی میرا غم نہیں بزم عالم میں چراغ کشتہ کا ماتم نہیں
سرو قد غیرت صد غنچہ دہن پتھر کے بتکدے میں نظر آتے ہیں چمن پتھر کے
آسیا کہتی تھی ہر صبح باآواز بلند رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے
پھول اب سعتۂ پیری سے نہیں سکتا عرش تو لتے تھے کبھی ان ہاتھوں میں من پتھر کے[1]

مولوی محمد حسین آزاد نے عرش کے متعلق لکھا ہے۔

میر صاحب کے بیٹے لکھنؤ میں ملے تھے باپ کے برابر نہ تھے۔ مگر بدنصیبی بیں فرزند خلف تھے ایک پر مرد، بے پروا، مستغنی المزاج تھے۔ میر عسکری نام میر کلّو مشہور تھے۔ عرش تخلص تھا۔ خود شاعر صاحب دیوان تھے۔ اور چند شاگرد بھی تھے ایک شعر ان کی غزل کا لکھنؤ میں زبان زد خاص و عام ہے۔

آسیا کہتی ہے ہر صبح باآواز بلند رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے[2]

---

[1] خم خانۂ جاوید جلد ۵ ضمیمہ۔ [2] آب حیات مصنفہ محمد حسین آزاد ص ۲۲۴ شیخ علی حسن صاحب نے عرش کے چند اور اشعار دئے ہیں:۔

گر ہو نہ خفا تو کہہ دوں جی کی اس دم تمھیں یاد ہے کسی کی

(باقی اگلے صفحہ پر)

عشرت لکھنوی مرحوم نے قواعد میر میں چند جملے عرشؔ[1] کے متعلق لکھے ہیں لیکن انھوں نے نام میر محمد عسکری لکھا ہے سید حسن عسکری نہیں ان کی پوری عبارت یہ ہے:

میر صاحب نہایت ضعیف ہوئے تو ایک روز اپنے فرزند میر محمد عسکری عرف میر کلّو عرش سے فرمانے لگے:

"بیٹا ہمارے پاس مال و متاع دنیا سے تو کوئی چیز نہیں ہے، جو آئندہ تمھارے کام آئے لیکن ہمارا سرمایۂ ناز قانونِ زبان ہے۔ جس پر ہماری زندگی اور عزت کا دار و مدار رہا۔ جس نے ہم کو خاکِ مذلت سے آسمان شہرت پر پہنچا دیا۔ اس دولت کے آگے ہم سلطنت عالم کو ہیچ سمجھ رہے ہیں۔ تم کو بھی اپنے ترکے میں یہی دولت دیتے ہیں۔" خدا جانے ان قواعد میں کیا استغنا بھرا ہوا تھا کہ جس کو حاصل ہوتے تھے نازک دماغ اور مدمغ بنا دیتے تھے۔ چناں چہ جناب عرش کی ملاقات کو جب مولوی

(بقیہ نوٹ ص ۲۷۰ یہ ہے)

گل گیر نے کاٹ کر سرِ شمع ... پروانہ سے شب جلی کٹی کی

بس شب کا چھپایئے نہ احوال ... گزری ہے خبر گھڑی گھڑی کی

ترتیب کہن کی وضع لائے عرش ... ہم نے دیوان میں نئی کی

[1] عرش کا حلیہ جو شیخ محمد جان شاد نے شیخ علی حسن صاحب سے بیان کیا تھا یہ ہے:
آپ متوسط القامت، دُہرے جسم کے تھے۔ سانولا رنگ، کرتہ پہنے، کبھی سر پر پگڑی اور کبھی ٹوپی افیون پینے کے عادی تھے اور حقہ کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹتا۔ مشاعروں اور محفلوں میں بھی ساتھ لاتے۔ مشاعروں میں ترتیب خواندگی کے عادی نہ تھے جب جی میں آتا صاحب خانہ کی اجازت لے کر اپنی غزل سنا دیتے اور حقہ اٹھا کر رخصت ہو جاتے۔ (نگار ج ۴۴ ش ۴)

محمد حسین آزاد مرحوم لکھنؤ میں تشریف لائے تو انھوں نے اپنی نازک مزاجی سے ہم کلام ہونا بھی پسند نہ کیا اور وہ غریب عرش سے ناخوش ہو گئے اور ان کی بدمزاجی کی شکایت لکھی ہے۔[۱]

فساخ نے لکھا ہے:

مشہور ہے کہ عرش نے سرقہ کے بہت سے مضامین ناسخ کے دیوان سے نکالے ہیں ..... صاحب سراپا سخن محسن علی محسن شاگرد خواجہ وزیر شاگرد ناسخ نے ان کو ناسخ کا شاگرد لکھا ہے حالاں کہ ان کو ناسخ کی شاگردی سے انکار ہے۔[۲]

عرش کے شاگردوں میں شیخ محمد جان (متوفی ۱۸۹۵ء) خاص طور پر مشہور ہیں جو عمر بھر استاد کی خدمت کرتے رہے اور لیلیٰ سخن کے ایسے فریفتہ ہوئے کہ شادی بھی نہیں کی۔ عشرت مرحوم ان ہی کے شاگرد تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس بیان کو غلط سمجھا جائے۔ دوسرے درایتاً اس میں کوئی نقص بھی نہیں ہے۔

میر کے دوسرے بیٹے کا نام میر فیض علی تھا۔ ان ہی کے نام پر میر نے فیض میر لکھی ہے۔ رسالہ کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

می گوید فقیر حقیر میر محمد تقی میر متخلص بہ میر کہ دریں ایام فیض علی پسر من ذوق خواندن ترسل پیدا کردہ بود لہذا حکایات خمسہ متضمن فواید بسیار را باندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گذاشتم۔[۳]

اس رسالہ کا نام آزاد نے فیض میر لکھا ہے[۴] اور محسن نے میر فیض[۵] لیکن فیض میر کی

---

[۱] قواعد میر، عشرت لکھنوی ص ۴ (مطبوعہ ۱۹۱۹ء) [۲] سخن شعرا ص ۳۲۳ [۳] فیض میر: مصنفہ میر محمد تقی میر ص ۱ [۴] آب حیات ص ۲۰۷ [۵] تذکرہ سراپا سخن ص ۲۶۔

اشاعت کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

تذکرہ سخن شعرا میں فیض کے تین شعر نقل کیے گئے ہیں۔[۱]

کہہ دیا سب سے جو کہ تھا معلوم　　　دل ترا حوصلہ ہوا معلوم

شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحر حسن　　　موج کی مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

یہ ترک چشم ترے مست ہیں جواں دونوں
کہ سو رہے ہیں تلے رکھ کے سر کہاں دونوں

مصحفی نے میر فیض علی کے متعلق لکھا ہے کہ

اندکے حصہ از عُجب پدر ہم دارد

انھوں نے کچھ اور اشعار نقل کیے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

نہ مانی تو نے میری اپنی ہی ضد بے وفا رکھی　　　کہیں ہم کس سے اب جا کر ہماری تو نے کیا رکھی
شب وصل آئی تھی یار و سو اس بے لطفی سے کاٹی　　　ہمارے اپنے ان کے درمیاں تلوار لا رکھی
کدورت جب نہ تب انداز سے نکلا ہی کی تیرے　　　ہماری خاک اس کوچہ میں تو نے کب صبا رکھی
بنائے صانع قدرت نے کیا کیا پھول گل یوں تو　　　مرے اس گل بدن میں کچھ ادا سب سے جدا رکھی

دور میں ساقی ترے آ نکلے ہیں مے نوش ہم
جام خالی دے ہے کیا؟ اتنے نہیں مدہوش ہم
سر فرو لاتے نہیں زولیدہ مویاں عشق کے
سایۂ بال ہما پر مارتے ہیں پاپوش ہم

---

[۱] تذکرہ سخن شعرا: عبدالغفور نساخ ص ۳۰۳۔

بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفت ہیں
چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم

شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن
موج کی مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم

دل نہیں رہتا کہ چھپ کر دیکھ لیں ہیں ورنہ فیض
عمر گذری نا کسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

گل کھا موئے جنھوں کے لئے جسمِ زار پر
دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر

یاری کی مت امید رکھا کر رقیب سے
اک میں ہی ناتواں ہوں بھاری ہزار پر

کیا کیا جلوہ آن کے سر تیرے پھر گئے
کچھ ان دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر

یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں
مت بھول آہ یہاں کے تو نقش و نگار پر

روش بھائی ہے کیا ان خوب صورت گل عذاروں کو
لئے آئینہ دیکھا کرتے ہیں اپنی بہاروں کو

نہیں معلوم کس رشکِ قمر کی راہ تکتے ہیں
کہ ساری رات آنکھوں میں کٹا کرتی ہے تاروں کو

خدا جانے کہ تجھ سے فیض کیا ہے اس کو بیزاری   جہاں دیکھا تجھے اس نے پکارا اپنے یاروں کو

شیفتہ نے فیض کے متعلق لکھا ہے:

فیض تخلص میر فیض علی پسر میر تقی مرحوم است در سرکار وزیر الممالک باپدرش بسر می برد۔ آوردہ اند کہ غرور سخن گوئی بسیار داشتہ وفقیر از ایشاں شعرے مصداق دعوی ندیدم یارب مگر نازش ایشاں بر شاعری پدر باشد والعجب کل العجب کہ بمقتضائے الولد سر لابیہ دعوی را آموختند ووجہ دعوی را گذاشتند۔ خلاصہ ایں ابیات او راست۔

گل لکھا موئے جنھوں کے لئے جسم زار پر
دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر[1]

میر کے دو بیٹوں یعنی عرش اور فیض کا حال ہمیں معلوم ہے لیکن تذکرہ کریم الدین میں میر فائز علی کا بھی ذکر ہے جن کو انھوں نے میر کا بیٹا لکھا ہے:

میر فائز علی دہلوی، بیٹا اور شاگرد میر محمد تقی مشہور بہ تخلص میر کا، مصحفی کہتا ہے کہ اس نے اشعار کا مذاق اپنے باپ سے بطور ورثہ کے پایا تھا۔ فی الحقیقت اس کے شعر مشابہت میر کے عجیب استعداد سے رکھتا، رکھتے ہیں۔ ایک ہزار گیارہ سو چھیانویں ہجری (۱۱۹۶ھ) میں فائز درمیان لکھنؤ کے تھا۔ جس جا سے بموجب خواہش علی ابراہیم کے اپنے اشعار واسطے اندراج تذکرہ کے روانہ کئے تھے[2]

لیکن تذکرہ گلزار ابراہیم میں فائز کا نہیں، فیض کا ذکر ہے اور ان کے ترجمہ میں لکھا ہے:

فیض دہلوی۔ میر فیض علی۔ فرزند و شاگرد میر تقی میر است بہ سال یک ہزار و یک صد و نود و شش ہجری اشعارش در بلدۂ بنارس

---

[1] تذکرہ گلشن بے خار: نول کشور۔ [2] تذکرہ کریم الدین ص ۱۵۹۔

از لکھنؤ طلبیدہ تحریر شد۔[۵۱]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کریم الدین نے فیض علی ہی کو غلطی سے فائز علی لکھ دیا ہے۔

میر کے ایک لڑکی بھی تھی جس سے انھیں بے انتہا محبت تھی اس نے شادی کے چند ہی روز بعد انتقال کیا۔ میر کا یہ شعر اسی سانحہ کی یادگار ہے۔

اب آیا دھیان اے آرام جاں اس نامرادی میں
کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں[۵۲]

نوادر الکملا میں میر کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ان کی ایک لڑکی کے مرنے کی بھی اطلاع ہے[۵۳] معلوم نہیں تذکرہ شاعرات اردو میں کون سی لڑکی مراد ہے اور وہ کس بیوی سے تھی۔ نوادر الکملا میں ان کی بیوی کے انتقال کا بھی تذکرہ ہے اور تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں ان کی بڑھاپے کی شادی کا بھی ذکر ہے:

آخر میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا اور صورت کسی کی آئینۂ خورشید میں معائنہ ہوتی تھی۔ پیر جواں ہمت الیسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ پیرانہ سالی میں کدخدا ہونے کا کیا باعث ہوا۔ فرمایا: اس واسطے کہ سسرال والے کہیں، لڑکا آیا[۵۴]

بہر حال ایک لڑکی جس کا تخلص بیگم تھا، اس کا ذکر مختلف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ نساخ نے لکھا ہے:

بیگم تخلص، دختر میر ساکنہ لکھنؤ شاگرد میر تقی میر[۵۵]

---

۵۱ تذکرہ گلزار ابراہیم ص ۱۹۱ ۵۲ تذکرہ شاعرات اردو ص ۱۵۱ ۵۳ دیوان میر قلمی۔ (محمود آباد) ۵۴ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا۔ ۵۵ سخن شعرا ص ۷۲ و تذکرہ شمیم سخن مولفہ مولوی عبدالحیٔ ص ۲۷ مطبوعہ نول کشور۔

بیگم کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

برسوں خم گیسو میں گرفتار تو رکھا — اب کہتے ہو کیا تم نے مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی — ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
اتنا بھی غنیمت ہے تری طرف سے ظالم — کھڑکی نہ رکھی روزن دیوار تو رکھا
وہ ذبح کرے یا نہ کرے غم نہیں اس کا — سر ہم نے تہ خنجر خونخوار تو رکھا

اس عشق کی ہمت کے ہیں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا

تذکرہ شمیم سخن اور تذکرۃ الخواتین میں بیگم کا صرف پہلا دوسرا اور تیسرا شعر درج ہے چوتھا شعر اور مقطع ایک قدیم تذکرے میں ملے ہیں جس کا نام اذکار خواتین اور سن تصنیف ۱۲۶۳ھ، ۱۸۴۷ء ہے۔

میر کے شاگرد

میر کی شہرت اور مقبولیت میں شبہ نہیں لیکن ان کے شاگردوں کا حلقہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اور نہ شاعری میں ان تلامذہ کا بڑا درجہ ہے اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ میر کے سامنے شاعری کے چند اصول تھے اور وہ ان پر سختی سے زور دیتے تھے۔ آب حیات میں جو روایتیں اُن سے منسوب کی ہیں وہ پوری طرح صحیح ہوں یا غلط، لیکن ان کے نظریۂ فن کی ضرور غماز ہیں:

میر قمر الدین منت دلی میں ایک شاعر گذرے ہیں کہ علوم رسمی کی قابلیت سے عمایدِ دربار شاہی میں تھے وہ میر کے زمانہ میں مبتدی تھے شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے لئے اُردو کی غزل لے گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا، آپ نے فرمایا کہ سید صاحب اُردوئے معلی خاص دلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجئے۔

سعادت یار خاں رنگین نواب طہماسپ بیگ خاں قلعہ دار شاہی کے بیٹے تھے ۱۴، ۱۵ برس کی عمر تھی بڑی شان و شوکت سے گئے اور غزل اصلاح کے لئے پیش کی۔ سن کر کہا کہ صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیر زادہ ہیں نیزہ بازی، تیر اندازی کی کسرت کیجئے۔ شہسواری کی مشق فرمایئے۔ شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں ہے یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔ یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گذرا۔[1]

اس نظریہ کی ترجمان ان کی مثنوی تنبیہ الجہال بھی ہے:-

صحبتیں جب تھیں تو یہ فن شریف — کسب کرتے جن کی طبیعتیں تھیں لطیف
تھے ممیز درمیاں انصاف تھا — خار و خس سے کیا یہ عرصہ صاف تھا
دخل اس فن میں نہ تھا اجلاف کو — کچھ بتاتے تھے بھی سو اشراف کو
تھے جو اس ایام میں استاد فن — ناکسوں سے وے نہ کرتے تھے سخن
پھر حصول اس سے نہ دنیا ہے نہ دین — کوئی حاجت اس سے وابستہ نہیں
گر چمار اس کارخانہ میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و ناچار اس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گھٹوانا پڑے
حاجت اس فرقہ سے مطلق یاں نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصان نہیں
ہم تلک تھی بھی وہی رسم قدیم — یعنی جن کے ہوتے تھے ذہن سلیم
پیار کرتے تھے انھیں استاد فن — ان کے ہوتے رہبر راہ سخن
جلف واں زنہار پاتے تھے نہ بار — شاعری کا ہے کو تھی ان کا شعار

---

[1] آب حیات ص ۲۱۷۔

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا — شعر سے بزازوں ندافوں کو کیا
الغرض یاروں نے قیدیں دیں اٹھا — جو کوئی آیا اسے دی پاس جا
ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو — کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو
چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ — پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ
آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ — کرنے لاگے شاعری سے حرف گپ
بولے ان کو آج کل سے ہے خیال — ذہن ان کا تیزی رکھتا ہے کمال
ہوویں گے کچھ اگر صحبت رہی — اور ہم سے بھی انھیں الفت رہی
جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید — سب نے جانا اس کو شاگرد رشید
کی اشارت تاکہ وہ کھولے دہن — آگے استادوں کے ہو گرم سخن
ان کی ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا — شاعراں فن کے منہ چڑھنے لگا
نیم قدا اٹھ کے یہ سننے لگے — جا و بیجا سر کے تئیں دھننے لگے
وہ سراپا جہل ناگہ وقت کار — ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار
سر میں رکھ کر دعوئ طبع لطیف — میر و مرزا کا ہوا آخر حریف
کیسی کیسی یوں گئیں طبعیں بباد — آفریں شاگرد و رحمت اوستاد
جب تلک یاں تھی تمیز زشت و نیک — کا ہے کو یوں شعر کہتا تھا ہر ایک

اہلِ فن کی رہتی تھی سب کو تلاش
ان کے ہاں کرتے تھے جا کر بود و باش[1]

پوری مثنوی کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہی کہ میر شاعری کو "فن شریف" سمجھتے تھے اور اس کے لئے علمی قابلیت کو ضروری قرار دیتے تھے نکات الشعراء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روزمرہ کو پسند کرتے تھے لیکن اس میں سوقیت کے دلدا

۱؎ کلیاتِ میر، نول کشور، ص ۹۲۵

نہیں تھے وہ ایہام، تنافر، نامانوس ترکیب اور محاورہ میں تصرف کو شعر کا سب سے بڑا عیب سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک نہ وہ شاعری اچھی ہے جو "گل و بلبل" تک محدود ہو نہ وہ "ریختہ پیش عزیزاں سند" ہے جو "بے سوزِ دل" کہا جائے۔

لیکن جو شاگرد ان کے اصول کی پیروی کرتے تھے ان کی اصلاح میں ان کو کوئی تامل بھی نہ تھا۔ نکات الشعراء میں انھوں نے ان لوگوں کو اپنا شاگرد لکھا ہے:

(۱) میر عبدالرسول نثارؔ: "فقیر مولف کے دوستوں میں سے ہیں چناں چہ میرے مشورے سے شعر کہتے ہیں۔ سید نجیب اور جوان سعادت مند ہیں۔ ان کی اصل اکبرآباد سے ہے۔ فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں جب نیکو سیر نے اکبرآباد میں ہنگامہ برپا کر رہا تھا۔ ان کے بزرگ عزت کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ بہت آراستہ و پیراستہ سنجیدہ اور سمجھ دار ہیں۔ میں ان کے طور طریق سے بہت خوش ہوں۔" نمونۂ کلام۔

جو ہے یعقوب یوسف دیکھنا منظور آنکھوں سے
تو اتنا پھوٹ کر مت رو کہ جائے نور آنکھوں سے

ٹک دیکھ تو چمن کا کیسا ہے ڈھنگ تجھ بن
منہ سے اڑا ہے گل کے گلشن میں رنگ تجھ بن
ہر سمت صد تمنا تڑپیں ہیں خاک و خوں میں
ہر صحن خانہ میرا میدانِ جنگ تجھ بن
یاں گل رکھے بھرے ہے دستار پر تو اپنی
واں عاشقوں کے سر پہ پڑتے ہیں سنگ تجھ بن

۱؎ سخن شعرا ص ۵۰۲ نساخ نے صرف معاصر میر تقی میر لکھا ہے۔

اکثر ہیں دلفگار و لیکن نہ اس قدر — کتنے ہیں بے قرار و لیکن نہ اس قدر
میں ہوں وہ جس کے رشک سے گل نے کیا سحر — ٹکڑے جگر ہزار و لیکن نہ اس قدر

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم — یہ گریبان دامنِ صحرا کو دکھلاویں گے ہم

(۲) محمد محسن محسنؔ: میرؔ کے بھتیجے تھے تذکرہ نکات الشعرا، کی تحریر کے وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ میرؔ نے لکھا ہے:

ذہنش بسیار مناسب و سلیقہ اش خیلے درست معلوم می شود[۲]

میرؔ نے اپنے دیوان چہارم کا ایک نسخہ ان ہی کو دیا تھا جو راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ نمونہ کلام:

حرف تیرے عقیق لب کا شوخ — زندہ کرتا ہے نام عیسیٰ کا

ٹک راہ پر تو آؤ اب سیر کو کہ محسنؔ — مانند نقشِ پا کے پامال ہو گیا ہے

اس کے کوچہ میں ہے کچھ نالۂ شب کا چرچا
دیکھیو کوئی میاں میراؔ تو مذکور نہیں

کیا جانیئے وہ شوخ کدھر ہے کدھر نہیں — ہم کو تو تن بدن کی بھی اپنے خبر نہیں

مر گیا پوچھی نہ پر تم نے مری زحمتِ دل
جیو کی جیو میں ہی رہی ہائے مری حسرتِ دل

---

[۱] شیفتہ: گلشنِ بے خار ص ۲۰۱، و تذکرہ کریم الدین ص ۱۶۵ [۲] نکات الشعراء ص ۱۴۰۔

محسن نہ روؤں میں تو بھلا کہہ کہ کیا کروں

اک دل بساط میں تھا میں اس کو بھی کھو چکا

---

(۳) بندرابن راقم: اوائل عمر میں کلام میر صاحب کو دکھلاتے تھے اور پھر مرزا رفیع سے اصلاح لینے لگے۔ میر صاحب لکھتے ہیں:

مشق شعرانہ مرزا رفیع می کند۔ قبل ازیں با فقیر نیز مشورت شعری کرد[1]

یاں تک قبول خاطر کیجیے تری جفا کو تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

دل کو کنج قفس میں کر فریاد بہت رویا ہنسنے کے تئیں گل کے کر یاد بہت رویا

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض

مجھ کو قسم ہے چھیڑوں اگر برگ و بر کہیں

اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب

آپس میں دردِ دل کہیں ٹک بیٹھ کر کہیں

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب

یا رب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

---

(۴) میاں جگن: میر لکھتے ہیں:

دعویٰ شاگردیٔ فقیر می کند

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۵۳۔ راقم کو عشقی عظیم آبادی نے سودا کا شاگرد لکھا ہے۔

نکات الشعرا میں میرؔ نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے:

اس دل مریضِ عشق کو آزار ہی بھلا

چنگا ہو تو ستم ہے یہ بیمار ہی بھلا

نکات الشعرا کے علاوہ اور تذکروں سے بھی میرؔ کے شاگردوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ ہم نے ان کا شمار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس تذکرہ کو مکمل نہ سمجھا جائے۔

(۵) تجلّی: نساخ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

شاگرد و خواہر زادۂ میرؔ [۱]

گلشن بے خار میں لکھا ہے:

تجلی تخلص، میر محمد حسین المشتہر بہ حاجی۔ ولد میر محمد حسن کلیم خواہر زادۂ میر تقی میر در باغ بیگم واقع چاندنی چوک سکنت داشت۔ جوان خرم و خنداں و ظریف و نکتہ داں بودہ۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں بزبانِ ریختہ از خیالاتِ او بنظر رسیدہ، پذیرائے دل نشد[۲]۔ نمونہ ؎

مری وفا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم

یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا

---

(۶) جانؔ: شیفتہ نے لکھا ہے:

جان تخلص، جان علی۔ از مردم جہاں آباد است۔ با نواب بیرم خاں مغفور

---

[۱] سخن شعرا: ص ۸۲ و مقدمۂ انتخابِ مثنویاتِ میر ص ۲۵ (مسز شاہ سلیمان)

[۲] گلشنِ بے خار ص ۴۰ - نیز تذکرہ کریم الدین ص ۱۳۹

واسطہ قرابت دارد و نسبت تلمذ با میر تقی میر، آزادانہ بسری برد۔ از وست

ذکر اس زلف کی درازی کا　　　صبح سے تا بشام ہوتا ہے

(۷) شکیبا: شیفتہ نے لکھا ہے:[۱]

شکیبا تخلص۔ شیخ غلام حسین دہلوی شاگرد میر تقی میر بزمرۂ شعرائے پایۂ تخت حضور والا محسوب بود۔ بیت اول او لغایت دل پذیر فقیر است

نیم بسمل اس نے گر چھوڑا شکیبا غم نہیں
پر یہ غم ہے اعتبار دستِ قاتل اٹھ گیا

(۸) لطف: شیفتہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

لطف تخلص، مرزا علی اصلش در استر آباد است در دہلی نشو و نما یافتہ و در نواح عظیم آباد ساکن و بہ حیدرآباد رفتہ قصائد انشا کردہ وصلہا یافتہ نسبت شاگردی بمیر تقی داشتہ، تذکرہ در حال گویاں بزبان ریختہ نوشتہ است، بنظر رسید۔ نمونہ

بڑھایا قصہ سنبل صبا نے حد لیکن　　　فسانہ زلف کا تری بہت دراز رہا

لیکن خود مرزا لطف یہ لکھتے ہیں:

اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے۔[۳]

(۹) مجنوں: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے لکھا ہے:

مجنوں تخلص، مجہول الاسم، مشہور بدرویش سر برہنہ، شخصے بود از

---

[۱] تذکرہ گلشن بے خار ص ۱۱۰ - و تذکرہ کریم الدین ص ۱۳۵

[۲] تذکرہ گلشن بے خار ص ۱۶۷　[۳] گلشن ہند: مرزا علی لطف۔

اولاد را سے بہیم تا تقریر بزرگانش بیک دو واسطہ با سلام مائل شدند۔ از تلامذہ میر تقی میر است۔ گو بند کہ در کوچہ و برزن عور یحض می گشت و این معنی دلیل تاثیر تخلص است۔ ؎

جس سے جی چاہے ملو تم، نہ کسی سے پوچھو
مجھ سے کیا پوچھتے ہو اپنے ہی جی سے پوچھو[۱]

گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ ان کا تخلص خافی بھی ہے۔ (ص ۲۳۵)

(۱۰) مرزا: شیفتہ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

مرزا تخلص، آقا مرزا نام۔ اصلش از مازندران است۔ و دے در لکھنؤ متولد شدہ پدرش محمد اسمٰعیل نام تجارت پیشہ بود و از تلامذہ میر است[۲]

نمونہ ؎

بالیں سے جب وہ پھر گیا، غش سے کھلی تب آنکھ
مجھ نارسا کے طالع خوابیدہ دیکھنا

مرزا کا ذکر مصحفی نے بھی کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ریاض الفصحا ص ۲۷۶)

(۱۱) برشتہ: نساخ نے لکھا ہے:

برشتہ تخلص، آغا حسین علی مرحوم لکھنوی۔ شاگرد میر تقی[۳]

(۱۲) راسخ: نساخ نے لکھا ہے:

شاگرد مرزا فدوی، میر تقی کو بھی اپنے شعر دکھلاتے تھے۔ ۱۲۳۸ھ میں انتقال کیا[۴]

---

[۱] گلشن بے خار ص ۱۶۹ نیز تذکرۂ کریم الدین ص ۲۱۷ [۲] ایضاً ص ۱۷۴
[۳] سخن شعرا ص ۶۴ لیکن مصحفی نے لکھا ہے کہ وہ مرزا کے شاگرد تھے۔ جلوۂ خضر میں بھی ان کو میر کا شاگرد لکھا ہے۔ [۴] سخن شعرا ص ۱۷۶۔ نیز اشپرنگر ص ۹۴۔

(۱۳) بیگم : نساخ نے لکھا ہے:

بیگم تخلص، دختر میر ساکنہ لکھنؤ شاگرد تقی میر[1]

(۱۴) نزار : نساخ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

نزار تخلص، خواجہ محمد اکرم شاگرد میر تقی میر[2]

ان کے علاوہ سر شاہ سلیمان مرحوم نے میر کے شاگردوں میں سخن، عشق، آرزو اور آبرو کو بھی شامل کیا ہے[3] لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا۔

---

[1] سخن شعرا ص ۵۷۲ [2] ایضاً ص ۵۰۷

[3] مقدمہ انتخاب مثنویات میر ص ۲۵ -

باب دوم

میر کی سیرت اور اُن کے بنیادی تصوّرات

سیرت

سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں نسلی اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ ماحول اور تربیت کے اثرات بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ میر کو بچپن سے ہندوستانی تصوّف کے اثرات ملے جس نے ان کی طبیعت اور مزاج کو ایک خاص سانچہ میں ڈھال دیا تھا۔ ان کے یہاں جو ثباتِ قدم، ضبطِ نفس، آتشِ احساس، سوز و گداز، دردمندی، پاسِ وضع، غیرت و حمیت، بے نیازی و استغنا اور اقدارِ عالیہ پر ایمان محکم ہے، اس کا سرچشمہ بھی ان کی ابتدائی زندگی اور خارجی حالات میں تلاش کرنا چاہیے۔

میر ایک درویش کے بیٹے تھے۔ ان کے والد کبھی کبھی ان کے زرد رنگ[لہ]

لہ کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں رنگ اڑا جاتا ہی ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

اور عاشقانہ تڑپ کو دیکھ کر کہتے تھے "اے سرمایۂ جان! یہ کون سی آگ ہے جو تیرے دل میں نہاں ہے ؟" کبھی اس طرح نصیحت کرتے :

بے عشق کے زندگانی وبال ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے.....

میر کو سید امان اللہ سے بھی بے حد محبت تھی، اُن کی پُر سوز اور عاشقانہ طبیعت کا بھی میر پر گہرا اثر پڑا ہے۔ وہ اکثر ان کے ساتھ صوفیوں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے ارشادات کو یاد رکھتے۔ درویش احسان اللہ سے ملنے گئے تو انھوں نے پوچھا "یہ لڑکا تمھارے ساتھ کون ہے ؟" کہا "یہ علی متقی کا بیٹا اور میرا بغل پروردہ ہے" درویش نے فرمایا کہ "یہ ابھی بچہ ہے اگر بخوبی تربیت ہوئی تو ایک ہی پرواز میں آسمان کے اس طرف پہنچ جائے گا" اس کے بعد اس درویش نے روٹی کا ایک سوکھا ٹکڑا پانی میں بھگو کر دیا۔ میر لکھتے ہیں کہ مجھے اس میں وہ لذت ملی جو آج تک کسی کھانے میں نہیں ملی۔

احسان اللہ کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی ملنے آتا تو اپنے زاویہ ہی سے کہہ دیا کرتے "احسان اللہ گھر میں نہیں ہے" میر کا کلیات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ بے خودی کی ادا بہت پسند تھی۔ بعض اشعار میں اسی کیفیت کا اظہار کیا گیا ہے:

مسکن جہاں تھا دل زدہ مسکیں کا ہم تو واں
کل دیر میر میر پکارے، نہیں ہے اب

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو   دیر سے انتظار ہے اپنا

بے خودی پر نہ میر کی جاؤ   تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

از خویش رفتہ اس بن ہنا ہی میر اکثر   کرتے ہو بات کس سے، وہ آپ میں کہاں ہے

بایزید کے کلماتِ پند بھی اہم ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر نے ان کو اچھی طرح گرہ میں باندھ لیا تھا:

خود را از بیندِ دیر و مسجد وا رہاں یعنی با خدا باش نہ در ہمہ جا بماں

ان نصیحتوں کی بازگشت ان کے کلام میں بھی سنائی دیتی ہے:

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف، کہیں رخ نہ دکھا

اختلاف آیا نہ ہندو مسلماں کے بیچ

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل

اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

میر نے اپنے والد، "عم بزرگوار" اور اہلِ دل کی صحبتوں سے فیض اٹھایا اور اس کا رس ہمیشہ ان کے کلام میں باقی رہا۔ اس ماحول میں جو قوتیں چھپی تھیں اور وہ جس ذہن کا پرتو تھیں، ان میں اور میر کے ذہن کی قدرتی ساخت میں بڑی مناسبت اور مشابہت تھی اسی مناسبت رکھنے والے دیئے سے ان کے ذہن کا دیا روشن ہوا اور اسی رسیلی شبنم سے ان کے ذہن کی کلی کھلی۔

اصل یہ ہے کہ میر شروع ہی سے دیگیر، مستغرق، کم آمیز، اندرون بیں، اور دردمند سے نظر آتے تھے۔ جو صاحبِ دل ان کو دیکھتا، ان کے حق میں کلمۂ خیر ادا کرتا۔ خواجہ ناصر عندلیب نے فرمایا تھا:

میر تو میرِ مجلس ہوگا۔

ان کے والد جو خود بڑے خدا رسیدہ بزرگ اور درویش جگر ریش تھے، ان کے سوزِ باطن کے معترف اور ان کی غیرت مندی کے قائل تھے ذکرِ میر میں لکھا ہے:

حق تعالیٰ غیور است و غیور را دوست می دارد۔ غالب کہ میر دست نگر تو نشود۔
(حافظ محمد حسن)

آزاد نے میر کی بد دماغی اور نازک مزاجی کے بہت سے افسانے لکھے ہیں لیکن نواب صدر یار جنگ مرحوم کا خیال ہے کہ انھوں نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں اور محض معجز بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔ آزاد کی نظر سے غالباً "نکات الشعرا" اور "ذکر میر" نہیں گزری تھیں، اور ان کے بعض بیانات ضرور تحقیق کے محتاج ہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ آزاد کی دست رس جن شہادتوں تک تھی، ہماری ان تک نہیں ہے۔ ان کے بعض بیانات کی تصدیق دوسرے تذکروں سے بھی ہوتی ہے اس لئے ان کے ہر بیان کو لازماً غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ احمد علی یکتا نے میر کے "غرور کمال" اور "استغنائے تصوف" کے سلسلہ میں میر اور ملا محمد کا واقعہ نقل کیا ہے[۱] جس کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

مرزا مغل سبقت کہتے تھے جب میر صاحب لکھنؤ میں تشریف لائے، بندہ ان کے شرف ملازمت کو گیا۔ خبر ہونے کے بعد دیر میں تشریف لائے۔ میں نے دولت قدم بوسی حاصل کی اور بعد قیل و قال کے ملتمس ہوا کہ کچھ اپنے کلام سے مستفید فرمایئے۔ بے تامل فرمایا کہ تمھارے بشرے سے شعر فہمی معلوم نہیں ہوتی۔ سخن کے ضائع کرنے سے حاصل؟[۲]

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ناصر نے لکھا ہے:

ایک دن شاہ قدرت اللہ اور میر صاحب کشتی پر سوار تھے۔ قدرت اللہ نے چند غزلیں اپنے دیوان کی میر صاحب کے آگے پڑھیں۔ میر صاحب نے

---

[۱] دستور الفصاحت ص ۲۵، ۲۶ [۲] تذکرہ خوش معرکہ زیبا: سعادت خاں ناصر۔

کچھ نہ کہا۔ وہ ملتمس ہوا کہ "آپ نے کچھ نہ فرمایا"۔ میر صاحب نے کہا "صواب دید یہ ہے کہ دیوان کو اپنے دریا میں ڈال دو۔"[1]

سعادت خاں ناصر نے "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" میں ایک اور واقعہ درج کیا ہے جو میر کی سیرت کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے:

نقل ہے کہ عماد الملک نواب غازی الدین خاں[2] لب دریا بیٹھے ہوئے تھے اور مرغابیاں، آبی بط اور سرخاب دریا میں واسطے سیر تماشا کے دریا میں چھوٹی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً میر صاحب اُدھر سے آ نکلے نواب چند قصیدے اپنے ان کو پڑھ کر داد طلب ہوئے۔ میر صاحب نے فرمایا "میری تعریف کی کیا احتیاج ہے۔ ہر بط کو صاحب کے اشعار پر حالت وجد و سماع ہے۔" نواب پر یہ سخن نہایت ناگوار گزرا اور دوسرے روز میر صاحب کو پھر طلب کیا۔ آپ کرسی پر بیٹھے، زمین پر سوائے خاک نہ بچھوایا میر صاحب نے لمحہ کے لمحہ انتظار مونڈھے چوکی کا کیا۔ بعد ازاں دوپٹہ اپنا دوتہا کر کے بچھایا اور بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے فرمایا: "کچھ ارشاد کیجیے!" میر صاحب نے یہ قطعہ پڑھا:

---

[1] تذکرہ خوش معرکہ زیبا، سعادت خاں ناصر [2] شیفتہ نے لکھا ہے: "نظام تخلص، نواب عماد الملک غازی الدین خاں بہادر وزیر یست جلیل القدر، امیر یست، عالی شان، حالش مستغنی از شرح و بیان مرزا رفیع سودا اورا از ثنا گستران است۔" (گلشن بے خار ص ۲۳۲)، "تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے: "یہ امیر بہت نمک حرام اور برباد کرنے والا خاندان تیموریہ کا تھا۔ عالم گیر ثانی بھی اسی کی نمک حرامی کے سبب مقتول ہوا۔ مرزا رفیع سودا اس کے مداحین میں سے ہے۔" (ص ۱۲۳) ناسخ نے نظام کا نمونہ کلام دیا ہے ؎

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میسر — کیا جانیے کس وقت مری آنکھ لگی ہے

(سخن شعرا ص ۵۲۹) نیز ملاحظہ ہو ذکر میر ص ۱۱۳۔ نظام کی بیوی گنا بیگم شوخ بھی شعر کہتی تھی (ملاحظہ ہو شمیم سخن ص ۳۱)۔

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا ۔۔۔ ناگہ وہ استخواں شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر ۔۔۔ میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا[۱]

ان حالات کی روشنی میں نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کا میر کو "منکسر المزاج" لکھنا یا یہ کہنا کہ ان کے قلم سے کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا جس سے ان کی خود بینی، خود پسندی بد دماغی اور تعلی عیاں ہوتی ہو[۲] کسی طرح صحیح نہیں۔ صرف آزاد ہی نے نہیں، ناصر یکتا، اور قاسم نے بھی ان کی نازک مزاجی کا ذکر کیا ہے۔ میر حسن لکھتے ہیں:

بسیار صاحب دماغ است و دماغ او را می زیبد[۳]

اس کے علاوہ میر کے حساس اور نازک دماغ ہونے کا ثبوت خود ان کے کلام سے بھی ملتا ہے[۴]:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ۔۔۔ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی ۔۔۔ جوں شیشہ میرے منھ نہ لگو میں نشے میں ہوں

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی ۔۔۔ تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسی نے

حالت تو یہ کہ مجھ کو غموں سے نہیں فراغ ۔۔۔ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ ۔۔۔ ہے نام مجلسوں میں مرا میر بے دماغ
ازبسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

۱؎ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا ۲؎ مقدمہ نکات الشعراص ۴ ۳؎ تذکرہ شعرائے اردو ص ۱۷۵ ۴؎ میر نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں بھی اپنی نازک مزاجی کے کئی واقعات درج کئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ص ۷۰، ۷۵، ۱۲۱، ۱۳۵۔

بے دماغی اور بد دماغی ایک ہی حالت کی دو صورتیں ہیں۔ بے دماغی ماحول سے ایک قسم کا گریز ہے، یہ ذہن کی منفی حالت ہے اور بد دماغی، ماحول سے ایک قسم کی پیکار ہے اور یہ ذہن کی مثبت حالت ہے۔ ان کا کلام ان دونوں کیفیات کو ظاہر کرتا ہے:

ملنے والوں، پھر ملئے گا، ہے وہ عالم دیگر میں
میر فقیر کو سکر ہے یعنی مستی کا عالم ہے اب

بے دماغی، بے قراری، بے کسی، بے طاقتی
کیا جئیں وہ روگ جن کے جی کو یہ اکثر رہیں

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

میر اپنے غلط ماحول اور بیرونی تناقضات سے کسی قیمت پر بھی مصالحت نہیں کر سکتے اس لئے ان کی ساری بغاوت ایک عجیب فراریت یا بے دماغی میں تبدیل ہو جاتی ہے یا پھر وہ زمین و آسمان کی ہر چیز سے الجھنے لگتے ہیں:

الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

معاصرین نے اسے بد دماغی پر محمول کیا۔ حالاں کہ یہ الجھاؤ صرف باطنی تضاد اور اندرونی پیکار کا اظہار تھا۔ اور اسی لئے میر کو یہ شکایت رہی کہ ان کے متاع ہنر کی قدر نہیں ہوئی اور ان کے جواہر کا مول ان کو نہیں ملا، حد یہ ہے کہ ان کو کوئی مخاطب "صحیح" میسر نہیں آسکا۔ ع تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے!

ع
سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

اس آویزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر کی انانیت کی لے بڑھتی ہی گئی۔ وہ مثنوی اژدرنامہ میں حریفوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے — جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر — گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

(مثنوی اژدر نامہ)

میر کو سکون اس خیال سے حاصل ہوتا ہے:

جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے!

یا ے قدر و قیمت میر تمھاری اس سے زیادہ کیا ہو گی
جس کے خواہاں دونوں جہاں ہیں اس کے ہاتھ بکاؤ تم

میر کی سیرت کو سمجھنے کے لیے ان کے ابتدائی اور خاندانی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ انہیں دس برس کی عمر میں گھر سے نکلنا پڑا۔ باپ اور "چچا" کا انتقال ہوا بھائی اور "ماموں" درپے آزار ہو گئے۔ اس پر بے چارگی اور بے نوائی۔ دلی میں جب تک رہے پریشان رہے۔ لکھنؤ آکر بھی سکون حاصل نہ ہوا اور وہ خارج اور باطن کی آویزش بدستور قائم رہی۔ پھر بھی ان کا ضبط اور تحمل قابلِ تعریف ہے۔

اس وقت زمانہ کی حالت بھی بڑی عبرت آموز تھی۔ روز کی دستبرد، غارت گری اور گرد و پیش کے غیر یقینی حالات نے میر کے سینے کو درد اور سوز و گداز کا آتش کدہ بنا دیا تھا۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، آج ہے تو کل نہیں، صبح کو ملی تو شام کا یقین نہیں، ان حالات میں خودداری اور وضع داری کو نبھانا بڑے ضبط و تحمل اور دل گردہ کا کام تھا۔ اس وقت شاعر تو شاعر، بڑے بڑے امراء اور رؤسا پریشان اور مضمحل تھے۔ ذکر میر کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

القصہ جہاں عجب حادثہ گاہیست۔ چہ مکان ہا خراب گشتند و چہ جواناں از ہم گزشتند۔ چہ باغہا ویرانہ شدند۔ چہ بزم ہا افسانہ شدند۔ چہ گل ہا افسردند چہ جواناں مردند۔ چہ مجلس ہا بر شکستند۔ چہ قافلہا رخت بستند۔ چہ عزیزاں ذلت کشیدند۔ چہ مرداں بجاں رسیدند۔

تاہم میر کی درویشانہ تربیت، جگرداری اور عزم و استقلال کی داد دینا چاہیئے کہ باوجود نامرادانہ زلیست کرنے کے، جب تک بن پڑا وہ دہلی ہی میں قدم جمائے رہے اور ان حالات کو بڑے سلیقہ سے بنھایا۔

تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہی کہ "میر با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود، در پردہ تعشق طبع و میل خاطر می داشت۔" اس عشق میں میر کو ناکامی ہوئی اس کا اندازہ اس آگ کی لپٹ سے ہو سکتا ہی جو ان کے کلام سے نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جنسی جذبہ کے انحرافات خود اذیتی کی شکل میں جا بجا ملتے ہیں۔ ان کی جبلتِ حیات ہمیشہ زندگی کے تلخ حقائق سے برسر پیکار رہی اور اسی نے ان کی شاعری کو کشمکش اور آویزش کا آئینہ دار اور ان کے غم عشق کو بلند المیہ بنا دیا۔ ان کے کلام میں جو تشنگی اور بے چینی کا احساس ہے وہ معمولی نہیں۔ جو محبت کی کسک اور نیازِ عشق کی سپردگی ہے وہ ادنیٰ درجہ کی نہیں۔ لیکن ان کی موروثی خصوصیات اور تہذیبی روایات نے پیمانے کو چھلکنے نہیں دیا۔ بلکہ انھوں نے جنسی پہلو کو جمالیاتی رفعت دی، اور تہذیبِ عشق کا ایک ایسا اعلیٰ معیار قائم کیا جس سے زندگی کی لطافتوں کا احساس اٹھ جاتا ہے،

ذکر میر میں بھی بعض ایسے اشارے ہیں جن سے تذکرہ بہارِ بے خزاں کے بیان کو تقویت پہنچتی ہی:

شعری خواندم۔ عاشقانہ می زیستم۔ شبہا می گریستم۔ عشق با خوش قداں می باختم۔

ان کی غزل کا ایک شعر ہے:

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا　　　وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

کلیات میں اور بھی اشعار اس مضمون کے ہیں:

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

اس پردے میں غمِ دل کہتا ہے میر اپنا
کیا شعر و شاعری ہے یا رو شعار عاشق

اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں شجاعانہ جذبات رفتہ رفتہ فنا ہو رہے تھے اور زندگی کی تھکی ہوئی اور سسکتی ہوئی قوتیں جس کا سہارا لئے ہوئے تھیں، وہ یہی سوز و عشق کا جذبہ تھا۔ میر کے یہاں یہ جذبۂ غم فطری ہی۔ ناکامیوں اور مصیبتوں نے اسے اور بھڑکایا۔ یہاں تک کہ ان کی تمام شاعری اسی رنگ میں ڈوب گئی۔ پھر میر کی پرورش جس گھر میں ہوئی تھی وہ بڑے درویش کا گھر تھا۔ بچپن ہی سے عشق بسوزد، عشق بسازد کی تعلیم پائی تھی۔ اس کا بھی لازمی طور پر اثر ہونا چاہیئے تھا۔ چنانچہ میر فرماتے ہیں

عشق ہی عشق ہی جہاں دیکھو　　　سارے عالم میں بھر رہا ہی عشق

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہی　　　اک عشق بھر رہا ہی زمیں آسماں میں

میر امان اللہ کی صحبتیں اور درویشوں کی باتیں، اپنا ایک نقش چھوڑ گئیں۔ یہ اثرات ان کی شخصیت اور کلام دونوں میں کارفرما ہیں۔

میر کی زندگی اور شاعری وقت کی بے رحم قوتوں کے خلاف خوب صورت

احتجاج ہے۔ وہ غزل کے اشعار کی طرح غیر مربوط اور غیر مسلسل تو ہے لیکن بے احتجاج اسی طرح ان کے یہاں ایک سماجی احساس ہے جو بہت حکیمانہ نہیں لیکن ہوشمندانہ ضرور ہے۔

میر اپنی تہذیب کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی اقدار سطحی اور معمولی نہیں ہیں اور نہ ان کا اخلاق خشک اور بے روح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نفس پروری کی نہیں، جگرداری اور دردمندی کی مظہر ہے۔ ان کا جذبہ سچا اور گہرا ہے ان کا عشق، فطری اور حقیقی ہے اور ان کا غم، ایک بسیط صداقت اور حقیقت۔ جس میں روحِ عصر بھی دل کے دریچہ سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میر نے زمانہ کے ساتھ مصالحت نہیں کی اور نہ زمانے نے ان کے ساتھ کی۔ ان کی سیرت کی چوب خشک ٹوٹ سکتی تھی، لچک نہیں کھا سکتی تھی۔ لیکن اس اندرونی پیکار اور خارجی تناقصات کی جاں گداز آزمائش کے باوجود وہ زمین پر مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے رہے اور مرگ کو بھی ایک ماندگی کا وقفہ سمجھتے رہے۔ وہ دم لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور انسان کی عظمت کو پہچانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری باوجود غم واندوہ کی کثرت کے، اپنے اندر ایک حوصلہ۔ ایک عزم رکھتی ہے۔ ان کے کلام میں دردمندی ہے، درد فروشی نہیں ـــــ جس کو لوگ میر کی غم پرستی سمجھتے ہیں، وہ دراصل ان کی غم خواری ہے۔ اس میں جو سوتِ آبِ حیات کی آکر ملی ہے، وہ انفرادی اور اجتماعی ماحول کے ظلمات سے نکلتی ہے۔

بنیادی تصوّرات

میر کے کلام سے ایک کلّی تصوّرِ حیات پیش کرنا مشکل ہے اس لئے کہ غزل گو شاعر کی کچھ اپنی دقتیں اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ان کی غزلوں کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے فلسفۂ زندگی کے متعلق بھی کچھ ایسے نقوش چھوڑے ہیں جن کا آب و رنگ ہمیشہ قائم رہیگا۔

میرؔ کی زندگی دکھوں سے بھری ہوئی تھی اور ان کو کبھی غموں سے فراغ نصیب نہیں ہوا۔ لیکن غم والم انسان کی ہمت کا امتحان بھی ہوتے ہیں۔ دل اور دلی کی خرابی کا حال اس سے پہلے آچکا ہے۔ ان نامساعد حالات میں میرؔ جس طرح ثابت قدم رہے اور سلیقہ سے نبھاتے رہے وہ اُن کی بلند سیرت کا بہت بڑا ثبوت ہے زندگی کی ایسی دشوار گذار وادی میں جہاں خضر کی رہنمائی بھی کام نہیں دیتی اور جہاں پاؤں چلتے چلتے شل ہوجاتے ہیں وہاں میرؔ نے سینہ کے بل اپنا راستہ طے کیا ہے۔ اور یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

میرؔ نے غم دوراں کو غمِ جاناں بنالیا ہے۔ رضا کو تسلیم کی نظر سے دیکھا ہے۔ اور دنیوی حیات میں ایک خاص حسن پیدا کر دیا ہے۔ ان کی آواز بالکل مردہ اور بے جان نہیں ہے بلکہ اس میں ایک ہمت اور حوصلہ ہے جو ہمیں طوفان سے گذر جانے میں مدد دیتا ہے۔

میرؔ نے اضطراب دل کا جابجا ذکر کیا ہے اور ہر جگہ قیامت کا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے۔

یہ اضطراب دیکھ کہ اب دشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو

حسرتیں اس کی سر پٹکتی ہیں　　　مرگِ فرہاد کیا کیا تو نے

آنکھوں سے جو پوچھا حال دل کا　　　اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

رنگ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے　　　یہاں کی بھی صبح دیکھو ایک آدھ رات رہ کر

اس کے کاکل کی پہیلی کو بھی تم بوجھے میر کیا ہی؟ زنجیر نہیں، دام نہیں، مار نہیں

اے کاش ہم کو سکر کی حالت رہے مدام تا حال کی خرابی سے ہم بے خبر رہیں

پاس ناموس عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اس اضطراب میں کتنا ٹھہراؤ ہے! اور یہ اسی وقت ممکن ہی جب صحیح اقدار حیات سامنے ہوں۔

میر کی شخصیت جامد قسم کی نہیں ہی۔ وہ موثرات خارجی کے ساتھ بدلتی اور ترقی کرتی رہی ہی۔ اُن سے کسی معین اور منظم فلسفہ کی توقع رکھنا بے کار ہے لیکن غزل کی رنگا رنگی اور ہیئتی دقتوں میں بھی انھوں نے تخیل کی تربیت اور روح کی نشو و نما کے لئے ایسا بیش قیمت سامان فراہم کر دیا ہی جس سے ہماری زندگی سنور سکتی ہی۔

میر نے عشق کو تہذیب میں داخل کر کے زندگی اور عشق دونوں کا رتبہ بڑھایا ہے انھوں نے خود اپنی عزت کی ہے اور دوسروں کو انسان کی عزت کرنا سکھائی ہے اُن کی غیرت اور خودداری اور تہذیب عشق اردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہی۔ دہلی اور آگرے کے قلعے ریت کی دیوار سے زیادہ کمزور تھے لیکن میر کا یہ حصار "ناقابل شکست قلعہ روئیں" ثابت ہوا۔ اس غیرت کو مریضانہ انانیت سمجھنا صحیح نہیں بلکہ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہی کہ عشق نے ان کی انانیت کو ختم کر دیا، لیکن خودداری کو باقی رکھا ہی، یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں "میں" کے بجائے جا بجا "ہم" کا استعمال ہے جس میں جامعیت اور عالمگیریت کہیں زیادہ ہے۔

چند شعر ملاحظہ ہوں جس میں انسانی عظمت پر زور دیا گیا ہی:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہی فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

مرتا ہوں میں تو آدم خاکی کی شان پر　　　اللہ رے دماغ کہ ہے آسمان پہ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب اِصاحب نظر بنے ہے

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے　　　پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

یہ اشعار بھی قابلِ غور ہیں:

آدم خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ　　　آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

ہیں مشتِ خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

سرکسی سے فرو نہیں آتا　　　حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

میرؔ کی خودیابی، انسان دوستی سے گذر کر عرفان کی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔

خدا ساز تھا آذر بت تراش　　　ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

آدمی سے ملک کو کیا نسبت　　　شان ارفع ہے میرؔ انساں کی

ماہیت دو عالم کھاتی پھرے ہے غوطے
یک قطرۂ خوں یہ دل کا طوفاں ہی ہمارا

میر پامال ہو کر ہموار ہوئے تھے اسی لئے وہ پست و بلند کو اہمیت نہیں دیتے اور کامیاب زندگی کے لئے صرف اچھے اعمال کو ضروری سمجھتے ہیں:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

وہ زندگی کی عمارت کو دردمندی کی بنیاد پر اٹھانا چاہتے ہیں ان کے نظامِ اخلاق میں ظلم اور غرور سب سے بڑے گناہ ہیں۔ یہ دنیا دارِ مکافات ہے یہاں "دست بلبل" اور "دامن گل" ساتھ ساتھ اُگتے ہیں۔ اس لئے دامن اٹھا کے چلنا چاہیئے ممکن ہے کسی دادخواہ کا ہاتھ کمین میں ہو۔ کعبہ کی تعمیر اگر دل کو ڈھا کر کی گئی ہے تو وہ بھی قابلِ احترام نہیں ہے۔ اس لئے دیر و حرم سے گذر کر اب دل ہی کو گھر بنانا چاہیئے اور اسی پر سیر و سفر کا خاتمہ ہے۔

میر کا خیال ہے کہ سرفرازی کے لئے راہ خلق میں پامال ہونا ضروری ہے اگر کے بیچ اگر بُو نہیں تو وہ چوبِ خشک ہے، شمع کی طرح عشاق کی سرفرازی یوں ہی نہیں ہے انھوں نے جل کر یہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ دنیا سیلِ حوادث کی رہ گذر ہے، اس کو آدمی عشق ہی کے سہارے عبور کر سکتا ہے۔ اس عشق کے لئے پاکی و پاک بازی، جذب و مستی، خلوص و احتیاط، مدارات و مساوات شرط ہے۔

دنیا بے حقیقت ہے اور آفاق کی منزل سے کوئی سلامت نہیں گیا لیکن میر آگاہ کرتے ہیں کہ ؏

یہ منزل نہیں، بے خبر راہ ہے

ان کے نزدیک زندگی موت پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ تو دم لینے کے لئے ایک لمحہ ہو ؎

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا ؎

وقفہ مرگ اب ضروری ہے
عمر طے کرتے تھک رہے ہیں ہم

میرؔ باوجود اپنی انتہائی نرالی شخصیت کے اپنے زمانہ کی مخلوق ہیں اور ان کا وجدان و فکر اپنے عہد کے حالات سے بہت کچھ متاثر ہوا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے تجربات کا لہو ہے لیکن وہ صرف عشق و محبت کے دائرہ میں اسیر نہیں۔ اس میں انفرادیت اور آفاقیت کی ہم آہنگی ہے اسی لئے ان کی قدروں اور خواہشوں میں بھی ایک گہرا رشتہ ہے۔

میرؔ کی سیرت کے چند نفسیاتی پہلو
نظر بہ گزشتہ

میرؔ اقلیمِ سخن کے تنہا تاجدار ہیں۔ ان کی زندگی اور شاعری میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ ان کی سیرت نے انداز و اسلوب کی تعمیر میں بڑی مدد دی ہے۔ وہ تشنگی، وہ بے چینی وہ والہانہ سپردگی؛ وہ ضبط و تنظم، وہ "قیامت کا سا ہنگامہ" اور وہ "آگ کی سی لپٹ"۔ جو ان کے کلام میں ہے اس کے حقیقی اسباب ان کی زندگی اور نفسیاتی حقائق ہی میں مل سکتے ہیں۔

میرؔ کو بچپن ہی سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی عمر دس برس کی تھی کہ ان کے "چچا" اور باپ کا انتقال ہوگیا۔ سوتیلے بھائی نے جو کچھ اثاثہ تھا اس پر قبضہ کرلیا اور میرؔ بالکل لاوارث اور بے یار و مددگار رہ گئے۔ ؎

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

وہ کچھ دنوں اطرافِ اکبر آباد میں پھرتے رہے لیکن جب کوئی صورت معاش کی پیدا نہیں ہوئی تو تکلیفیں اٹھا کر دلّی آئے۔ یہاں بھی قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ امیرالامرا صمصام الدولہ کے روزینہ سے نان و نمک میسر آنے لگا لیکن ۱۷۳۹ء میں یہ سہارا بھی جاتا رہا اور میر مجبوراً اکبر آباد چلے آئے۔ لیکن وطن میں جو لوگ علی متقی کے سامنے انھیں آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔ انھوں نے یک بارگی نظریں پھیر لیں۔ اس لئے میر دوبارہ دلّی آئے اور خانِ آرزو کے یہاں ٹھیرے۔ لیکن وہ بھی محمد حسن کے لکھنے پر کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے، درپئے آزار ہو گئے۔ میر لکھتے ہیں کہ اگر ان کی دشمنی کی تفصیل بیان کروں تو ایک دفتر ہو جائے۔ ہر وقت بُرا بھلا کہتے، میں بہتیری خاموشی اختیار کرتا لیکن وہ ظلم سے باز نہ آتے۔ آخر کار مجھے جنون ہو گیا، اور زندانی و زنجیری کر دیا گیا۔

تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میر اپنے شہر میں ایک پری تمثال عزیزہ کے ساتھ در پردہ تعشق طبع اور میلِ خاطر رکھتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر سترہ اٹھارہ سال سے کم نہ تھی، جوان تھے، حساس تھے۔ بہت ممکن ہے خان آرزو کو اسی تعشق طبع کی ناگواری ہوئی ہو اور بھائی نے اسی لئے میر کو "فتنۂ روزگار" لکھا ہو۔ اہلِ اکبر آباد کی بے التفاتی اور میر کی دیوانگی کا بھی اصلی سبب یہی ہو سکتا ہے۔

میر کے دیوان میں جابجا اس قسم کے اشارے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دل تیغ عشق کا زخم خوردہ ہے اور ان کی شاعری اسی زندگی کی سچی اور بے لاگ تصویر ہے۔ اُن کا دیوان عشق کا محضر ہے۔ اس میں جن کیفیات و واردات کا ذکر ہے وہ اس وقت تک ادا ہی نہیں کی جا سکتیں، جب تک شاعر خود اس قلزمِ خون کا شناور نہ رہا ہو اور اس نے اس آگ میں کود کر اسے گلزار نہ بنایا ہو۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گہہ آپ میں نہیں ہو، گہ منتظر کہیں ہو
یہ میر جی تمہارا ان روزوں حال کیا ہی

لائے تھے جا کر ابھی تو اس گلی میں پکار
چپکے چپکے میر جی تم اٹھ کے پھر کیدھر چلے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی، پھوٹ بہی
درد مندی میں گئی ساری جوانی اس کی

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

گلی میں اُس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے جو رویا تو لگا کہنے، نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

یہ اشعار بھی غور طلب ہیں:

گلیوں میں اب تلک تو مذکور ہے ہمارا افسانۂ محبت مشہور ہے ہمارا

تھا بلا ہنگامہ آرا میر بھی اب تلک گلیوں میں اس کا شور ہے

میر کو عشق میں ناکامی ہوئی۔ یہ ناکامی معمولی نہیں ہے۔ اس سے ان کے تن بدن کا ایک ایک تار بلبلا اٹھا اور ان کا محبوب ایک خاموش درد کی طرح ان کی ساری زندگی میں سما گیا۔ ان کے خود مشغول اور کم اختلاط ہونے کی نفسیاتی وجہ بھی یہی شکست اور محرومی ہے۔

سینکڑوں حرف ہیں گرہ دل کی پر کہاں پایئے لبِ اظہار

میر ایک نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہیں، ان کے ذہن کے کسی چھپے ہوئے گوشے میں ایک ہنگامہ برپا ہے۔ ایک طرف اپنی بڑائی کا احساس ہے اور دوسری طرف اپنی محرومی اور بے کسی کا احساس۔ ان چیزوں نے مل کر انہیں سبزہ نودمیدہ کی طرح پامال کر دیا، اور چراغ کی طرح بجھا دیا۔ لیکن ان ہی نے ان کی عشقیہ شاعری میں امرت کی بوندیں بھی ٹپکا دیں۔

میر کے یہاں دبے ہوئے صنفی رجحانات بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے طفلانِ تہ بازار اور دلّی کے کج کلاہ لڑکوں کی تمام دلربا اداؤں پر غور کیا تھا:

ے کیا پہناوا خوش آتا ہے ان لڑکے چیپاں پوشوں کا

موںڈھے چسپے ہیں، چولی پھنسی ہے، ٹیڑھی ٹیڑھی کلاہیں ہیں

ع یہ زمستانے لونڈے ہیں محمل دو خوابا

میر کی عیاریاں معلوم لڑکوں کو نہیں — کرتے ہیں کیا کیا ادائیں اس کو سادا سمجھ

رفتہ رفتہ یہ طفلِ خوش ظاہر — فتنۂ روزگار ہوتے ہیں

مت مل اہل دول کے لڑکوں سے — میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں کئی ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے جن کا جنسی شعور صحت مند نہیں تھا مثلاً رسوا (ص ۱۲۹) قدر (ص ۱۵۷) عاجز (ص ۱۵۸) میر کا ان اثرات سے دامن کشاں گزرجانا آسان نہیں تھا۔ لیکن "آلودگی بہ دامنِ پاکاں نمی رسد" ان کی سلامتی طبع نے انہیں گرنے سے سنبھال لیا۔

(میر کی سیرت کی تعمیر میں موثراتِ خارجی کو بھی بڑا دخل ہے۔ وہ اس زمانہ میں دلّی آئے جب واقعیٔ دونوں ہاتھوں سے بھی دستار سنبھالنا مشکل تھی۔ ہر طرف نفسی نفسی اور ابتری کا عالم تھا۔ ان بے رحم حالات کے آگے انھیں اپنی شکست یقینی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن نہ وہ ان کے آگے بالکل سپر ڈالنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اور نہ اس دنیا سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہیں۔)

میر عقل معاش سے عاری نہیں تھے۔ یہ عام خیال کہ وہ بالکل قانع اور قطعی متوکل آدمی تھے اور ان کی لوحِ دل پر آرزو کا کوئی نقش تھا ہی نہیں۔ صحیح نہیں ہے۔ دلّی میں ان کے محسنین کی فہرست کافی طویل ہے جس سے ان کی جدوجہد کے علاوہ اس زمانہ کے ناسازگار اور غیر یقینی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے:

(۱) امیر الامرا صمصام الدولہ: ذکر میر ص ۶۲

(۲) رعایت خاں: ص ۶۷ — (۳) نواب بہادر: ص ۸۱

(۴) مہا نرائن دیوان: ص ۷۲ — (۵) راجہ جگل کشور: ص ۷۵

(۶) راجہ ناگرمل : ص ۷۸ (۷) رائے بشن سنگھ : ص ۹۳

(۸) وجیہہ الدین خاں برادر حسام الدولہ : ص ۱۲۲

اس درمیان میں ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ دربان نے اندر جانے سے روکا ہے اور میرؔ شرمندہ و ناکام واپس آئے ہیں :-

تا آمدم در آمدم[1]

یا ناچار برگشتہ آمدم۔[2]

میرؔ نے درباداری بھی کی ہے :

ازاں روز بعد نماز عشا بطریق ملازماں درخانہ باغ ایشاں می رفتم وتا دو پہر شب می ماندم۔ گل ایں خدمت آں بود کہ بہ شگفتگیٔ خاطر اوقات می گزرانیدم

ص ۹۷

اور اپنی دل تنگی اور پریشان حالی کا ذکر کر کے دستِ سوال بھی دراز کیا ہے۔[3] لیکن میرؔ حرص و ہوا سے آزاد تھے۔ ان کے اندر خوئے گدایانہ نہیں تھی۔ وہ فطرتاً خوددار اور باحمیت واقع ہوئے تھے اور "دماغ وصفِ گل و یاسمن" نہیں رکھتے تھے انھوں نے اگر ہاتھ پھیلایا ہے تو بڑی مجبوری میں اور کسی کے سامنے اپنی غریبی کا دکھڑا رویا ہے تو یہ سمجھ کر کہ یہ "جانِ غیور" پر بڑا ستم ہو رہا ہے لیکن ایک غیر جانب دار وقائع نگار ان باتوں کو قطعی نظر انداز بھی نہیں کر سکتا کہ انھوں نے شکار نامے اور قصیدے بھی لکھے، ستائش گری اور مداحی بھی کی، "تلاشِ معاش میں صفتِ جام بھی بھرے اور با وصف اہلِ دہلی کی قدردانی اور اربابِ لکھنؤ کی سرپرستی کے (جو یقیناً ان کی توقعات سے بہت کم تھی)، وہ شکایتِ روزگار سے باز نہیں آئے :

---

[1] ذکر میر ص ۸۰، [2] ذکر میر ص ۹۷، [3] ذکر میر ص ۸۷، ۹۱۔

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے   ورنہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے   دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

دہلی میں عوام کی عقیدت کا یہ حال تھا کہ جدھر سے وہ گزرتے :

ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا

امیر اور رئیس ہی نہیں، بادشاہ اُن کی عزت کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کے حالات اور معیار کو دیکھتے ہوئے، میرؔ کی حالت بہت سے لوگوں کے مقابلہ پر غنیمت تھی۔ تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار میں لکھا ہے :

(میر) اولاً بشاہ جہاں آباد و فارغ البال می بود۔ نوبتے رو سوئے لکھنؤ نمود۔ اگرچہ بخرج ما یحتاج محتاج نہ بودہ، مگر روزی از خوانِ احسان نواب وزیری یافت وہم درآں جا بسیر ملک عدم شتافت [۱]

لیکن بقول آزاد خاندان خالی آدابوں سے تو نہیں پلتے۔ دلّی میں اس قدردانی کی ماہیت حقیقتاً کچھ بھی نہ تھی۔ روٹی صبح کو مل گئی تو شام کی خیر نہیں۔ شاعر تو شاعر، شاہی خاندان پر فاقے گزرتے تھے [۲]۔ سیرت فریدیہ میں لکھا ہے :

شاہزادوں کو جو قلعے کے نہ محلے میں رہتے تھے، ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا۔ وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں! بھوکے مرتے ہیں!! [۳]

اس پس منظر میں دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ میرؔ نے سنگِ گرانِ عشق کو کس پامردی سے اٹھایا اور ان نامساعد حالات میں کس طرح اپنی وضع داری پر آنچ نہیں آنے دی ؎

موئے سہتے سہتے جفا کاریاں   کوئی ہم سے سیکھے وفاداریاں

---

[۱] گلشن ہمیشہ بہار مصنفہ نصر اللہ خاں خورجوی (مطبوعہ فتح الاخبار کول ۱۲۷۸ھ) ص ۱۱۱

[۲] تاریخ عالم گیر ثانی (قلمی)، ص ۱۹۰ [۳] سیرت فریدیہ ص ۲۳، ۲۴۔

میر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ گئے۔ وہاں ان کی قدر کی گئی اور تین سو روپے ماہوار مقرر ہو گئے۔ آزاد کے اس بیان کی تردید کہ آخر عمر میں ان کی تنخواہ بند ہو گئی تھی، مرزا علی لطف کے تذکرے سے ہو جاتی ہے[1] ——— یہ اتنی بڑی تنخواہ ہے کہ غالب کو باوجود دعا گوئی اور مدح گستری کے دہلی اور رام پور سے میسر نہ آسکی۔ غالب کا ابتدائی زمانہ "شاہد و شمع و مے و قمار" میں گزرا تھا۔ میر درویش زادے تھے، فقر و فاقہ کی تعلیم ابتدا سے حاصل کی تھی، ان کے لئے یہ تین سو کم نہ تھے لیکن کچھ عجب نہیں کہ یہ تنخواہ وقت پر نہ ملتی ہو۔ اور "وقتِ قلمدان نیست"[2] اور "مردہ کی چھ ماہی"[3] کے لطیفے آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے یہاں بھی پیش آتے ہوں۔

مصحفی نے تنخواہ نہ ملنے کی شکایت کی ہے ؎

شاہا کہ وسیع ہے ترا دستِ سخا　　　گزرے کئی ماہ از رہ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دو شالہ مجھ کو　　　زنگت کے لئے ہے وہ کھٹائی میں پڑا

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں　　　تنخواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں
ہے لب پہ خوشامد اور غضب کے مارے　　　بیٹھے ہوئے جی میں گالیاں دیتے ہیں
ظاہر میں تو ہاں نعیم کے نوکر ہیں　　　باطن میں ولے کریم کے نوکر ہیں

میر لکھتے ہیں ؎

۱؎ گلشنِ ہند ص ۲۱۰　۲؎ ذکر میر ص ۶۳

۳؎ مرزا غالب ؎ میری تنخواہ جو مقرر ہے　　　اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک　　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات　　　اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

معرفت ان کی بعد صد خواری   فرد دستخط ہوئی جو یک باری
جیسے کھینچے لکیریں کوئی نقاش
اس لکھے کا نہیں ٹھکانا کچھ   وہم میں بھی نہیں ہے پانا کچھ

یا میر ؎

مدت مدید گزری مجھے کرتے انتظار
خجلت ہوئی جو حال لکھا میں نے بار بار

اس فرد دستخطی کو ہے یہ ماہ ہفتمیں
تنخواہ کا نہیں ہے ٹھکانا ابھی کہیں

برسوں ہوئے مہینوں کے وعدے ہوئے وعید
سچ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ان جھوٹوں سے بعید

بہرحال اسباب جو بھی ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ میر کو دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ مالی پریشانیوں سے سابقہ پڑا۔ ان کے کلام میں سوز و گداز جس عنوان سے موجود ہے اس میں صرف عشق کی ناکامی ہی کو نہیں، ان کی مالی حالت کو بھی بڑا دخل ہے۔ ان کی رمزی علامتیں تمام تر روایتی نہیں ہیں۔ بعض ان کے معاشی حالات کی بہترین ترجمان ہیں اور یہ اندرونی شہادت تذکروں کے بیانات سے بھی ہم آہنگ ہے۔

مرزا علی لطف نے لکھا ہے:

"میر سا شاعر جو کہ سحر کاریٔ سخن میں طلسم سازہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے[1]"

---

[1] گلشن ہند ص ۲۰۹

تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے:

وہیں جا (لکھنؤ) بصد حسرت جانکاہ جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدار یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد۔[۱]

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا میں لکھا ہے:

جب مرضِ موت سے میر صاحب بیمار رہوئے وصیت کی، میرے جنازہ کے اٹھانے میں تعجیل نہ کرنا۔ جو سنے گا میر نے انتقال کیا ہے۔ خواہ مخواہ نقد اور سامان معقول پہنچے گا۔ جب بموجب وصیت کے صبح سے شام ہوئی، کہیں سے کچھ نہ آیا آخر دفن کر دیا۔

لکھنؤ میں میر کی پریشانی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ دربار کی غیر معتدل شوخیوں[۲] کو گوارا نہ کر سکتے تھے۔ ان کو برداشت کرنے کے لئے ایک خاص قسم کے "دماغ" کی ضرورت تھی جس کی اُس میر سے توقع رکھنا عبث ہے جو علی متقی، میر ناصر عندلیب اور خواجہ میر درد کی صحبتوں کا لطف اٹھا چکا ہو۔ یہ تصادم دو مختلف تہذیبی اقدار کا تصادم تھا۔ لیکن یہاں بھی میر نے اپنی وضع کو نہیں چھوڑا۔ وہ اہلِ دول سے فائدہ اٹھانے اور ان سے اپنی شرطوں پر ملنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے لیکن ان کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔

میر میں دراصل ایک دنیوی زیرکی ہے جو زمانہ کے گرم و سرد کو چکھنے کے بعد آتی ہے۔ ایک ہوش مندی ہے جو مشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں، وہ گھر میں نہیں بیٹھے رہے انھوں نے دنیا کو نکل کر دیکھا تھا۔ ع کم پائی پر بھی سیر کیا میں نے سب جہاں

---

[۱] تذکرہ بہارِ بے خزاں [۲] سرکار نے آصف الدولہ کے زمانہ کی تہذیب کو
Bastard Sprout of Anglo-Muslim Culture
لکھا ہے: زوال سلطنت مغلیہ سرکار: ج ۴ -

اسی لئے ان کی مدحیات میں زندگی کا ارادہ بھی ہے۔ اور بندگی کا جذبہ بھی۔ وہ زندگی کے ہنگاموں میں شریک ہی نہیں ہوئے بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کا ارمان بھی رکھتے ہیں:

موسم ابر ہو، سبو بھی ہو گل ہو، گلشن ہو اور تو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پہ میر ہو تو اُس کی ہی آرزو بھی ہو

کم ہے کیا لذت ہم آغوشی سب مزے، میرؔ، در کنار رہے

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔ ان کی سطح کے نیچے آرزوؤں کا کیسا شور ہے:

آرزوئیں ہزار رکھتے ہیں تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں

چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہم صفیروں کا

جو شخص خوں گشتہ تمناؤں کا مظہر ہو اور جو ان حالات اور واقعات کے سایہ میں پلا اور بڑھا ہو اس کا نازک مزاج نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔ اس اندرونی پیکار نے جو ان کے خارج اور باطن میں مسلسل جاری تھی، ان کے کمال فن کے احساس کو بہت تیز کر دیا تھا۔ ان کی طرفِ کلاہ کا ذکر اکثر تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ بعض محرومیوں نے اِس احساس کو اور بھڑکایا اور یہ انفرادیت کی لے اتنی بڑھ گئی کہ وہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے تھے:

نہ رکھو کان نظم شاعرانِ حال پر اتنے چلو ٹک میرؔ کو سننے کہ موتی سے پروتا ہے

اس فن میں کوئی بے تہہ کیا ہو مرا معارض　　اول تو میں سند ہوں پھر یہ مری زباں ہے

میر دریا ہے، سُنے شعر زبانی اس کی　　اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی
ایک ہی عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج　　اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

ذاتی رنجش اور غرور ونخوت کی وجہ سے میر نے اپنی سوانح عمری میں خان آرزو کو اپنا استاد بھی تسلیم نہیں کیا۔ حالاں کہ اس معاملہ میں ان کی کریم النفسی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ انھوں نے سعادت امروہوی اور میر جعفر عظیم آبادی سے لے کر تمام "یاران شہر" کے احسانات کا اعتراف کیا ہے۔

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے:

شیخ محمد یار خاکسار یہ ایک درویش قلندر تھا۔ قدم شریف دہلی میں خدمت کیا کرتا تھا۔ شعرا متقدمین میں سے شمار کیا گیا ہے یعنی سودا و میر حسن سے پیشتر تھا۔ میر تقی لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا، خاکسار اس کو اصلاح دیا کرتا تھا لیکن میر اپنے تذکرہ میں یہ ذکر نہیں کرتا بلکہ وہ خاکسار کو بسبب غرور اور سرکشی کے ملزم کرتا ہے۔ خاکسار چونکہ ملقب بلقب "شاہ الشعرا" تھا، اس دعوی کو میر نہیں مانتا[1]

لیکن نکات الشعرا میں خاکسار کی "سفلگی" کا ذکر ہے اور خود نوشت میں آرزو کی "خصمی وحلاجی" کا!

دلی میں میر کے کمالات کا اعتراف ہر چہار طرف ہوا۔ خود فرماتے ہیں:

یہ میر ستم کشتہ کسو وقت جواں تھا　　انداز سخن کا سبب شور وفغاں تھا
جادو کی پڑی پرچۂ ابیات تھا اس کا　　منھ تکیے غزل پڑھتے عجب سحر بیاں تھا

---

[1] تذکرہ کریم الدین ص ۸۹۔

جس راہ سے وہ دل زدہ دلّی میں نکلتا   ساتھ اس کے قیامت کا سا ہنگامہ رواں تھا
افسردہ نہ تھا ایسا کہ جوں آب زدہ خاک   آندھی تھا، بلا تھا، کوئی آشوب جہاں تھا

دلّی ہی کے لوگ ان کے ریختہ سے جیب چاک نہیں تھے، بلکہ دکن بھی دیوانہ ہو رہا تھا:

ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

اس شہرت کے ساتھ ساتھ میر کا غرور بھی بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اژدر اور معاصرین کو حقیر کیڑوں کی طرح ہیچ دپوچ سمجھنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں تو انھیں مستقل شکایت رہی کہ

جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا   خریدار لیکن نہ پایا گیا

اصل یہ ہے کہ میر کی سیرت اور کلام میں بہت سے تناقضات ملتے ہیں۔ اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں۔ ایک کی غیرت، حمیت، شرافت، کشادہ قلبی، اور پاک مشربی کی انتہا نہیں۔ دوسرا بے دماغ اور مغرور ہے۔ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی وہ رئیسوں اور امیروں سے بھی ملتا ہے۔ دلّی کے کج کلاہ لڑکوں سے بھی دل بہلاتا ہے۔ مدح بھی لکھتا ہے اور ہجو بھی۔ وہ ذاتی عناد کی بنا پر حقائق پر پردہ ڈال سکتا ہے اور احسانات سے قطع نظر کر سکتا ہے۔

ایسے ہی شاعری میں بھی دو میر ہیں۔ ایک کے کلام میں تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہے، جو شعر ہے وہ انتخاب اور دنیائے شاعری میں لاجواب۔ دوسرے کا کلام رعایات سے مملو ہے۔ اس میں سوقیت اور ابتذال ہے اسی لئے ان کے یہاں پست و بلند دونوں ہیں لیکن بے پست و بلند کے شعر اعجاز نہیں بن سکتا۔ اس سلسلہ میں آزردہ کا فیصلہ سب سے زیادہ متوازن اور منصفانہ ہے:

پستش اگرچہ اندک پست است امّا بلندش بسیار بلند[1]

جو حصّہ بسیار بلند کا ہے وہ میر کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔

---

[1] گلشن بے خار (شیفتہ) ص ۱۰۰ ترجمہ سودا۔

حِصّہ دوم : تصانیفِ نظم

باب سوم: شاعری

میر کا نظریۂ شاعری

میر نے اپنے نظریۂ شاعری کا ذکر نکات الشعرا میں کیا ہے :۔

بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم است۔ ازاں جملہ آنچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید اول آں کہ یک مصرعہ اش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ حضرت امیر علیہ الرحمۃ نوشتہ شد، دوم آں کہ نصف مصرعہ اش ہندی و نصف فارسی۔ چنانچہ شعر میر معز کہ نوشتہ آمد۔ سوم آں کہ حرف و فعل فارسی بکار می برند و ایں قبیح است چہارم آں کہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد، آں جائز است و ایں را غیر شاعر می داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد و پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بسہ شود، معنیٔ ایہام ایں است کہ لفظے کہ بر و بنائے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد۔ یکے قریب و یکے بعید، و بعید منظور شاعر باشد،

وقریب متروک او۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہاست تجنیس۔ ترصیع۔ تشبیہہ۔ صفائے گفتگو۔ فصاحت۔ بلاغت۔ ادا بندی۔ خیال وغیرہ این ہمہ ہا در ضمن ہمیں است۔ و فقیر ہم از ہمیں وتیرہ محظوظم۔ ہر کہ را دریں فن طرز خاص است ایں معنی را می فہمد۔ با عوام کار ندارم ایں کہ نوشتہ ام برائے یاراں فن سنداست نہ برائے ہر کس۔ زیرا کہ عرصۂ سخن وسیع است و از تلوّن چمنستاں ظہور آگہم۔ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است[1]

میر کے انداز میں اگر غور سے دیکھا جائے تو تجنیس، ترصیع، تشبیہہ، صفائے گفتگو۔ فصاحت بلاغت۔ ادا بندی۔ یہ تمام خصوصیات پورے طور پر موجود ہیں۔ وہ شاعری کو "فن شریف" سمجھتے تھے اور اس کے لیے علمی قابلیت[2] اور سلیقۂ شاعرانہ[3] کو ضروری خیال کرتے تھے۔ انھوں نے معنی یابی، تہ داری[4] اور تلاشِ لفظِ تازہ[5] کو بھی اچھے شعر کی شرط قرار دیا ہے۔ وہ فارسی کی اندھی تقلید کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور صرف ان ترکیبوں کو ریختہ میں رائج کرنا چاہتے تھے جو نامانوس نہ ہوں اور گفتگو میں کھپ جائیں[6]۔ وہ زبان آسان اور سلیس ضرور استعمال کرنا چاہتے تھے لیکن اس میں ابتذال گوارا نہ تھا۔ ع

شعر میرے ہیں سب خواص پسند   پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

نکات الشعرا میں قدر پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

زباں او بزباں لوطیاں می ماند[7]

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۷۹، ۱۸۰ [2] مثنوی تنبیہہ الجہال [3] نکات الشعرا ص ۱۸۷
[4] نکات الشعرا ص ۶۲ [5] نکات الشعرا ص ۱۶۔
[6] نکات الشعرا ص ۱۸۷ [7] نکات الشعرا ص ۱۵۷۔

زبان کے معاملہ میں میرؔ کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی۔ وہ کھرے کھوٹے کو پہچانتے تھے لیکن اپنا رشتہ عوام سے منقطع نہ کرتے تھے۔ ان کا ایک لطیفہ مشہور ہے کہ "لکھنؤ کے چند عمائد و اراکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات کریں اور اشعار سنیں۔ دروازہ پر آکر آواز دی۔ لونڈی یا ماما نکلی۔ حال پوچھ کر اندر گئی۔ ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھایا۔ انھیں بٹھایا اور ایک پرانا ساحقہ تازہ کرکے سامنے رکھ گئی۔ میر صاحب اندر سے تشریف لائے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انھوں نے فرمائش اشعار کی۔ میر صاحب نے اول کچھ ٹالا۔ پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ اگرچہ ناگوار ہوا مگر بہ نظر آداب و اخلاق انھوں نے اپنی نارسائی طبع کا اقرار کیا اور پھر درخواست کی انھوں نے پھر انکار کیا۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! انوری وخاقانی کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔ میر صاحب نے کہا کہ درست ہے مگر ان کی شرحیں، مصطلحات، اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لئے فقط محاورۂ اہلِ اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس سے آپ محروم۔ یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا ؎

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا
دل کا جانا ٹھیر گیا ہے، صبح گیا یا شام گیا

اور کہا آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ی کو ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ ی تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔"[1]

میر نے اس "محاورہ" کا ہر جگہ خیال رکھا ہے۔ ان کی زبان کھڑی بولی کی نِکھری شکل ہے۔ اس میں ہندوستانی عناصر ہیں۔ اس کا تعلق عوام سے بہت گہرا ہے لیکن اسے

---

[1] آب حیات ص ۲۱۹۔

خوش مذاقی اور سلیقہ کی چھلنی میں چھانا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کسی ایسے لفظ کی آمیزش نہیں جو غیر فصیح ہو۔ یا غزل کے لئے گراں بار ہو۔ میر جس چیز کو سلیقہ اور مذاق کہتے ہیں اس میں لسانیات اور فصاحت کے اصولوں کی واقفیت شامل ہے۔ ان کا نظریۂ فن بے روح اور سخت گیر نہیں ہے اس میں زبان کی فطری صلاحیتوں کا احترام شامل ہے:

حسن تو ہے ہی کر و لطف زباں بھی پیدا
میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر   دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

میر مضمون کی تلاش، چشم بینا اور دل بیدار کی مدد سے کرتے ہیں لیکن جب وہ مل جاتا ہے تو اسے بڑی صفائی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں:

سخن مشال گہر بر کشیدہ آساں گفت

وہ جذبات کی نقل نہیں اتارتے بلکہ اندرونی تپش، سوز و گداز، اعلیٰ ترین تصوریت اور سخت ترین محنت سے شعر کو زمیں سے آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ وہ صناعت کے قائل ہیں ؎

صناع طرفہ ہیں ہم عالم میں ریختہ کے
جو میر جی لگے گا تو سب ہنر کریں گے

طرفہ صناع ہیں اے میر یہ موزوں طبعاں
بات جاتی ہے بگڑ بھی تو بنا دیتے ہیں

میر صناع ہے ملو اس سے   دیکھو باتیں تو کیا بناتا ہے

میر نے ابہام اور تنافر سے بچنے کی کوشش کی ہے اور اس کا اہتمام کیا ہے کہ شعر میں کوئی نادر بات یا "رمز" ضرور ہو۔ ان کے اشعار "بے شورش و کیفیت و معنی" نہیں ہیں ان میں ایک "ادا" ہے، موتی کی سی "صفائی" ہے اور زلف کا سا "پیچ" ہے۔

میر کا ایمان ہے کہ اس قسم کے اشعار بغیر تجربہ اور مشاہدہ کی مدد کے نہیں کہے جا سکتے۔

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

جب زمزمہ کرتی ہے صدا چبھتی ہے دل میں　　بلبل سے کوئی سیکھ لے اندازِ سخن کا

دفتر لکھے ہیں میر نے دل کے الم کے یہ　　یہاں اپنے طور و طرز میں وہ فرد ہو گیا

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہی عمر کو　　اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

میر کی غزلیں "گل و بلبل" کے افسانہ[1] تک محدود نہیں ہیں بلکہ روح عصر کی ترجمان ہیں صنفِ غزل میں اظہار و ابلاغ کی جو بنیادی دقتیں پوشیدہ ہیں۔ ان کے باوجود میر کی نظر ضمیرِ وجود تک پہنچ گئی ہے اور انھوں نے "دل و دلی" کے مرثیے اس طرح لکھے ہیں کہ ان کے الفاظ و علامات کسی شے یا تصور کی نشانی نہیں معلوم ہوتے بلکہ کسی داستان یا پس منظر کا ٹکڑا معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار قلب کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں اور ان کی شور انگیزی میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔

ہر ورق ہر صفحہ میں اک شعر شور انگیز ہے　　عرصۂ محشر کا عرصہ ہے مرے دیوان کا

غزلیاتِ میر

تغزل کے میدان میں میر کی ہمسری کا دعویٰ آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ انھوں نے جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے اس کی مثال دنیائے اردو میں نہیں ملتی۔ میر کی فتادگی و دل سوزی، خستگی و بر شتگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی اور ان کے کلام کو سوز و گداز کا آتشکدہ

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۱۵۔

بنا دیا۔ وہ خود فرماتے ہیں:

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیواں کیا

کہیئے گا اس سے قصۂ مجنوں
یعنی پردے میں غم سنا بیئے گا

"تکلیف درد دل کی عبث ہم نشیں نے لی
درد سخن نے میرے سبھوں کو رلا دیا

میرؔ کو یقین ہے کہ:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسی کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

ان کا ہر آنسو ایک شعر ہے اور ہر مصرع ایک خون کی بوند۔ ان کا دل مضغۂ گوشت نہیں، سوزِ عشق کا آتش کدہ ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں "استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں"۔

میرؔ نے قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی کی ہے۔ وہ اپنی نفسیاتی افتاد کے ماتحت ایسے تجربات کا اعادہ کرتے ہیں جس میں غم و اندوہ کا عنصر غالب ہے۔ میرؔ کے تجربات ذاتی مصائب کے پیدا کردہ بھی تھے اور اجتماعی ناسازگار حالات کا نتیجہ بھی۔ یہ چبھن اور جلن ان کے یہاں آپ بیتی ہی کی نہیں، جگ بیتی کی بھی ہے۔ اسی لئے ان کی محرومیاں بڑی درد انگیز ہیں:

دل نہ پہنچا گوشہ داماں تلک　　قطرۂ خوں تھا، مژہ پر جم رہا

ہجران یار ایک مصیبت ہے ہم نشیں　　مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے

کوئی نہیں جہاں میں جو اندوہگیں نہیں　　اس غم کدہ میں آہ دلِ خوش کہیں نہیں

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم　　اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں　　ہوں غنچۂ افسردہ کہ مردودِ صبا ہوں

یہاں ان کا ایک فارسی شعر بھی توجہ کے قابل ہے:

حیف در شورہ زارِ عالم میر　　سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

غمِ عشق اور غمِ روزگار نے میر کی ہستی کو مٹا دیا لیکن یہ ہی خاکستر، سمندر کی طرح، ان کی شاعرانہ زندگی کا "سامانِ وجود" ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو دل کی آگ میں تپایا ہے اور مٹ کر ایک نئی زندگی حاصل کی ہے۔ جو آدمی اپنی روح کو کھوتا ہے، وہی اُسے پا بھی سکتا ہے۔ میر نے اپنے غم انگیز وجدان سے ایک الگ دنیا تعمیر کی ہے جو اپنی عظمت اور رنگ روپ کے اعتبار سے بالکل نئی اور انوکھی ہے۔

میر کے کمالات کی اصلی جولان گاہ غزل ہے جو ایک داخلی صنفِ سخن ہے۔ اس کی ٹکنیک بہت سادہ ہے۔ پوری بات صرف دو مصرعوں میں کہنا ہوتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں شرح و تفصیل کی گنجائش نہیں۔ یہ کمی ایمائیت سے پوری کی جاتی ہے۔ یہ رمزی علامتیں جس سلیقہ اور سچائی کے ساتھ برتی جائیں گی اتنی ہی غزل میں وسعت، اثر، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوگی۔ غزل کی خارجی قبا مقرر ہے

لیکن اس کی داخلی ٹکنیک ترقی وتنزل کی منزلوں سے گزرتی رہی ہی۔ اسی لیئے میرنے بھی غزل کی روح اور اس کی معنویت کو متاثر کیا ہی۔ ان سے غزل کی عاشقانہ روایت ہی کا آغاز نہیں ہوتا بلکہ انھوں نے اپنے وجدان کے عمل سے خارجی ٹکنیک کو بھی داخلی بنادیا ہی۔ غزل میں عکسِ مے سے شیشہ کا گلابی ہوجانا معمولی سعادت نہیں ہی۔ میر کے یہاں غزل کا اشاراتی انداز، اس کا اختصار، اس کی نغمگی، اس کی مرکزیت۔ یہ تمام خوبیاں اس حسن تناسب کے ساتھ موجود ہیں کہ ذہن، الفاظ ومعانی کی دوئی کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔

میر نے دراصل اپنے ہی تجربات کے نغمے گائے ہیں۔ اور اپنی ہی کیفیات وواردات کو لباسِ شعر میں پیش کیا ہی ؎

اک آفت زماں ہی یہ میرِ عشق پیشہ   پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہی

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا   سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

میرے قصے سے سب کی گئیں نیندیں   کچھ عجب طور کی کہانی تھی

سرگزشت اپنی کس اندوہ سے شب کہتا تھا   سو گئے تم نہ سنی آہ کہانی اس کی

میر بچپن ہی میں باپ اور چچا کے سایہ سے محروم ہوگئے تھے۔ اوران پر کم عمری ہی میں ذمہ داریوں کا بوجھ آپڑا تھا۔ آخروہ اکبرآباد چھوڑنے پر مجبور ہوئے لیکن اس طرح کہ

ہر گام گلہ لب پہ یارانِ وطن کا تھا

مثنوی میں فرماتے ہیں:

بندھا اس طرح آہ بارِ سفر ۔۔۔ کہ نے زاد رہ کچھ نہ یارِ سفر
دل اک بار سو بے قرار بتاں ۔۔۔ غبارِ سرِ رہگذارِ بتاں
چلا اکبر آباد سے جس گھڑی ۔۔۔ در و بام پر چشم حسرت پڑی

اس کے علاوہ سوتیلے بھائی اور خانِ آرزو سے تعلقات کشیدہ رہے اور عزیز پری تمثال کے عشق میں ناکامی ہوئی۔ جس کی وجہ سے ان کی حالت بالکل دیوانوں کی سی ہوگئی اور انھیں چاند میں ایک صورت، چاند سے زیادہ حسین نظر آنے لگی:

سراپا میں جس جا نظر کیجئے ۔۔۔ وہیں عمر اپنی بسر کیجئے

یقیناً یہ "چہرۂ مہتابی" اسی "عزیز پری تمثال" کی مانند ہوگا جس کے عشق میں وہ "غبارِ ناتواں" کی طرح "کُو بکو" پھرتے رہے۔ میر اچھے تو ہو گئے لیکن اس زنجیر پائی کی یاد ان کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ اور خرد کو کبھی انہوں نے جنوں پر ترجیح نہیں دی ؎

خردمندی ہوئی زنجیر ورنہ ۔۔۔ گزرتی خوب تھی دیوانہ پن میں

اس کے بعد ان کی زندگی کا رنگ و آہنگ کچھ اس طرح کا رہا:

عمر بھر ہم رہے شرابی سے ۔۔۔ دل پُر خوں کی اک گلابی سے

یہ مدہوشی دراصل، غمِ زیست کی مدہوشی ہے!

دلّی میں میر کے محسنین کی فہرست کافی طویل ہے لیکن ان کو اپنی پراگندہ مزاجی اور اس وقت کی سیاسی بے اطمینانی کی وجہ سے آسائشِ خاطر میسر نہ آسکی۔ اور وہ "نان و نمک" کی خاطر اکثر پریشان ہی رہے لیکن یہ مشکلیں صرف معاشی نہیں تھیں۔ بلکہ اپنی وضع کو نبھانے کی بھی تھیں۔ دلّی کی مفارقت اور لکھنؤ کا عیش پرستانہ

ماحول ان کے لئے قیامت تھا۔ اس لئے وہاں بھی وہ خوش نہیں رہے۔ ؎

جانِ غیور پر ہے ستم سا ستم کہ میرؔ   بگڑا جنھوں سے چاہیئے ان سے بنائیے

لکھنؤ کے متعلق فرماتے ہیں۔ ؎

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا   وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یہاں

اس داستانِ محرومی و محزونی سے صاف ظاہر ہے کہ میرؔ نے شاعری نہیں کی بلکہ

ع   دفتر لکھے ہیں دل کے الم کے یہ

ان کے سوز و گداز کا چشمہ خود ان کی الم ناک زندگی اور اس وقت کے پُرآشوب حالات میں موجود ہے:

کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہی عمر کو   اب آخر آخر آن کے یہ ریختہ کہا

کیا کروں شرح خستہ جانی کی   میں نے مر مر کے زندگانی کی

یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار   پر کیا کروں میں دیدۂ بے اختیار کو

آسائش و راحت سے جو پوچھے کوئی تو کیا کہوں

میں عمر بھر کھینچا کیا رنج و غم و آلام کو

میرؔ کی شاعری پر غور کرتے وقت ان کے خاندانی ماحول کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔ ان کو اپنے "چچا" اور باپ سے جو تعلیم ملی تھی وہ اس قسم کی کہ:

اے پسر عشق بورز عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است اگر عشق نمی بود نظم کل صورت نمی بست۔ بے عشق زندگانی وبال است۔ دل باختۂ عشق بودن کمال است، عشق بسازد عشق بسوزد۔

داخلیت

اس آب و ہوا نے میر کے دل میں گداختگی پیدا کر دی اور ان کو عشق ورزی کا اہل بنا دیا۔ عزیزہ پری تمثال سے عشق کی داستان تاریخی اعتبار سے صحیح ہو یا غلط (اگرچہ اندرونی شہادتیں اس کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہیں)، لیکن عشق اگر جذباتی اسلوب کا نام ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کے یہاں اس کے رجحانات نہایت قوی ہیں۔ ان کے یہاں جو سوز و گداز ہے وہ محض تخیلی اور جمالیاتی اثر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح انہوں نے عشق کی جن پوشیدہ اداؤں کا ذکر کیا ہے وہ بھی بغیر اس آگ کو گلزار بنائے ہوئے ممکن نہیں۔

اس بے سہارے نوجوان نے جب محبت کی، تو روح کی پوری قوت اور شدت کے ساتھ ——— میر کے مقطعے اس کے گواہ ہیں اور اسی وجہ سے ان سے مصوری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ عشق کی نازک اور عمیق کیفیات کی ایسی صحیح اور دلآویز تصویر کشی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ ابتدا سے انتہا تک عشق کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس کا نقشہ میر نے اپنے باریک مو قلم سے نہ کھینچا ہو۔ ان مقطعوں کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں عشق کا بہت ہموار اور باقاعدہ "ارتقا" ہوا ہے:-

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

کہتا تھا کسو سے کچھ، تکتا تھا کسو کا منھ — کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم — ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

سمجھے تھے ہم تو میر کو عاشق اسی گھڑی — جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

چلانہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میر ابھی تو اس گلی سے پکار لایا ہوں

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ بدن نزار
تیرا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا

گیا کوچے سے تیرے اُٹھ کے میر آشفتہ سر شاید پڑا دیکھا تھا میں نے رہ میں اس کے سنگ بالیں کو
کچھ زرد زرد چہرہ کچھ لاغری بدن میں کیا عشق میں ہوا ہے اے میر حال تیرا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم یہ سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

میر نے عشق کی علامات کو نہایت صاف اور دل نشین انداز میں بیان کیا ہے ؎

گہ آپ میں نہیں ہو، گہ منتظر کہیں ہو
کچھ میر جی تمہارا ان روزوں حال کیا ہے

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے اک آگ سی رہے ہے کیا جانیے کہ کیا ہے

گر عشق نہیں ہے تو یہ کیا ہے بھلا مجھ کو جی خود بخود اے ہمدم کاہے کو کھپا جاتا

کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اس بن　　شوق نے ہم کو بے حواس کیا

اب تو دل کو نہ تاب ہے نہ قرار　　یادِ ایام جب تحمّل تھا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　نادان! پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

پھرتے ہو میرؔ صاحب سب سے جدے جدے تم　　شاید کہیں تمھارا دل ان دنوں لگا ہے

کس سے جدا ہوئے ہیں کہ ایسے ہیں دردمند　　منھ میرؔ جی کا آج نہایت ہی زرد ہے

میرؔ جی رازِ عشق ہوگا فاش　　چشم ہر لحظہ مت پُرآب کرو

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میرؔ سے　　پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخِ زرد پر مرے　　کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

بے طاقتی سکوں نہیں رکھتی ہے ہم نشیں　　رونے نے ہر گھڑی کے مجھے تو ڈبو دیا

کیا میرؔ ہے یہی جو ترے در پہ تھا کھڑا　　نم ناک چشم و خشک لب و رنگ زرد سا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

دل جو نہ تھا تو رات ز خود رفتگی میں میرؔ　　گہ انتظار و گاہ مجھے اضطراب تھا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر　　تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوگا کہ میر کا عشق ان کی زندگی کی روایت نہیں، صداقت ہے:

لائے تھے جا کر ابھی تو اُس گلی میں سے پکار
چپکے چپکے میر جی پھر اٹھ کے تم کیدھر چلے

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب　　سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

کیا اضطراب عشق سے ہیں حرف زن ہوں میرؔ
منھ تک جگر تو آنے لگا گفتگو کے ساتھ

آتا ہی میرے کوچہ میں ہوتا جو میرؔ یہاں
کیا جانیے کدھر کو گیا، کچھ خبر نہیں

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں　　حالت اب اضطراب کی سی ہے

آسودگی تو معلوم ہے اے میرؔ جیتے جی یہاں
آرام تب ہی پاؤں جب جی سے ہاتھ اٹھاؤں

چلا نہ اُٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ
ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں

میرؔ کی غزلوں کے پڑھنے سے ان کے عشق کی ساری داستان سامنے آجاتی ہے۔ ان کی محبت کی نشو و نما بڑی باقاعدگی اور ہمواری کے ساتھ ہوئی ہے ان کے یہاں دل لگی بھی ہے۔ اور دل کی لگی بھی۔ نظر بازی بھی اور دیوانگی بھی۔ انہوں نے عشق کی پوری وادی کو چھانا ہے۔ اس کے ایک ایک گوشہ کو دیکھا ہے۔ اس کے چرکے سہے ہیں، مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ دل کی ایک ایک دھڑکن، اور نبض کی ایک ایک حرکت ان کے اشعار میں سنائی دیتی ہے:

جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے   خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

عاشق ہیں ہم تو میرؔ کے بھی ضبط عشق کے   دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے
ایک آدھ حرف پیار کا منہ سے نکل گیا

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں   پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

احوال میرؔ جی کا مطلق گیا نہ سمجھا   کچھ زیر لب کہا بھی سو دیر دیر رد کر

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

جوں توں کر حالِ دل اک بار تو میں عرض کیا
میر صاحب جی بس اب بار دگر مت پوچھو

رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

نالۂ میر نہیں رات سے سنتے ہم لوگ
کیا ترے کوچہ سے اے شوق وہ رنجور گیا

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میر
آئی جو بات لب پہ سو فریاد ہو گئی

کیوں کر نہ مر رہے جو بے تاب میر سا ہو اک آدھ دن تو گھر سے دل تھام تھام نکلا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

میر نے اپنی درماندگیٔ عشق اور ناکامیٔ محبت کو عجیب عجیب پیرایہ میں بیان کیا ہے

کام تھے عشق میں بہت پر میر ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

کوئی جی سے نہ جائے گا اے میر حیف یہ ہے کہ تو جوان گیا

پوشیدہ راز عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہوں دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
آہ کس طرح روئیے کم کم شوق حد سے زیاد ہے ہم کو

میر سوز دروں سے ہمیشہ چراغ کی مانند جلتے رہے۔ ان کا جنونِ محبت رسمی یا برائے شعر گفتن نہیں تھا۔ اس قسم کے اشعار بغیر تجربہ کی مدد کے کہنا مشکل ہیں:

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی دھوم ہے پھر بہار آنے کی

دل تڑپے ہے، جاں کھپے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

پتھر کی چھاتی چاہیئے ہی میر عشق میں | جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے
عاشقی ہر کیسی، ایسے جیوگے کب تک | ترک وفا کرو ہو مرنے کے میر ڈر سے

یہ بے خودی بھی ملاحظہ ہو :-

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو | دیر سے انتظار ہے اپنا

اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ عاشق کی یہ حالت چشم اشک بار کی وجہ سے ہوئی ہے یا دل آشفتہ حال کی وجہ سے :-

کہتا ہے دل کہ آنکھ نے مجھ کو کیا خراب | کہتی ہے آنکھ یہ کہ مجھے دل نے کھو دیا
لگتا نہیں پتا کہ صحیح کون سی ہے بات | دونوں نے مل کے میر ہمیں تو ڈبو دیا

خارجیت مختصر یہ ہے کہ میر نے عشق کی جملہ کیفیات و واردات کی ترجمانی کی ہے اور اتنی صحت و صداقت کے ساتھ کہ دوسری جگہ اس کی مثال نہیں مل سکتی لیکن میر کا تخیل اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ اس نے خارجی شاعری کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا تھا، معشوق کی دل ربا اداؤں کا ذکر اس نے جس متنوع طریقہ سے کیا ہے اس کی مدد سے ایک چابک دست مصور چاہے تو سحر کاری کر سکتا ہے :-

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں عار نہیں

ناز و انداز و ادا، عشوہ و اغماض و حیا
آب و گل میں تری سب کچھ ہی مگر پیار نہیں

جاگے تھے ہمارے بخت خفتہ | پہنچا تھا بہم وہ اپنے گھر رات
تھی صبح جو منھ کو کھول دیتا | ہر چند کہ تب تھی اک پہر رات
پر زلفوں میں منھ چھپا کے بولا | اب ہووے گی میر کس قدر رات

ظلم ہے قہر ہے، قیامت ہے   غصّے میں اس کے زیر لب کی بات

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں   پھر پوچھتے ہو ہنس کر مجھ بے نوا کی خواہش

خارجیت جب غزل میں برتی جاتی ہے تو بالعموم شاعر محبوب کے خط وخال زلف وعارض کے بیان میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کو داخلی زندگی کے احوال پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لیکن میر کی خارجیت شعرائے لکھنؤ سے مختلف ہے۔ اس کے یہاں اندرونی تجربہ کی جھلک ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس داخلی خارجیت کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

ایک نگہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں

اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

کیا چال یہ نکالی ہو کر جواں تم نے   اب جب چلو ہو دل کو ٹھوکر لگا کرے ہے

میر کے یہاں نہ ایسی "دروں بینی" ہے کہ "غیر خود" کا وجود ہی نہ رہے اور نہ ایسی خارجیت کہ جس کی وجہ سے اپنی ذات کے اندرونی تجربوں اور تاثرات کی دنیا، بالکل بے رنگ و بو ہو جائے۔

کھلا جو نشے میں پگڑی کا پیچ اس کے میر

سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا و لے   دل سے گئیں نہ باتیں تری پیاری پیاریاں

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں   جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

میرؔ کی خارجیت دبی ہوئی اور نکھری ہوئی ہے۔ محبوب کے سراپا کے ذکر میں کہیں نفاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے:

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

ہے تصنّع کہ لعل ہیں وے لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کریے
تو تو نہ بول ظالم بُو آتی ہے دہاں سے

لب ترے لعل ناب ہیں دونوں
پر تمامی عتاب ہیں دونوں
ہے تکلف نقاب، وے رخسار
کیا چھپیں آفتاب ہیں دونوں

رخسار اس کے ہائے رے، جب دیکھتے ہیں ہم
آتا ہے جی میں آنکھوں کو ان میں گڑو دیئے

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

قیامت ہیں یہ چسپاں جامے والے
گلوں نے جن کی خاطر خرقے ڈالے

شوقِ قامت میں ترے اے نونہال
گل کی شاخیں لیتی ہیں انگڑائیاں

لگ نکلی ہے کسو کی مگر بکھری زلف سے
آنے میں بادِ صبح کو یاں اک دماغ ہے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گل برگ — ٹک ہونٹھ ہلا تو بھی کہ ایک بات ٹھہر جائے

پڑتی ہے آنکھ ہر دم، جا کر صفائے تن پر — سو جی گئے تھے قرباں، اس شوخ کے بدن پر
نام خدا، نکالے کیا پاؤں رفتہ رفتہ — تلواریں چلتیاں ہیں اس کے تو اب چلن پر

ہر بات پر خشونت، طرزِ جفا تو دیکھو — ہر لمحہ بے ادائی اس کی ادا تو دیکھو
گل برگ سے ہے نازک خوبیٔ پا تو دیکھو — کیا ہے چمک کنک کی، رنگ حنا تو دیکھو
سایہ میں ہر پلک کے خوابیدہ ہے قیامت — اس فتنہ زماں کو کوئی جگا تو دیکھو

تناسب پہ اعضا کے اتنا تبختر — بگاڑا تجھے، خوب صورت بنا کر
سرو و شمشاد خاک میں مل گئے — تو نے گلشن میں کیوں خرام کیا

ہر نقشِ پا ہے شوخ ترا رشکِ یاسمن — کم گوشۂ چمن سے ترا رہ گزر نہیں

تصوّرِ حسن و عشق

میر کے محبوب میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو ایک مثالی پیکر میں ہونا چاہئیں۔ اس کے خط و خال اور انداز و اطوار میں جو دلکشی ہے اس کا مشاہدہ، صحیح اور غائر جمالیاتی نظر ہی سے ہوسکتا ہے۔

پھول گل شمس و قمر سارے ہی تھے
پر ہمیں ان میں تمہیں بھائے بہت

لیکن میرؔ، موے و میان اور کرشمہ و خرام سے گزر کر حسن کو اپنے وسیع معنوں میں بھی دیکھ سکتے ہیں:

گل ہو، مہتاب ہو، آئینہ ہو، خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہو

میرؔ نے اپنی معجز بیانی سے رُخ محبت اور روحِ حسن کے چہرہ سے نقاب سرکا دی ہے۔ اور چشمِ سخن سے حسن و عشق کی اُن پر اسرار حقیقتوں اور قوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کے دم سے حیات اور کائنات میں اُجالا ہے۔ عشقیہ شاعری بڑی اسی وقت ہو سکتی ہے اور اس میں یہ دوررسی اور ہمہ گیری اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب من جملہ اور لوازمات کے، اُس کے عشق کا معیار بلند ہو، اور اس کے محبوب کا تعلق "جنس کم ارز" سے نہ ہو۔ میرؔ نے سماج کی ایک شریف زادی سے محبت کی تھی اور اُس کو پانے کے لئے بہت کچھ کھویا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سیاستِ درباں اور رشکِ غیر کا ذکر دوسرے شاعروں کی نسبت بہت کم ہے۔ اور محبوب سے ہم آہنگی اور نزدیکی کا احساس زیادہ ہے۔

میرؔ کی محبت خنک روحانیت یا مرطوب ماورائیت کا نام نہیں ہے۔ اس میں تپش اور گرمی ہے۔ انھوں نے اپنی تصویروں میں جن قدروں کو ابھارا ہے وہ وہی ہیں جو شریف، متوسط گھرانوں میں پائی جاتی ہیں۔ اُن میں تمنا کا اظہار، سرشار تجربوں کا نکھار، چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے۔ ایک دل ربا اصلیت ہے، ایک کارآگہی ہے جو تجربات کی وادی میں سینہ کے بل چلنے سے آتی ہے۔ ان کی محبت اصلی اور حقیقی ہے۔ ان کا عشق مادی تقاضوں کا محرم ہے۔ اس میں جنس کی مہک ہے، لیکن بڑی بھینی بھینی، بڑی جان پرور، ان کے تہذیبی عوامل نے کثافتوں کو

چھانٹ دیا ہے اور اس جنسی محبت کو حد درجہ لطیف اور رنگین بنا دیا ہے۔ اس میں جو سچائی پاکیزگی، اور ضبط ہے وہ عام شاعروں کی دسترس سے باہر ہے:

وعدہ وصل رہا ہے شب آیندہ پہ میر بخت خوابیدہ جو ٹک جاگے تو سو دیں گے کل

ساعدسیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیئے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

گرچہ کب دیکھتے ہو، پر دیکھو آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو

اشک کی لغزش مستانہ پہ مت کیجو نظر دامن دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

موسم ابر ہو، سبو بھی ہو گل ہو، گلشن ہو اور تو بھی ہو

خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاسِ جوشِ گُل و دل گرمیٔ ایام کرو

سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو

حریف بے جگر ہے صبر ورنہ کل کی صحبت میں نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

میر محبوب سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتے جو جارحانہ ہو یا خودداریٔ عشق کے خلاف ہو۔ وہ محبوب کے جور و ستم کا ذکر بھی کرتے ہیں تو اپنا ہی دل خون کرنے کی حد تک۔ اور

عشق کی بلند فنادگی ہر حال میں قائم رکھتے ہیں :

اس کے ایفائے عہد تک نہ جئے　　　عمر نے ہم سے بے وفائی کی

حال بد گفتنی نہیں اپنا　　　تم نے پوچھا تو مہربانی کی

بالیں پہ میری آکر ٹک دیکھ شوق دیدار
سارے بدن کا جی اب آنکھوں میں آرہا ہے

میر معشوق سے کسی مخصوص یا ناممکن رعایت کے طلبگار نہیں۔ عاشق ہونے کے باوجود وہ انسانیت سے قطع نظر نہیں کرتے۔ اور بارگاہِ محبوب میں جو مطالبہ بھی پیش کرتے ہیں وہ عاشق کی حیثیت سے کم اور انسان کی حیثیت سے زیادہ۔ ملاحظہ ہو:

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا　　　آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

خوش نہ آئی تمھاری چال ہمیں　　　یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

وہ درد دل نہیں تو کیوں دیکھتے ہی مجکو　　　پلکیں جھکالیاں ہیں آنکھیں چرالیاں ہیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں، شام نہیں
وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں

حد سے زیادہ جور وستم خوشنما نہیں　　　ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں　　　میر کو تم عبث اداس کیا

یہ بے قراریاں نہ کبھو ان نے دیکھیاں　　جان کا ہیاں ہماری بہت سہل جانیاں

وصل اس کا خدا نصیب کرے　　میرؔ جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

یہ التجا ملاحظہ ہو ؎

رنگ شکستہ میرا بے لطف بھی نہیں ہے
ایک آدھ رات کو تو یاں بھی سحر کرو تم

محبوب کی تغافل شعاری اور مجبوری کی رعایت دیکھیے :

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

جگر چاکی، ناکامی، دنیا ہے آخر　　نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہوگا

میرؔ کا مطالبہ یہ ہے کہ محبت نہ سہی، انسانیت اور مروت کے مطالبات تو پورے ہونا چاہئیں :

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا　　چھوڑا وفا کو ان نے، مروت کو کیا ہوا

اگرچہ سہل ہیں، پر دیدنی ہیں ہم بھی میر
ادھر کو بار تامّل سے گر نگاہ کریں

اک نگاہ، ایک چشمک، ایک سخن　　اس میں بھی تم کو ہے تامّل سا

میرؔ عاشق کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے لیکن انسانی دردمندی کے لہجہ میں ؎

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی
میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

یوں میرؔ تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے　　اب رات کم ہی سوؤ بس ہو چکی کہانی

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے　　جان ہے تو جہان ہے پیارے

یہ انسانی ہمدردی ایک میرؔ ہی نہیں بلکہ تمام عالم کرتا ہے ؎

چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا

بے چارہ کیوں کہ "تا سر دیوار جائے گا

عاشق طلبگار رحم ہے اس لئے نہیں کہ وہ عشق کر کے کوئی احسان کرتا ہے بلکہ اس لئے کہ　"عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم"

یہ شعر بھی دیکھئے ؎

در پئے خونِ میرؔ ہی نہ رہو　　ہو بھی جاتا ہی جُرم آدم سے

صاحب ہو مار ڈالو مجھے تم و گرنہ کچھ　　جز عاشقی گناہ نہیں ہے غلام کا

اگر وہ کوئی التجا کرتا ہی تو بڑے نرم اور دل نشیں انداز میں :

دم آخر ہے بیٹھ جا مت جا　　صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو　　آرزو ہے کہ تم اِدھر دیکھو

میرؔ کی عاشقانہ سیرت کی تعمیر میں ان کے خاندان کی تہذیبی اور معاشرتی روایات کو بڑا دخل ہے۔ انسان کے دکھ درد کا احساس۔ اپنی اور دوسروں کی عزت، عشق کی غیرت اور حسن کے احترام کے سرچشمے ان کے تہذیبی اور خاندانی ورثہ میں مل جائیں گے۔ ان خارجی عوامل کو سامنے رکھ کر ذرا ان اشعار پر غور کیجئے :۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ہے دور ادب سے تم کھڑے، میں پاکشیدہ ہوں   مت آیو جنازے کی میرے، نماز کو

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف   اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

سعیٔ طوف حرم نہ کی ہرگز   آستاں پر ترے مقام کیا

یک قطرہ خوں ہو کے پلک سے ٹپک پڑا   قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنے
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

میر کو اپنے محبوب کا احترام، ہر حال میں منظور ہے اس کے عشق میں جو احتیاط، اور مساوات ہے اس کی مثال اردو میں بہت کم ملتی ہے:۔

خواہ مارا انھیں نے میر کو، خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا، ہوا، مت پوچھو

چلے ہم اگر تم کو اکراہ ہے   فقیروں کی اللہ اللہ ہے

وہ پرخلوص برتاؤ اور دو طرفہ محبت کا طلب گار ہے ؎

تمھیں بھی چاہیئے ہے کچھ تو پاس چاہت کا
ہم اپنی اور سے یوں کب تلک نباہ کریں

دو شعر اور ملاحظہ ہوں ؎

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا   اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلایئے

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حالِ میر　　　اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میر　　　دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

میر نے اگر محبوب کے ظلم و ستم کا ذکر کیا ہے، تو اس کا ردِ عمل بھی اتنا ہی شدید دکھلایا ہے:

جم گیا خون کفِ قاتل پہ ترا میر زبس　　　ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

میر نے مصائب عشق کو اپنے نصیب کی خوبی سمجھا ہے اور بہت کم محبوب کی ستم پیشگی کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے:

کیا کہیئے آہ عشق میں خوبی نصیب کی　　　دلدار اپنا تھا سو دل آزار ہو گیا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں　　　دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موئے
اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے　　　عمر نے ہم سے بے وفائی کی
اس تقریب اس گلی میں رہے　　　منتیں ہیں شکستہ پائی کی

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہو بتاں
مجکو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں

محبت میں تلخی اور ناکامی سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس موقع پر بے وفائی کی شکایت

اور حالات کے بدل جانے پر حیرت ہوتی ہے۔ ماضی کی یادیں دل کو لبھاتی ہیں اور حال کی مجبوریاں اور ناگواریاں طبیعت کو بے چین کر دیتی ہیں۔ اس وقت شاعر جھلا اٹھتا ہے ؎

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

کوئی سمجھے نہیں ہمارا حال　　　تم سے بھی اے بتاں خدا سمجھے

کوئی تجھ سا بھی کاش تجھ کو ملے　　　مدعا ہم کو انتقام سے ہے

یا پھر غزل میں واسوخت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے ؎

نہ پھر رکھیں گے تیری رہ میں پا ہم　　　گئے گزرے ہیں آخر ایسے کیا ہم

کہا سنتے تو کاہے کو کسو سے دل لگاتے تم
نہ جاتے اس طرف تو ہاتھ سے اپنے نہ جاتے تم
شکیبائی کہاں جو اب رہے جاتی ہوئی عزت
کدھر وہ ناز جس سے سر فرو ہرگز نہ لاتے تم
یہ حسنِ خلق تم میں عشق سے پیدا ہوا ورنہ
گھڑی کے روٹھے کو دو دو پہر تک کب مناتے تم
یہ ساری خوبیاں دل لگنے کی ہیں مت برا مانو
کسو کا بارِ منت بے علاقہ کیوں اٹھاتے تم

لیکن یہ کیفیت مستقل نہیں ہے۔ اس کی طبیعت کا اصلی رنگ، ایک سنبھلی ہوئی حالت، اور اپنے آپ کو لئے دیے رہنے کی خصوصیت ہے۔ اس کی بے دماغی کی سب سے دل کش صورت



ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشکِ یاسمن　　کم گوشۂ چمن سے ترا رہ گزر نہیں

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحاں پر

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

جب کوندتی ہے بجلی تب جانب گلستاں
رکھتی ہے چھیڑ میرے خاشاک آشیاں سے

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں　　بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے　　پیدا کئے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر
افسانے ما و من کے سنیں میرؔ کب تلک　　چل اب کہ سو رہیں منہ پہ دوپٹے کو تان کر

میرؔ کے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف رہا ہے۔ وہ اس وادی کے ایک ایک ذرہ سے آشنا ہیں۔ اس کوچہ کے تجربات ان کے لئے جذباتی اصلیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اس کہانی کو چھیڑتے ہیں تو وہ روداد جہاں بھی معلوم ہوتی ہے اور سنی ہوئی آواز بھی۔ اسی جگہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہر بات ایک مقام ہے اور ان کی بصیرت، ان کا وجدان اور ان کا جمالیاتی احساس معمولی نہیں ہے۔

عشقیہ شاعری اس وقت تک پُر عظمت نہیں ہو سکتی اور اس میں حسن و عشق کے دائرہ سے باہر نکلنے اور کائنات کو اپنے اندر لے لینے کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک شاعر کے احساسات بلند نہ ہوں۔ میر کا عشق مادی اور مجازی ضرور ہے لیکن وہ جرأت کی طرح ہماری طبیعت کو پستی یا ہوس پرستی کی طرف مائل نہیں کرتا۔ اس کے پیر زمین پر جمے ہوئے ہیں لیکن اس کی پہنچ ستاروں سے بھی آگے ہے۔ میر کی شاعری محض قصہ حسن و دل نہیں ہے اور اسی لئے بڑی شاعری ہے۔

میر کے یہاں معاملہ بندی ہے لیکن اس کی سطح بہت اونچی ہے۔ وہ سفلی جذبات کو نہیں چھیڑتا۔ بلکہ ہماری فطرت میں بلندی اور بالیدگی پیدا کر دیتا ہے اس کی شاعری عارض و کاکل کی شاعری نہیں ہے۔ وہ ان حدود کو توڑ کر بے پایاں اور بے کراں ہو جاتی ہے۔ اور بزم کائنات میں اجالا کر دیتی ہے۔ ان اشعار میں جو خیر و برکت کی فضا، حسن و عشق کا گہرا وجدان، بے پناہ ایمائی اثر، ہمہ گیری و دور رسی اور احساس لامحدود ہے وہ ملاحظہ ہو ؎

رنگ شکستہ اپنا بے لطف بھی نہیں ہے
یہاں کی بھی صبح دیکھو ایک آدھ رات رہ کر

ہائے اس زخمی شمشیر محبت کا جگر　　درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا　　کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

ماہیت دو عالم کھاتی پھری ہے غوطے
یک قطرۂ خوں یہ دل کا طوفان ہے ہمارا

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو ہم وفا کر چکے

مجلس آفاق میں پروانہ ساں — میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

دل کس قدر شکستہ ہوا تھا کہ رات میرؔ — جو بات لب پہ آئی وہ فریاد ہو گئی

وجہ بیگانگی نہیں معلوم — تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

میرؔ نے جنسی نفسیات اور عشقیہ زندگی کے کامیاب مرقعے پیش کئے ہیں۔ اس کی اکثر غزلیں وجدانی فضا کی آئینہ دار ہیں اور ان سے عشقیہ وجدان کی ایک دنیا تعمیر ہو سکتی ہے۔ اس نے جو حسن و عشق کی دنیا تعمیر کی ہے وہ زندگی کے پس منظر کے ساتھ، اسی لئے وہ زیادہ دل کش اور موثر ہے۔ —— یہی وہ منزل ہے جہاں حیات و جمال اور حسن و عشق کے ظاہری حدود ٹوٹ جاتے ہیں اور ادب و شعر دوامی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

عشق کا تعلق سماج سے بہت گہرا ہے۔ نفسیات کی تعمیر میں خارجی حالات کو بڑا دخل ہے۔ سماجی روایتوں کا اثر ہمارے جذبات و احساسات پر پڑتا ہے۔ اور اسی آب و ہوا میں وہ مخصوص ذہنی کلچر بنتا ہے جس کی مدد سے ہم حسن کا احساس اور عشق کی گرمی محسوس کرتے ہیں۔ میرؔ کے یہ اشعار انفرادیت کے خلا میں نہیں لکھے جا سکتے تھے۔

دور بیٹھا غبار میرؔ اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

پاس ناموس عشق تھا ورنہ   کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ   کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

دل میں کتنے مسودے تھے ولے   ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ
پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

اس سماجی کلچر کو سمجھنے کے بعد ہی میرؔ کے عشق میں جو تواضع اور خلوص، پاکی و پاکبازی، درد انگیزی اور خونبا بہ کشی، وضع احتیاط، مدارات و مساوات ہے وہ بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے:

نہ شکوہ شکایت، نہ حرف و حکایت   کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

آگے تھے ابتدائے عشق میں ہم   اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم   جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک   قطرۂ خوں تھا مژہ پہ جم رہا

زیرِ شمشیرِ ستم میرؔ تڑپنا کیسا   سر بھی تسلیمِ محبت میں ہلایا نہ گیا

اسی تقریب اس گلی میں رہے   منتیں ہیں شکستہ پائی کی

راہِ دمِ تیغ پہ ہو کیوں نہ میرؔ   جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بے تاب
کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

فلسفۂ غم

میرؔ بچپن ہی میں بے یار و مددگار ہو گئے تھے۔ ایسا شخص جب محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کی انتہا نہیں ہوتی۔ یہ الفاظ محض دکھاوے کے نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں:

دل تڑپے ہے، جاں کھپے ہے، حال جگر کا کیا ہوگا
مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں، مجنوں کیا ہم سا ہوگا

سودائی و رسوا و شکستہ دل و خستہ   اب لوگ ہمیں عشق میں کیا کیا نہ کہیں گے

ایسے شخص کی محبت کی ابتدا، انتہا کے نقطہ سے ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اکثر ناکام ہوتی ہے۔ میرؔ کی عشقیہ شاعری میں اس ناکامی و محرومی کا احساس موجود ہے لیکن جب اس پر تاریخی ماحول کی چھوٹ پڑتی ہے تو اس سے زندگی کے عناصر چمک اٹھتے ہیں۔ میرؔ جب اپنی خوں افشانی سے دامن پر گلکاریاں کرتا ہے تو اس کا آرٹ بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

اور کائنات خود اس سے سرگوشیاں کرنے لگتی ہے۔

میر کی شاعری میں احساسِ غم پوری طرح نمایاں ہے۔ رنج والم کے اس مضمون کی کثرت نے ان کے کلام میں ایک قسم کی ناگوار یکسانیت پیدا کردی ہے۔ فراق گورکھپوری کو اسی لئے کہنا پڑا کہ میر بڑا غزل گو ضرور ہے لیکن فن کار کی حیثیت سے غالب بڑا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غم کا جذبہ میر کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ لیکن احساسِ غم، زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اسی کے ذریعہ کائنات کی قدروں کا احترام اور جذبات کی تہذیب اور تحسین ممکن ہے۔ شخصیت اسی کے ذریعہ نکھرتی ہے اور تمدن میں تابندگی اسی کی بدولت آتی ہے۔

میر کی شاعری دردانگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بیزار نہیں ہے۔ انسان کی عظمت پر ان کو پورا بھروسہ ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

وہ ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے، ان کے یہاں مصیبت میں استقامت ہے۔ اور محرومی میں غیرت وحمیت۔ ان کے کلام میں درد کی لَو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔ ان کے یہاں وہ جذبات ہیں جو شاعری کی جان ہیں اور جن کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ جس میں سوز والفت نہیں وہ انسان، لازمۂ انسانیت سے خارج ہے۔ اسی کا دوسرا نام دردمندی ہے۔ میر نے غمِ عشق اور غمِ آفاق کو مردانہ وار اٹھایا ہے۔ وہ ڈوب کر ابھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے چلنے کا عزم رکھتا ہے۔ اس کے غم میں ایک سنبھلی ہوئی کیفیت۔ ضبط اور خودداری کا احساس، اور مقابلہ کی ہمت اور توانائی ہے اس کا غم روایت نہیں، زندگی کی حکایت ہے۔ میر کے اشعار جو اس جذبۂ غم کے حامل ہیں، ان میں ہمیشگی اور حُسن ہے۔ دھیمی دھیمی موسیقیت ہے۔ فن کارانہ

ضبط و نظم ہے معصوم تحیّر ہے۔ بے ساختگی، روانی اور تاثیر اس بلا کی ہے کہ شعر کا نشتر براہِ راست دل پر کھٹکتا ہے۔

جس زمانہ میں میر کی شاعری پروان چڑھی ہندوستان میں جاگیری نظام کی شمع بھڑک رہی تھی۔ دیہی معیشت زوال پذیر تھی۔ افلاس بڑھ رہا تھا۔ اس کی تکلیف میں حاتم، میرد مصحفی ہی نہیں، بڑے بڑے کج کلاہ گرفتار تھے۔ پرانا فوجی، زرعی اور صنعتی نظام بوسیدہ ہو چکا تھا۔ اور بقول میر زور و زر کچھ بھی باقی نہ تھا۔ لیکن ابھی ملک میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی تھی جو اس کو جاگیرداری کے دائرہ سے باہر نکال سکتی۔ اور نہ عوام میں کوئی ایسا انقلابی شعور پیدا ہوا تھا جو ان کی حالت کو بدل دیتا۔

میر نے جس غم کا اظہار کیا ہے وہ صرف اپنی بے رونقی کا نہیں بلکہ اپنے طبقہ اور تمدن کی بے رونقی کا بھی غم ہے، یہ آپ بیتی نہیں، جگ بیتی بھی ہے:۔

صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

تو ہے بے چارہ گدا، میر ترا کیا مذکور ... مل گئے خاک میں یاں صاحبِ افسر کتنے

تڑپ کے خرمنِ گُل پر کہیں گرا اے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ... یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا ... کہے تو میر بھی یک بُلبلا تھا پانی کا

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

ان بے رحم خارجی حالات میں اگر میر نے یہ محسوس کیا کہ ع

زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

تو غلط نہیں ہے —— لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس جگر چاکی و خوں افشانی کے باوجود میر کے یہاں زندگی سے ایسی بیزاری اور نفرت نہیں ہے کہ وہ انسان کی عظمت کے قائل نہ رہیں ؎

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

وہ سمجھتے ہیں کہ ع

شان ارفع ہے میر انساں کی

اسی لئے ان کے یہاں دینوی زیرکی و ہوش مندی بھی ہے ؎

یوں رفتہ اور بے خود کب تک رہا کرو گے

تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

واعظ نہ ہو معارض نیک و بد جہاں سے

جو ہو سکے تو غافل اپنا ہی فکر کر کچھ

یہ اشعار بھی دیکھیے۔

موسم ابر ہو سبو بھی ہو گل ہو گلشن ہو اور تو بھی ہو

دل تمنا کدہ تو ہے پر میر ہو تو اس کی ہی آرزو بھی ہو

ان نامساعد اور بے مہر حالات میں جن سے میر کو واسطہ پڑا تھا وہ صبر و شکیب اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کے یہاں گریز و فرار سے زیادہ اپنے اندرونی قلعہ تک مقابلہ کرنے اور پھر آبرومندانہ مصالحت کرنے کا جذبہ ہے۔

اس میں بدبختی کے بجائے خلوص اور صداقت کا جوہر ہے:

ناکام رہنے ہی کا تمہیں غم ہے آج میر
بہتوں کے کام ہو گئے ہیں کل تمام یاں

بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

تو ہے بے چارہ گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

زیر فلک بھلا تو روئے ہے آپ کو میر
کس کس طرح کا عالم یاں خاک ہو گیا ہے

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا
اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

حالات کا رخ بدلنے اور تاریخ کو موڑ دینے کی ہمت میر میں کیا، اس وقت کسی میں بھی نہیں تھی۔ ان سے اس قسم کی توقع قائم کرنا، ان کے خارجی حالات سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے۔ اس وقت پرانا نظام پارہ پارہ ہو گیا تھا۔ پرانی تہذیب کے ورق، آشیانے کے تنکوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔ میر نے ان کو سمیٹا اور دل و جگر کے خون سے جوڑا۔ یہ بغاوت یا سرکشی نہیں ہے۔ لیکن ان نامساعد حالات میں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ بڑے جگر کا کام ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کی سیرت پاکیزہ اور بلند ہو۔ اور جس کا عزم و ثبات پہاڑوں سے بھی مضبوط اور پرشکوہ ہو۔ یہ کس بل یہ تیور، یہ توانائی دیکھیئے:-

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنے
اس خاکِ رہِ عشق کا اعزاز تو دیکھو

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

میں گریہ خونی کو روکے ہی رہا ورنہ یک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا

گو بے ستوں کو ٹال دے آگے سے کوہکن
سنگ گرانِ عشق اٹھایا نہ جائے گا

جب تک کڑی اٹھائی گئی ہم کڑے رہے
ایک ایک سخت بات پہ برسوں اڑے رہے

سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

کیوں کہ کہیے کہ اثر گریۂ مجنوں میں نہ تھا گرد نمناک ہے اب تک بھی بیابانوں کی

راہ دمِ تیغ پہ ہو کیوں نہ میرؔ جی پہ رکھیں گے تو گزر جائیں گے

اس منزل پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے آلامِ عشق اور آلام روزگار پر فتح پالی ہے، اور دلِ پرخون کی گلابی سے جینے کا ایک نیا ڈھب نکال لیا ہے۔ اس کے یہاں جس غم کا ذکر ہے، اس کی آنچ میں تپ کر انسان نکھر جاتا ہے۔ اس کی سیرت بلند ہو جاتی ہے۔ یہ غم دھیما دھیما اور حیات افروز ہے۔ اسی جذبہ نے اس کے عشق کے مرتبہ کو بلند کر دیا ہے اور اس کی شاعری میں ابدیت کے جوہر پیدا کر دئے ہیں۔

میر کے نظریۂ حسن وعشق میں غیرت اور خودداری ہے، وقار اور ہمدردی ہے۔ بلندی وپاکیزگی ہے۔ گہرائی اور گیرائی ہے۔ اس نے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک کے ساتھ ازل وابد کے چاک کو بھی ملا دیا ہے۔ اور کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری ہمیں حلقۂ شام وسحر سے نکال کر زندگی کے اسرار ورموز کی بے کراں دنیا میں لے جاتی ہے اور اسی لئے بڑی شاعری ہے۔

میر کا آرٹ

میر کے تغزل کا تجزیہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان کے فن کی خصوصیات نہ معلوم کی جائیں اور ان کے اسلوبی اور جمالیاتی پہلوؤں کا احاطہ نہ کیا جائے۔ میر کا فن ان کے عام تفکر اور تصورات کا جزو ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ان کی زندگی، سیرت اور عام طرزِ فکر کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ میر کا اسلوب، شعر و ادب کی تاریخ کا حادثہ بھی نہیں ہے۔ ان کے فن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے اس کو ادبی تاریخ کے بڑے نقشہ میں دیکھنا چاہیئے تاکہ تمام خط وخال واضح ہو جائیں۔

اردو غزل کی تاریخ میں دکن کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وجہی غواصی، نصرتی، ہاشمی، سراج اور سلطان قلی قطب شاہ کی غزلیں کافی تعداد میں ملتی ہیں اور ان کا تعلق بھی زندگی سے اساسی اور اصلی ہے لیکن ان کی زبان میں وہ لطافت نہیں ہے۔ جو ولی کا طرۂ امتیاز ہے۔ موخرالذکر نے اپنے زمانہ کے تمام ادبی معیاروں کو سمویا ہے اور ان کی شاعری "زبان وخیال کا وہ آخری نقطہ ہے جسے تاریخ عرصہ سے طے کر رہی تھی"۔[۱] لیکن جب مرکزِ ثقل دکن سے دہلی کو منتقل ہوا تو اردو شاعری کا یہ حال ہو گیا جیسے ایک بچہ جوان ہونے سے پہلے بوڑھا ہو جائے

۱؎ کلیات ولی ص ۲۲۔

وہ لوگ جنھوں نے اردو پر اپنا نام ثبت کرکے اس کا ایک معیار قائم کیا وہ صرف فارسی ہی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ ان کی ذہنیت، رجحانات، خیالات، سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے۔ پہلے پہلے انھوں نے ریختہ کو تبدیل ذائقہ کے طور پر لکھا لیکن رفتہ رفتہ تجربہ کامیاب ہو کر محبوب مشغلہ بن گیا اور پھر فارسی کے حسنِ مستعار سے اُردو شاعری کے بڑے جوہر دکھلائے گئے۔

محمد شاہ کا دور اردو غزل کی تاریخ میں بہت اہم ہے لیکن ابھی اس صنف کو ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرنا تھیں۔ شاہ مبارک آبروؔ اس زمانہ کے اکابر شعرا میں ہیں لیکن مکروہ الفاظ و معانی کی کثرت اور ایہام گوئی کے شوق نے ان کے کلام کو بہت سبک اور مبتذل بنا دیا تھا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یار و ڈرو کمر سے مڑوڑو نہ بھر کے انگ ۔۔۔ آجا کہیں لچک تو ابھی لاگ جائے لنگ

سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹا ہوا ۔۔۔ زر کی لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا

دھمکاؤتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر ۔۔۔ کھولے ابھی تو جاوے میاں نکل بھرم

یہی حال شاکر ناجیؔ کا ہے جو اس زمانہ کے اساتذہ میں ہیں۔ میرؔ لکھتے ہیں کہ ان کی طبیعت ہزل کی طرف مائل ہے[1] مصطفیٰ خاں یک رنگؔ، ناجیؔ کے معاصر ہیں لیکن تذکرہ قدرت میں لکھا ہے:

ہر چند پُر گو فاما بسیار پوچ گو است۔

حقیقت یہ ہے کہ قدما کے اس دور کی ساری رونق مرزا مظہرؔ، خواجہ میر دردؔ، حاتمؔ،

---

[1] نکات الشعراص ۲۴۔

مرزا سودا، میر، سوز اور قائم کی بدولت ہے۔ ان لوگوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اردو غزل آرائشِ اصلاح کی محتاج ہے اور اس کی زبان میں بہت کچھ ترمیم اور اضافہ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم مرزا مظہر جان جاناں نے اٹھایا اور ایہام گوئی کو ترک کر کے اردوئے معلیٰ میں جو اس وقت عوام و خواص کی پسندیدہ زبان تھی۔ شعر کہے۔ اور غزل کو ایک موزوں اور سنجیدہ قالب دیا۔ مصحفی نے اسی لیے ان کو ریختہ کا "نقاش اول" کہا ہے۔ سودا نے بھی اس ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اس "سنگ ریزہ" کو "در عدن" بنا دیا۔ قائم نے اُسے "خلعت قبول" بخشا اور حاتم نے

زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار نمودہ[1]

جلوۂ خضر میں لکھا ہے کہ شاہ حاتم کے ساتھ درد اور مکین نے بھی ثقیل ہندی الفاظ نکال ڈالے[2]

اس اصلاح میں میر نے بھی بڑا حصہ لیا ہے اور ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس "عیب" کو "ہنر" میں تبدیل کر دیا ہے۔

یہ اصلاح صرف زبان تک محدود نہیں رہی۔ بلکہ معانی و مطالب بھی اس کے احاطہ میں آ گئے۔ ان مصلحین نے جدت ادا، لطافتِ تخئیل اور وسعتِ نظر کے کمالات دکھلائے اور تغزل میں معیاری شان پیدا کر دی۔

میر کا شیوۂ گفتار

مولانا عبدالرحمٰن جامی رح نے بہارستان میں کسی شاعر کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا، انوری کو قصیدہ کا اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

---

[1] دیوان زادہ: حاتم [2] جلوۂ خضر ج ۱ ص ۹۱۔

در شعر سہ کس پیمبرانند   ہرچند کہ لانبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

اس قطعہ کو سُن کر کسی نے پوچھا۔ "اور حافظ؟" کہا "وہ تو خدائے سخن تھا۔" بعینہٖ یہی بات میر کے متعلق صحیح ہے۔ اُس کی شاعرانہ جلالت کے متعلق اجماعِ امم ہے کہ

"ہرچہ ہست استادی ریختہ برو مُسلّم است"۔ (مصحفی)

ناسخ، غالب، ذوق، اکبر، حسرت سب ہی اس کے شیوۂ گفتار پر رشک کرتے رہے لیکن کسی کو بھی اس کا انداز و اسلوب نصیب نہ ہو سکا آخر اس کا کیا سبب ہے اور وہ کونسی چیز ہے جس نے اس کی غزل کو "تیرِ نیم کش" بنا دیا ہے۔ میر نے بھی یہی سوال کیا ہے ؎

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

ذیل کی سطروں میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کا جواب ایک حد تک ہی دیا جا سکتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں اثرات کا مکمل تجزیہ بڑا مشکل ہے اس لئے کہ دلبری کے بعض شیوے ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہوتا اور نہ ان جاں ستاں اداؤں کی تفصیل بیان کی جا سکتی ہے۔

میر کے اسلوب کو اس کی شخصیت سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔ میر کو الفاظ میں تحویل کرنے ہی سے اس کا شاعرانہ آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے۔ اس کے اندازِ بیان کی خارجی خصوصیات، اس کی شخصیت کے داخلی امتیازات ہی کی پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے یہ لب ولہجہ اپنے آپ کو مٹا کر حاصل کیا ہے اور وہ بغیر رفتار و گفتار و کردار کی ہم آہنگی کے ممکن نہیں۔

میر کی شاعری دہلی میں پروان چڑھی جو تباہ و برباد ہونے کے بعد بھی ایک عظیم الشان

تہذیب کی نشانی تھی۔ یہاں کے امیرانہ تمدن میں شاعر کی قدر تھی[1]۔ میر نے بھی اس سرپرستی سے فائدہ اٹھایا لیکن اس کے ہاتھ اپنے آپ کو بیچا نہیں۔ اسی لئے ان کی سیرت میں اور پھر اس کے اثر سے ان کی شاعری میں خلوص، رکھ رکھاؤ، راستی اور آزادہ روی ہے۔ جو بلاشبہ اُردو کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس کا تعلق خواص سے بس ایک حد تک ہے لیکن خون کا رشتہ عوام سے ہے:۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر نے اپنا تعلق جامع مسجد کی سیڑھیوں، عوام کے جلسوں اور زندگی کی معمولی چیزوں سے کبھی منقطع نہیں کیا۔ ان کے کلام میں دیوار کے سائے میں سونے، راہ کے کانٹے، مکڑی کے جالے، بجھتے ہوئے دئے، لٹے ہوئے نگر، اور اس قسم کی حالتوں اور چیزوں کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان سادہ و سلیس ہے اور ان کی تشبیہات موثر و دل نشین۔

میر کی زندگی میں خلوص اور راستی کو بہت دخل ہے۔ ان خصوصیات کا اثر ان کے کلام میں بھی نظر آتا ہے انہوں نے غزل میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور جو محسوس کیا ہے وہی لکھا ہے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

---

[1] ابوالفضل نے آئین اکبری میں وزراء کے بعد علماء و شعرا کا درجہ قائم کیا ہے۔ قانونِ ہمایونی میں بھی شاعر کو متوسلین دربار میں بڑا رتبہ دیا گیا ہے۔ مآثر رحیمی میں عرفی کے متعلق لکھا ہے:

دبہر طرزے ورشے کہ می خواستند در مجالس نشستہ۔" (مآثر رحیمی ص ۲۹۷)

یہ روایات کم و بیش ظفر کے زمانہ تک قائم رہی ہیں۔

سادگی و پرکاری میر کے کلام کی دلآویزی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے واردات اور حالات کو ایسے پُر تاثیر، دل نشین اور انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے اور بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ان اشعار میں کتنی معمولی بات کہی گئی ہے لیکن کتنے سادہ، بلیغ اور موثر انداز میں؛

کہتا ہے دل کہ آنکھ نے مجھ کو کیا خراب ۔۔۔ کہتی ہے آنکھ یہ کہ مجھے دل نے کھو دیا
لگتا نہیں پتا کہ صحیح کون سی ہے بات ۔۔۔ دونوں نے مل کے میر ہمیں تو ڈبو دیا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا
ہم یہ سمجھے تھے کہ اے میر یہ آزار گیا

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی ۔۔۔ دھوم ہے پھر بہار آنے کی

وحشت وجنوں کا مضمون نہایت پامال ہے لیکن اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے کہ باوجود ہزاروں مرتبہ پڑھے جانے کے اس کی تاثیر میں کمی نہیں آتی۔ ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

حالی نے اس مضمون کے ۲۳ شعر نقل کئے ہیں اور آخر میں لکھا ہے:

> مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ متاخرین میں سے کسی نے اس سے بہتر چاک گریباں کا مضمون باندھا ہو۔[۱]

---

[۱] مقدمہ شعر وشاعری: حالی

اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ میر کے تخیل میں تجربہ کی آمیزش ہے۔ اس کے کلام میں جو ماورائی سادگی، راستی، معصومیت، خلوص اور شدتِ اثر ہے وہ یوں ہی نہیں آئی، خونِ جگر سے آئی ہے۔

ندرت

حسنِ کلام کے ارکان میں ندرت اور تازگیٔ بیان کا درجہ بہت بلند ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی خیال بھی حسن ادا اور تازگیٔ بیان کی وجہ سے پسندیدہ بن جاتا ہے۔ میر کے یہاں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ان اشعار میں کتنی عام اور پیش پا افتادہ باتیں ہیں لیکن کس صفائی اور ندرت کے ساتھ نظم ہوئی ہیں:

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ　　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے

دونوں کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو　　　ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

جفا اس کی نہ پہنچی انتہا کو　　　دریغا عمر نے کی بے وفائی

کیا کہیے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا

جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے

اب تو وفا و مہر کا مذکور ہی نہیں　　　تم کس سمے کی کہتے ہو ہے یہ کہاں کی بات

بے کلی بے خودی کچھ آج نہیں ایک مدت سے وہ مزاج نہیں

وصل اس کا خدا نصیب کرے میرجی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

میر جن کیفیات کو بیان کرتے ہیں صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان سے گزر چکے ہیں اور شاید ایک اعلیٰ سطح پر پہنچ گئے ہیں۔ ورنہ یہ ٹھہراؤ آہی نہیں سکتا۔ یہ ٹھہراؤ مجبوری کا نہیں ہے۔ ضبط اور پندار کلہے۔ اسی لئے اُن کے سکون کے نیچے اضطراب کا سمندر لہریں مارتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ایک محروم چلے میر ہمیں عالم سے ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

اب حال اپنا اس کے ہے دلخواہ کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

آنکھوں سے پوچھا حال دل کا ایک بوند ٹپک پڑی لہو کی

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی کیا پتنگے نے التماس کیا

قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل سارے عالم کو میں دکھا لایا

ہائے اس زخمی شمشیرِ محبت کا جگر درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

نشتریت نواب سید امداد امام اثرؔ نے لکھا ہے کہ "میر صاحب غزل سرائی میں کبھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے احاطہ سے باہر قدم نہیں رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ تب ہی تو ان کے کلام میں سوز و گداز، خستگی، نشتریت، رنگینی، ملاحت، شیرینی وغیرہ کی کیفیتیں بدرجہ کثیر پائی جاتی ہیں۔"[۱]

اس میں شک نہیں کہ داخلی اور قلبی واردات کی غم انگیز عکاسی میں میرؔ کو کمال حاصل ہے۔ ذیل کے اشعار میں جو اثر، طرفگی اور ماورائیت ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

جب نام ترا لیجے، تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

عالم کی سیر میرؔ کی صحبت میں ہو گئی
طالع سے میرے ہاتھ یہ بے دست و پا لگا

تم نے جو اپنے دل سے بھلایا ہمیں تو کیا
اپنے تئیں تو دل سے ہمارے بھلائیے

---

[۱] کاشف الحقائق جلد دوم ص ۹۹، ۱۰۰۔

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ   اب توقع نہیں رہائی کی

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے   جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

میرؔ کا غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے جس کے بغیر جمالی اور حیاتی بصیرتوں میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے اظہار کے لئے وہ جن الفاظ کا استعمال کرتے ہیں ان میں انتقالِ ذہن اور تلازمِ خیالات کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہر لفظ سے ایک تصور وابستہ ہے اور ہر تصور کا   ایک پس منظر ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آج کل بے قرار ہیں ہم بھی   بیٹھ جا چلنے ہار ہیں ہم بھی
منع گریہ نہ کر تو اے ناصح   اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں   داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا

دیدنی ہے شکستگی دل کی   کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

یہ جو چشمِ پُر آشوب ہیں دونوں   ایک خانہ خراب ہیں دونوں
ایک سب آگ، ایک سب پانی   دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

یہ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں:

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش   گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے   عشق بن یہ ادب نہیں آتا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

آوارگان عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشت غبار لے کے صبا نے اڑا دیا

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

ان اشعار میں درد دل کس خوبی سے بیان کیا ہے۔ اس مضمون کے لئے اس سے زیادہ درد انگیز اور جدت آمیز پیرایہ ممکن نہیں ؎

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق
وہ اس کی وفا پیشگی، وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے جو رو دیا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

اسی قبیل کے چند شعر اور سنئے جن میں ندرتِ بیان نے جان ڈال دی ہے۔

اک نگاہ سے بیش کچھ نقصان نہ آیا اس کے تئیں
اور میں بے چارہ تو اے مہرباں مارا گیا

دل لے ہر روز رہی اور تم آتے ہی رہے ہم کو دیکھو کہ لگے چلنے تو جاتے ہی رہے

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانا گیا

ہر چند میں نے شوق کو پنہاں کیا ولے ایک آدھ حرف پیار کا منھ سے نکل گیا

یہ اضطراب دیکھ کہ اب دشمنوں سے بھی
کہتا ہوں اس کے ملنے کی کچھ تم دعا کرو

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

شاید کہ دیوے رخصتِ گلشن، ہوں بے قرار
میرے قفس کو لے تو چلو باغباں تلک

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا

چاہیں تو تم کو چاہیں، دیکھیں تو تم کو دیکھیں
خواہش دلوں کی تم ہو، آنکھوں کی آرزو تم

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

میر کے اضطراب میں ایک سکون ہے، اس کے سوز و گداز میں گہرائی و سنجیدگی ہے اسی لئے

زبان میں بلا کی نرمی و نغمگی ہے:

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے   حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں عالم سے   ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

میرؔ نے غم کے عنصرِ حیات کو اس حسن کے ساتھ جلوہ گر کیا ہے کہ اس سے جذبات کی تہذیب ہو سکتی ہے:-

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر   میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا

مجلس آفاق میں پروانہ ساں   میرؔ بھی شام اپنی سحر کر گیا

یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیسا چمن کہ ہم سے اسیروں کو منع ہے
چاکِ قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا

میرؔ سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم   ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

مرتے ہیں میرؔ سب پہ نہ اس بے کسی کے ساتھ   ماتم میں تیرے کوئی نہ رو دیا پکار کر

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچھتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے

تلوار کے تلے ہی گیا عہدِ انبساط   مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

میرنے اپنی "دل خراشی، جگر چاکی و خوں افشانی" میں رومانیت کی حسین آمیزش کرکے سوز واثر بڑھا دیا ہے۔ ان کی محرومی میں ایک تخیلی رنگ ہے جو اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب احساس، تجربہ اور تخیل، لفظوں میں بندھ جائیں:

کیا سیر اس خرابہ کا بہت، اب چل کے سو رہیے
کسو دیوار کے سائے میں منھ پرے کے داماں کو

کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ

سہل ممتنع

میرؔ کا کلام سہل ممتنع ہے۔ وہ سچا شاعر ہے اور اس کی شاعری سچی شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی سی سلاست اور فصاحت اردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ "سہل ممتنع سادگی وحسن بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں بھی تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے لیکن جب کوشش کرکے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔" میرؔ کے یہاں اس کی جا بجا مثالیں ملتی ہیں:-

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل — سارے عالم کو میں دکھا لایا
سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا
اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

عمر نے ہم سے بے وفائی کی — اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
منتیں ہیں شکستہ پائی کی — اسی تقریب اس گلی میں رہے

دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں

میر کا کمال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مضامین کو بھی سادہ و سلیس پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا تخیل بلند ہے۔ وہ مسلمہ امور اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ ان پر دوبارہ تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور بات میں بات پیدا کرتے ہیں:

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

سرسری تم جہان سے گزرے — ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو — دیر سے انتظار ہے اپنا

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجو نظر — دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میر — کیا کہہ گئی نسیم سحر، گل کے کان میں

سلیقہ میر کی مہارت شعری کا راز ان کی سلیقہ شعاری میں مضمر ہے سلیقہ سے مراد وہ احساسِ تناسب ہے جس کے بغیر جمالی تخلیق ممکن ہی نہیں میر اس سلیقہ کو زندگی میں بھی اہمیت دیتے تھے اور شاعری میں بھی:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں

سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں

میر کو صحیح الفاظ کے انتخاب کا بڑا سلیقہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں

خیالوں اور لفظوں کی ترتیب الگ الگ نہیں ہوتی۔ وہ طبیبِ کامل کی طرح ہر لفظ اور مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کون کہاں اور کس طرح سجے گا۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں ایک ایک لفظ مقتضائے حال کے سب مطالبوں کو پورا کرتا ہے۔

ان نے کھینچا ہے مرے ہاتھ سے داماں اپنا
کیا کروں، گر نہ کروں چاک گریباں اپنا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

پہلے شعر میں اگر "ان نے" کے بجائے "اس نے" ہو تو سارا لطف غارت ہوجائے گا۔ اسی طرح دوسرے شعر میں اگر "سپہر" کے بجائے "فلک" ہو تو سخافت اور عمومیت پیدا ہوجائے گی۔ جو لفظ سپہر میں نہیں ہے۔ نواب مرزا جعفر علی خاں اثر نے اس موضوع پر مزامیر میں بہت دلچسپ بحث کی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔[1]

الفاظ و معانی کا توازن

اسی طرح میر کے یہاں الفاظ و معانی کا توازن اور ان کی ہم آہنگی بھی ہے۔ یہ بھی سلیقہ شاعرانہ ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ "مغربی شاعری میں یہ صنعت صرف حواس ظاہری کے مشاہدات کا قرض پورا کرتی ہے۔ مثلاً دریا کی روانی، خنجر کی بُرِش وغیرہ۔ یہ بات نہیں کہ صوت یا نشست الفاظ کسی جذبے یا قلبی واردات کی پیش خوانی کرے۔ یہ میر کے کمال فن کا معجزہ ہے کہ اس نے اردو شاعری میں جس پر سخت قیود عاید ہیں... وہ خوبیاں پیدا کردی ہیں۔ جو مغربی شاعری میں اتنی آزادی پر بھی معدوم ہیں۔"[2]

مثال کے لیے یہ شعر ملاحظہ ہو:

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

---

[1] مزامیر ص ۱۴۱-۱۴۴۔ [2] ایضاً ص ۱۳۱۔

جناب اثر لکھنوی نے لکھا ہے کہ "پہلے مصرعے سے کتنی گھبراہٹ ظاہر ہوتی ہے! الفاظ اور ان کی ترتیب ایسی ہے کہ آدمی جلد پڑھنے پر مجبور ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کو اپنے میں وہ تغیرات محسوس ہونا شروع ہو گئے جو ایک مرتبہ پہلے دیوانگی کا پیش خیمہ بن چکے ہیں .... دوسرے مصرعے میں لفظ دھوم ایسی جگہ واقع ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈھول تاشے باجے بج رہے ہیں۔ بہار کا لشکر جوق در جوق امڈا چلا آرہا ہے اور اس غریب کا خرمن صبر و ہوش تاراج کئے دیتا ہے[1]"

ذیل کے اشعار میں بھی میر نے آواز یا نشست الفاظ سے مفہوم کی ترجمانی کی ہے اور تحت شعوری یادوں کو جگا دیا ہے :-

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

آنکھوں میں جی مرا ہے، ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو۔ ہائے رے صرفہ نگاہ کا

یارو مجھے معاف کرو۔ میں نشے میں ہوں
اب دو تو جام خالی ہی دو، میں نشے میں ہوں

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

عالم عالم عشق و جنوں ہے۔ دنیا دنیا تہمت ہے دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

---

[1] مزامیر ص ۳۱، ۳۳ نیز صفحات ۳۴ و ۳۵ -

ایجاز | میرؔ کم سے کم الفاظ میں اپنے مطلب کو ادا کرتا ہے۔ اور جو الفاظ چھانٹتا ہے ان میں ایمائی اثر کے خزانے بھرے ہوتے ہیں۔ یہی ایجاز کا کمال اور بلاغت کی انتہا ہے۔

علامہ طبا طبائی نے لکھا ہے :۔

چند لفظوں میں معنی کثیر کا ادا کر دینا، ایجاز نہیں، اعجاز سمجھئے۔ دانہ کی گرہ میں خرمن، غنچہ کی مٹھی میں گلشن کا سما جانا تو دیکھئے۔ ذرا سی بات کو پیرائے بدل بدل کر کہنا اطناب نہیں، نور کی طناب سمجھو جس سے سات طرح کے رنگ پیدا ہوتے ہیں اور شعاع ایک ہی ہے۔ ایجاز ہو خواہ اطناب، اگر جوش طبع سے پیدا ہو تو وہ آب زلال کی نہر ہے اور یہ سمندر کی لہر۔

میرؔ نے واقعیٔ دانہ کی گرہ میں خرمن اور غنچہ کی مٹھی میں گلشن کو جمع کر دیا ہے۔ اس کو شاید معلوم تھا کہ تخلیقی وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہی ہو سکتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا   کبھو ہم پر بھی مہربانی تھی

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی   دھوم ہے پھر بہار آنے کی

بعض جگہ اس نے تلمیح کے ذریعہ رمزی اثر میں اضافہ کیا ہے :

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دوانے نے موت پائی ہے

کہیں یہ طلسمی تاثیر استفسار و استفہام سے پیدا کی ہے :

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ   کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی   کیا پتنگے نے التماس کیا

حسنِ ادا کی یہ مثالیں بھی ملاحظہ ہوں۔ ان میں رمز وایما نکھر گیا ہے:۔

میرے تغیر حال پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

آنکھوں سے پوچھا حال دل کا　　اک بوند ٹپک پڑی لہو کی

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسّم کیا

مت تربتِ میؔر کو مٹاؤ　　رہنے دو غریب کا نشاں تو

اجزائے کلام کی اصلی ترتیب

مولانا شبلی نے "موازنۂ انیس و دبیر" میں لکھا ہے:
ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزاء کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے مثلاً فاعل، مفعول مبتدا خبر، متعلقات، جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال میں آتے ہیں یہی ترتیب شعر میں بھی قائم رہے۔

میرؔ اجزائے کلام کی اصلی ترتیب کو قائم رکھتے ہیں۔ اور یہ ان کی قادرالکلامی کا بہت بڑا ثبوت ہے:

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

میرؔ صاحب رلا گئے سب کو　　کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

تھا میرؔ عجب فقیر صابر، شاکر ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

جائے ہی جی نجات کے غم میں ایسی جنت گئی جہنم میں

میرؔ کے کلام میں اجزا کی اصلی ترتیب اس لئے قائم رہتی ہے کہ وہ عام بول چال سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کرتے۔ ع

پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

ان کی سادگی و سلاست کا اصلی سرچشمہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے روزمرہ اور محاورہ کو اس سلیقہ سے برتا ہے کہ اس میں عام دل کشی بھی باقی رہتی ہے اور ابتذال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ:

وہ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں، محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر جاتے ہیں۔

میرؔ نے خود بھی اپنی غزل کو "باتیں" ہی کہا ہے:

باتیں ہماری یاد رہیں، پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

گل نے ہزار رنگ سخن سر کیا ولے دل سے گئیں نہ باتیں تیری پیاری پیاریاں

اسی لئے میرؔ نے اپنے اشعار میں میاں، بھائی، صاحب، میر جی، قبلہ، ظالم، پیارے کا استعمال کیا ہے۔ اور بے تکلفی ظاہر کرنے کے لئے آپ کے بجائے تم اور تو کو ترجیح دی ہے مثلاً

نہ شکوہ شکایت، نہ حرف و حکایت کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے

لائے تھے جا کر ابھی تو اس گلی میں سے پکار
چپکے چپکے میر جی تم اٹھ کے اب کیدھر چلے

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہے کیا نہیں
تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

یک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب و قبلہ فقیر ہو

شکوہ آبلہ ابھی سے میر ہے پیارے ہنوز دلّی دور

مرہ کہیں تو میر جا سرگشتہ پھرنا تا کجا
ظالم کسو کا سن کہا، کوئی گھڑی آرام کر

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

غالب نے اسی طریقہ سے مراسلہ کو مکالمہ اور میر نے غزل کو راز گفتن بہ معشوق، کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے "جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہیتے عزیز سے باتیں کر رہا ہے۔"

محاورے

میر نے ضرب الامثال اور محاورے بڑے سلیقہ سے نظم کئے ہیں۔ ان کی یادوں کی پشت پر زندگی کی تاریخ ہے۔ لیکن وہ اشعار محض محاورے کی خاطر نہیں لکھے گئے ہیں۔ داغ نے آخر زمانہ میں جو محاورے نظم کئے، ان میں میر کا سا سلیقہ نہیں

ہے۔ وہ مصنوعی محاورہ بندی کی بدترین مثال ہیں۔ میرؔ کے برجستہ محاورے "سوئے ہوئے استعارے" ہیں اور ان کے پیچھے تاریخی اور تمدنی لوازمات چھپے ہوئے ہیں۔ ان سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے اور شعر کی بے تکلفی اور طلسمی تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے:-

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میرؔ   کیا دوانے نے موت پائی ہے

کھلا جو نشے میں پگڑی کا پیچ اس کے میرؔ
سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ہوا

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے   آئے ہیں پھر کے یارو اب کے خدا کے یاں سے

میرؔ شعر میں لطف محض محاورہ ہی سے پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی بات بیان کرنے کے بجائے اُسے دو ہمدرد یا رازدار آدمیوں کی باہمی گفتگو کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس خطابیہ انداز کا نفسیاتی اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے   پچتاؤ گے، سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کر

واعظ نا کس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ   آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو   ہے خیر میرؔ صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا؟

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

میرؔ اگر کوئی بات بیانیہ انداز میں بھی کرتے ہیں تو بڑے ڈرامائی حسن کے ساتھ:

مرا شور سن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا، تو کہے ہے کیا
جسے میرؔ کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے

وہ نفسیاتی امور کو سامنے رکھ کر شعر کہتے ہیں اور بات کو اس طرح کرتے ہیں جس میں مخاطب کا فائدہ ہوتا ہے یا کم سے کم اُسے قائل کی ہمدردی کا یقین ہو جاتا ہے:-

بے ہوشی سی آتی ہے تجھے اس کی گلی میں
گر ہو سکے اے میرؔ تو اس راہ نہ جا تو

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی　　میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

کیا حال ہو گیا ہے ترے غم میں میرؔ کا　　دیکھا گیا نہ ہم سے تو ٹک اس جواں کی اُور

طنز — میرؔ کے انداز و اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا طنزیہ لب و لہجہ ہے جو شاعرانہ آرٹ کا انتہائی نقطۂ عروج ہے۔ میرؔ کا طنز "عنصری" قسم کا ہے۔ وہ مصائب عشق کا ذکر اس صبر و ضبط کے ساتھ کرتے ہیں کہ اس کا بیان تیر و پیکاں سے کم نہیں ہوتا۔ طنز کی نشتریت اس کی واقعیت میں پوشیدہ ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ میرؔ کی شاعری کی بنیاد، واردات پر قائم ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ　　کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

اب حال اپنا ان کے ہے دل خواہ　　کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

ترٹپے ہے جب کہ سینہ میں اچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میرؔ تو آرام ہو چکا

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں، عیب نہیں، عار نہیں

اردو غزل میں طنز کی مثالیں غالبؔ اور مومنؔ کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ غالبؔ کے طنز میں شوخی ہے، دل پرشتگی نہیں، مومنؔ کے یہاں وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ "دل کشا" کہیئے۔ لیکن وہ محبت کے احترام کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ——— میرؔ کے طنز میں دھیما پن ہے۔ ہلکی ہلکی ٹیس ہے۔ اس کی مثال اُس نشتر کی سی ہے جس کی دھار بہت باریک اور تیز ہو۔ ان اشعار کو گنگنایئے، اور پھر دیکھیئے دل کا کیا حال ہوتا ہے۔ ذرا یہ بھی خیال رہے کہ شاعر کے ذوق و وجدان میں ان الفاظ کا کیا مفہوم ہے:

حالِ بد گفتنی نہیں میرا
تم نے پوچھا تو مہربانی کی

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی

دل کہ دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

پہنچا نہیں کیا سمع مبارک میں مرا حال
یہ قصہ تو اس شہر میں مشہور ہوا ہے

واں تم تو بناتے ہی رہے زلف
عاشق کی بھی یاں گئی گزر رات

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ　　ہے پیارے ہنوز دلی دور

میرؔ کے اشعار ان کی سیرت کے آئینہ دار اور ان کی طبیعت کی ہو بہو تصویر ہیں۔ انھوں نے سنی سنائی نہیں بلکہ اپنے اوپر گزری ہوئی باتیں لکھی ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں بلا کا خلوص اور اثر ہے۔ خلوص، تکلف کا دشمن ہے۔ وہ اپنے اظہار کے لئے سادہ سے سادہ اسلوب تلاش کرتا ہے۔ یہی سادگی، دل کشی اور دلربائی کی خزینہ دار ہے۔

تشبیہیں اور رمزی علامتیں

میرؔ تشبیہیں اور استعارے کم استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر کرتے ہیں تو بڑے سادہ اور سریع الفہم۔ ان کی حیثیت ایسی ہے جیسے پھول پر شبنم۔ ان کی وجہ شبہ ہمیشہ قریبی۔ اور مناسب حال ہوتی ہے۔ ان سے شعر میں الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ چمک اٹھتا ہے۔ میرؔ کے استعارے علامتیں اور تشبیہیں سادہ ہیں لیکن ان میں بلا کا ایمائی اثر پوشیدہ ہے۔ اس لئے کہ وہ زیادہ تر ان کے تجربہ یا مشاہدہ سے اخذ کی گئی ہیں گردشِ روزگار نے انھیں پیالہ و ساغر کی طرح پھرایا تھا اور ان کے اندر تجربہ کی وسعت اور مشاہدہ کی قوت پیدا کر دی تھی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ وہ اس درجہ تنہائی پسند اور مردم بیزار تھے کہ انہوں نے کبھی اپنے پائیں باغ پر بھی نظر خوار نہیں کی تھی۔ اس موضوع پر پچھلے صفحات میں کافی بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں اتنا اشارہ کافی ہے کہ میرؔ کو غم دنیا اور غم معشوق دونوں سے سابقہ پڑا تھا اور ان دونوں نے مل کر ان کے کلام میں وہ گرمی پیدا کی ہے جو مے دو آتشہ میں ہوتی ہے۔ تجربات کے شیشہ میں پڑ کر اس میں وہ تیزی بھی آگئی ہے جو تلوار میں ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرٹ، بغیر مشاہدہ و تجربہ کے، اور تفکر بغیر عمل کے، کوئی معنی نہیں رکھتا، صداقت نقل اور اندھی تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ تجربہ سے چشم دل میں نظر پیدا ہوتی ہے اور شعر کی لذت، تحلیل ہو کر اثر بن جاتی ہے۔

ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیئے جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

کیسی معمولی اور سادہ تشبیہہ ہے اور میرؔ کے مشاہدہ سے کتنی قریب، فراقِ یار میں عاشق کے دل کی جو حالت ہو جاتی ہے اس کی ہو بہو تصویر ہے۔

میرؔ کا مشہور شعر ہے ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے دل ہوا ہی چراغ مفلس کا

دل افسردہ کو مفلس کا ٹمٹماتا ہوا چراغ کہنا نہایت بلیغ بات ہی۔ ہمارے تمام عوامی ادب میں تلاش کر لیجئے اس مصوری، کا جواب مشکل سے ملے گا۔

صبح کو ایک وقت ایسا بھی آتا ہی جب سورج کی سنہری کرنوں کا رنگ اڑکر سفید ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے مندرجہ ذیل شعر میں صبح کے چہرۂ نورانی کا مقابلہ بتوں کے صندل پیشانی سے کیا ہی۔ اور بعض ظاہری مماثلتوں کو سامنے رکھ کر ان کی عدم مماثلت کو نمایاں کیا ہی۔ کہتا ہے کہ صبح کا تو رنگ اڑتا جاتا ہی لیکن بتوں کی کندن کی سی دمک بڑھتی ہی جاتی ہی ؎

لطف گر یہ ہے بتاں صندلِ پیشانی کا حُسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

اسی قبیل کا ایک شعر یہ ہے ؎

کیا خوبی اس منہ کی اے غنچہ نقل کریئے تو تو نہ بول ظالم بُو آتی ہی دہاں سے

اس میں مکالماتی انداز اور حسنِ تضاد نے شعر میں جان ڈال دی ہی۔ حافظؔ نے ایک شعر میں زلفِ محبوب کو بنفشہ پر ترجیح دی ہی۔

بنفشہ طرۂ مفتولِ خود گرہ می زد صبا حکایتِ زلفِ تو درمیاں انداخت

بڑا پاکیزہ شعر ہے اور ایک دنیا اس میں آباد ہے لیکن حافظؔ نے "حکایت درمیاں انداخت" کہہ کر معاملہ ختم کر دیا ہی اور ہمارے سامنے رمز و ایما کی ایک وسیع دنیا

کھول دی ہے۔ لیکن میرؔ نے اپنے محبوب کے رقیب "غنچہ" کی زبونی اور خرابی پر یہ کہہ کر مہر لگا دی ہے اور کسی دلیل و حجت کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے

تو تو، نہ بول ظالم بُو آتی ہے دہاں سے!

میرؔ نے رمز و کنایہ کی ایمائی قوت سے پورا کام لیا ہے۔ وہ شعری علامات کی مدد سے ہمارے تحت الشعور میں بھولی بسری یادوں کو جگا دیتا ہے یا پھر ہمیں "ابدیت کی سدا بہار وادیوں" میں پہنچا دیتا ہے:

کِھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے　　اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

شعلوں کی ڈانک گویا لعلوں تلے دھری ہے　　چہروں کے رنگ کیا کیا ہم دیکھتے ہیں جھمکتے

کچھ موج ہوا پیچاں اے میرؔ نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی آرام کیا

سیر گلزار مبارک ہو صبا کو ہم تو　　ایک پرواز نہ کی تھی کہ گرفتار ہوئے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے، کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

میرؔ نے بعض مواقع پر خیال کو صورت میں بدل دیا ہے اور مجرد کیفیتوں کو ذی روح فرض کر لیا ہے یہ صورت گری ایسی اعلیٰ قسم کی ہے کہ شاعری و مصوری کی سرحدیں مل گئی ہیں۔ میرؔ نے ان تصویروں میں، رنگ زندگی سے لے کر بھرا ہے ملاحظہ ہو ؎

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں ایک داغ
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

اب سیل سیل آنسو آتے ہیں چشم تر سے   دیوار و در سے کہہ دو بے اختیار ہیں ہم

یہ شعر دیکھیے۔ نہ تشبیہ ہے، نہ استعارہ، چند خطوں سے تصویر کھینچی ہے لیکن کیسی مکمل ؎

لائے تھے جا کر ابھی تو اس گلی میں سے پکار   چپکے چپکے میر جی تم اٹھ کے اب کیدھر چلے

کہیں محض نشستِ الفاظ سے مرقع نگاری کی ہے:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی   اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

جناب اثرؔ لکھنوی فرماتے ہیں کہ اس شعر میں لفظ سنگ ایسی جگہ واقع ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک پا بہ زنجیر دیوانے نے جو ہاتھ میں پتھر لئے ہوئے ہے، پہلا مصرعہ پڑھا اور دانت بھینچ کے آنکھیں بند کر کے پتھر سے سر پھوڑ لیا۔ اور لہو میں نہا گیا۔

حالاں کہ شعر میں ان امور کا ذکر نہیں ہے[1]

غزل میں عام طور پر اندرونی تجربے "لالہ و گل" کے پردے میں بیان کیے جاتے ہیں اسی لیے فطرت اس کا موضوع نہیں، پس منظر ہے۔ لیکن اس پابندی کے باوجود میر کی غزلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عالم خارجی کو غور سے دیکھ کر اپنے دل کو حسین پیکروں سے آباد کر لیا تھا۔

قدما میں شاید ہی کوئی اردو کا غزل گو شاعر ایسا ہو جس نے اتنے سفر کیے ہوں اور جس کے تجربات اتنے وسیع اور ہمہ گیر ہوں جتنے میر کے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت خود اس کے محاکاتی کلام میں موجود ہے۔

یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قفس کے چاک سے دیکھوں ہوں میں تو تنگ آتا ہوں
چمن میں غنچہ ہو آنا گلوں پر ہم صفیروں کا

مژگاں تر کو یار کے چہرے پہ کھول میر
اس آب خستہ "سبزے کو ٹک آفتاب دے

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

بہار آئی، شگوفے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہال سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

---

[1] مزامیر ص ۳۴

اگتے تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم　　صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

میر کا کلام ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ علم معانی و بیان کے سارے نکتے یہاں مل جائیں گے۔ مضمون شعر اور الفاظ شعر میں مطابقت قائم کرنا اور الفاظ کا موقع و محل کے اعتبار سے انتخاب کرنا، کمالات شعری میں سے ہے۔ میر کے یہاں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں ؎

رفیقوں سے دیکھی بہت کوتہی　　غریبی نے اک عمر کی ہمرہی

ہم رہروانِ راہِ فنا ہیں برنگِ عمر　　جاویں گے ایسے کھوج بھی پایا نہ جائے گا

فیض اے ابرِ چشمِ تر سے اٹھا　　آج دامن وسیع ہے اس کا

یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ صبح بزمِ خوش جہاں، شب غم سے کم نہ تھی مہرباں
کہ چراغ تھا سو تو دود تھا جو پتنگ تھا سو غبار تھا

اس استعارے کا طلسم بھی قابل غور ہے ؎

پھاڑا ہزار جا سے گریباں صبر میر　　کیا کہہ گئی نسیم سحر گل کے کان میں

یہ مراعاۃ النظیر دیکھئے کیا فطری انداز ہے ؎

برقع اٹھتے ہی چاند سا نکلا　　داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

صنعت مقابلہ کی مثال ملاحظہ ہو ؎

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا　　یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُرغرور تھا

غیر ذی روح سے مکالمہ نے ان اشعار کی تاثیر کو بہت بڑھا دیا ہے اور اس کی وجہ سے زندگی کا تضاد دل نشین ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھا ہے:

بعض اوقات شیوۂ نازک خیالی اور طرز ادا کی ندرت اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے شاعر دو تمثیلی تصوروں یا خیالی پیکروں کو ایک دوسرے کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے یہ مقابلہ استعارے ہی کی ایک لطیف قسم ہے جو جان بوجھ کر منطق کی صحت بیان کے خلاف ہوتی ہے تاکہ ایک کے بجائے دوسرا مطلب پیدا ہو اور محض خیالوں کے تلازم سے حقیقت ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جائے۔ اس طرح نہ صرف ایک تاثر دوسرے تاثر میں تبدیل ہو جاتا ہے بلکہ اس کی شدت بڑھ جاتی ہے[1]

میر کے کلام میں اس حسن تقابل کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں:

گزار شہر وفا میں سمجھ کے کر مجنوں کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

نالے کر تو سمجھ کے اے بلبل باغ میں اک کنارہ ہم بھی ہیں

کیا خوبی اس کے منہ کی اے غنچہ نقل کیجے تو تو نہ بول ظالم بو آتی ہے وہاں سے

مولانا حسرت موہانی مرحوم نے لکھا ہے کہ بعض اوقات شعر میں واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانا بھی مستحسن ہے[2] اس کی مثالیں میر کے یہاں بھی ملتی ہیں:۔

---

[1] اردو غزل: ڈاکٹر یوسف حسین ص ۳۰۰، ۳۰۱ (دوسرا اڈیشن)

[2] نکات سخن: مولانا حسرت موہانی ص ۱۶۲۔

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

جب تک بلی جلی سی جفائیں تھیں اٹھ سکیں کرنے لگے ہو اب تو ستم گاریاں بہت

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

ڈاکٹر یوسف حسین نے مولانا حسرت کی رائے پر یہ اضافہ کیا ہے کہ صیغہ واحد کے استعمال سے تفرد اور تعین کی صورت پیدا ہوتی ہے لیکن صیغہ جمع سے اشتباہ کا رمزی اور طلسمی اثر پیدا ہو جاتا ہے جو تغزل کے لئے ضروری ہے۔

شعر میں منطقی استدلال کے بجائے شاعرانہ سچائی ہوتی ہے جو اندرونی جذبوں کو تخیّل کی زبان میں بیان کرنے ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ چناں چہ شاعر صحت مقالی کے لئے سا، سی، بھی، شاید، کچھ، تو، الفاظ لاتا ہے۔ اسی صحت مثالی میں اسلوب کی بے پایانی کا بھی راز پوشیدہ ہے۔ میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

مفتی صدرالدین آزردہ کا خیال ہے کہ جس طرح قل ہو اللہ کا جواب ممکن نہیں، ایسے ہی اس شعر کی نظیر نہیں اس کا سبب شعر کے یہ الفاظ ہیں۔ شاید، کچھ۔ جنہوں نے مضمون کو "مطلق العنان" بھی نہیں ہونے دیا اور اپنے عدم تعین سے اس کے مفہوم میں بے کرانی بھی پیدا کر دی۔

چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں ان میں شاعری کا حقیقت سے دامن ٹکا ہوا ہے۔

زندگی اپنی خواب کی سی ہے یہ نمائش سراب کی سی ہے

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

میر کے یہاں محذوفات بھی ملتے ہیں وہ پُر کیف مفہوم کی بعض کڑیاں نکال دیتا ہے اور ہمارا ذہن خود اس خلا کو پُر کرتا ہے لیکن اس کے یہ محذوفات چیستاں یا معمہ نہیں ہیں :-

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

موئے دلبر سے مشک بو ہے نسیم
حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

تکرار الفاظ عیب ہے لیکن میر کی شاعری میں حسن۔ اس سے نہ صرف شعر کا ایمائی اثر بڑھ جاتا ہے بلکہ "خیالی پیکروں کے نقوش میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے"[1] یہ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بدنامی عشق کی کیا کہیے، رسوائی سی رسوائی ہے
صحرا صحرا وحشت بھی، اور عالم عالم تہمت تھی

ع پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
ع ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

اسی طرح میر کے یہاں حروف کی بھی تکرار ہے۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شعر کی موسیقیت بڑھ جاتی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

وہ ناوکِ دل دوز ہے لاگو مرے جی کا
تو سامنے ہو ہم دم اگر تجھ کو جگر ہے

موسیقیت اس موسیقیت کو بڑھانے کے لئے میر نے بعض غزلوں میں قافیے مکرر استعمال کئے ہیں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ موسیقی اور لفظوں کے امتزاج سے ہی تغزل کی تخلیق ہوتی ہے ؎

---

[1] اردو غزل: ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص ۲۲۴ (دوسرا ایڈیشن)

موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے پودھے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگِ گل سے میرؔ بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

میرؔ یہ موسیقیت صرف الفاظ اور قوافی ہی سے پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ ایسی رواں اور مترنم بحروں کا انتخاب کرتے ہیں کہ روح اہتزاز کرنے لگتی ہے لمبی بحروں کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

جو جو ظلم کیے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

جب ملنے کا سوال کروں ہوں زلف و رُخ دکھلاتے ہو
برسوں مجکو یوہیں گزرے صبح و شام بتاتے ہو

صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ
بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو، کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ

تو بھی رباطِ کہن سے صوفی سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابرِ سیہ قبلہ سے آکر جھوم پڑا مے خانوں پر

صبح وہ آفت اٹھ بیٹھا تھا تم نے نہ دیکھا صد افسوس
کیا کیا فتنے سر جوڑے پلکوں کے سائے سائے گئے

کرو توکل کہ عاشقی میں نہ یوں کروگے تو کیا کروگے
الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کروگے

تب تھے سپاہی، اب ہیں جوگی۔ آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

میرؔ نے چھوٹی بحروں میں بجلیاں بھر دی ہیں وہ ان کی کیفیات وجذبات کی آئینہ دار ہیں۔ اس غزل کی بحر دیکھیے معلوم ہوتا ہے دل ٹوٹا جارہا ہے، اور جذبۂ محبت، موسیقی میں حل ہوگیا ہے۔

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا — چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے — آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

اس بحر میں جو جذباتی فضا ہے، وہ بھی دیکھیے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو، ہم دعا کر چلے
کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منھ بھی چھپا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بت تجھے — نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

کیسی نرم اور دھیمی بحر ہے، محبت میں شکایت اسی لب ولہجہ میں کی جاسکتی ہے۔

یہ بحر بھی ملاحظہ ہو

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز — میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

یہ بحر یہ بھی دیکھیے، محرومی کا کتنا شدید احساس ہے:۔

دل میں کتنے مسودے تھے ولے　　ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے　　دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل　　سارے عالم کو میں دکھا لایا
دل مجھے اس گلی میں لے جاکر　　اور بھی خاک میں ملا لایا
اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر　　پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ذیل کے شعر کی بحر ہی سے منت و سماجت کے تمام درجے ظاہر ہو جاتے ہیں اور پچھلی بربادی کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے:

مت تربت میر کو مٹاؤ　　رہنے دو غریب کا نشاں تو

یہ شعر دیکھیے۔ بحر ہی سپردگی کا اعلان کر رہی ہے:۔

شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں　　آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا

میر کا یہ دعویٰ صحیح ہے:۔

کہے ہیں نے اشعار ہر بحر میں　　ولیکن قیامت روانی کے ساتھ

ترکیبیں

جناب اثر لکھنوی نے لکھا ہے:

خوشنما فارسی تراکیب کا مطبوع صرف میر کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کے بعد مومن اور غالب نے یہ راستہ اختیار کیا۔ بہت سی ترکیبیں مثلاً کاوکاو۔ سادہ و پرکار، استم ظریف۔ شیشہ باز۔ یک بیاباں وغیرہ جن کے وضع کرنے کا سہرا غالب کے سر باندھا جاتا ہے۔ میر کی دست نگر ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ وہ طرز جو غالب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کی بھی داغ بیل میر ڈال گئے تھے۔

فارسی کی دلآویز ترکیبوں سے میر ہی نے نہیں بلکہ تمام متقدمین نے اپنے کلام کو

آراستہ کیا ہے۔ میرؔ کے سامنے اس کے کچھ قواعد اور اصول تھے۔ وہ صرف ایسی فارسی ترکیبوں کو اردو میں رائج کرنا چاہتے تھے جو اس زبان میں کھپ سکیں اور اجنبی نہ معلوم ہوں نکات الشعرا میں لکھا ہے:

چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائز است وایں را غیر شاعر نمی داند۔ وترکیبے کہ ناموس ریختہ می باشد۔ آں معیوب است۔ ودانستن ایں نیز موقوف بسلیقہ شاعری است ومختار فقیر ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔

میرؔ نے جو ترکیبیں استعمال کی ہیں وہ اسی اصول کے پیش نظر۔ غالبؔ کی سی بے اعتدالی ان کے یہاں نہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ　　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا　　　پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

ہائے اس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر　　　درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست
شمع کا جلوہ غبارِ دیدۂ پروانہ تھا

سر نشینِ رہِ مے خانہ ہوں، میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

میرؔ نے باد فروش چمن، سعی طوف حرم، عمر برق جلوہ، قمار خانہ آفاق، اور اس قسم کی بیسیوں ترکیبیں استعمال کی ہیں اور اس طرح اردو میں وسعت پیدا کی ہے۔

مصحفیؔ نے مرزا مظہرؔ کے متعلق لکھا ہے کہ

اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست

میرؔ نے بھی فارسی کے حسن مستعار سے اردو کو چمکایا ہے اور فارسی اساتذہ کے بعض اچھے اشعار کو اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ تذکرہ آب حیات میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دی ہیں ہم طوالت کے خوف سے صرف دو شعر پیش کرتے ہیں:۔

سعدیؔ ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم
باید اول بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میرؔ فرماتے ہیں ؎

چاہنے کا ہم پہ یہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ
ان سے بھی پوچھو کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

بیدلؔ عظیم آبادی کا شعر ہے ؎

زندگی بر گردنم افتاد بیدلؔ چارہ نیست
شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

میرؔ لکھتے ہیں ؎

گوشہ گیری اپنے بس میں ہے نہ ہے آوارگی
کیا کریں اے میرؔ صاحب بندگی بیچارگی

ہندوستانیت لیکن میر نے "ہندوستانیت" سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا ہے۔ ان کے کلام میں ہندوستانی عناصر موجود ہیں اور وہ اردو کے ابتدائی رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ ہندی کے ہلکے پھلکے اور میٹھے میٹھے الفاظ جن میں سے بیشتر کو افسوس ہے کہ اب خارج کر دیا گیا ہے۔ ان کے کلام کی رونق بڑھاتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں

ع دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں

ع اس سمے میں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرو

ع رات ہوئی جس جاگہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

ع سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت

ع ابھرا ہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

میر کا کلام فارسی کی کاربن کاپی" نہیں ہے۔ اگر اسے فارسی کی شیرینی عزیز ہے تو اس نے ہندی کی نمکینی سے بھی اپنا دسترخوان آراستہ کیا ہے۔ عہد متوسط میں منصور و منوہر کی رنگ کاری، خسرو و تان سین کی موسیقی، جائسی اور فیضی کی شاعری، اور سیکری و تاج محل کی صناعی میں جو اتحاد پسندی کا رجحان ہے، وہی میر کی شاعری میں بھی کارفرما ہے۔ یہ نہ ہندی ہے، نہ ایرانی۔ اس ادب کا نام صرف ہند ایرانی ادب ہو سکتا ہے۔

میر کی کرشمہ آفریں طبیعت نے ہندی اور فارسی کے خوب صورت امتزاج سے اردو زبان کو وسعت بخشی اور اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ مختلف مضامین کو نظم کر سکے۔ خود میر کے یہاں انداز بیان کا اتنا تنوع ہے کہ اس کو دیکھ کر اس کی قادرالکلامی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ اس نے مذہب، حکمت، تصوف اخلاق، نفسیات، خمریات، حیات و کائنات کے ہر ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ان عنوانات سے علیحدہ صفحات میں بحث کی گئی ہے۔

اس لئے یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن میرؔ کے انداز بیان میں جو تنوع ہے اس کو ظاہر کرنے کے لئے ایک بات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ میرؔ کو ساقی و مے خانہ کے ذکر سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے کہ اس کے کلام میں "جوانی کی ترنگ اور توانائی و اہتزاز کی لہر" نہیں ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے شعرالہند کے حصہ دوم میں خمریات کا ایک علیحدہ باب قائم کیا ہے لیکن اس میں میرؔ کا ایک شعر بھی نقل نہیں کیا جو "مے خوارانہ" شاعری کے ذیل میں آسکتا ہو۔ ان کا اصلی خیال اس معاملہ میں یہ ہے کہ اردو میں خمریات کا دور قدماء کے دور تغزل کے بعد اور معاملہ بندی اور ہوسناکی کے ساتھ ساتھ آیا ہے[1] لیکن میرؔ کا کلام اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ اس کے یہاں وہ مستی اور رنگینی بھی ہے جو رندانہ اشعار میں ہونا چاہیئے اور وہ حسین ایمائیت بھی، جو شاعری کو سحرکاری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان میں ولولہ ہے۔ جینے کا حوصلہ ہے اور آج کی سرمستی میں "کل" کی تکلیف کو بھلا دینے کی خواہش ہے:

ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف بھی دیکھ — ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج

جی چاہتا ہے عیش کریں ایک رات ہم — تو ہووے چاندنی ہو، گلابی شراب ہو

موسم ابر ہو، سبو بھی ہو — گل ہو، گلشن ہو اور تو بھی ہو

شیخ جی آؤ، مصلّیٰ گرو جام کرو — جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے خام کرو
فرش مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں — مے کی تعظیم کرو، شیشے کا اکرام کرو

---

[1] شعرالہند ج دوم ص ۳۱۷۔

نیکنامی و ثقاہت کو دعا جلد کہو دین و دل پیشکشِ سادہ و خودکام کرو
خنکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں پاسِ جوشِ گل و دل گرمیٔ ایام کرو
سایۂ گل میں لبِ جو پہ گلابی رکھو ہاتھ میں جام کو لو، آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

تو بھی رباطِ کہن سے صوفی، سیر کو چل ٹک سبزے کی
ابر سیہ قبلے سے آکر جھوم پڑا ہے خانوں پر

معتبر کیا ہے میرؔ کی طاعت رہن بادہ ہے جانماز ہنوز

کس کی مسجد، کیسے مے خانے، کہاں کے شیخ و شاب
ایک گردش میں تری چشمِ سیہ کی سب خراب

قربان پیالۂ مے ناب جس سے کہ ترا حجاب نکلا

ابر اور جوشِ گل ہے چل خانقہ سے صوفی ہے لطف میکدے میں وہ چند اس ہوا کا

مسجد ایسی بھری بھری کب ہے مے کدہ اک جہان ہے گویا

تحقیق کروں کس سے حقیقت کے نشے کو خضر آب اُسے کہتا ہے تو آتش کہے موسیٰ

یک چشمکِ پیالہ ہی ساقی بہارِ عمر ‏ جھپکی لگی کہ دور یہ آخر ہی ہو چکا

شریف مکہ رہا ہی تمام عمر اے شیخ ‏ یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

واعظ نا کس کی باتوں پر کوئی جاتا ہی میر ‏ آؤ مے خانے چلو تم کس کے کہنے پر گئے

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں ‏ لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ میر نے اپنی تصویروں میں کہیں فارسی سے رنگ بھرا ہے اور کہیں ہندی سے۔ ان کے یہاں قلم کی تیزی بھی ہے اور رنگوں کی خوشنمائی بھی۔ یہ مصوری ایسی ہنرمندی اور چابک دستی کے ساتھ کی گئی ہے کہ اس مرقع میں ہر قسم کی تصویریں مل جائیں گی۔ وہ شاعری کو گل و بلبل میں محدود کر دینا نہیں چاہتے تھے[1] ایہام کے سخت مخالف تھے[2] اور "لفظ تازہ" کی تلاش پر زور دیتے تھے[3]

میر کا نظریہ فن

اس کے علاوہ دردمندی کو جو انسانیت کی لازمی شرط ہے، وہ شاعری کے لئے بھی ضروری سمجھتے تھے[4] ان کے نزدیک سخن وری پیشہ نہیں ہی "فن شریف" ہے۔ میر نے اس کی کوشش کی ہی کہ شاعری کا ایوان رفیع قبول عام پر قائم کریں۔ انھوں نے زبان کے مزاج کو پہچانا ہی۔ اور فارسی اور ہندی کے صرف وہ الفاظ استعمال کئے ہیں جو اس میں کھپ جائیں اور رونق کو بڑھا دیں۔ الفاظ کے معاملہ میں ان کے یہاں "فلاں ابن فلاں" کا سوال نہیں ہی۔ وہ صرف وہ

---

[1] نکات الشعراء ص ۱۱۵ [2] ایضاً ص ۲۸ [3] ایضاً ص ۱۶ [4] ایضاً ص ۹۸۔

الفاظ انتخاب کرتے ہیں جو مطلب کو دل میں اتار دیں۔ یہ اشعار نہیں، شربت کے گھونٹ ہیں۔ غزلیں نہیں، میٹھی میٹھی باتیں ہیں۔ وہ لفظ کو بے جان اور بے روح چیز نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اس کی جوہری انفرادیت کے قائل تھے۔ اور اسے اپنے سلیقہ شاعرانہ سے اس طرح شعر میں کھپاتے تھے کہ وہ لفظ وہیں کا ہو جاتا تھا۔ ان کی لفظیات اور تشبیہات کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کا تعلق عوام سے اصلی اور بنیادی ہے۔ اسی لئے ان کا اثر دیرپا ہے۔ وہ اردو کی فطری صلاحیتوں سے باخبر تھے اور اس کے ہندوستانی عناصر کے قدردان۔ وہ فن کا احترام کرتے ہیں لیکن اس کے لئے حسن کو قربان نہیں کرتے۔ وہ اندر کی طرف دیکھتے ہیں لیکن جب باہر کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ۔ کون و مکاں کے جلوے ان میں سمائے ہوئے ہیں ——— ان کا ادبی شعور سخت گیر نہیں، حقیقت پسند ہے۔ اس میں جمود نہیں، سادگی اور روانی ہے، اس میں تفصیل نہیں، اشاریت اور اجمال ہے۔ صنعت گری نہیں، خلوص اور صداقت ہے، مجردات نہیں محسوسات اور مجسمات ہیں ——— ان کی زلفِ سخن، مشاطہ کی محرم نہیں ہے۔ اسی لئے اس میں فطری آن بان اور نوک پلک ہے۔ یہ سعادت زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی۔ میرؔ نے سچ کہا ہے:

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب! صاحب نظر بنے ہے

کس کس طرح سے میرؔ نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر اُن نے ہے یہ ریختہ کہا

میراور تصوّف

تصوف کا اصلی مایہ خمیر عشق حقیقی ہے۔ میر نے جا بجا اس موضوع پر متصوفانہ نظر ڈالی ہے ؎

درد ہی خود ہے خود دوا ہے عشق　　شیخ کیا جانے تو کہ کیا ہے عشق
تو نہ ہووے تو نظم کل اٹھ جائے　　سچے ہیں شاعران خدا ہے عشق

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
عشق معشوق عشق عاشق ہے　　یعنی اپنا ہی مبتلا ہے عشق
عشق ہے طرز و طور عشق کے تئیں　　کہیں بندہ کہیں خدا ہے عشق
گر پرستش خدا کی ثابت کی　　کسو صورت میں ہو بھلا ہے عشق

کوہکن کیا پہاڑ کاٹے گا　　پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا　　آرزو عشق، مدّعا ہے عشق

عشق سے نظم کل ہے یعنی عشق کوئی ناظم ہے خوب
ہر شے جو یاں پیدا ہوئی ہے موزوں کر لایا ہے عشق

دائر سائر ہے یہ جہاں میں جہاں تہاں متصرف ہے
عشق کہیں ہے دل میں پنہاں اور کہیں پیدا ہے عشق

اس کے علاوہ میر نے مثنویوں میں بھی عشق و محبت کے موضوع پر لکھا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور　　نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت مسبّب محبت سبب　　محبت سے آتے ہیں کار عجب

محبّت بن اس جا نہ آیا کوئی　　محبّت سے خالی نہ پایا کوئی
محبّت ہی اس کارخانے میں ہے　　محبّت ہی سب کچھ زمانے میں ہے

دراصل تصوف کا اصلی مقام عشق و محبت ہے اس عالم میں دوست اور دشمن کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ بقول عرفیؔ: "پروانہ چراغ حرم و دیر نداند" میرؔ بھی یہی کہتے ہیں کہ عالم حقیقت کفر و اسلام دونوں سے بالاتر ہے ؎

مذہب سے میرے کیا تجھے میرا دیار اور　　میں اور، یار اور، مرا کاروبار اور
کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر　　دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

کس کا کعبہ، کیسا قبلہ، کون حرم ہے کیا احرام
کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل　　اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

راہ سب کو ہے خدا سے، جان اگر پہنچا ہے تو　　ہوں طریقے مختلف کتنے ہی، منزل ایک ہے

ہم نہ کہتے تھے کہیں زلف کہیں رخ نہ دکھا　　اختلاف آیا نہ ہندو و مسلمان کے بیچ

عشق نے باب فنا کھول دیا ہے:

ہم رہروانِ راہ فنا دیر رہ چکے　　وقفہ یہاں صبح کوئی دم بہت ہی یاں

بے اجل میرؔ اب پڑا مرنا　　عشق کرتے نہ اختیار اے کاش

جب مقام لاہوت پر ان کا گذر ہوتا ہے تو فرماتے ہیں:-

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا

یہ جستجو بھی ملاحظہ ہو:

اسے ڈھونڈھتے میر کھوئے گئے ہم　　کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف

ہوئے ہیں حواس اور ہوش و خرد گم　　خبر کچھ تو آئی ہے اس بے خبر تک

تصوف میں ادراک کا محل دل ہے، تمام مکاشفات اور واردات اسی لطیفۂ روحانی سے تعلق رکھتے ہیں:

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلہ پر سیر و سفر ہمارا

غافل تھے ہم احوال دل خستہ سے اپنے　　وہ گنج اسی کنج خرابہ میں نہاں تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم　　یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا

مت رنجہ کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد　　دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا

طریق عشق میں ہے رہنما دل　　پیمبر دل ہے قبلہ دل خدا دل

وحدتِ وجود کا مسئلہ صوفیانہ شاعری کی جان ہے۔ خواجہ فریدالدین عطار کا خیال ہے کہ تمام اشیاء میں معشوق حقیقی کا حسن کارفرما ہے۔ وہ قد میں جلوہ، زلف میں شکن، ابرو میں وسمہ، یاقوت میں آب، مشک میں خوشبو ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:-

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا　　خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا

تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ　　سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

کم نازسے ہی کس کے بندے کی بے نیازی　　قالب میں خاک کے یاں پنہاں خدا ہی شاید

صورت پذیر ہم بن ہرگز نہیں وہ معنی　　اہلِ نظر ہمیں کو معبود جانتے ہیں

غلط تھا آپ سے غافل گذرنا　　نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

جلوہ ہی اسی کا سب گلشن میں زمانے کے　　گل پھول کو ہی اُن نے پردہ بنا رکھا

آیئنہ میں جب کسی کا عکس پڑتا ہی تو یہ عکس مجسم ہو کر سامنے آتا ہے لیکن درحقیقت وہ کوئی چیز نہیں۔ ایک ذات واحد ہے اور یہ عالم اسی کا پرتو ہے۔

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

ارباب عرفان پر جب محبت کا غلبہ ہوتا ہی تو ان کو صانع کل کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

عام ہے یار کی تجلی میرؔ
خاص موسیٰ و کوہ طور نہیں

وجہ بیگانگی نہیں معلوم　　تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

یہ کشفِ حجاب شراب معرفت سے سرشار ہونے کے بعد ہی ممکن ہی۔

مستی میں شراب کے جو دیکھا　　عالم میں یہ تمام خواب نکلا
قربان پیالۂ مے ناب　　جس سے کہ ترا حجاب نکلا

انسان کی حقیقت بھی ملاحظہ ہو۔ عالم طبیعیات میں تو وہ کمزور اور حقیر چیز ہے لیکن تصوف میں وہ ذرہ سے پھر آفتاب بن سکتا ہی۔

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میرؔ ہم ہیں　　　مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

خواجہ فریدالدین عطارؔ نے فرمایا ہی:

انچہ می جویند بیرون دو عالم سالکاں
خویش را یابند چوں ایں پردہ از ہم بردرند

انسان مظہر ذات خدا ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو پہچان لے اور حقیقت سے باخبر ہو جائے تو عرفان ممکن ہی۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

اپنے خیال ہی میں گذرتی ہے اپنی عمر
پر کچھ نہ پوچھو سمجھے نہیں جاتے ہم سے ہم

معرفت کی راہ میں ہستی ایک پردہ ہے۔ لیکن فنا کے بعد حجاب باقی نہیں رہتا

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ　　　ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

میرؔ کا اصلی رجحان جبر کی طرف معلوم ہوتا ہی ان کا خیال ہی کہ انسان خود مختار نہیں ہی کوئی اور قوت ہی جو اس سے کام لے رہی ہی بقول حافظ ع مادل بہ عشوہ کہ دہیم اختیار چیست

میرؔ فرماتے ہیں ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہی سو اتنا ہی
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

بہت سعی کریئے تو مر رہیئے میرؔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

منہ نہ ہم جبریوں کے کھلواؤ کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

صوفیہ کہتے ہیں کہ فنا، بقا کا دیباچہ ہے اس لئے نیستی ان کا عین مقصود اور منتہائے آرزو ہے۔ میر حیاتِ جاوداں کی طرف اشارہ کرکے فرماتے ہیں۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہی
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تصوف میں سالک کے لئے جو مقامات مقرر ہیں ان میں ایک فنا بھی ہی۔ جب جسم فنا ہوگا تو روح ذات بحت میں جا کر مل جائے گی اس لئے موت بھی ترقی کی ایک منزل ہے۔ میرؔ فرماتے ہیں :۔

ایں نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است
مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے پایاں ما

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :۔

لذت سی نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

مرگ کیا منزلِ مراد ہی میرؔ یہ بھی اک راہ کا توقف ہے

وقفۂ مرگ اب ضروری ہے　　　عمر طے کرتے تھک گئے ہیں ہم

عمر کا وقفہ اس رستہ میں کیا ہی میرؔ سمجھتے ہو
ہارے باندھے راہ کے ہیں ہم لوگ کوئی دم سولیں گے

تھا جسم کا ترک اولیٰ ایام میں پیری کے
جاتا تھا چلا ہر دم جامہ بھی پرانا تھا

میرؔ بظاہر اہلِ حال سے نہ تھے لیکن وہ عرفا اور صوفیا کی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ اس کا اثر ان کے کلام میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی فن کارانہ صلاحیتیں غیر معمولی تھیں اس لئے انھوں نے متصوفانہ حقائق و معارف کو بھی اس خوبی کے ساتھ آب و رنگِ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے کہ دل و نظر جذب ہو کر رہ جاتے ہیں:

آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو　　　حیراں ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے

فلک کا منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا　　　ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا　　　ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

ہمت اپنی ہی تھی یہ میرؔ کہ جوں مرغِ خیال　　　اک پر افشانی میں گزرے سرِ عالم سے بھی

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ　　　دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہی آگ

پھاڑا ہزار جا سے گریبانِ صبر میرؔ — کیا کہہ گئی نسیم سحر گُل کے کان میں

عرش تک تو خیال پہنچا میرؔ — وہم پھر ہے کہیں، قیاس کہیں

جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی سدھ جائے
بے خودی آئی اچانک ترے آجانے میں

بیٹھے تھے میرؔ یار کے دیدار کو سو ہم — اپنا یہ حال کر کے اٹھے اک نگاہ میں

تسبیحیں ٹوٹیں، خرقے مصلّے پھٹے، جلے
کیا جانے خانقاہ میں کیا میرؔ کہہ گئے

رنگِ گُل و بوئے گُل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہی تو بھی جو چلا چاہے

میرؔ نے درحقیقت تصوف اور تغزل، مجاز اور حقیقت کی سرحدوں کو ملا دیا ہی اور یہی ان کا بڑا کمال ہے۔

میرؔ کا فلسفۂ اخلاق

میرؔ کے نزدیک دنیا آنی جانی ہی۔ یہاں قیام مختصر ہے یہ مہلت ایک تبسم گل۔ ایک شرار سے زیادہ نہیں

ع — مہلت ہمیں بسانِ شرر کم بہت ہی یاں

انسان کی ہستی "حباب"[۱] اور "دنیائے آب و گل" "سراب" ہے:-

۱؎ ہستی اپنی حباب کی سی ہی۔

مشہور ہیں عالم میں تو کیا ہیں بھی کہیں ہم
القصّہ نہ درپئے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر ‏ ‏ دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا ‏ ‏ ہمیشہ رہے نام اللہ کا

سیر کی ہم نے ہر کہیں پیارے ‏ ‏ پھر جو دیکھا تو کچھ نہیں پیارے

میر کا خیال ہے کہ عالم ایک کربلا[۱] ہے۔ ہر طرف ظلم ہی ظلم ہے۔ کوئی سسک رہا ہے کوئی دم توڑ رہا ہے۔ یہاں فکر تعمیر عقلمندی کے خلاف ہے:

رہ گذر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر
اس خرابی میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا

میر کے نزدیک دنیا سے دل لگانا غلط ہے۔ اور یہاں کی دولت پر ناز کرنا حماقت اس "کارگہ شیشہ گری" میں زندہ رہنے کا راز صرف یہ ہے کہ آدمی سانس بھی لے تو آہستہ اور قدم بھی رکھے تو احتیاط سے، اس "مہلت کم" میں ایک لمحہ عیش کا میسر نہیں اس لئے آرزو پیدا کرنا ہی فضول ہے ؎

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمین ‏ ‏ تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

قلندرانہ زیست

لیکن یہ کیفیت مستقل نہیں ہے میر بلندی و پستی پر فلسفیانہ نظر ڈالتے ہیں اور قلندرانہ زیست کرنے کے قایل ہیں۔

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقش قدم یاں ‏ ‏ پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

---

[۱] ایک از آں جملہ کربلا ہے یہاں۔

وہ کسی کے عروج پر حسد نہیں کرتے۔ اور نہ کسی کی پستی کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی حالت پر قانع ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

گو توجہ سے زمانے کی جہاں میں مجھ کو ۔۔۔ جاہ و ثروت کا میسر کوئی ساماں نہ ہوا
شکر صد شکر کہ میں ذلت و خواری کے سبب ۔۔۔ کسی عنواں میں بھی ہم چشم عزیزاں نہ ہوا

تھا میر عجب فقیر، شاکر، صابر ۔۔۔ ہم نے اس سے کبھو شکایت نہ سنی

۵ خودداری اور عالی ہمتی

میر فقیری میں دست سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتے

خوب کیا جو اہل کرم کے جور کا کچھ نہ خیال کیا!
ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے پہلے ترک سوال کیا

یہ شانِ خودداری ملاحظہ ہو۔ محکوم تو محکوم وہ حاکم بننا بھی پسند نہیں کرتے:

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یہ عالی ہمتی دیکھئے۔

آب حیات وہی نہ جس پر خضر و سکندر مرتے تھے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی

ان کو اپنی عظمت کا پورا احساس ہے:

مت سہل ہمیں سمجھو۔ پہنچے تھے بہم تب ہم
برسوں تئیں گردوں نے جب خاک کو چھانا تھا

میر کا یہ احساس نازک مزاجی اور بے دماغی تک پہنچ جاتا ہے کہ

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا ۔۔۔ ہزار مرغ گلستاں مجھے پکار رہے ؏

جبر | میرؔ جبریہ عقائد کو تسلیم کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ انسان کو کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ مشیت کی طرف سے، اس لئے مشیّت سے مصالحت کی صورت صرف یہ ہے کہ قلندرانہ زندگی بسر کی جائے۔

مت اس چمن میں غنچہ صفت بود و باش کر ۔۔۔ مانند گل شگفتہ جبیں یاں معاش کر

یتراے دل یہ غم فرو بھی ہو گا ۔۔۔ اندیشہ رزق کم کبھو بھی ہو گا
کھانے کو دیا ہے آج حق نے تجھ کو ۔۔۔ کل بھی دیوے گا کل جو تو بھی ہو گا

مہر و وفا | میرؔ کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان غم زدہ رہے، یا دل شاد لیکن کسی کا دل نہ دکھائے اور دنیا میں ایسا کام کر چلے جس سے اس کا نام دیر تک باقی رہے میرؔ کو "قصۂ سکندر و دارا" میں کبھی لطف نہیں آیا۔ انہوں نے ہمیشہ "مہر و وفا" کی ہی تلقین کی۔ فرماتے ہیں ؎

جی میں آوے سو کیجیو پیارے ۔۔۔ ایک ہو جیو نہ درپئے آزار
بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو ۔۔۔ ایسا کچھ کر کے چلو تم کہ بہت یاد رہو

عمر عزیز گذری سب برائی کرتے ۔۔۔ اب کر چلو بھلا کچھ شاید یہی بھلا ہے

کعبہ پہنچا تو کیا ہوا اے شیخ ۔۔۔ سعی کر ٹک پہنچ کسی دل کو

رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا ۔۔۔ لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا

وسیع المشربی | میرؔ کا مسلک مہر و محبت عام پابندیوں سے بلند تھا؛

میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو ۔۔۔ قشقہ کھینچا۔ دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ہم نہ کہتے تھے، کہیں زلف کہیں رُخ نہ دکھا — اختلاف آیا ہندو و مسلماں کے بیچ

مذہب سے میرے کیا تجھے، میرا دیار اور — میں اور، یار اور، مرا کاروبار اور

میر واحد اور محیط صداقت کے سامنے مذہب و ملت کے فرق کو غیر ضروری سمجھتے ہیں[۵]

کس کو کہتے ہیں نہیں میں جانتا اسلام و کفر
دیر ہو یا کعبہ مطلب مجھ کو تیرے در سے ہے

یارانِ دیر و کعبہ دونوں بلا رہے ہیں — اب دیکھیں میر اپنا جانا کدھر بنے ہے

ذیل کے اشعار سے ان کے نظریۂ اخلاق کی وضاحت ہو سکتی ہے:

خودداری
آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

خدمتِ خلق
بساں خاک ہو پامال راہ خلق اے میر
رکھے ہے دل میں اگر قصد سرفرازی کا

خوش سیرتی
خوش سیرتی ہے جس سے کہ ہوتا ہے اعتبار
ہے چوب خشک بو جو نہ ہووے اگر کے بیچ

کریم النفسی
بحر پر، نہر پہ، برسے ہے برابر ہی ابر
پیش ہر اک سے کریم آتے ہیں احسان کے ساتھ

معیشت کا طریقہ
ایسی معیشت کر لوگوں سے جیسی غم کش میر نے کی
برسوں ہوئے ہیں اٹھ گئے ان کو روتے ہیں ہمسائے ہنوز

ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں — وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ تجھے یاد کریں

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر   کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں   یہ کارگاہ ساری دوکانِ شیشہ گر ہے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام   آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

دنیا کی بے ثباتی | جس شاعر کی نظر اندر کی طرف زیادہ ہو اور جس کا خارجی ماحول مصیبتوں سے بھرا ہوا ہو اس کے یہاں ناپائیداری اور بے ثباتی کا مضمون حیرت انگیز نہیں ہے۔

خاک بھی موجزن جہاں میں اور   ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

غفلت سے ہے غرور تجھے ورنہ ہے بھی کچھ   یاں وہ سماں ہے جیسے کہ دیکھے ہے کوئی خواب

جہاں سے تو رختِ اقامت کو باندھ   یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

کائنات |

آیاتِ حق ہیں سارے یہ ذرّاتِ کائنات
انکار تجھ کو ہووے تو اقرار کیوں نہ ہو

میرؔ نے انسان کی عظمت پر جا بجا زور دیا ہے :۔

انسان کی عظمت |

آدمی سے مَلَک کو کیا نسبت
شان ارفع ہے میرؔ انسان کی

آدمِ خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ   آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

اب ایسے ہیں کہ صانع کے مزاج اوپر بہم پہنچے   جو خاطر خواہ اپنے ہم ہوئے ہوتے تو کیا ہوتے

خدا ساز تھا آذر بت تراش ہم اپنے تئیں آدمی تو بنا ہیں

کہاں ہے آدمی عالم میں پیدا خدائی صدقے کی انسان پر سے

مشت خاک اپنی جو پامال ہے یاں اس پہ جا سر کو کھینچے گا فلک پر یہ غبار آخر کار

عجز وانکسار
خاک ہے اصل طینت آدم چاہیئے اس کو عجز کرے
بات کی تہ کو کچھ پاتے تو اتنا سر نہ اٹھاتے تم

دل بے مدّعا
سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دلِ بے مدعا ہوتے

شوق منزل
برسے اگر شمشیر سروں پر منہ موڑیں زنہار نہیں
سیدھے جانے والے ادھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

ہمت
ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغ خیال
اک پر افشانی میں گذرے سر عالم سے بھی

میر کے اخلاق کی بنیاد دردمندی ہے جس کو انھوں نے زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہ سعادت بھی معمولی نہیں ہے۔

قصائد میر
میر نہایت خوددار اور آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ شرافت نفس نے انھیں کبھی خوشامد وتملق پر مجبور نہیں کیا اسی لئے وہ قصیدہ کے لئے فطرتاً موزوں نہیں تھے، جو لکھے وہ کم، اور ایسے جو ان کی غزلوں کے مقابلہ میں بلند مرتبہ نہیں رکھتے اُن میں نہ شکوہ ہے نہ زور۔ اور نہ "تا خدا باشد بہادر شاہ باد" والا انداز بیان، وہ خود فرماتے ہیں۔

مجھ کو دماغ وصف گل و یاسمن نہیں میں جوں نسیم باد فروش چمن نہیں

یہی وجہ ہے کہ قصائد میں ان کا درجہ بلند نہیں ہے۔ طباطبائی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ قصیدہ کہنا جانتے ہی نہیں۔[1]

نواب شیفتہ نے لکھا ہے۔

چنداں کہ غزلش بلند مرتبہ تر است ہم چناں قصیدہ اش پست پایہ تر۔[2]

لیکن صاحب شعر الہند نے لکھا ہے کہ میر کے قصائد سے بھی سرسری گذر جانا مناسب نہیں ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے: "یہ سچ ہے کہ اس زمانہ میں جو چیزیں قصیدہ گوئی کا معیار خیال کی جاتی تھیں ان سے ان کے قصائد خالی ہیں انھوں نے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا، دھوم دھام کی تشبیہیں نہیں لکھی ہیں۔ طولانی قصائد بھی ان کے یہاں نہیں پائے جاتے ان کے یہاں عموماً الفاظ کی شان و شوکت بھی موجود نہیں۔ قصائد میں ان کی بندشیں بھی چست نہیں ہوتیں (لیکن جب ان کے قصاید ان اوصاف سے معریٰ ہیں تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟) لیکن بایں ہمہ تشبیہات میں جو سادگی اور لطافت سودا کے یہاں پائی جاتی ہے وہ ہی میر کے قصاید میں موجود ہے۔ الفاظ کی شان و شوکت اگرچہ ان کے یہاں کم ہے تاہم جہاں کہیں انہوں نے زور طبع دکھلایا ہے وہاں شاندار الفاظ اور باوقار تراکیب کا انبار لگا دیا ہے۔ مثلاً ایک قصیدہ میں وہ مسلسل قسمیں کھاتے ہیں۔

به سینه سوزئ داغ و بآتش هجراں | به آه سرد سحرگاهی و بنالۂ زار
به عشق دیر بطوف حرم بسعیٔ تمام | بلوح مشهد عاشق بسوز شمع مزار
به ساغر مئے گلگوں بنو به سنگین | به دلنوازئ ساقی با بردبار یار
بقلقل و به سبو به لغزشش هر دم | به هستئ مے ناب و به خاطر هشیار
به سیل خانه خراب و به وادی مجنوں | بجر گه جرگه غزالاں بدیدهٔ خونبار

---

[1] شرح دیوان غالب ص ۹۲ [2] تذکرہ گلشن بے خار ص ۲۹۱۔

بگوشہ گوشہ سرشک وبدار بست مژہ | بقطرہ قطرہ شراب وبجام دست یار
بہ شوق وصل نگار وبجان مایوسی | بہ آرزوئے ہم آغوشی و بہ بخت کنار"

(شعر الہند ج ا ص ۶۶)

ان ترکیبوں کی خوشنمائی سے کسی کو انکار کی مجال نہیں۔ لیکن ان میں طمطراق اور شکوہ سے زیادہ غزلیت نمایاں ہے۔ عرفی کو اسی لئے قصیدہ میں خاقانی و انوری کا ہم مرتبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آخر میں مولوی عبد السلام ندوی نے سودا کے مشہور رزمیہ قصیدے۔

"اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل"

کی تشبیب کا مقابلہ میر کی تشبیب سے کیا ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل | رنگ گل جھمکے ہے ہر پات میں ہیگی او جھل

اور یہ ثابت کرنے کی کوشش ہے کہ میر کی تشبیب سودا سے بہتر ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس سے بھی متفق نہیں ہو سکے۔

ذیل میں ہم دونوں کے رزمیہ قصیدے کے اشعار شعر الہند سے نقل کرتے ہیں تاکہ اس بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو:۔

میر:	سودا:
جب سے خورشید ہوا ہے چمن افروز حمل	اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستاں سے عمل
رنگ گل جھمکے ہے ہر پات میں ہیگی او جھل	تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
وقت وہ ہے کہ زبس شوق سے چشم بلبل	بارے سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
خوبئ دلکش گل دیکھنے کو ہوا احول	لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بیکل
چشم رکھتا ہے تو چل فیض ہوا کو ٹک دیکھ	شاخ میں گل کے نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
نرگس اگتی ہے جہاں بوئی تھی دہقاں نے بصل	شمع ساں گرمئ نظارہ سے جاتی ہے پگھل

خون خمیازہ کش عاشق و غنچۂ گل
دونوں نکلے ہیں تہ خاک سے اب مست و نغل
جوش گل یہ ہے جہاں تک کرے ہے کام نظر
لالۂ زرکش گل سے ہیں بھرے دشت و جبل
لطف روئیدگی مت پوچھ کہ ہیں شیشے میں ہوں
سبزۂ غلطاں ہے لب جو پہ کہ خواب مخمل
سیر کر تازگی و خرمی و شادابی
خشک بھی شاخ نے اب سبز نکالی کونپل
برگ گل فیض ہوا کرتا ہے ہرا اخگر کو
آگ کے گر کہیں سلگا کے رکھیں ہیں منقل

حد ایام گے پیش از مدد نامیہ سے
بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل
بخشتی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہر دشت و جبل
واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاؤ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول شاعر
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

مولوی عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے:

> سودا کی تشبیب میں اوپر کے چار شعر تو بالکل تخئیلی ہیں جن سے بہار کی کوئی کیفیت نظر نہیں آسکتی۔

یہ دلیل عجیب ہے شعر میں تخئیل کا شامل ہونا (اگر وہ اعتدال سے متجاوز نہ ہو تو) حسن ہے عیب نہیں۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں:

> اگرچہ محاکات اور تخئیل دونوں شاعری کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے محاکات میں جو جان آتی ہے تخئیل ہی سے آتی ہے۔ ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں[1]

حیرت ہے کہ صاحب شعرالہند کی نظر میں سودا کے اس قسم کے اشعار نہیں بچے جن میں محاکات

---

[1] شعرالعجم جلد ۴ -

بھی ہی اور تخئیل بھی مثلاً

بارسی آب رواں عکس ہجوم گل کے — لوٹے ہے سبزہ پہ ازبسکہ ہوا ہی بکل

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار سودا کی تشبیب میں بہ کثرت ہیں جن کو انھوں نے اہمیت نہیں دی ہے

داسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگی کرنے روش پہ مخمل

تار بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ — ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے — خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

خیال آفرینی اگر بری چیز ہے تو وہ میر کے یہاں بھی ہی۔ بلبل کا احول ہو جانا اور بصل کی جگہ نرگس کا اگنا کیا ہی؟ اور "خون خمیازہ کش عاشقی و پنجۂ گل" کا دست و نعل ہو جانا کس قبیل کی چیز ہے؟ —— ان سب میں تخئیل ہی تو کارفرما ہے۔ مولوی عبدالسلام ندوی نے نہ پورے قصیدہ اور پوری تشبیب کو سامنے رکھا اور نہ ان اصولوں کو جو اس زمانہ میں قصیدہ کا معیار تھے۔ محض چار شعروں اکولے کر سودا کے خلاف اور میر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہی[1] یہ طریقۂ بحث آئین انتقاد سے منافی ہی۔

میر پختۂ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ اس لئے انہوں نے قصیدے بھی لکھے لیکن فن کے لحاظ سے ان کے قصائد، سودا و ذوق کے ہم رتبہ نہیں ہو سکتے اکثر جگہ ان کی تمہید معمولی ہے اور گریز پامال۔ الفاظ کا شکوہ، طبیعت کی بلند پروازی مضامین کی طرفگی، جوش، زور اور مبالغہ جو قصیدہ کے لئے ضروری ہیں میر کے یہاں کم ہیں۔ اسی لئے ان کے قصیدے بلند پایہ نہیں ہیں۔ میر کی افسردہ خاطری نے ان کا ساتھ مدحیات میں بھی نہیں چھوڑا۔ مدح میں جتنے قصیدے لکھے ہیں وہ سب شکوۂ فلک اور

---

[1] شعر الہند ج اول ص ۶۸، ۶۹۔

جفائے آسمان سے شروع ہوتے ہیں۔ ان میں جوش وخروش شان وشوکت، متانت و جزالت نہیں ہے اس لئے کہ ان کی طبیعت کا اصلی رجحان غزل کی طرف تھا۔ قصیدہ کی طرف نہیں ؎

قصیدہ کارِ ہوس پیشگان بود عرفی
تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

مولوی عبدالحق نے صحیح لکھا ہے:

میر صاحب نے چند قصیدے بھی لکھے ہیں۔ اگرچہ اس میں بھی وہ بند نہیں اور تراکیب خیال میں بلندی پائی جاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس گون کے نہیں تھے اور قصیدے لکھنا ان کی طبیعت کی افتاد کے خلاف تھا۔

میر کے قصائد کی تعداد سات سے زیادہ نہیں ہے اور ان میں سے چار ائمہ معصومین کی شان میں ہیں، دو آصف الدولہ کی مدح میں اور ایک شاہ عالم کی تعریف میں ——— ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر قصیدہ گوئی میں ایسے عاجز نہیں تھے جیساکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اپنی گرفتہ مزاجی کی وجہ سے انھوں نے اس صنف کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور اسی لئے وہ غزلوں کے مقابلہ میں "پست پایہ تر" ہیں۔

مثنویات میر

مولوی عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے:

میر مثنویات کے موجد اور نمونہ ہیں ان میں قدرتی انداز ہے انہیں کی بدولت مثنوی کو ترقی ہوئی میر حسن و شوق کو انھیں کا مقلد سمجھنا چاہیئے۔

ہم مولوی صاحب کی اس رائے سے متفق نہیں ہو سکتے کہ میر مثنویات کے موجد ہیں۔ دکن کی مثنویاں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ میر کی

بدولت مثنوی کو شمالی ہندوستان میں ترقی ہوئی۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ میر حسن اور شوق، میر کے مقلد ہیں۔ دونوں کے انداز فکر میر سے مختلف ہیں۔ نیاز فتحپوری نے لکھا ہے کہ

> میر حسن اپنے والد کے ساتھ بچپن ہی میں لکھنؤ آ گئے تھے اور یہیں کے ماحول میں ان کی شاعری نے آنکھ کھولی تھی۔ اس لئے لکھنوی معاشرت کے پس منظر پر سب سے پہلی کامیاب مثنوی میر حسن کی سحر البیان ہی خیال کی جاتی ہے۔[1]

اسی طرح شوق کی مثنویوں پر بھی نہ میر کا اثر ہے اور نہ میر اثر کا۔[2] ان میں خلوص اور ہلکے پن کا جو میل ہے وہ لکھنؤ کی زندگی کی غمازی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ واجد علی شاہ کے عہد میں بہ کثرت مثنویاں لکھی گئیں۔ خود بادشاہ نے اس طرف توجہ کی اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے شاعروں کو بھی شوق ہوا۔ اگر مثنوی بحر الفت (واجد علی شاہ) اور مثنوی عالم (بادشاہ محل) کو سامنے رکھ کر شوق کی مثنویوں کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شوق لکھنؤ کی ان ہی مثنویوں سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔[3]

میر نے حسب ذیل مثنویاں لکھی ہیں:

(۱) مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی
(۲) مثنوی در بیان ہولی
(۳) مثنوی در تعریف سگ و گربہ
(۴) مثنوی در بیان بز
(۵) مثنوی در بیان مرغ بازاں
(۶) مثنوی در ہجو خانہ خود
(۷) مثنوی در ہجو خانۂ خود کہ بہ سبب شدت باراں خراب شدہ بود

۱؎ مرزا شوق لکھنوی: خواجہ احمد فاروقی۔ مقدمہ ص ۴ (مطبوعہ لکھنؤ)
۲؎ مقدمہ خواب و خیال: ڈاکٹر مولوی عبدالحق (انجمن ترقی اردو ہند دہلی)
۳؎ کلاسکی ادب: خواجہ احمد فاروقی (مطبوعہ آزاد کتاب گھر دہلی)

(۸) مثنوی در مذمت برشگال کہ باراں دراں سال زیادہ شدہ بود۔

(۹) مثنوی در ہجو نااہل	(۱۰) مثنوی تنبیہہ الجہال
(۱۱) مثنوی اژدرنامہ	(۱۲) مثنوی در مذمت آئینہ دار
(۱۳) مثنوی در ہجو اکول	(۱۴) مثنوی در بیان کذب
(۱۵) مثنوی شکار نامہ	(۱۶) مثنوی ساقی نامہ
(۱۷) مثنوی شعلۂ عشق	(۱۸) مثنوی دریائے عشق
(۱۹) مثنوی عشقیہ	(۲۰) مثنوی معاملات عشق
(۲۱) مثنوی جوش عشق	(۲۲) مثنوی اعجاز عشق
(۲۳) مثنوی ننگ نامہ	(۲۴) مثنوی خواب وخیال

(۲۵) مثنوی در مذمت دنیا

ان میں چھ عشقیہ مثنویاں ہیں۔ سات کا تعلق نواب آصف الدولہ اور ان کے دربار سے ہے ایک مدحیہ اور چھ ہجویہ ہیں۔ تیرہ مثنویاں میر صاحب کی ذات یا ان کے ماحول سے متعلق ہیں۔

میر کی وہ مثنویاں جن میں کتے، بلی، بکری اور مرغ وغیرہ کے قصے درج ہیں ندرت سے خالی نہیں اور ان کے سوانح نگار کے لئے بہت اہم ہیں۔ انکی عشقیہ مثنویوں کی زبان ضرور قدیم ہے لیکن اس وقت اس سے بہتر زبان میں مثنوی لکھنا امکان سے باہر تھا۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھا ہے:

> باوجودیکہ میر کی عمر غزل گوئی میں گذری ہے مثنوی میں بھی بیان کے انتظام اور تسلسل کو انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور مطالب کو بہت خوبی سے ادا کیا ہے۔ جیسا کہ ایک مشاق اور ماہر استاد کر سکتا ہے۔

اس کے سوا صاف اور عمدہ شعر بھی میر کی مثنوی میں بمقابلہ ان کے اشعار کے جن میں پرانے محاورے یا فارسیت غالب ہے کچھ کم نہیں ہیں صدہا اشعار میر کی مثنویوں کے آج تک لوگوں کی زبان زد چلے آتے ہیں۔

اگرچہ میر کی مثنویوں میں قصہ بہت کم پایا جاتا ہی۔ انہوں نے چند صحیح یا صحیح نما واقعات بطور حکایات کے سیدھے سادے طور پر بیان کئے ہیں نہ اُن میں کسی شادی یا تقریب یا وقت اور موسم کا بیان کیا گیا ہے نہ کسی باغ یا جنگل یا پہاڑ کی فضا یا اور کوئی ٹھاٹھ دکھایا گیا ہی مگر جتنی میر کی عشقیہ مثنویاں ہم نے دیکھی ہیں وہ سب نتیجہ خیز اور عام مثنویوں کے برخلاف بے شرمی و بے حیائی کی باتوں سے پاک ہیں۔[1]

میر کی مثنویوں کے بیسیوں شعر زبان زد خلائق ہیں۔

صنبط کروں میں کب تک آہ اب ‏ ‏ ‏ چل اے خامے بسم اللہ اب

میر جی اس طرح سے آتے ہیں ‏ ‏ ‏ جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل ‏ ‏ ‏ کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل

یہ پیمبر ہے شہ ہے کہ درویش ہے ‏ ‏ ‏ سبھوں کو یہی راہ درپیش ہے

رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی ‏ ‏ ‏ دور پہنچی ہے میری رسوائی

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے ‏ ‏ ‏ اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری: حالی۔

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں اپنے زمانے میں بہت مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی اور دیگر خصوصیات کی وجہ سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، مناظر کی تصویر کشی داخلی محاکات نگاری ربط و تسلسل اور قدرتی بیان کے اعتبار سے بھی ان کا ایک درجہ ہے اور وہ بھلائی نہیں جا سکتیں۔

میر اپنے مکان کے متعلق لکھتے ہیں:

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واقع　　سو شکستہ تر از دل عاشق
کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک　　کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک
کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے　　کہیں چوہے نے سر نکالا ہے
کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا　　شور ہر کونے میں ہے مچھر کا
کہیں مکڑی کے لٹکے ہیں جالے　　کہیں جھینگر کے بے مزہ نالے
کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں　　پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں
اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے　　جی اسی حجرے میں ہی پھرتا ہے
آگے اس حجرہ کے ہے اک ایوان　　وہ ہی اس تنگ خلق کا ہے مکان
کڑی تختے سب ہی دھوئیں سے سیاہ　　اس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ
کبھو کوئی سپنولیا ہے پھرے　　کبھی چھت سے ہزار پائے گرے
کوئی تختہ کہیں سے ٹوٹا ہے　　کوئی واسا کہیں سے چھوٹا ہے
دب کے مرنا ہمیشہ مد نظر　　گھر کہاں صاف موت کا ہے گھر

میر کے زمانہ میں لکھنؤ میں مرغ بازی کا عام رواج تھا۔ ایک مثنوی میں اس فن کی اصطلاحات اور مرغ بازوں کے متعلق دل چسپ معلومات فراہم کی ہیں:

جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم　　گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم

مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش | جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش!
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں | سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے پھڑکنے لگے | اُن نے کی نوک پہ کرٹ کنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج | ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج وہج
مرغ کی ایک پر فشانی ہے | اُن کی صد رنگ بد زبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ | ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو تراتے ہیں | لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار | ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ میں آیا جو کچھ وہ بکنے لگے | تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے | بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ | لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ
پھر جو روز معین آوے گا | نالہ مرغ سحر ستاوے گا
عالم آوے گا گرد ویسا ہی | گرم ہنگامہ ہوگا ایسا ہی
میر ان کا نہ ہووے گو قایل | مرغ معنی پہ وہ بھی ہیں مایل

میر کی بعض محاکاتی نظموں کو دیکھ کر نظیر اکبر آبادی کی یاد آجاتی ہے۔ لیکن نظیر کا میدان وسیع ہے۔ اس کا مشاہدہ بے پناہ اور قوت استنباط غضب کی ہے۔ بایں ہمہ میر کی اوّلین تخم ریزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ نظیر کی آبیاری نے اس کشت زار میں لالہ و گل پیدا کر دیئے۔

شعلۂ عشق

میر کی عشقیہ مثنویوں میں شعلۂ عشق کا بڑا درجہ ہے یہ پرس رام کی بیوی کی سادہ اور دردناک کہانی ہے سارے قصہ پر یاس و الم چھایا ہوا ہے۔ میر نے قصہ کا آغاز اس طرح کیا ہی:۔

کب اس عشق نے تازہ کاری نہ کی | کہاں خوں سے غازہ کاری نہ کی
زمانے میں ایسا نہیں تازہ کار | غرض ہے یہ اعجوبۂ روزگار
عجب کام پٹنے میں اس سے ہوا | عجب اہل عالم کو جس سے ہوا

پرس رام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

کہ واں ایک جواں تھا پرس رام نام | خوش اندام و خوش قامت و خوش خرام
جوانی کے گلشن کا وہ آب و رنگ | گلستاں سے کام اس کی خوبی پہ تنگ
کھلے بال چلتا تھا وہ سرو ناز | قدم بوس کو آتی عمر دراز
جدھر کو وہ ٹک گرم رفتار ہو | قیامت ادھر سے نمودار ہو
سراپا میں اس کے جہاں دیکھیے | وہیں روئے مقصود جاں دیکھیے

آگے کے واقعات میر کی زبان سے سنیے:

خراماں نکلتا وہ جس راہ سے | قیامت تھی واں نالہ و آہ سے
فدا اس پہ جی جان ہر ایک کا | کہ مقصود دل تھا بد و نیک کا
کوئی کشتہ شوق رفتار کا | کوئی نیم جاں ذوق دیدار کا
انھوں میں سے اک عاشق زار تھا | اس آفت سے اس کو سروکار تھا
بہم ربط و چسپاں بہم اختلاط | نہ کم ہوتی گرمی نہ کم اختلاط
کہ ناگہ وہ دلبر ہوا کتخدا | رہا اپنے عاشق سے چندے جدا
زن و شو سے اخلاص باہم ہوا | اس آشفتہ سے رابطہ کم ہوا
نگاہیں بہم دل میں کاوش کریں | سخن سے وفا بیں زادش کریں
ہوا ربط چسپاں بہم اس قدر | کہ دشوار اٹھے ہمدگر سے نظر
رہیں دونوں دست و بغل روز و شب | کبھو منہ پہ منہ ہو کبھو لب پہ لب
دفانے جو تکلیف کی ایک روز | گیا اپنے عاشق کے وہ دل فروز

کئی دن میں جا کر جو اس سے ملا — کیا اس نے حد سے زیادہ گلا
کہ اے نازنیں آہ کن نے کہا — کہ تو حال سے میرے غافل رہا
مگر سد رہ تھا کسو کا فریب — ملا کوئی تجھ سے بھی دشمن شکیب
کوئی زلف زنجیر پا ہو گئی — کہ مسدود راہ وفا ہو گئی
طرح کس کی چتون کی دل میں کھبی — جگر میں پلک شوخ کس کی چبھی
کسو چشم نے تجھ کو جادو کیا — مرے جام عشرت کو لوہو کیا
کہا اُن نے تھی کد خدائی مری — نہ تھی بے سبب یہ جدائی مری
رکھ اب مجھ کو معذور لاچار ہوں — محبت کا میں تو گرفتار ہوں
نہ فرصت مجھے صبح ہے اب نہ شام — طرف اس کے ہے دل کو میل تمام
اسے بھی مرے ساتھ اخلاص ہے — دلوں کو بہم رابطہ خاص ہے
نکلتا ہوں گھر سے جو میں ایک آن — تڑپتا ہوں جا کر اسے نیم جان
نہ دیکھے جو مجھ کو تو مر جاوے وہ — وہیں جی سے اپنے گذر جائے وہ
غرض اس کو تاب و تحمل نہیں — شکیبائی ہجر بالکل نہیں
یہ سن کر کہا اس دل افگار نے — ستم کشتۂ دوری یار نے
کہ مجھ کو نہیں تیری باتیں قبول — یہ مکر زناں ہیں تو ان پر نہ بھول
جہاں میں فریب ان کا مشہور ہے — زبانوں پہ مکر ان کا مذکور ہے
پئے امتحاں عاقبت یک نفر — مقرر ہوا تا کہ جا اس کے گھر
کہے غرق دریا ہوا پرس رام — ہوئی زندگانی کی صبح اس کی شام
گیا تھا نہانے کو وقت سحر — سو ڈوبا وہ خورشید روشن گہر
گیا موج دریا نے سر سے گذار — اٹھا طبع نازک سے اس کے غبار
وہ گیسو جو بکھرے تھے بالائے آب — سو اب سا موج دریا کو ہے پیچ و تاب

پھریں بھتیں جو وے انکھڑیاں آب میں | سوئے گردشیں اب ہیں گرداب میں
تمنایں تھے جس کے سب دلفگار | سو دریا کو اب ہے وہ بوس وکنار
نہ سمجھا وہ نافہم اسرارِ عشق | نہ سوچا وہ ناتجربہ کارِ عشق
کہا غرق دریا ہوا پرس رام | ہوا کام اس رشک مہ کا تمام
کہے تو کہ موجوں کو تھا انتظار | کہ دست وبغل ہو گئیں ایک بار
گیا بھٹہ پانی میں ایسا شتاب | کہ گویا لبِ آب کا تھا حباب
گری ہو کے بیجان وہ دردمند | ہوا شورِ نوحے کا گھر سے بلند
موئی غم میں اس جملہ تن نازکے | گئی جان ہمرہ سخن ساز کے
وہ آیا جو تھا دل پریشاں گیا | کہ اس واقعہ سے پشیماں گیا
خبر ہے گیا اس کنے زود تر | جو تھا درپئے امتحاں بے خبر
کہ وہ رشک مہ امتحاں دے گئی | محبت کے ناموس کو لے گئی

میر نے شعلۂ عشق میں جو قصہ نظم کیا ہے وہ اس کے مخترع نہیں ہیں ۔ جلال لکھنوی نے لغت گلشن فیض میں پرس رام کے آگے لکھا ہے:

نام شخصے بود از عشاق[۱]

مثنوی کے ایک پرانے نسخہ میں جو مطبع مصطفائی میں چھپا ہے، قصہ کے شروع میں لکھا ہے:

آغاز قصہ جانکاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد رو بروئے دنیع دشریف بظہور پیوستہ[۲]

شوق نیموی نے اس واقعہ کو یادگار وطن میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اُس کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

---

[۱] گلشن فیض: جلال لکھنوی مرحوم [۲] شعلۂ عشق مطبوعہ مطبع مصطفائی ۔ نیز ملاحظہ ہو مثنویات میر: دریائے عشق و شعلۂ عشق (۱۲۳۷ھ) نسخہ قدیمہ مملوکہ عثمانیہ یونی ورسٹی ۔ حیدرآباد دکن

محمد شاہ بادشاہ کے دورِ حکومت میں پٹنہ شہر کے ایک محلہ چھوٹی پٹن دیبی میں محمد حسن ایک شریف نوجوان رہتے تھے۔ فارسی اور بھاکا کے ماہر تھے۔ ایک صبح گنگا دریا کے کنارے ٹہلنے گئے۔ وہاں ایک مہاجن کی لڑکی جس کا نام شام سُندر تھا اشنان کر رہی تھی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ایک دوسرے پر جی جان سے فریفتہ ہو گئے۔ شوقِ دید میں محمد حسن کبھی دیوانہ وار اس کی گلی کا طواف کرتے، کبھی گھنٹوں انتظار میں گھاٹ کنارے ٹہلتے رہتے۔ لیکن جنون بڑھتا ہی گیا۔ آخر کار سنسکرت کا مطالعہ شروع کیا۔ وید اور رامائن پر قدرت حاصل کی، اشلوک ازبر کئے اور جوگی پنڈت کے لباس میں محمد حسن مہاجن کے ہاں آنے جانے لگے اپنا نام برس رام (یعنی روح الامین) رکھا۔ مہاجن کے یہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ سارا گھر مہاتما جی کے چرنوں میں تھا....... کچھ دنوں بعد شام سندر کی شادی کسی اور سے ٹھہری اور برس رام ہی اس رسم کے پنڈت مقرر کئے گئے عین شادی کے روز گھر میں آگ لگی۔ خود لگی یا لگائی گئی۔ اللہ کو معلوم۔ جان بچا کر لوگ بے تحاشا بھاگے۔ غریب شام سندر اپنے کمرہ میں غش کھا کر گر پڑی، برس رام اسے آغوش میں دبوچے اپنے گھر لے آئے۔ جب مہاجن کا سارا گھر جل کر راکھ ہو گیا تو اسے اور اس کے گھر والوں کو یقین ہو گیا کہ شام سندر جل بُھن کر کباب ہو گئی۔ ادھر محمد حسن نے شام سندر کو مہاجن کے پاس پہنچانا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ آخر کار اس سے نکاح کر لیا اور دونوں خوشی بخوشی رہنے لگے۔

ایک سال محمد حسن جھتر کے میلہ (واقع درمیان سون پور و حاجی پور) سے واپس آ رہے تھے کہ ان کی کشتی بھنور میں پھنسی اور الٹ گئی۔ ان کے ڈوب جانے کی خبر آناً فاناً ایسی مشہور ہوئی کہ شام سندر نے کلیجہ پیٹ لیا اور جان بحق

ہوگئی۔ محمد حسن نے ڈبکیاں ضرور کھائیں لیکن غرقِ آب نہ ہوئے بلکہ ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر آ لگے۔ شام سندر کی جواں مرگی سے دل پر اتنی گہری چوٹ کھائی کہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ادھر دریا کے کنارے کچھ اور ہی تماشا تھا، آدھی رات کو ایک تیز و تند روشنی آسمان سے اترتی "اور حسن حسن" پکارتی۔ محمد حسن نے جب شعلۂ آسمانی کا حال سنا تو بے قرار ہو گئے۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ ایک کاغذ پر کچھ لکھا، اسے صدری کی جیب میں ڈالا اور چند احباب کے ساتھ کشتی میں سوار دریا کے دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ اور آدھی رات گزر جانے پر آسمان سے وہ شعلہ اترا، کناروں پر دوڑا "اور حسن حسن" پکارنے لگا۔ محمد حسن کی عجب حالت ہوئی۔ بجلی کی تیزی سے وہ شعلہ کی طرف لپکے اور احباب کے دوڑتے دوڑتے یہ جا، وہ جا۔ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سطحِ آب پر دو تیز و تند روشنیاں ابھریں "اور حسن، شام سندر، حسن شام سندر" کہتی ہوئی ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگیں، جب دونوں مل گئیں تو بھک سے روشنی کی چمک بجلی سی ہوگئی اور دریا سارا منور ہو گیا۔ معاً یہ چمک ماند پڑ گئی اور پھر کبھی کوئی روشنی دیکھنے میں نہ آئی۔ محمد حسن کی لاش کا کوئی پتہ نہ چلا۔[۵۱]

محمد حسن نے تھوڑی دیر آرام کرنے کی غرض سے اپنی صدری اتاری تھی لیکن دوبارہ اس کے پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ اس صدری کی جیب سے ایک کاغذ نکلا تھا جو (بقول شمیم رضوی صاحب) میر اور راسخ کے ہم عصر خواجہ عبداللہ تابؔد عظیم آبادی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) کے پاس محفوظ رہا۔ اسے انھوں نے اپنے خط کے ساتھ شاہ عالم کے بیٹے

---

۵۱ یادگارِ وطن؛ شوق نیموی مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ۱۸۹۶ء صفحہ ۳۲ تا ۳۵، بحوالہ "برگِ گل" کراچی شمس اص ۲۴ - ۲۶ -

شاہزادہ مرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کو بھیجا تھا۔ تابدؔ عظیم آبادی کے خطوط کا مجموعہ اکبر کے زمانہ میں "زبدۃ المنشآت" کے نام سے شائع ہو گیا تھا۔ اس میں محمد حسن کے کاغذ کی نقل درج ہے۔ ملاحظہ ہو:

اے یارانِ وفاکیش و احبابِ خیر اندیش شما از حالِ من آوارۂ کوچہ محن مصیبت زدۂ گردشِ چرخ کہن محمد حسن آگاہی ندارید و نائرہ عشق شعلہ انگیز کہ در سینہ ام شرر ریزی ہا و کاشانۂ دلم را خاک سیاہ نمود، ازاں بے خبر ہستید۔ شمع رخیکہ دلم را پروانہ وار کردہ و آخر در سوگِ من جان دادہ۔ در حقیقت دختر مہاجنے بود و واقعہ اش پُر سوز و حسرتناک است۔ مدتہا در فراقش خونِ دل خوردم و سراسیمہ و بے قرار خاک بیزی ہا کردم۔ گاہ بہوائے دیدار بکوچۂ دلدار مجنوں وار پا کشیدم و گاہے بصورت جوگیاں مستانہ وش بآستانہ اش رسیدم و گاہے تا مدتِ چند بلباس برہمناں مصروف کتھا خوانی مانند شربتِ دیدارِ یار چشیدم۔ چوں نوبتِ عروسیش رسید بخانہ اش چناں آتشے سر گرفت کہ بطرفۃ العین نمونۂ آتش کدۂ پارس گردید۔ ہر کسے راہ نجات محبت و کسے پروائے عروس نداشت۔ درآں وقت من دل سوختہ بتبدیل لباس درآں جا حاضر بودم۔ بمعائنہ ایں حادثہ جگر سوز او را در آغوشِ خود گرفتہ از دریچہ بیروں کردم و بخانہ خویش آوردم۔ چوں وقتِ شب بود و ہنگامہ ہا برپا کسے نشناخت و تعرضے نساخت۔ ہمگناں دانند کہ چوں بخانۂ مہاجن آتش برافروختہ، دخترش نیز اندرون خانہ بسوخت چوں عشق من پاک بود، خواستم کہ بعزت و آبرو بخانۂ اش رسانم۔ آں شعلہ رُو دم سرد کشید و راضی نگردید۔ آخر الامر بحبالۂ نکاحِ خود در آوردم۔ ایں مختصر ایست از واقعاتِ گزشتہ کہ از احبائے من میر محمد رضا کہ فی الحال

بدحلی ہستند مفصلاً آگاہی دارند، از ایشان پرسیدنی است۔ دریں جزو زماں
انچہ برسرم گذشت حاجت بیان دارد۔ اکنوں بہ تحقیق پیوست کہ از چند روز بعد
نصف شب شعلۂ بشکل موج از آسمان سرمی زند و بہ آں روے دریا فرود
می آید و تا دیر سراسیمہ و بے قراری ماند و بصدائے حسرت آمیز و لہجۂ دردانگیز مرا
یاد می کند۔ نیک دانستم کہ روح پاک آں غیرتِ حور لاثانی بہ موج نورانی بتلاش
من زندہ در گور می آید۔ ہیہات ہیہات کہ من زندہ مانم و دعویٔ عشق برزباں
رانم۔ عزم بالجزم دارم کہ بہ آں شعلۂ آتشیں پیوستہ جاں بجاناں سپردہ آتش
شوق را بآب وصال فرونشانم۔ چشم کہ ہمگناں در حق من دل سوختہ دعائے
مغفرت سازند و از صدمہ فراق و درد ہجراں بہ نوحہ و زاری نپردازند۔[1]

اس واقعہ کو میر ہی نے نہیں۔ ان کے بعد منشی باقر علی خاں لکھنوی نے شعلہ جاں سوز کے عنوان سے نثر میں اور شوق نیموی نے سوز و گداز کے عنوان سے نظم میں لکھا ہے۔

شعلۂ عشق کے قصہ میں تاریخی صداقت اور تخیلی رنگ آمیزی کتنی ہے، یہ قطعی طور پر کہنا مشکل ہے لیکن بقول ڈاکٹر عبدالحق "جن اشخاص کا اس میں ذکر آیا ہے، ان کی ساری حالت حقیقی رنگ میں دکھلائی ہے۔ قصے کی دلچسپی اس میں نہیں کہ کس کس نے کیا کیا کیا؟ بلکہ اس راز میں ہے کہ ہوئی، اُن ہوئی نہیں ہو سکتی۔ مثنوی میں ہر چیز انسانی

---

[1] زبدۃ المنشآت: خواجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی۔ جناب نسیم رضوی کا بیان ہے کہ یہ کتاب اب نایاب ہے اس کی ایک کاپی جناب ابوالعاص صاحب رئیس پٹنہ کے کتب خانہ میں موجود تھی؛ مخدومی قاضی عبدالودود صاحب نے اس سلسلہ میں راقم الحروف کو لکھا تھا: "ابوالعاص صاحب کی کتابیں کتب خانہ مشرقیہ میں آگئی ہیں مگر جہاں تک مجھے یاد ہے زبدۃ المنشآت ان میں نہیں ۔۔۔۔ تائید کے خطوط وغیرہ کا ایک مجموعہ ریاض المنشآت میرے پاس تھا، در کتب خانہ مشرقیہ میں بھی ہے اس میں واقعہ معلومہ کے متعلق ایک لفظ نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ واقعہ صحیح ہے۔"

زندگی سے کامل طور پر مطابق ہے، سوائے انجام کے جسے تخیل کی پرواز، حقیقی سے خیالی زندگی میں اڑا لے گئی ہے[1]۔"

حکایت عشق

میر کی عشقیہ مثنویوں میں حکایتِ عشق بھی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ اس کا ہیرو افغان پسر ہے۔ جو غایت درجہ پرکار و پرہیزگار تھا"

تناسب بہت اس کے اعضا کے خوب ۔۔۔ سراپا میں دیکھو تو ہر جا ہے خوب
خوش اندام و خوش رو و پاکیزہ خو ۔۔۔ کسی وقت رہتا نہ تھا بے وضو

وگر آگے سے ہو پری کا گذر ۔۔۔ حیا سے نہ اس پر کرے ٹک نظر
جوانی کا ہنگام طاعت کا صرف ۔۔۔ لب سرخ پر دلبروں کا نہ حرف

اتفاقاً اس کی شرمگیں نگاہیں ایک شادی شدہ عورت سے لڑ گئیں اور دونوں تیغ عشق سے زخمی ہو گئے۔

کیا چند شرط وفا ہی کا پاس ۔۔۔ لگے رہنے دونوں گھروں میں اداس
کئی دن میں ہندو زن آنے لگی ۔۔۔ لئے پانی اس راہ جانے لگی
نگاہیں ہوئیں ہمدگر آشنا ۔۔۔ محبت کا دونوں نے پانی بھرا
یہی مدتوں دیکھا دیکھی رہی ۔۔۔ دلوں کی کسو سے نہ ہرگز کہی

میر نے دونوں کی خاموش محبت کو بڑے پر اثر انداز میں بیان کیا ہے دونوں کی محبت بے لوث اور پاکباز قسم کی تھی اس لئے شمع کی مانند گھلتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد شوہر زن، دق میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ عورت عشق سے رہائی اور سماج سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے لئے ستی پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی خبر اس نو گرفتار کو بھی ہوئی اور وہ جذبۂ الفت سے بے اختیار ہو کر دریا کے کنارے پہنچ گیا:

---

[1] مجموعہ انتخاب کلام میر صفحہ ظ۔

یہ بے تاب ہو آگ پر بھر پڑا　　　پتنگا سا اس آگ میں گر پڑا

مگر دوستوں نے بچالیا اور عورت جل کر خاک ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد عورت راکھ کے ڈھیر سے نکل کر افغان پسر کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس نوجوان کو

اسی ناز و انداز و خوبی کے ساتھ
اٹھایا اُسے ہاتھ میں لے کے ہاتھ

اس کے بعد دونوں غائب ہو گئے۔ ؎

ہوئے جاتے جاتے نظر سے نہاں　　　گیا عشق کیا جانے لے کر کہاں

اس مثنوی کا اختتام قابل اعتراض ہی۔ لیکن اس میں جو معصومیت، درد اور اثر پنہاں ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دریائے عشق میر کی مثنوی دریائے عشق کو جو مقبولیت حاصل ہی اس میں آج تک کمی نہیں آئی۔ گلشن ہند میں لکھا ہی۔

طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے خصوصاً دریائے عشق....
ایک جہاں کے مرغوب ہے۔[1]

اس مثنوی کا قصہ بھی سادہ ہے۔ ایک "جوان رعنا" ایک "مہ پارہ" پر عاشق ہو گیا جب عشق کا چرچا ہوا تو "کدخدائے خانہ" نے یہ صلاح ٹھہرائی کہ اس "عزتِ مہ تاباں" کو ایک دایۂ غدار کے ساتھ دریا کے پار بھیج دے۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ پوری داستان میر ہی کی زبان سے اچھی معلوم ہو گی۔ یہاں دریائے عشق کے مربوط اشعار پیش کئے جاتے ہیں تاکہ قصے کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک جا ایک نوجوان رعنا تھا　　　لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم　　　دل وہ رکھتا تھا موم سی بھی نرم

---

[1] گلشن ہند ص ۲۱۰۔

شوق تھا اس کو صورت خوش کا انس رکھتا تھا وضع دلکش سے
الغرض وہ جوان خوش اسلوب ناشکیبا رہے تھا بے محبوب
ایک دن بے کلی سے گھبرایا سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گل پاس وہ صنم ٹھہرا کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
ایک خیاباں میں سے ہو نکلا ایک سایے تلے سے رو نکلا
نہ تسلی ہوا دل بے تاب نہ تھما چشم تر سے خون ناب
ناگہ اس کوچہ سے گذر ہوا آفت تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے اک مہ پارہ تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اس پہ اک نظر اس کی پھر نہ آئی اُسے خبر اس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بے قراری نے کج ادائی کی تاب و طاقت نے بے وفائی کی
منہ جو اس کا طرف سر اس کے پھرا مضطرب ہو خاک پہ یہ گرا
جھاڑ دامن کے تئیں وہ مہ پارہ اٹھ گئی سامنے سے یک بارہ
وہ گئی۔ اس کے سر بلا آئی خاک میں مل گئی وہ رعنائی
ہاتھ جانے لگا گریباں تک چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک
طبع نے ایک جنوں کیا پیدا اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
سوزش دل نے جی میں جاگہ کی داغ نے آ جگر کو آتش دی
بستر خاک پر گرا وہ زار درد کا گھر ہوا دل بیمار
خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ رابطہ آہ آتشیں کے ساتھ
خلق اس کی ہوئی تماشائی پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسی نے شفقت سے رو دیا اُن نے ایک حسرت سے

چشم تر سے لہو بہا کرتا | صبح کے باد سے کہا کرتا
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی | دور پہنچی ہے میری رسوائی
ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ | دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے | اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
سنگ باراں سے سخت ہوں دل تنگ | شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب | جانا ہر اک نے عاشق بیتاب
منہ پر اس کے جو رنگ خوں نہیں | عشق ہے اس کو یہ جنوں نہیں
ہے نگاہ اس کی جس طرف مائل | اس طرف ہی گیا ہے اس کا دل
جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں | جاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا | مضطرب کدخدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہر دفع رسوائی | بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرت مہ تاباں | جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
شب محافے میں اس کو کرکے سوار | ساتھ دے ایک دایۂ غدار
پار دریا کے جلد رخصت کی | اس طرح فکر رفع تہمت کی
گھر سے باہر محافہ جو نکلا | اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
تپش دل سے ہو کے یہ آگاہ | ہو لیا ساتھ اس کے بھر کے آہ
واں کے رہنے سے اس کو کام نہ تھا | وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا
دست افشاں و پائے کوباں یہ | تھے محافے کے ساتھ گرم رہ
قطرہ زن اشک سا وہ راہ تمام | در پئے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زبان پر جاری | خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہمسری اس کی تھی میسر کب | ہے مجھے بخت واژگوں سے عجب

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے / اڑنے لاگے جگر کے پرکالے
اضطرابِ دلی نے زور کیا / ان نے بے اختیار شور کیا
کاے جفا پیشہ و تغافل کیش / اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
مجھ چھپایا ہی تو نے اس پر بھی / نگہ التفات ایدھر بھی
ہے تو نزدیک دل سوائے طنّاز / لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز
ناز نے ایک نفس نہ رخصت دی / آئینہ نے تجھے نہ فرصت دی
تو تو واں زلف کو بنایا کی / جاں یاں پیچ و تاب کھایا کی
تجھ کو تھی اپنے خالِ رخ پہ نگاہ / دل مرا مبتلائے داغ سیاہ
تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی چال / میں ستم کش ہوا کیا پامال
گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن / تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلّی کی / وعدۂ وصل سے تشفّی کی
کاے ستم دیدۂ غم دوری / ہو چکا اب زماں مہجوری
زار نالی نہ کر شکیبا ہو / عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا / نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزم عشرت کریں گے باہم ساز / ہو جواب اپنے دوست کا ہمساز
دے کے اس کو فریب ساتھ لیا / دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک در پردہ ان نے یہ ٹھانی / کیجیے اس سے خصمی جانی
یہ تو دل تفتۂ محبّت تھا / سخت وارفتہ محبّت تھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود / ہو فلک سی ہلال جیسے نمود
کی کنارے پہ لا کے استادہ / تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینہ میں جلد جا پہنچا / یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا

بیچ دریا میں دایہ نے جاکر / کفش اس گل کی اس کو دکھلاکر
پھینکی پانی کی سطح پر اکبار / اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش / موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو / چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو
اس طرف آب کے اترنا ہے / اس نواحی کی سیر کرنا ہے
پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود / ظلم ہے ہو ویں گر غبار آلود
سن کے یہ حرف دایۂ مکار / دل سے اس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر کارِ عشق کی تہ سے / جست کی اس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینے میں یا کہ دریا میں / موج زنجیر ہو گئی پا میں
کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب / تھی کشش عشق کی کہ گر تہِ آب
کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں / لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں
ڈوبے جو یوں کہیں وہ جا نکلے / غرق دریائے عشق کیا نکلے
عشق نے آہ کھو دیا اس کو / آخر آخر ڈبو دیا اس کو
قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ / آئی وہ رشک مہ ز خود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ / ہو گیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا / آرزو مند اس جہاں سے گیا
شور و فتنے تھے اس تلک سارے / اب تو بدنامیاں نہیں بارے
دل تڑپتا ہے متصل میرا / مرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا
وحشتِ طبع اب تو افزوں ہے / حال جی کا مرے دگرگوں ہے
بے دماغی کمال ہوتی ہے / جان تن پہ وبال ہوتی ہے
دایہ بولی کہ اے سراپا ناز / حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا — سدّرہ کون ہے نکلنے کا
ہو محافے میں دل خوشی سے سوار — شاد شاداں کر آب سے تو گذار
صبح گاہاں وہ غیرت خورشید — اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النہار دریا پر — روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ — یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش — تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند — پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر — گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
موج ہر اک کمند شوق تھی آہ — لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ
دام گسترده عشق تھا تہ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
کودے غواص و آشنا سارے — تا بہ مقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب — نہ لگا ہاتھ وہ در نایاب

اس مثنوی کا انجام بھی الم ناک ہے۔ بالعموم میرؔ کے ہر قصہ کا اختتام اسی طرح عاشق و معشوق کی موت پر ہوتا ہے۔ میرؔ کو جذبہ نگاری میں کمال حاصل ہے۔ یہ کیفیات فطرت کے مطالعہ کے علاوہ ان کے ذاتی تجربات کا نتیجہ ہیں یہ ہی وجہ ہے کہ وہ درد و اثر سے خالی نہیں۔

میرؔ نے عام طور پر عشق کی عالم گیر کارفرمائیوں سے بحث کی ہے۔ ان کی مثنویاں عشق و محبت کے مرقعے ہیں ان کے پلاٹ غیر اہم اور معمولی ہیں۔ اصل چیز وہ پاک اور سچا جذبۂ محبت ہے جو ہر مثنوی کی فضا پر چھایا ہوا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

کا خیال ہے کہ دریائے عشق کا ماخذ ایک غیر معلوم شاعر کی فارسی مثنوی قضا و قدر ہے جس کا سنہ تصنیف اور سنہ کتابت ۱۱۱۳ھ ہے[1]۔ انھوں نے اس گم نام فارسی مثنوی کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ شاعرانہ اور فنی حیثیت سے بہت معمولی اور ناقص ہیں ان میں اور میر کے اشعار میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ قصہ میں بھی میر نے عشق کے واردات اور دایہ کے قصہ کا اضافہ کیا ہے اور اپنے نفس گرم کی آمیزش سے اس کی ساری فضا کو بدل دیا ہے۔

شکار نامے میر کے صید ناموں سے ان کی سیرت اور لکھنؤ کی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ دہلی کے مقابلہ پر لکھنؤ میں میر کو زیادہ آسائش میسر آئی۔ وہ دربار کے تعلق سے شاہی ضیافتوں اور تقریبوں میں حصہ لیتے تھے۔ اور ایسے موقعہ پر نظمیں بھی لکھتے تھے۔ وہ دو دفعہ نواب آصف الدولہ کے ہمراہ (جن کو انھوں نے "سخن ور نواز" اور "عاشق ہنر" کہا ہے) شکار میں بھی گئے۔ اور بطور ارمغان و یادگار صید نامے بھی نظم کئے۔ اُن کی شان نزول کے متعلق خود میر نے لکھا ہے:

زمانے میں ہے رسم کہنے کی کچھ — امید اس سے ہے نام رہنے کی کچھ
کو سی ہوئی شاہ نامے کی فکر — کہ محمود کا لوگ کرتے ہیں ذکر
گیا شاہ جہاں نامہ کہہ کر کلیم — دلِ شاعراں رشک سے ہے دو نیم
کنھوں نے کہی عشق کی داستاں — ہوا کوئی کھانے سے ہم داستاں
پئے آصف الدولہ میں نے بھی میر — کہے صید نامے بہت بے نظیر
مگر نام نامی یہ مشہور ہو — گئے پر بھی لوگوں میں مذکور ہو

اِس کے بعد آصف الدولہ کی تعریف اور حسن طلب ملاحظہ ہو:

زہے آصف الدولہ، داد گر — سخن ور نواز اور عاشق ہُنر

---

[1] میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ: اردو اپریل ۱۹۵۱ء۔

دہش سے جہاں اس کے زنہار پذیر | وزیر ابن دستور ابن وزیر
کریمی کرے تو جہاں در جہاں | کف جود خورشید ساز رفشاں
سراپائے احسان تمامی ہمم | ہمہ تن مروت سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار | یہ حرف و حکایت بھی ہی یادگار

ان صید ناموں میں میرؔ نے شکار کی پوری تفصیل پیش کی ہی۔ جانوروں کے علاوہ جنگلوں پہاڑوں اور دریاؤں کا حال نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا ہی۔ دوران سفر میں جو موسمی تبدیلیاں واقع ہوئیں ان کو بھی بڑی صفائی اور سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بعض جگہ قدرت بیان کے نہایت اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں:

(آصف الدولہ دوسرے روز شکار کے لیے روانہ ہوتے ہیں)

چلا پھر بھی نواب گردوں شکار | رسد باؤ کے گھوڑے پر ہو سوار
روانہ ہوئی فوج دریا مثال | نہنگوں کی اب کھینچی جاویگی کھال
گیا شور تا آسماں بریں | ہوئی گرد افواج گردوں قریں
زمیں ہو گئی جائے خوف و خطر | فلک کو لگے دیکھنے شیر نر
چڑھا بس کے دریائے فوج گراں | اتر ہاتھیوں کی گئیں مستیاں

میرؔ نے درندوں، پرندوں اور دریائی جانوروں کی تفصیل ایسے دلآویز پیرایہ میں پیش کی ہی کہ اس کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہی کہ اردو کا وہ غزل گو شاعر جس کے متعلق عام طور پر یہ مشہور ہے کہ اس نے کبھی اپنے پائیں باغ کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا اور جس کا تخیل بقول معترضین محدود تھا اور جس کی نظر کوتاہ، مشاہدہ اور معلومات کی ایسی وسعت اور ہمہ گیری کا بھی ثبوت دے سکتا ہی۔

ان صید ناموں میں جا بجا غزلیں بھی ہیں اور بعض بہت ہی پاکیزہ ہیں ہم چند منتخب اشعار پیش کرتے ہیں۔

جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں
داغ جگر پہ جلائے ہیں چھاتی پہ جراحت کھائے ہیں

تب تھے سپاہی اب ہیں جوگی آہ جوانی یوں کاٹی
ایسی تھوڑی رات میں ہم نے کیا کیا سوانگ بنائے ہیں

میر مقدس آدمی ہیں تھے سب ہی کف میخانے ہیں
صبح جو ہم بھی جا نکلے تو دیکھ کے کیا شرمائے ہیں

میر نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے   نام خدا ہو جوان کچھ تو کیا چاہیئے

میر نے ان شکارناموں اور غزلوں کا ذکر اپنی سوانح عمری میں بھی کیا ہے۔

بندگان عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند۔ من در رکاب بودم شکارنامہ موزوں نمودم۔ بار دیگر باز برائے شکار سوار شدند، تا دامن کوہ شمالی تشریف بردند۔ اگرچہ مرداں از نشیب و فراز ایں سفر دور و دراز سخت خوردند لیکن شکار چنیں و فضائے چنیں و ہوائے چنیں ندیدہ بودند۔ بعد از سہ ماہ بدر القرار خود آمدند۔ فقیرے شکارنامۂ دیگر گفتہ بحضور خواند۔ دو غزل از غزلہائے شکارنامہ انتخاب زدہ خود بدولت مخمس کردند۔ بخوبی کرمی بایست و در زمین غزل لیند افتادہ غزل دیگر فرمایش نمودند۔ آں ہم از فضل الہٰی گفتہ شد۔ زباں مبارک بہ تحسین کشادند و داد سخن دری دادند۔[1]

ساقی نامے وغیرہ | شاہی تقاریب کے سلسلے میں میر نے شکارناموں کے علاوہ مندرجہ ذیل چار مثنویاں بھی لکھی ہیں۔

(۱) ہولی (۲) ساقی نامہ ہولی (۳) ساقی نامہ (۴) کتخدائی آصف الدولہ۔

---

[1] ذکر میر ص ۱۴۷ و ۱۴۸۔

میرنے عام توقعات کے خلاف ساقی ناموں اور ہولی کی مثنویوں میں خوب دل کھول کر عیش و عشرت کی داد دی ہی۔ اور آتش بازی اور رنگ کھیلنے کے دل کش مناظر دکھائے ہیں۔ ان مثنویوں سے عہد آصف الدولہ کی شان و شوکت کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ اس سیاسی انحطاط کے زمانہ میں بھی ہماری معاشرت اور تہذیب کے رشتے نہایت مضبوط تھے۔ ہندو مسلمان ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ہولی اور محرم ہمارے مشترک تہوار تھے[1]

ان نظموں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہی کہ میر گرد و پیش کے حالات سے مصالحت بھی کر سکتے تھے اور وہ ان محفلوں میں پوری دل شگفتگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے
"مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی" کے چند ابتدائی اشعار یہ ہیں۔

آؤ ساقی بہار پھر آئی ‏ ‏ ہولی میں کتنی شادیاں لائی
دست و سنو رہے جو زر افشاں ‏ ‏ پھر جہاں کہن ہوا ہے جواں
جس طرف دیکھو معرکہ سا ہے ‏ ‏ شہر ہے یا کوئی تماشا ہے
چشم بد دور ایسی بستی سے ‏ ‏ یہی مقصد ہے ملک ہستی سے
لکھنؤ دلّی سے بھی بہتر ہے ‏ ‏ کہ کسو دل کی لاگ ادھر ہے

کیف و نشاط کے اِس عام منظر میں شاعر کی مضطرب آرزوئیں بھی ملاحظہ ہوں:

آؤ ساقی قرار ہے باہم ‏ ‏ کہ تماشا کناں پھریں خرّم
زن رقّاص پر نگاہ کریں ‏ ‏ کسو سادہ سے چل کے راہ کریں
کسو دلبر کے کھینچ لیویں ہاتھ ‏ ‏ کسو محبوب کو اٹھالیں ساتھ

---

[1] ملاحظہ ہو ایک مرہٹہ کیمپ: ۱۸۰۹ء ص ۵۱ ، اور "انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ": از عبداللہ یوسف علی ص ۷۹

خوش تنوں سے کریں ہم آغوشی — کسو نازک بدن سے ہم دوشی
کہیں دو جام سے ہوں سرمست — جائیں گے تھوڑی دور دست بدست
پھلے بن جائیں گے کسو کو دیکھ — پھر منیں گے کسو کے رو کو دیکھ
اب گلابی کو لیں گے بھر بھر ہم — باقی ساقی پئیں گے پھر کسا ہم

رنگ کھیلنے کا یہ منظر بھی ملاحظہ ہو:

چھڑیاں پھولوں کی دلبروں کے ہاتھ — سینکڑوں پھولوں کی چھڑی کے ساتھ
قمقمے جو گلال کے مارے — مہوشان لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں — گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں
جشن نوروز ہند ہولی ہے — راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

روشنی کا اہتمام دیکھیے:-

عشق ہے اے گروہ آتش زن — دونوں رستے چراغ ہیں روشن
در دولت سے لے کے تا سر آب — ہے چراغ اور شمع ہی کی تاب
پھر سر پل سے تا عمارت نو — جلتے ہیں مجتمع دیئے سو سو

میر نے کھیل تماشوں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے:

ہاتھی رنگے گئے پڑی ہے دھوم — جیسے ابر سیاہ آئے جھوم
خیمہ استادہ کر چکے شب باز — پتلیوں نے کیا خرام ناز
یاں کی صحبت کا تھا نمونہ سب — شاہ دستور حکم کار و ادب
آئے شکلیں بنا کے صورت باز — ڈوم ڈھاڑی بنے بجا کر ساز
نقل معقول کی سو حاجی بنے — سج کے عمامے سر پہ کتنے جنے
کوئی جوگی کوئی فقیر بنا — کوئی داڑھی لگا کے پیر بنا
کچھ سپاہی بنے تھے کچھ تجار — کوئی زاہد ہوا کوئی خمار

جس کی تقلید کی ہے ویسی طرح   اصل ہوتی نہیں ہرا یسی طرح

اس کے بعد شادی کے جلوس۔ آتش بازی، داد و دہش، انعام و اکرام اور انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر ہے۔

مثنوی خواب و خیال، میر کی دیوانگی کا منظوم مرقع ہے اس کے اقتباسات ایک اور مقام پر دئے جا چکے ہیں۔ میر کے ایک چچا فاتر العقل تھے۔ میر میں بھی ایک وارفتگی کی شان شروع سے موجود تھی۔ لیکن خان آرزو کے یہاں قیام کے زمانہ میں میر کو کچھ ایسے صدمے پہنچے۔ کہ آتشِ جنوں بھڑک اٹھی اور وہ زندانی و زنجیری ہو گئے۔

مثنوی دنیا۔ پایان شیب کی تصویر ہے۔ اس میں میر نے اپنی ضعیفی اور پیرانہ سالی کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ میر کے مصائب پیری کی تصدیق ذکر میر سے بھی ہوتی ہے[1]

اکثر اوقات بیمار می باشم۔ چندے درد چشم کشیدم ضعف بصر بچشم خود دیدم۔ عینک خواستم ...... غرض کہ از ضعف قوی و بے دماغی و ناتوانی و دل شکستگی و آزردہ خاطری معلوم می شود کہ دیر نخواہم ماند[2]

مثنوی دنیا میں لکھتے ہیں:۔

وگرنہ دیا سا بجھا جائے ہے   پھر اٹھ بیٹھوں تو جی چلا جائے ہے
سیہ روئے شیب اک ستم کر گیا   لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا
قلم رکھ دے کہ میر ختم کلام   تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

سرگزشت سفر، خانۂ میر، اور معنبہ کی طغیانی سے بھی میر کی خانگی زندگی اور ان کے

---

[1] ذکر میر ص ۱۵۲، ۱۵۳ [2] ایضاً ۶۴، ۶۵۔

ماحول کے متعلق بہت سی مفید باتیں معلوم ہو سکتی ہیں، مورخ اور سوانح نگار ان مثنویوں سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتا۔

مثنوی مرغ بازاں سے اس زمانہ کے لکھنؤ کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ مثنوی ننگ نامہ میں صعوبات سفر کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نظمیں فن کے اعتبار سے بلند نہ سہی لیکن وہ عصری معلومات کا گنجینہ ہیں۔ اور اس لحاظ سے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

میر کی مثنویاں سوانحی نقطہ نظر سے بھی بہت اہم ہیں۔ وہ گھریلو اشیاء مثلاً مرغ، بلی، کتے، بکری، مکان وغیرہ پر غائر نظر ڈالتے ہیں۔ اور ذاتی حالات و نفسی کیفیات کا نقشہ خوب کھینچتے ہیں۔ لیکن وہ عالم خارجی کی طلسم آرائیوں اور نیرنگیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ یہ خیال غلط ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل بے خبر تھے۔ اوپر کافی اقتباسات پیش کیے جا چکے ہیں اور یہاں ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ان مثنویوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سے میر کے سماجی ماحول اور ان کی فطرت اور سیرت کے موثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک آئینہ ہیں جن میں میر کے تمام خط و خال نظر آ سکتے ہیں۔

میر کی مثنویوں کی زبان اتنی منجھی ہوئی نہیں ہے جتنی غزل کی۔ ڈاکٹر زور کا خیال ہے کہ "ان میں ادبیت کا فقدان ہے"[1]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل نے بہت ترقی کر لی تھی اور مثنوی کو ابھی بہت سی منزلیں طے کرنا باقی تھیں۔

مراثی میر اصطلاح شاعری میں مرثیہ اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں شخص متوفی کے محاسن و فضائل درد و حسرت کے ساتھ بیان کیے جائیں"۔ لیکن ہمارے ملک میں مرثیے کا اطلاق زیادہ تر حضرت حسینؑ اور اُن کے رفقاء کے احوال شہادت پر ہوتا ہے۔

---

[1] تنقیدی مقالات: ڈاکٹر محی الدین زور قادری (میر کی مثنویات)

عرب میں مرثیہ گوئی کا عام رواج تھا اور ایامِ جاہلیت میں یہ فن کافی ترقی کر گیا تھا۔ لیکن محمدؐ کے نواسے پر عربی میں کوئی قابلِ ذکر مرثیہ نہیں ہے[1] اس کی وجہ یہ ہے کہ خانوادۂ امویہ کے ظلم و ستم نے تمام شاعروں کی زبانیں بند کردی تھیں اور واقعہ کربلا کو نظم کرنے کی جرأت کسی کو نہیں ہوتی تھی۔ ایران میں البتہ محتشم اور مقبل نے مرثیے لکھے اور اہلِ بیت کی غلامی کا حق ادا کردیا۔

اردو کا مرثیہ اپنی وسعت، ہمہ گیری اور فنی لوازم کے اعتبار سے فارسی سے مختلف ہے بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اردو ہی میں اس کی بنیاد پڑی اور یہ صنف اسی زبان میں نشو ونما پاکر درجۂ کمال کو پہنچی[2] اردو میں مرثیہ کی ابتدا کب ہوئی یہ تعیین مشکل ہے۔ لیکن اس کے ابتدائی دور میں محمد قلی قطب شاہ وجہی۔ شاہی، اور غواصی نے مرثیہ گوئی میں شہرت حاصل کی اس کے بعد بحری، ذوقی، امامی، رام راؤ سیوا، ہاشم علی برہان پوری، کاظم علی اور علی عادل شاہ نے نام پیدا کیا۔ ابوالحسن تانا شاہ کے مصاحب شاہ قلی خاں شاہی کے مرثیے شمالی ہندوستان میں بھی مقبول تھے[3]

ولی نے مرثیہ مثنوی کے پیرایہ میں لکھا۔ اس کے بعد سکندر، مسکین، حزیں، غمگین، گدا، عاجز، حسرت اور یک رنگ کے مرثیے مجالس عزا میں مقبول ہوئے۔ اور اس صنف سخن کا خوب رواج ہوگیا۔ ان کی زبان قدیم ہے اور شکل زیادہ تر مربع کی ہے لیکن وجہی اور غواصی وغیرہ نے غزل میں بھی مرثیے لکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شہدائے کربلا کے مرثیے، قصیدے، مثنوی، غزل،

---

[1] نگار: اردو شاعری نمبر = لکھنؤ اور دیگر اصناف سخن۔

[2] مرثیہ نگاری اور میر انیس: نگار جلد ۴ ش ۴ ص ۵۸ [3] گلزار ابراہیم ص ۱۶۳۔

مثلث، مربع، مخمس، مسدس، غرض سب ہی اصنافِ نظم میں لکھے جاتے تھے لیکن ضمیر لکھنوی نے مرثیے کے لئے مسدس کو مخصوص کر دیا اور اب زیادہ تر اسی کا رواج ہے۔

میر نے بھی مرثیہ کو اپنی جولاں گاہ بنایا ہے۔ ان کی کلیات کا جو قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے اس میں ان کے نو مرثیے شامل ہیں[1] ان میں سے ہر ایک کا پہلا بند رسالہ نیرنگ رام پور کے میر نمبر میں شائع ہو چکا ہے[2]۔ اس کے بعد ان ہی نو مرثیوں میں سے چھ اور ایک سلام کی نقل رسالہ اردو میں شائع ہو چکی ہے[3] لیکن پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانہ میں جو قلمی نسخہ کلیات میر کا ہے اس میں میر کے ۳۹ مرثیے اور سلام موجود ہیں۔ رام پور کے نسخے میں دو تو نئے ہیں باقی یہ سب مرثیے اس نسخہ میں موجود ہیں۔ اس طرح میر کے اکتالیس مرثیے اور سلام دستیاب ہوئے جن کو سید مسیح الزماں جائسی لکچرر الہ آباد یونی ورسٹی نے ایک مفید مقدمہ اور حواشی کے ساتھ مراثی میر کے نام سے شائع کر دیا ہے[4]۔

میر کی غزلوں میں جو نشتریت ہے وہ ان کے مرثیوں میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ اندرونی کشمکش اور باطنی تضاد ہے جس کو وہ کبھی دور نہ کر سکے۔ انھیں اپنی بڑائی کا بہت قوی احساس تھا، دوسری طرف انھیں اپنی شکست، محرومی اور بے کسی کا احساس بھی مغلوب کئے دیتا تھا۔ میر نے غزل میں اپنی کہانی بیان کی ہے اور اپنے اندرونی تجربات کا اظہار کیا ہے۔ اس لئے اس میں درد و الم کی نرالی شان ہے جس کا نشتر براہِ راست دل پر کھٹکتا ہے۔ یہ بات عام طور پر

---

[1] کلیات میر (قلمی)، رضا لائبریری رام پور نمبر ۳۸۲۔

[2] رسالہ نیرنگ رام پور: میر نمبر ۱۹۲۸ء

[3] ملاحظہ ہو رسالہ اردو: جنوری ۱۹۳۱ء و اپریل ۱۹۳۱ء

[4] مراثی میر: سرفراز قومی پریس لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۱ء

نہ ان کے مرثیوں میں ہے اور نہ عشقیہ مثنویوں میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ وہ اہل بیت کی محبت میں کسی سے پیچھے ہیں یا دوسروں کے عشق سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ بلکہ اپنی نفسیاتی افتاد سے مجبور ہیں۔ شعلۂ عشق اور دریائے عشق پُراثر ہیں لیکن خواب وخیال کی سی درد انگیزی اُن میں کہاں۔ اسی طرح میر دلّی کی تباہی سے متاثر ہوئے لیکن انھیں اپنے دل کے اُجڑنے کا رنج زیادہ تھا جہاں انھوں نے عام انسانیت کا ماتم کیا ہے۔ وہاں بھی اپنی اندرونی شدت کو خارجی عالم پر اس طرح طاری کر دیا ہے کہ معلوم اور عالم کا فرق مٹ گیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

دہر کا ہو گلہ کہ شکوہ چرخ　　اس ستم گر ہی سے کنایت ہے

یا ع　　ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

ان بنیادی حقائق کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں میر کے مرثیوں کو دیکھنا چاہیئے۔ لیکن کربلا کے بھی جن واقعات کو وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربے میں تحلیل کر سکتے ہیں، ان میں نسبتاً درد اور کسک زیادہ ہے۔ مثلاً حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد عورتوں کی فریاد اور حضرت عابد کی مصیبت، ان کی ذمہ داریاں، ان کی تنہائی کے بیانات، میر کے خاص موضوع ہیں۔ سردار کا مارا جانا، گھر کی تباہی، مخدرات کے بین، نئے امام کی مجبوریاں، بے شبہ ایسے بیانات ہیں جو سننے والوں کا جگر خون کر سکتے ہیں لیکن کربلا کے درد انگیز مناظر میں سے انھیں کا بار بار ذکر اس اہمیت کا پتہ دیتا ہے جو ان واقعات کو میر کے ذہن میں حاصل ہے[1]۔ میر کو بھی اپنی ابتدائی زندگی میں کچھ اسی قسم کے واقعات سے سابقہ پڑا تھا اسی لیے حضرت عابد کی مصیبتیں ان کے یہاں ایک اشارے اور علامت

---

[1] مراثی میر ص ۳۸۔

کی حیثیت رکھتی ہیں جن کے ذریعہ ان کی بہت سی تحت شعوری یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

قائم اور سودا کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مرثیہ کا کوئی اعلیٰ معیار نہیں تھا اور عام طور پر بگڑا شاعر مرثیہ گو سمجھا جاتا تھا۔ بقول شیخ چاند مرثیہ گویوں کی تعداد تو بڑھ گئی تھی لیکن مرثیہ گوئی کی حالت بری تھی[۱] جب ہم معاصر شعرا کے مرثیوں کو سامنے رکھ کر میر کے مرثیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ہمیں حقیر نہیں معلوم ہوتے۔ سودا کے علاوہ باقی سب سے ان کا "قد" نکلتا ہوا ہے۔ سودا کی رزم اور چہرے بہتر ہیں لیکن اثر انگیزی میں میر ان سے کم نہیں۔ اس کیفیت کو انہوں نے ہندوستانی رسم ورواج کے بیان اور سینہ زنی کے آہنگ سے بڑھایا ہے۔

ذیل میں ہم میر کا ایک سلام اور دو مرثیے نقل کرتے ہیں[۲] جن سے ان کے اسلوب کا اندازہ ہوگا۔

سلام[۳]

اے سبط مصطفیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے
اے جانِ مرتضیٰ کے تجھ کو سلام پہنچے
اے حکم کش قضا کے تجھ کو سلام پہنچے
اے غمزدہ سدا کے تجھ کو سلام پہنچے

بیٹے، بھتیجے، پیارے یار و رفیق سارے
ساقیٔ کوثر آگے کیا تشنہ لب سدھارے
پانی جو اُن نے مانگا سو تیر تجھ کو مارے
اے خستہ دل جفا کے تجھ کو سلام پہنچے

بابا شہِ ولایت نانا کی خلق امت
دریا کنارے اترے سارے وہ بے مروت
تو تشنہ کام و تنہا یہ رنج یہ مصیبت
اے مبتلا بلا کے تجھ کو سلام پہنچے

---

[۱] سودا: شیخ چاند ص ۲۸۶ [۲] یہ سلام اور مرثیے ہمیں عشرت علی خاں سحابی دہلوی کی وساطت سے حاصل ہوئے ہیں ملاحظہ ہو رسالہ اردو دہلی جنوری ۱۹۳۱ء اور مراثیِ میر ص ۱۵۵۔ [۳] یہ سلام مراثیِ میر میں نہیں ہے۔ (مراثیِ میر مطبوعہ لکھنؤ)

اللہ رے تیری عزت مرنا جو تو نے ٹھانا
آتا ہے کس سے ایسا بیکس ہو سر کٹانا
زنہار منہ نہ پھیرا گو پھر گیا زمانہ
اے دل زدہ رضا کے تجھ کو سلام پہنچے

برسا کی تیغ لیکن تو نے سپر نہ رکھی
کیا کہئے جب توجہ ہی جان پر نہ رکھی
دریا بہا کیا پر تو نے نظر نہ رکھی
کشتہ ہیں اس وفا کے تجھ کو سلام پہنچے

تسلیم کا رضا کا دیکھا ترا عجب ڈھب
یہ بندگی الٰہی بہ انکسار یا رب
وقت بریدن سر سجدہ میں تھا مؤدب
اے شوق کش خدا کے تجھ کو سلام پہنچے

مجلس میں گر پڑا تھا گرم آش کا پیالہ
غصہ کو کھا گیا تو منہ سے نہ کچھ نکالا
چھینٹیں پڑی جو تجھ پر بہا وہ لانے والا
اے صاحب حیا کے تجھ کو سلام پہنچے

تعریف سے ہے باہر سید ترا یہ ساکا
اب نقش ہر دلوں پر تیرا اثبات پاکا
شائستہ معرکے میں تو ہی تھا اپنا جاکا
اے بابِ صد ثنا کے تجھ کو سلام پہنچے

درویش بے بضاعت ہے میر دست کوتہ
غیر از سلام تحفہ رکھتا نہیں ہے کچھ وہ
ہر لحظہ اور ہر دم ہر گاہ اور بے گہ
اے شاہ دوسرا کے تجھ کو سلام پہنچے

مرثیہ

ابن علی سے سنا ہی یارو دشت بلا میں لڑائی ہوئی
ادھر تھے ہفتاد و دو تن وے ادھر ساری خدائی ہوئی
صاف[1] نکل کر جیسے گیا یہ گھر کی ساری صفائی ہوئی
چارہ کیا ہی خواہشِ حق سے کب رہتی ہی آئی ہوئی

تھی وہ ختم رسل کی امت یہ بھی اس کا نواسا تھا
چشم وفاداری رکھتا تھا ایک جگہ کا باسا تھا
سو دے سب دریا پر اترے ایک یہی واں پیاسا تھا
دیکھو ان اندھے لوگوں سے کیسی دیدہ درائی ہوئی

ہائے کسی نے یہ بھی پوچھا کیا ہے گنہ ان لوگوں کا
ثابت کچھ تو کیا چاہے ہے حال برا ان لوگوں کا
قتل ہوا پھر کس خاطر سردار بھلا ان لوگوں کا
یہ تو مسافر اترے تھے کاہے کو ان پہ چڑھائی ہوئی

آنکھ اٹھا کر[2] کہہ تو فلک پر کیسی نظر تھی تاروں کی
جانیں کھپائیں، اگر دیں کٹیاں بھوکے پیاسے بچاروں کی
سرور دیں یوں خاک پہ لوٹیں عزت ہیبے خواروں کی
آیا ظالم کیسی یہ مائی دُو بائی ہوئی[3] ......

---

[1] یہ دو مصرعے رسالہ اردو میں نہیں ہیں۔ ہم نے مراثی میر سے اضافہ کیا ہی۔
[2] مراثی میر میں "آنکھ ملا کر کہہ تو ہے (ص ۱۵۵)
[3] مراثی میر میں" چتر گرا یا کس کا ظالم کس کے ہائے دہائی ہوئی "ہے۔

کہئے طول جو حد رکھے کچھ ظلم و ستم کے باتوں کا
کیسا ٹھہرانا سبطِ نبی پر قدغن تھا سب باتوں کا
دل کا کھانا ترک ہوا تھا، منع تھا رونا راتوں کا
پانی سیّد پینے نہ پاویں چاروں اور سنائی ہوئی

کھانا ترک کئے پر اس کو ایسے غم کھانے پڑے
بیٹے بھتیجے بھانجے سب کے سر ناچار کٹانے پڑے
ہائے لیے اس عزت پہ اس کو کیا کیا ظلم اٹھانے پڑے
جان گئی[۱]، ناموس لٹی، گھربار گیا رسوائی ہوئی

جب بولیں ہیں گے لوگ حرم کے چھاتی پھٹ پھٹ جاوے ہے
ایک گھڑی تھا بنے ہے عابد ایک ایسے سمجھاوے ہے
ایک طرف مچلی ہے سکینہ، زینب اس کو مناوے ہے
بابا بن وہ روٹھی جو ہے منتی نہیں ہے منائی ہوئی

اک بہن کہتی تھی یوں گھربار ترا کیوں لوٹ لیا
کوئی نہ چھوڑا پیچھے جیتا ہائے یہ کیا ستھراؤ کیا
کنبہ مر کر ڈھیر ہوا آخر کو تو نے جی بھی دیا
بارے تقصیر ایسی سزا کی کیا تجھ سے اے بھائی ہوئی

ایک کہے تھی نوشہ قاسم کیا بیاہ رچایا تھا
کیا ساعت تھی نحس وہ جس میں بیاہنے کو تو آیا تھا
لگ گئی چپ ہے ایکا ایکی اتنی ہی کیا لایا تھا
منہ بولے ہے اب تک تیرے ہاتھ کی مہندی لگائی ہوئی

---

[۱] مراثی میر میں "کھبی" ہے ص ۱۵۶۔

نیگ[1] کی جس کو رسم تھی اس سے کہتی تھی وہ رو رو کر
اس میں کتنی باقی ہیں جو یاں سے چلا غمگیں ہو کر
جاتے ہی آنکھیں مند گئیں شب کو نہ اٹھا تھا تو سو کر
ایک نگاہِ حسرت ہی کیا سہرے[2] کی میرے بندھائی ہوئی

کوئی کہے تھی شبیہ اکبر آنکھوں میں کیوں کر اب آوے
نقشہ اس کا نقش جو ہے خاطر صفحہ سے کیا جاوے
دل کی تڑپ اب جا ہی چکی ہے جاں تسلّی کیا پاوے
جلوہ گری پھر کرتی ہے کوئی صورت ایسی مٹائی ہوئی

ظلم اٹھایا جی بھی کھپایا سر کو کٹایا، چھاتی جلی
پیاسا جی سے گیا دریا پر منت پھر ایک خس کی نہ لی
شہ جو غیور تھا سوچا جی میں اس جینے سے موت بھلی
ہاتھ لپارے کون کسی سے شاہی نہیں یہ گدائی ہوئی

ایک کہے تھی کوئی ہمارے چھٹکارے کی طرح نہیں
ظلم و ستم ہے جور و جفا ہے رحم کسو میں ہی بھی کہیں
ظاہر ہے رفتار فلک سے دکھا ہم کو اسیر یہیں
قید حیات سے نکلا کوئی جو بالے اس کو رہائی ہوئی

کوئی کہے تھی تو نے شاہا جتنے ان سے جور سہے
یار و یاور خویش و برادر سارے آکر ڈھور لیے
خاک تھے جو کہ انہوں نے اٹھ کر منہ پر کیا کیا حرف کیے
ہائے لیے کیوں کر دل میں تیرے ایسے غموں کی سمائی ہوئی

---

[1]، [2] ان ہندوستانی رسوم کا ذکر قابلِ غور ہے۔

کوئی کسو ملت میں یا روا ایسا ستم بھی کرتا ہے
سبط نبی۔ فرزند علی کا ناچاری سے مرتا ہے
دل تو چاہے ہے جینے کو پر موت پر جی کو دھرتا ہے
کیا سمجھے تھے شامی کوئی ایسی جن سے برائی ہوئی

کیا سمجھی یہ قوم سیاہ رو گیا اُن نے یہ خیال کیا
زہر حسنؑ کو دے کر مارا۔ حیدرؑ کا وہ حال کیا
اب جو حسینؑ رہا تھا بے کس تس کو یوں پامال کیا
اول سے لے آخر تک کیا ان لوگوں سے بھلائی ہوئی

حالِ عابدؑ کچھ مت پوچھو ایک تو تھا بیمار و نزار
دوسرے کنبہ اس کا سارا جور و ستم سے ڈالا مار
تیسرے آفت آ کر ایسی ٹوٹ پڑی ہے ایک ہی بار
چوتھے ایسے حال میں اس کو ویسے پدر سے جدائی ہوئی

قصہ کوتاہ میرؔ کہاں تک آلِ عبا کے دُکھ سُنیئے
رو دیئے۔ کڑھیئے۔ ماتم کریئے کوٹیئے چھاتی سر دھنیئے
جیسے کباب برشتے آتش جلیئے شام و سحر بھنیئے
چپ رہ ظالم خوب نہیں اب آگے بات بڑھائی ہوئی

(۲)

حسین ابن علی عالی نسب تھا — سزائے عزت و باب ادب تھا
جفا و جور کا شائستہ کب تھا — سلوک اسلامیاں سے یہ عجب تھا

کہ اس مہماں کی عزت نہ کیجے
ضیافت یک طرف پانی نہ دیجے

کسو کافر سے ایسا نہ ہو کردار ہوا اسلامیوں سی جو باصرار
کجی رفتار کی تلخی گفتار تس اوپر کھینچ کر ہر اک نے تلوار

بہت بے ڈول اس پر آنا ئی
علی منہ سے کچھ بھی شرم آئی

محمدؐ جس کی امت سب کہاویں اسی کی آل لوہو میں ڈباویں[1]
علی سن کر جسے سب سر جھکاویں اسی کے گھر کو بن پانی رلاویں

زہے اسلام نادر لوگ خوش دور
عجب آئین عجب ایماں عجب طور

کرے عابد کہاں تک غم گساری جسے بیماری و تن کی نزاری
کھنچی ہر دور تک اپنی یہ خواری اٹھانا پاؤں کا اس پر ہے بھاری

ہو ایسے حال میں کیوں کر دلاسا
کرے کس کس کی دلداری وتنا پاس آ

کہیں زینب بہن زہرا سے مادر کرے گا کون اب ہم سوں کا آدر
پڑا ہی خاک میں بے سر برادر لئے جاتے ہیں چھینے سر کی چادر

کہاں لے جاؤں بھائی کو اٹھا کر
اڑاؤں خاک کس کے آگے جا کر

ہمیں بازار میں لا کر بٹھایا کیا پامال ایسا سر اٹھایا
تسلی کو بھی کوئی ٹک نہ آیا کفن جی سے کسو نے بھی نہ پایا

---

[1] مراثی میر میں "اسی کی آل کا لوہو بہاویں" ہے ص ۱۸۹۔

ستم پر ہے ستم یہ جور پر جور
زمانہ ہو گیا پل مارتے اور

سکینہ جب کرے ہی باپ کو یاد   قیامت ایک ہو جاتی ہی بنیاد
اٹھے ہے ہم اسیروں میں جو فریاد   تو یہ کرتے ہیں ظلم ایک دربا جاد

کہاں مقدور یہ اس ناتواں کا
کہ ہو وے پیش رو اس کارواں کا

ریاست کے لیے شبیر مارا   بھلا یوں اس کی تھی تقدیر مارا
سبھوں کو کیوں ہی بے تقصیر مارا   علی اصغر کے کیوں پھر تیر مارا

چھنائیں عورتوں کی کیوں ردائیں
روا کاہے کو رکھیں یہ جفائیں

چلا سر کٹ کے اس جان جہاں کا   گرا ہے خاک پر خون ہر جواں کا
ہوا ستھراؤ یوں خورد و کلاں کا   مقرر لوٹنا ہی خانماں کا

کسو ملت میں ایسا بھی ہوا ہی؟
بنا وارث ہمارا ہی موا ہی؟

سکینہ کا گناہ کیا ہے بتا ویں   پدر مردہ کو کس خاطر کڑھاویں
کہاں فریاد لے کر آہ جاویں   کسے یہ ماجرا سارا سناویں

جفا ہر لحظہ ہم سب پر نئی ہے
حیا اک رسم تھی سو اٹھ گئی ہے

حسن تو تھا خلیفہ جس کو مارا   گنہ قاسم کا کیا جو اس کو مارا
کہوں میں کب تک کس کس کو مارا   ستم سے جور سے جس جس کو مارا

رہا وارث نہ غیر از عابدیںؑ کے
پڑے ہیں خاک میں ارکان دیں کے

علیؑ کے تئیں موا جانا سبھوں نے   محمدؐ کو نہ کچھ مانا سبھوں نے
بُرا شبیرؑ کا ٹھانا سبھوں نے   کیا اس گھر کو ویرانہ سبھوں نے

رہا تنکا سا عابد کش مکش میں
حرم کے لوگ بے حالی سے غش میں

علیؑ اکبر کہ تھا شکلِ محمدؐ   طرف ایک ایک کے ہوتے تھے صد صد
اٹھائے اس نے جس دن زخم بے حد   لگا منہ کر نجف کو کہنے کا اے جد

ستم ہے شور ہے جور و جفا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا ہے

پڑی تھی دھوپ میں وہ لاشِ مظلوم   کسو کا دل تلک ہوتا نہ تھا موم
اسیری اور غارت کی مچی دُھوم   تردّد شہ کے لے جانے کا معلوم

رہا تھا عابدیںؑ سوزار و بیمار
نہ جس کی کچھ دَوا نے جس کا تیمار

زناں نوحہ کناں سب خاک بر سر   کہیں تھیں رو مدینے کی طرف کر
کہ منصف ہو ٹک اے ختم پیمبر   مصیبت کس قدر ہے آل او پر

کہیں کس سے کوئی حاکم نہیں ہر
نہ تو ہے نے امیر المومنین ہے

اسے ماریں جسے دیں گے امامت   نہ ہووے پھر کسو کو کچھ ندامت
کریں برپا ستم ہے اک قیامت   علاوہ اس پہ تشنیع و ملامت

حیا مطلق نہ غارت سے کسو کو
نہ بہرہ کچھ مروت سے کسو کو

اسے بےکس جو پایا مار ڈالا		رکھا میدان میں سر کو نیزہ بالا
پسر کو کانپتا گھر سے نکالا		بٹھائیں عورتیں رستہ پہ لا، لا
نہ کچھ کی دلدہی زین العبا کی
نہ کچھ روئے محمدؐ سے حیا کی

نظر میں باپ کا سر ہے سناں پر		پڑی ہے آنکھ لوٹے کارواں پر
بنے ہے آن کر ہر گام جاں پر		مصائب ہیں غرض اس ناتواں پر
ابھی میدان میں دس جا گرا ہے
چلا جاتا نہیں پر رہ گرا ہے

جو رکتا ہے بہت تو رو اٹھے ہے		جو گرتا ہے تو طاقت کھو اٹھے ہے
کہے ہے یوں تو شور اک ہو اٹھے ہے		کہ دیکھوں باپ کب تک سو اٹھے ہے
سرِ راہ قافلہ ہے کوئی بولو
کہ دورِ رخصت اسے ٹک آنکھ کھولو

ہوئے سب شام کو آخر روانا		کہ جن کو ٹھور تھی نے کچھ ٹھکانا
بہت بے دردیوں پر تھا زمانا		کچھ آگے شرح و بسط اچھا نہ جانا
قلم کو میرؔ نے اب توڑ ڈالا
سر اپنا پتھروں سے پھوڑ ڈالا[۱]

ان نمونوں سے واضح ہو گا کہ میرؔ کے یہاں بزم، بین اور رزم کا رنگ

[۱] اس مسدس کے بندوں کی ترتیب "مراثیِ میر" سے مختلف ہے۔ ہم نے عشرت رحمانی کی ترتیب کو برقرار رکھا ہے۔

بہت پھیکا ہی۔ خارجی اور بیانیہ شاعری بھی اونچے درجہ کی نہیں ہی۔ انھیں مرثیہ کے ذریعہ عوام کو مخاطب کرنا تھا اس لئے انھوں نے سودا کی طرح بے تکلف ہندی الفاظ اور ہندی رسم و رواج کو مرثیوں میں داخل کیا ہی۔ میر، مرثیہ کی زبان اور اسلوب کے ارتقا کی ایک کڑی ہیں اور ان کے مرثیوں کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

واسوخت

واسوخت نظم کی وہ قسم ہے جس میں عاشق اپنے معشوق کی بے وفائی ظلم و ستم، رقیب کے ساتھ بے جا محبت اور جدائی کی مصیبت اور تکلیف کی شکایتیں کرتا ہی گویا معشوق کو دھمکاتا ہی کہ اگر اس کا طرز عمل یہی رہا تو وہ معشوق سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

خزینۃ العلوم میں لکھا ہی:

(واسوخت کا) یہ ڈھنگ فارسی زبان میں وحشی نے اختراع کیا تھا مگر اردو والوں نے اس کو وہ رونق بخشی کہ بیان نہیں ہو سکتی[1]

فارسی میں وحشی اور فغانی نے واسوخت کو ترقی دی اور اسی کے اثر سے اردو میں بھی اس کا رواج ہوا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہی "اہل تحقیق نے فغانی یا وحشی کو فارسی میں اور اردو میں انھیں (میر کو) واسوخت کا موجد تسلیم کیا۔"[2]

آزاد کے اس دعوی کی تائید دوسرے ذرائع سے نہیں ہوتی۔ میر سے پہلے شعرائے دکن نے واسوخت نما نظمیں کہی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو (متوفی ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء) نے "جوش و خروش" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس کو با آسانی میر کے واسوخت کے مقابلہ میں زمانی حیثیت سے مقدم قرار دیا جا سکتا ہی۔[3] اس لئے کہ آبرو کے

---

[1] خزینۃ العلوم فی متعلقات منظوم [2] آب حیات ص ۲۰۹ [3] ملاحظہ ہو معاصر پٹنہ: ستمبر ۱۹۴۱ء مقالہ قاضی عبدالودود، نگار لکھنؤ: مارچ ۱۹۵۱ء مقالہ شاہ ولی الرحمن، معاصر حصہ ۲ مقالہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اور صد سالۂ عام پٹنہ عید نمبر ۱۹۵۳ء مقالہ "واسوخت آبرو"۔

انتقال کے وقت میرؔ کی عمر دس گیارہ سال سے زائد نہ تھی۔ حاتمؔ، آبروؔ کے مقلد تھے ان کے دیوان زادہ میں بھی سوز و گداز" کے عنوان سے ایک ترکیب بند ہے جس کو واسوخت ہی سمجھنا چاہیئے اور جو حاتمؔ کی صراحت کے مطابق اس کے دیوانِ قدیم سے ماخوذ ہے[۱]۔

میرؔ کے کلیات میں چار واسوخت ملتے ہیں[۲]:

(۱) طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے
(۲) سچ کہو شہر میں صحرا میں کہاں رہتے ہو
(۳) یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجکو نہ تھی
(۴) ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ فریب آتے تھے

میرؔ کی واسوخت ملاحت، طعن، طنز اور گلہ و شکایت سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجکو نہ تھی — سرمہ و آئینہ کی اور نظر تجھ کو نہ تھی
فکر آراستگی شام و سحر تجھ کو نہ تھی — زلف آشفتہ کی سدھ دو دو پہر تجھ کو نہ تھی
شانہ تھا نابلدِ کوچۂ گیسو تیرا
آئینہ کاہے کو تھا حیرتی رُو تیرا

آگہی حُسن سے اپنے تجھے زنہار نہ تھی — اپنی مستی سے تری آنکھ خبردار نہ تھی
پانوں بے ڈول نہ پڑتا تھا یہ رفتار نہ تھی — ہر دم اس طور کمر میں ترے تلوار نہ تھی
خون یوں کاہے کو کوچے میں ترے ہوتے تھے
دل زدے کب تری دیواروں تلے روتے تھے[۳]

---

[۱] معاصر پٹنہ حصہ ۲ ص ۱۴۲۔ دیوان زادہ قلمی (رام پور) [۲] کلیات میر (نول کشور) ص ۸۳۸ و ۸۵۰ نیز ملاحظہ ہو شعلۂ جوالہ: (نول کشور) [۳] کلیات میر ص ۸۴۴۔

واسوخت کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

آرسی کی کبھی صورت نہ دکھاتے تجھ کو　　طرز یہ سرمہ کشی کی نہ سمجھاتے تجھ کو
دلربائی کے نہ انداز بتاتے تجھ کو　　کیوں بگڑتا تو جو ایسا نہ بناتے تجھ کو
مستی چشم سے ہوتی نہ اگر تجھ کو خبر
ایسی ہشیاری سے کرتا نہ تو ایدھر کو نظر

اور مہ پارہ بھی اس شہر میں مشہور ہے اب　　اس کی محبوبی و خوبی ہی کا مذکور ہے اب
دیکھنا کچھ ہو اسی کا مجھے منظور ہے اب　　صرف اس پر کروں گا اپنا جو مقدور ہے اب
اس کنے ضد سے تری شام و سحر جاؤں گا
گھر سے جب دم اٹھوں گا اس کے ہی گھر جاؤں گا

اسی مسدس کا ایک بند ہے:

پھر توجہ کو میں کروں گا اسی مہ پر قربان　　راہ و منزل میں پھروں گا اسی کے دست افشاں
بس بگولا سا ہوا تیرے لئے سرگرداں　　اس قدر مجکو دماغ اب ہے کہاں، دل ہے کہاں
کہ رہوں بے خود و بے خواب شبوں کو روتا
کاش مشتاق ترے منھ کا نہ اتنا ہوتا[1]

میرؔ نے اِس صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرکے دوسرے شعرا کو شمع راہ دکھلائی۔ دہلی میں اس کے بہترین نمونے مومن کے یہاں ملتے ہیں جن کے واسوخت "صحیح معنی میں جلی کٹی سنانے اور چھیڑ چھاڑ کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔"[2] لکھنؤ میں جرأت،[3] آتش،[4] امانت[5] اور مرزا شوق[6] نے اس صنف کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا اور اس میں بہت

---

[1] کلیاتِ میر ص ۸۰۴　[2] مقدمۂ دیوان مومن: مولانا ضیا احمد بدایونی ص ۴۳　[3]، [4] تذکرہ گلدستۂ نازنینان ص ۱۰۱، ۲۴۴　[5] تذکرہ مہر جہاں تاب　[6] شعلۂ جوالہ (نول کشور)

مفید اضافے اور اصلاحیں کیں۔ لکھنؤ میں نظارہ جمال بھی تھا اور شوق وصال بھی۔ اس لئے یہاں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ واسوخت کو بھی فنی ترقی کا خوب موقع ملا۔ لیکن میر کی سادگی کی جگہ صنع طرازی نے لے لی۔ اور امیر مینائی نے تو اس کی ٹکینک بدل کر اسے افسانہ سے قریب کر دیا[۱]

ہجویات میر میر کو اتنی مرتبہ یاسیات کا امام کہا گیا ہے کہ اس کی شاعری کے بہت سے تابناک حصے اس تنقید کی ظلمت میں چھپ کر رہ گئے ہیں اگر تنقیدوں کے بجائے خود اس کی پوری زندگی اور شاعری کو سامنے رکھا جائے تو یقین ہے کہ اس کی نوا اس قدر مردہ و افسردہ اور اس کا کلام اس درجہ تخیلی و تخلیقی ظرافت سے خالی نظر نہیں آئے گا جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

پچھلے صفحات میں میر کی زندگی اور سیرت کا جو نیا خاکہ پیش کیا گیا ہے اس سے بھی یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ میر جنازہ بردوش قسم کے آدمی نہیں تھے، وہ دوستوں کے ساتھ سراپا اختلاط تھے، ان کی محفلوں میں گرم جوشی کے ساتھ شریک ہوتے اور باہم ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے۔ انھوں نے سلام کے بیان میں لکھا ہے؛

فقیر را با او از تہ دل اخلاص است چنانچہ اکثر اوقات اتفاق باہم فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح نمودن می افتد[۲]

تذکرہ نکات الشعراء کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گرم جوشی اور شگفتگی ان کے یہاں ایک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسروں کی صفات بیان کرنے میں بھی انھوں نے ان ہی خوبیوں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غم کا جذبہ

---

[۱] واسوخت اردو : امیر مینائی [۲] نکات الشعراء ص ۱۴۱۔

ان کی غزلوں پر چھایا ہوا ہی لیکن چھ دیوانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو ظرافت سے خالی ہو۔ ان کا یہ شعر صداقت پر مبنی ہی:

لطف مجھ میں بھی ہیں ہزاروں میرؔ دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو

ذیل کے اشعار اس لحاظ سے قابلِ غور ہیں کہ ان میں معاشرہ کی خرابیوں پر تنقید کی گئی ہے:

کل رقصِ شیخ مطلق دل کو لگا نہ میرے
آیا وہ خرِ شرعی کتنا مٹک مٹک کر

بن عصا شیخ یک قدم نہ رکھے راہ چلتا نہیں یہ خر بے چوب

میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا
پر کیا کروں ساتھ اپنے حجّام نہیں رکھتا

ہائے مستوں نے ہوشیاری کی دے کے کچھ محتسب کا منہ جُھلسا

خرقہ مندیل ورداست لئے جاتے ہیں
شیخ کی ساری کرامات چلی جاتی ہے

میر کی غزلوں میں اس قسم کے طنز کی بھی مثالیں ملیں گی ان کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے:

ہو گا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

ہمیں تو نزع میں شرمندہ آکے اُن نے کیا

رہا ہے ایک رمق جی، سو کیا نثار کریں

میر کی ہجویات بظاہر تفریحی نظمیں ہیں لیکن دراصل مغلیہ حکومت کے زوال اور انحطاط کی پُردرد کہانیاں ہیں۔ انھوں نے سوسائٹی کی معاشرتی یا اخلاقی خرابیوں اور افراد و اشخاص کی بیہودگیوں پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا اندازہ ان کی ہجویات کی فہرست سے ہو سکتا ہے:

(۱) مخمس در ہجو بلاس رائے محرر دفتر (۲) قطعہ در ہجو خواجہ سرا۔

(۳) مثنوی در بیان مرغ بازاں (۴) مثنوی در ہجو خانۂ خود

(۵) ایضاً (۶) مثنوی در مذمت برشگال

(۷) مثنوی در ہجو نااہل (۸) ہجو عاقل نام ناکسے کہ بسگال انس تمام داشت

(۹) مثنوی تنبیہہ الجہال (۱۰) مثنوی اژدر نامہ

(۱۱) مثنوی در ہجو اکول (۱۲) مثنوی در بیان کذب

میر کے یہاں ہجو کے اساسی عناصر زبان و بیان اور تخئیل موجود ہیں لیکن سودا کی سی بے اعتدالیاں[۱] نہیں ہیں۔ وہ زبان سے سب کچھ کہتے ہیں لیکن عداوت کا غبار ان کے یہاں نہیں ہے۔ بعض جگہ فحش کلمات بھی نکل گئے ہیں جو میر کے شایان شان نہیں[۲]۔ میر نے طنز و تشنیع سب ہی سے کام لیا ہے لیکن بالعموم ان کا مطمح نظر ہمدردی و اصلاح ہے۔ سودا کے مقابلہ میں میر کی ہجویات پست ہیں۔ سودا کے شہر آشوب کا اردو میں جواب نہیں، اس کی بلاغت و لطافت میں یاس و الم کا دریا موجزن ہے۔ قصیدہ تضحیک روزگار بظاہر ایک گھوڑے

---

[۱] ہجو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔ ہجو اہلیہ ضاحک۔ ہجو دختر مولوی ندرت کشمیری

[۲] ہجو خواجہ سرا۔ ہجو بلاس رائے۔

کی ہجو ہے لیکن دراصل "فوجی نظام کی خرابی کا مرثیہ" ہے۔ سودا کے یہاں تخیل کی کرشمہ سازی زبان کی لطافت و شگفتگی اسلوبِ بیان کی سلاست و پختگی، اخلاقی معاشرتی اور سیاسی عیوب کی پردہ دری، یہ تمام محاسنِ ہجو بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر اس روش کے آدمی نہیں تھے۔ سودا کا تخیل بقول آزاد ایک پھلجھڑی ہے جو بات میں بات پیدا کرتا ہے اور ہر بات میں مختلف پہلو نکالتا ہے۔

اس کے باوجود حیرت ہے کہ مولوی عبدالباری آسی میر پر دوسروں کی ہجویات کو ترجیح دینے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔[۱]

ہجو بطور نمونہ میر کے مخمس (در ہجو لشکر) کے چند اشعار نقل کرتے ہیں:

جس کسو کو خدا کرے گمراہ — آوے لشکر میں رکھ امید رفاہ
یاں نہ کوئی وزیر ہے نے شاہ — جس کو دیکھو سو ہے بحال تباہ
طرفہ مردم ہوئے اکھٹے آہ

جائیے جس کے یہاں وہ روتا ہے — یا کہے چوبدار سوتا ہے
جو مقدر ہے سو تو ہوتا ہے — کون وقت عزیز کھوتا ہے
میں تو تھوکوں نہ ایسوں پر واللہ

فوج میں جس کو دیکھو سو ہے اداس — بھوک سے عقل گم نہیں ہیں حواس
بیچ کھایا ہے سب نے ساز و لباس — جیتھڑوں بن نہیں کسو کے پاس
یعنی حاضر یراق ہیں گے سپاہ

نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں سودا کے چند ہم مضمون اشعار شہر آشوب سے پیش کر دیئے جائیں:

گھوڑے لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے

---

[۱] مقدمہ کلیات میر دآسی ص ۱۵ (نول کشور)۔

گذرے ہی سدا یوں علف و دانہ کی خاطر | شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیئے کے یاں ہو
ثابت جو ہو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال | تیروں میں ہو پر گیری تو بے چلہ کماں ہو
کہتا ہو آخر عزہ کو صراف سے جا کر | بی بی نے تو کچھ کھایا ہو فاقہ سی میاں ہو
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید و گر نہ | شوال بھی پھر ماہ مبارک رمضاں ہو

میر اور سودا کی ہجو یہ نظموں کا ماحول تقریباً ایک ہی۔ بعض مضامین بھی مشترک ہیں۔ دونوں میں عسکری اور اقتصادی نظام کی بربادی کا ذکر کیا گیا ہی۔ گھوڑے مریل، سپاہی بھوک سے پریشان:

نہ دم آب ہے نہ چمچہ آتش

امرا بے دستور۔ دربار کیا ہے؟ "دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار"۔ شہدوں کی بن آئی ہے۔ نہ قاعدہ دانی ہے، نہ اصول اور ضابطہ ہے۔ غرض میر کی یہ نظمیں اس زمانہ کے حالات کی اچھی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان میں سودا کی سی جزئیات نگاری اور مضمون کی رنگا رنگی تو نہیں ہے لیکن خلوص اور سادگی ہی جس کا ہر نقش دل پر بیٹھ جاتا ہی۔

میر نے ہجو اکول میں تخیل کی رنگ آمیزی کی ہی اور اس کے پیٹو پن کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا ہی:

اک ہی پُرخور آشنا بے پیر | سینہ سوراخ جس سی ہی کف گیر
صد منی دیگ ہی شکم اس کا | نفس اژدھا ہے دم اس کا
اس کے آنے کی سن کے بازاری | کرتے ہیں سودوں کی خریداری
کنجڑے ڈھانکے ہیں ساگ پات اپنا | تکتے ہیں بنیئے داؤ گھات اپنا
کہ مبادا ادھر کو آجاوے | سودے یکسو، ہمیں نہ کھا جاوے

جب مرے گا وہ بھوک کا روگی — روح توشے کی روٹی ہی ہوگی
کھانے کی بو جو ناک میں بیٹھے — مر گیا ہووے تو بھی اٹھ بیٹھے
عقل باور اگرچہ کرتی نہیں — وہ مرے بھوک اس کی مرتی نہیں
بھوکے اس کا جو جی نکل جاوے — گور میں بھی کفن نگل جاوے

تنبیہہ الجہال میں شاعروں پر طنز کرتے ہیں :-

گرچہ یار اس کارخانہ میں نہ ہو — ٹوٹے جوتے کو کہاں لے کر پھرو
چار و ناچار اس کنے جانا پڑے — کوڑیاں دے جوتی گٹھوانا پڑے
حاجت اس فرقے سے یاں مطلق نہیں — جو نہ ہو شاعر تو کچھ نقصان نہیں

ہجو مرغ بازاں میں لکھنؤ کی معاشرتی خرابیوں پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

دلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمعہ منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہو قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے یہ تڑپنے لگے — ان نے کی نوک یہ کڑکنے لگے
وہ جو بیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج

میر اپنی اور اپنے گھر کی حالت کا ذکر بھی اس طرح کر سکتے ہیں :-

اب جو آیا ہے موسم برسات — دن کو ہے اپنے ہاں اندھیری رات
مینھ میں گھر گئے پانچ چھ چھپر — ہم غریبوں کے ہوتے ہیں سر پر
پر تلک تنکے تھے کچھ ایک سڑے — سو وہ چڑیوں کے گھونسلوں کو گئے
دل ہے کچھ مکڑیوں کا احسان مند — کہ جنہوں نے کیے ہیں چھانکے بند
پھوس کچھ ہے کہیں، سو آٹا ہے — بانس کو جھینگروں نے چاٹا ہے

کیا کہوں آہ، گھر ہے کہنے کو　　　باندھتا ہوں مچان رہنے کو

میرؔ کے بیان میں اُستادانہ پختگی اور تاثیر ہے لیکن ان کا میدان سوداؔ کی طرح وسیع نہیں۔ سوداؔ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس کے تمام پہلو اجاگر کرتے ہیں اور بات میں بات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔" میرؔ کے یہاں جزئیات کم ہیں اور سوداؔ کے تخئیل کی سی سحر کاریاں بھی نہیں ہیں۔ تاہم یہ کہنا بعید از حقیقت نہ ہوگا کہ اُردو میں جن شاعروں نے ہجویہ نظموں اور بالخصوص شہر آشوب کی صنف کو زندگی اور جلا بخشی ہے، اُن میں میرؔ اور سوداؔ ہی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔[۱]

معائبِ میر | میرؔ کے کلام میں بیشتر گربگی اور ناہمواری پائی جاتی ہے اسی لئے شیفتہؔ نے ان کے کلام کے "پست و بلند" کی طرف اشارہ کیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میرؔ ہیں ایک کا کلام نہایت صاف اور پُر اثر ہے اور دوسرے کا مبتذل اور سوقیانہ ہے۔

شیفتہؔ نے لکھا ہے:

پست و بلند کہ در کلامش بینی و رطب و یابس کہ دراہیاتش بنگری نظر نکنی و از نظرش نیفگنی کہ گفتہ اند ؎

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یکدست نیست

لیکن یہ جواب اطمینان بخش نہیں ہو سکتا۔

میرؔ کے یہاں اس قسم کے رکیک اور مبتذل اشعار موجود ہیں اور یہ ان کے دامنِ شہرت پر بدنما داغ ہیں:

بلائے جان ہے وہ لڑکا پری نژاد　　　اسی کا شور ہے پیر و جواں میں

---

[۱] میر بحث و نظر: ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۵۹۔

دلّی کے کج کلاہ لڑکوں نے　　کام عشاق کا تمام کیا

رفتہ رفتہ یہ طفل خوش ظاہر　　فتنۂ روزگار ہوتے ہیں

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

لذت دنیا سے کیا بہرہ ہمیں　　پاس ہے رنڈی و لے ہے ضعف باہ

صحبت سے اس جہاں کی کوئی خلاص ہوگا
اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہوگیا ہے

دل لے گئے لونڈے دلی کے کب کا بچا گئے
اب ان سے کھائی پی ہوئی شے کیا وصول ہو

ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اس حمام میں بہت سے شاعر ننگے ہیں لیکن ایک کے برے ہونے سے دوسرے کا الزام رفع نہیں ہوتا۔

میر کے یہاں صنائع کے استعمال کی بھی بڑی کریہہ صورتیں ملتی ہیں:

تو شملہ جو رکھتا ہے خر ہے وگرنہ　　ضرورت ہے کیا شیخ دم اک وجب کی

حد سے زیادہ واعظ یہ کودنا اچھلنا
کاہے کو۔ جانتے ہیں ہم اے خر بس اب بندھا رہ

یاں بلیمھیں نکل گیا واں غیر اپنی کلّی لگائے جاتا ہے

یہ ہمدمی کہ دعویٰ اس کے لب خنداں سے بس کچھ نہ چلا ورنہ پستے کو چبا جاتا

نظم طبا طبائی نے صحیح لکھا ہے:

میر صاحب شاعر معنی بند اور استاد مضمون گو ہیں مگر جب تناسب لفظی اور صنائع کی طرف جھکتے ہیں تو امانت لکھنوی اور شاہ نصیر دہلوی کو مات کر دیتے ہیں۔

ایہام اور ابتذال کے سلسلہ میں عام طور پر لکھنوی طرز معاشرت کو مورد الزام ٹھرایا جاتا ہے۔ لیکن میر کے کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں یہ جراثیم دلّی ہی میں سرایت کر چکے تھے۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم کے کتب خانہ حبیب گنج میں دیوان سودا کا ایک نسخہ ۱۱۷۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ ان کے لکھنؤ جانے سے قبل کا کلام ہے۔ اور درانیوں اور مرہٹوں کے ہنگامہ و آشوب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سودا لکھنؤ میں نہیں بگڑے بلکہ دلی میں بھی اُن کے اخلاق کا وہی حال ہے جو لکھنؤ میں تھا۔ ان کی یہ ہجو دلّی ہی کی یادگار ہے:[1]

جورو سے شیخ جیو کو یہ صحبت رہی مدام بھڑوا و مسخرا و مچھندر ہے اس کا نام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاشرہ پر انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا کسی جگہ کی تخصیص نہیں کی جا سکتی۔

میر بعض جگہ ایسے کرخت اور ثقیل الفاظ لائے ہیں کہ غزل ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی:

---

[1] دیوان سودا (قلمی) کتب خانہ حبیب گنج۔ مکتوبہ ۱۱۷۴ھ

ع تا رخ مخطّط قسراں ہے ہمارا

ع آوے جو مصطبے میں تو سن لو کہ راہ ہے

ع اب تو لے کر چراغ نکلی ہے

ع چاروں کا ہے مجملہ یہ سب

میر کے یہاں تنافر کی بھی مثالیں ملتی ہیں ؂

اس کی چشم سیہ ہے وہ جس نے
کتنے جی مارے اک نگاہ کے بیچ

آنکھوں میں میری عالم سارا سیاہ ہو اب
مجھ کو بغیر اس کے آتا نہیں نظر کچھ

یہ تعقید کتنی تکلیف دہ ہو ؂

تڑ پیا بھی دیکھا نہ بسمل کا اپنے ہیں کشتہ ہوں انداز قاتل کا اپنے

مصرعہ ثانی کا مضمون یہ ہے کہ اپنے قاتل کے انداز کا کشتہ ہوں لیکن فارسی ترکیب نے تعقید کی بدنمائی کو بڑھا دیا ہو اور "اپنے" کا تعلق "انداز" کے ساتھ پیدا کر دیا ہو۔

اردو الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ کا وصل معیوب ہو۔ میر نے اس سے بھی پرہیز نہیں کیا ہو:

پھرتی ہیں اس کی آنکھیں آنکھوں تلے ہمیشہ
رہتا ہو آب دیدہ یاں تا گلے ہمیشہ

نہ رکھو سر چڑھائے دلبروں کے گوندھے بالوں کو
کھلانا کھیلنا مشکل بہت ہے ایسے کالوں کو

کوئی بھی اس طرح سر جی پہ اپنے کھیل جاتا ہے مگر بازیچہ سمجھے میر عشق خورد سالوں کو

اسی طرح صفت کا استعمال بجائے موصوف کیا ہے مثلاً

میلان دلربا ہو کیوں کر وفا کے اوپر

دیتا ہے جان عالم اس کی جفا کے اوپر

میرؔ کا مطلب میلان دلربا سے اس دلربا کا میلان ہے۔ دلربا بغیر اسم اشارہ یعنی (اس)، کے صحیح نہیں۔ لیکن یہ غلطی ایسی ہے جو ناسخؔ، غالبؔ، مومنؔ، داغؔ جلیلؔ سب نے کی ہے۔ اسی طرح میرؔ نے فارسی کے واوِ عطف کا استعمال صحیح نہیں کیا ہے۔ اردو میں اس کا استعمال اسی وقت ہو سکتا ہے جب مفرد کا عطف مفرد پر ہو۔ اور دونوں فارسی لفظ ہوں لیکن میرؔ نے اس کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ ؎

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی تم بگڑ گئے

بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص و پیار کی

یہ جور و جور کش تھے کہاں آگے عشق میں

تجھ سے وفا و میرؔ سے رسم و فا چلی

اپنے کوچہ میں فغاں جس کی سنو ہو دن رات

وہ جگر سوختہ و سینہ جلا میں ہی ہوں

یہ غلطی بھی اتنی عام ہے کہ سوداؔ۔ غالبؔ۔ مومنؔ۔ داغؔ۔ سبھی کے یہاں ملتی ہے۔

میرؔ کے یہاں شکست ناروا کا عیب بھی ملتا ہے:۔

نہ خیال زلف سیہ جفا شعاراں!

نہ ہوا کہ صبح ہووے شب تیرہ روزگاراں

یہاں زلف سیاہ کا پہلا حصہ یعنی "زلف" مصرعہ اولیٰ کے پہلے ٹکڑے میں واقع ہی اور دوسرا حصہ یعنی "سیہ" مصرعے کے دوسرے ٹکڑے میں۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔

میر نے بعض جگہ محاورۂ عوام (محاورۂ عام نہیں) استعمال کیا ہے یہ چیز بھی پسندیدہ نہیں کہلائی جا سکتی۔ مثلاً

ان طیوروں سے ہول میں بھی اگر آتی ہے صبا
باغ کے چاروں طرف آگ لگا دیتے ہیں

تابوت مرا دیر اٹھا اس کی گلی سے
اثبات ہوا جرم محبت کا اسی سے

میر نے حشو و زواید کا بھی استعمال کیا ہی مثلاً

سمجھا تنک نہ اپنے تو سود و زیاں کو میں
مانا کیا خدا کی طرح ان بتاں کو میں....

آخر ہماری خاک تو برباد ہو گئی   اس کی ہوا میں ہم پہ تو بیداد ہو گئی

پروفیسر کلیم الدین احمد نے میر کے کمالِ شاعری کا اعتراف کیا ہی اور لکھا ہی کہ

میر اپنے حدود میں لاجواب ہیں۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ کئی اعتراضات بھی کئے ہیں:

(۱) میر کی دنیا تاریک ہی کہیں امید کا ستارا چمکتا ہوا نظر نہیں آتا۔

(۲) ان کے جذبات و تصورات میں تنوع نہیں

(۳) دماغی قوت کی طرح ان کے تخیئل میں بھی اعلیٰ درجہ کی قوت پرواز نہ تھی، ان کے تخیئل میں وہ زور نہیں، وہ شوکت و حشمت نہیں جو اور شعرا کو میسر تھی؛

وہ نزدیک و دور۔ زمین و آسمان سے نقوش بہم نہیں کر سکتا۔

(۴) وہ جبریہ عقائد کے قائل ہیں جو کچھ ہونا ہی وہ ہو رہے گا انسان صرف مصائب کا شکار ہو سکتا ہی اور بس۔

لیکن اگر میر کو ان کے سماجی، تاریخی، لسانی اور ادبی ماحول میں دیکھا جائے تو بہت سے اعتراضات کا وزن کم ہو جاتا ہی اور ہمارے اوپر میر کی عظمت کے نئے راز کھل جاتے ہیں۔ ہم نے پچھلے اوراق میں ان ہی کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہی:

بڑا شاعر صرف اس لئے بڑا نہیں کہ وہ اپنے رنگ میں لاجواب ہی
بلکہ اس لئے بھی کہ وہ دوسرے رنگ میں کہنے سے معذور رہے۔

میر کا فارسی کلام

مصحفی نے میر کی فارسی شاعری کے متعلق لکھا ہی:

دعوی شعر فارسی ندارد۔ مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست۔ می گفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم۔

لیکن یہ کلام نہایت کمیاب ہی آسی نے ایک مکمل دیوان قلمی" کا ذکر کیا ہی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ فارسی دیوان کا موجود ہے جو آسی کے بیان کے مطابق ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہی۔ کتب خانہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سبحان اللہ سیکشن میں ایک پرانی قلمی بیاض ہی جس میں ۲۹۴۰ اشعار ہیں اس میں یہ عبارت درج ہے:

دیوان نظم فارسی کہ میر تقی میر گفتہ اند نوشتہ شد۔

اس میں چند رباعیاں اور ایک ناتمام مثنوی اور ۴۸۱ غزلیں ہیں۔

عزیز لکھنوی مرحوم نے اس نسخہ سے استفادہ کیا تھا اور ایک دل چسپ

مضمون بعنوان "میر کا فارسی کلام" نیرنگ[1] میر نمبر (۱۹۲۸ء) میں شائع کیا تھا۔ یہ نسخہ اصل میں عزیز مرحوم کو حاصل ہوا تھا جو انہوں نے مولوی سبحان اللہ صاحب گورکھپوری کو دے دیا تھا۔

جس زمانہ میں میر نے فارسی شاعری شروع کی، اردو فارسی کے زیر اثر تھی اور ریختہ کے مسلم الثبوت استاد اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی ضروری سمجھتے تھے۔ میر اور سودا دونوں نے فارسی میں لکھا ہے۔ غالب اور مومن فارسی کی بہت اچھی لیاقت رکھتے تھے۔ غالب کو تو فارسی ہی کے نقش ہائے رنگ رنگ پر ناز تھا۔ اور وہ اردو کلام کو مجموعۂ بے رنگ سمجھتے تھے۔

اس زمانہ میں ظہوری و بیدل نظیری و فغانی طالب و کلیم کے طرز کو پسند کیا جاتا تھا اور نکتہ یابی اور معنی آفرینی پر شعر کی خوبی کا انحصار تھا۔ میر نے زمانہ کی روش کو اختیار نہیں کیا اور اپنے فطری اقتضا کو رہنما بنایا۔ جو سادگی اور بے ریائی ان کی طبیعت میں تھی وہی اشعار سے ٹپکتی ہے۔ جو انداز و اسلوب اردو میں ہے وہی فارسی کے لباس میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہ دل برشتگی اور لب تشنگی جو میر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے فارسی کے اشعار میں بھی نظر آتی ہے ؎

بہ جمع ماتمیان حرف من اثر دارد

بہ بزم عیش نفہمد کسے زبان مرا

فارسی اور اردو کے ہم مضمون اشعار دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر کی طبیعت فارسی کے مقابلہ پر اردو میں زیادہ رواں ہے۔ غم انگیز وجدان میں تنوع کے زیادہ امکانات نہیں ہوتے اس لئے جو داستان درد اردو میں بیان کی گئی ہے وہی کم و بیش فارسی میں منتقل کر دی ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو نیرنگ رام پور "میر نمبر" ص ۵ تا ص ۱۹ "میر کا فارسی کلام"۔

تا بودہ ایم گریہ کناں بودہ ایم ما

اردو اور فارسی کے چند ہم مضمون اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اُردو: آہوں کے شعلے جس جا اٹھے تھے میرسے شب
واں صبح جا کے دیکھا مشتِ غبار پایا

فارسی: دراں جائے کہ سری زد شب از شعلہ من آہے
نشد معلوم آں جا صبح دم غیر از کف خاکے

اردو: سر نشین رہ میخانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

فارسی: من چہ دانم راہ و رسم خانقہ عمرِ من در خدمت میخانہ رفت

اردو: رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

فارسی: از راہِ طلب خبر نہ داریم مائیم وہمیں شکستہ پائی

اردو: جگر ہی میں یک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

فارسی: دلے در سینہ من قطرۂ خونے بود است
چوں بچشم آمد از شیوۂ طوفاں دیدم

اردو: موت اک ماندگی کا وقفہ ہی یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

فارسی: ایں نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است
مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایانِ ما

میر تصوف کے گلزار میں اردو اور فارسی دونوں دروازوں سے داخل ہوئے ہیں۔ مسئلہ شہود صوفیاء کا بڑا اہم عقیدہ ہے۔ میر نے اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ فارسی کے پیراہن میں پیش کیا ہے۔

جلوہ ہا داریم و از ہر جلوہ بے خود گشتہ ایم
خود تماشائیم و خود محو تماشا گشتہ ایم

اردو میں ہمہ از وست کے مسئلہ پر اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

جلوہ اسی کا سب ہے گلشن میں زمانے کے
گل پھول کو ہے ان نے پروانہ بنا رکھا

میر نے عشق پر دفتر کے دفتر لکھے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کے تمام حزنیہ پہلوؤں پر میر کی نظر گئی ہے اور انہوں نے ان کو بڑی دلسوزی کے ساتھ آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ اردو میں انکے جوہر کھلتے ہیں۔ لیکن فارسی میں بھی کہیں کہیں وہی سوز اور درد پیدا ہو جاتا ہے۔

عشق یارب چہ بلا است کہ پیشش بے جرم
می رود میر بحالے کہ گناہگار رود

دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد
شورے است در سر من شاید بہار آمد

از دل چہ حکایت کنم اکنوں کہ بجا نیست
زیں پیشتر ایں قطرۂ ہم جگرے داشت

مہر شد مفقود یا ایں جا محبت رسم نیست
یا مزاج ما دگر شد یا جہانِ دیگر است

بارے یک گونہ ازیں دیدۂ خونابہ فشاں
بر رخ زرد من غمزدہ رنگ آمدہ است

دل از پئے او غرق بہ دریائے بلا بود
واں گوہر تر سر بکنارے دگرے

ایک فارسی رباعی میں نصیحت کرتے ہیں ؎

عشق تا بہ کجا ز درد مژگاں تر کن
برخیز و فسانۂ محبت سر کن

شد روز غمت شام بہ سوزائی داغ
اے میرؔ چہ مردۂ چراغے بر کن

میرؔ کا مسلک دیر و حرم سے بالاتر ہے۔

دیر و حرم سے گذرے اب دل ہی گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلہ پر سیر و سفر ہمارا

فارسی میں کہتے ہیں ؎

رفتۂ شوق شو و دیر و حرم را بگذار
طوف کن میرؔ بہر در بہ سجود آمدہ را

لیکن اردو کا انداز بیان زیادہ بلیغ ہے۔

دوسری جگہ اسی خیال کی وضاحت کی ہے۔

مرا ز دیر و حرم مطلبے بنود اے شوخ
ز فرط شوق تلاش تو در بدر بودم

خیال دیر وحرم راز سر بدر کردم
سجدۂ عمر دریں خانہ سر بسر کردم

میر محض "طوف حرم" کے قایل نہیں ہیں۔ کعبہ بھی ان کے یہاں صرف نخستیں منزل ہے شیخ و رند میں ان کے یہاں بنیادی فرق ہے۔ ایک نے عشق کو رہنما بنایا ہے اور دوسرے نے عقل کو ——— اور

عشق راہ دگر و عقل طریق دگرست!

اہل تصوف نے دنیا کو ناپایدار اور ریت کی دیوار مانا ہے حافظ نے اس عجوزۂ کو "عروسِ ہزار داماد" کہا ہے۔

میر نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اور خوب خوب دادِ سخن دی ہے۔

وقت رحیل آہ بخواب گراں گذشت — تا چشم واکنم ز نظر کارواں گزشت

وقت آں کس خوش کہ گلزار جہاں را دید و رفت
ہم چو گل بر بے ثباتیہائے خود خندید و رفت[1]

غافل مشو ز رفتن کیں طاق چرخ نیلی
از گرد راہ یاران برخاستہ غبارے

طور و طرز رفتن اہل جہانم داغ کرد
عالمے بگزشت ازیں راہ و نشاں معلوم نیست

---

[1] اردو میں اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے ؎
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

میر موت کو ہمیشہ ماندگی کا وقفہ سمجھتے رہے اور ہمیشہ مرنیکی آرزو میں مرتے رہے

در خواب عدم ہم دل آسودہ نداریم
مردیم و ہمانست تمنائے وصالت

نوحہ گری اور درد سرائی میر پر ختم ہے۔

پھر نوحہ گری کہاں جہاں میں   ماتم زدہ میر اگر نہ ہوگا

وہ آگ کی لپٹ جو اردو کلام میں موجود ہے اس کی چنگاریاں کبھی کبھی فارسی میں بھی نظر آتی ہیں:

من اے ہمدم مصیبت دیدۂ چوں میر کم دیدم
سخن از محنت خود تا بگوید چشم تر دارد

بہ مردن تسلی شدم ورنہ میر   نہایت بنود آرزوئے مرا

از غریق چو من چہ آگاہی   خاک افتادگان ساحل را

ز ضعف ہر نفسم چشم بستہ می گردد   ترا خیال کہ مایل بخواب می گردم

دل کہ در سینہ می تپید مرا   ایں زباں از مژہ چکید مرا
دست ہر دم بہ تیغ برد لِ او   میر در خاک و خوں کشید مرا

عمر من بر در کسے بگزشت   کہ نیامد یکے بخانۂ ما
حیف در شورہ زار عالم میر   سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

اس بحث کو ہم میر کی ایک غزل پر ختم کرتے ہیں جو بقول عزیز مرحوم میر کے فارسی دیوان کی پہلی غزل ہے۔

ای ز انعام تو واشد غنچۂ امکان ما — آب در جو دارد از لطف تو باغ جانِ ما
با کسم گر کار افتد جرم ما را نیست قدر — یک پر کاہ است کوہ شاخ عصیان ما
دیدۂ تر کے تسلی بخش عاشق می شود — مخ طوفاں شود یارب سر مژگان ما
این نہ پنداری کہ مردن موجب آسودن است — مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایان ما
میر اگر این است جوش گریہ در ہجران یار — ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریان ما

میر کی فارسی شاعری میں ایرانی لب ولہجہ تقریباً مفقود ہے ان کی فارسی نثر میں زیادہ پختگی ہے۔ یہ دیوان برائے بیت تھا خود بھی بقول مصحفی ان کو فارسی شعر کا دعویٰ کبھی نہیں ہوا۔

میر کی اِصلاحیں

میر نے تذکرہ نکات الشعرا میں جا بجا شعرا کے کلام میں اصلاح تجویز کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر یہ شعر میرا ہوتا تو اس طرح لکھتا یا اگر فلاں لفظ کے بجائے فلاں لفظ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ ان اصلاحوں سے میر کی استادی اور مذاقِ شعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ مبارک کا شعر ہے ؎

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

میر لکھتے ہیں اگر بجائے اس قدر، کس قدر می گفت شعر بآسماں می رسید[۱]
مضمون کا شعر ہے:

میرا پیغام وصل اے قاصد — کہیو سب سے اسے جدا کر کے

میر نے اُسے محمد حسن کلیم کے سامنے اس طرح پڑھا:

---

[۱] تذکرہ نکات الشعرا ص ۱۱۔

میرا پیغام وصل اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کے

جدا کے ساتھ وصل کا تقابل نہایت پُرلطف ہے۔

مضمون کا ایک اور شعر ہے۔ اس پر اصلاح ملاحظہ ہو:

مضمون: مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سن رقیب
غصّہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

اصلاح: مضمون تو شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب
غصّہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

دوسرے مصرع کی رعایت سے اسم کا لفظ زیادہ برمحل اور معنی خیز ہے
میر نے لکھا ہے: "اسم" اصلاح خاں صاحب[1] است۔ وہ چہ اصلاح۔ زیرا کہ اہلِ دعوت اسم می خوانند۔ نہ نام"[2]

مصطفےٰ خاں یکرنگ کا شعر ہے:

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے راستی ہیگی دار کی صورت

میر نے بجائے سچ کے حق کو پسند کیا۔ اور لکھا:

باعتقاد فقیر بجائے سچ حرف حق اولیٰ است[2]

ایک لفظ کے بدلنے سے شعر آسمان کو پہنچ گیا۔ اس کو صرف رعایتِ لفظی نہیں کہا جا سکتا۔ یک رنگ کا ایک اور شعر ہے:

اس کو مت بوجھو سجن اوروں کی طرح
مصطفےٰ خاں آشنا یک رنگ ہے

میر لکھتے ہیں کہ اگر میرا شعر ہوتا تو اس طرح لکھتا:

مت تلوّن اس میں سمجھیں آپ سا مصطفےٰ خاں آشنا یک رنگ ہے

---

[1] خان آرزو [2] نکات الشعرا ص ۱۸ [3] نکات الشعرا ص ۲۱۔

موجودہ زمانے میں مت کا یہ استعمال متروک ہے۔

محمد شاکر ناجی کا شعر ہے:

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

میر صاحب کی رائے ہے کہ پہلا مصرع اس طرح چاہیئے تھا:

مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خود دکی
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

میر سجاد اکبر آبادی کا شعر ہے:

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی
مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

میر کی اصلاح کے بعد شعر یوں ہو گیا:

باطل بتوں سے داد نہ چاہو کہ یاں کوئی
مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

میر نے لکھا ہے کہ "باطل، باطل ضرور ہے مگر بجائے کافر کے باطل حق ہے۔" یہاں حق و باطل کا تقابل بھی بے مزہ نہیں۔

میر سجاد کا دوسرا شعر ہے۔

ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا　　ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میر کی اصلاح ملاحظہ ہو:

کس طرح کوہ کن پہ گزریں گی　　ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

یہ اصلاح نہیں، اعجاز ہے، زبان بدل گئی ہے لیکن مفہوم وہی ہے۔

انعام اللہ خاں یقین کا شعر ہے:

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجکو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

میر کی اصلاح ملاحظہ ہو :

مجنوں کی خوش معاشی کرتی ہے داغ مجکو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

محمد یار خاکسار کا شعر ہے[1]

خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجکو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

میر لکھتے ہیں کہ

برمتتبع ایں فن پوشیدہ نیست کہ بجائے بیمار کیا، گرفتار کیا، می بایست

لالہ ٹیک چند بہار کا شعر ہے :

تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر صاحب فرماتے ہیں کہ دوسرا مصرع یوں ہوتا تو اچھا تھا ع

حسن کیا منظر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

میر کی شاعری میں ہندوستانی عناصر

اُردو کا تعلق ہند آریائی خاندانِ السنہ سے ہے

وہ شورسینی پراکرت کا دودھ پی پی کر پلی اور بڑھی ہے۔ اس لئے یہ ناممکن تھا کہ

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۲۲ ۔ مصحفی نے لکھا ہے: گویند کہ میر در عالم شباب منظور نظر او بود" (تذکرہ ہندی ص ۸۸) کریم الدین نے لکھا ہے: "میر تقی میر لڑکپن میں جب شعر کہتا تھا۔ تو اکثر اس کو اصلاح کر دیا کرتا تھا۔" (طبقات الشعرا ص ۸۹)

اس میں ہندوستانی عناصر نہ ہوتے۔ یہ ضرور ہے کہ ناسخ اور آتش کے زمانہ میں اردو اپنے ابتدائی رجحانات سے دور ہو گئی تھی لیکن اس فارسی آمیزی کے دور میں بھی ہندوستان اور اس کی خصوصیات سے وابستگی کا میلان ملتا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا کلام اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

میر تقی میر نے بھی اردو کے ابتدائی رجحانات سے روگردانی نہیں کی۔ انھوں نے اس کو فراموش نہیں کیا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور اس کی جڑیں ہماری تہذیب اور جذباتی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں 'بھارتیتا' یا ہندوستانی عناصر کی آمیزش جا بجا ملتی ہے۔

میر کی شاعری کی ابتدا اس وقت ہوئی جبکہ اُردو گھٹنوں چل رہی تھی۔ شاعری میں نئے تجربات کیے جا رہے تھے۔ نئی نئی ترکیبیں اور بندشیں اختراع کی جا رہی تھیں۔ دکنی شعرائے اردو کے دامن کو گلہائے رنگ رنگ سے معمور کر دیا تھا۔ میر نے اپنی شاعری کا قصر اسی بنیاد پر قائم کیا۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میر نے اصلاحِ زبان اور اصلاح شاعری کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اس قسم کی رائے تاریخی حقیقت کے بالکل خلاف ہوگی۔ میر نے زبان اور شاعری کی اصلاح میں نمایاں حصّہ لیا۔ اور اس "لچر پن" زبان کو دُرِ عدن بنا دیا۔ لیکن انھوں نے زبان کی صفائی کے شوق میں ناسخ کی طرح ہندوستانیت سے بالکل قطع تعلق نہیں کیا۔ ان کے کلام کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ہندی الفاظ — ہندی استعارات اور تشبیہات کو پوری طرح قائم رکھا ہے۔ جو اس کے مزاج سے ہم آہنگ تھیں اور وہ چیزیں جو اس ارتقائی دور میں کھپ نہیں سکتی تھیں ان کو خارج کر دیا۔ میر کی شاعری یا میر کی شخصیت کوئی منجمد اکائی نہیں ہے۔ وہ ارتقا کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اگر ہم میر کے

ادبی کارناموں کو اس روشنی میں دیکھیں گے تو ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ میرؔ نے زبان کی بڑی خدمت انجام دی اور اس کی جڑوں کو ہندوستان اور ہندوستانیت سے الگ نہیں کیا۔

ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن میں میرؔ نے ہندی الفاظ کو پورے حسن کے ساتھ استعمال کیا ہے:

۱۔ کچھ ٹھور بھی تھی اس کی کچھ اس کا ٹھکانا تھا

۲۔ دوں کس کو دوش دشمنِ جانی تھی دوستی

۳۔ اس سمے میں دیکھنے ہم کو بہت آیا کرو

۴۔ تنکے سے ہم پربت ہوئے

۵۔ رات ہوئی جس جا گہ ہم کو ہم نے وہیں بسرام کیا

۶۔ اپچھرہیں تو عشق کے دو ہی لیکن ہے بستار بہت

۷۔ موند کر آنکھیں اگر تو دل کی طرف ٹک دھیان کرے

۸۔ جیسے کسو کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

۹۔ دن آج کا بھی سانجھ ہوا انتظار میں

۱۰۔ جتن کے کب ڈھب تھے ایسے

۱۱۔ چلتا پھرتا ہے پر اداس اداس

۱۲۔ بکھڑے سے کس کے تو نے اے میرؔ دل لگایا[1]

ان کے علاوہ میرؔ نے جوگ، اتجنا، سنسار، سمرن، بھسم، اچرج، ہنکار وغیرہ ہزاروں ہندی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ان کے یہاں اکثر الفاظ اپنی قدیم شکل میں ابتدائی حسن اور معصومیت کے ساتھ بے تکلفانہ آئے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر امرناتھ جھا کا مقالہ بعنوان "میر تقی میر" (مزامیر ج ۱)

۱۔ دل آپ کا کسو سے شاید لگا نہیں ہے

۲۔ تجھ کنے بیٹھے گھٹا جاتا ہے دل

۳۔ ان نے تو آنکھیں موند لیاں ہیں

۴۔ کوئی نہ ہم کو جانے تھا

۵۔ یہ بات مری ضد سے تمہیں کن نے بتائی

۶۔ ترک وفا کرو ہو مرنے کے میر ڈر سے

۷۔ پھرتے ہو میر صاحب سب سے جدے جدے تم

میر نے راون۔ رام۔ لنکا۔ اُجڑے نگر کے دیئے۔ ہندوستان کی برسات، پپیہے۔ دیوالی۔ ہولی۔ سب کا ذکر کیا ہے۔

میر کی غزلوں، مثنویوں اور شکارناموں کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے تو ان میں ہندوستان کے موسموں، پھلوں، جانوروں اور ہندوستانی معاشرت کے متعلق بہت سی باتیں مل جائیں گی۔ بعض غزلوں میں بھی ہندوستانی فضا ہے مثلاً

۱۔ عجب نہیں ہے نہ جانے جو میر چاہ کی ریت
سنا نہیں ہے مگر یہ کہ جوگی کس کے میت

۲۔ آتش عشق میں راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں

۳۔ دل و دلی گرچہ ہیں دونوں خراب
پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہیں

۴۔ چلتے ہو تو چمن کو چلیئے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم بادو باراں ہے

میر نے زیادہ تر عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور اسی تلفظ کو نظم کیا ہے جو عوام کی زبان پر چڑھ گیا تھا بعض جگہ اپنے تخلص کے ساتھ "جی" کا لفظ استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے اشعار میں بول چال کی گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے مثلاً

۱۔ رات تو ساری کٹی سنتے پریشاں گوئی
میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو

۲۔ اوّلِ عشق ہی میں میر جی تم رونے لگے
خاک بھی منہ کو ملو نالہ و فریاد کرو

یہ رجحان جس کا مقتضا یہ تھا کہ اُردو میں ہندی عناصر کو قائم رکھا جائے دور متقدمین سے گذرتا ہوا آج تک قائم ہے، درمیان میں کچھ رکاوٹیں ضرور پیدا ہوئی ہیں، لیکن اس چشمہ کی روانی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سلطان قلی قطب شاہ میر تقی میر۔ میر حسن۔ نظیر اکبر آبادی، ذوق، ظفر، حالی، مولوی محمد اسمٰعیل۔ عظمت اللہ خاں۔ آرزو لکھنوی۔ حفیظ جالندھری۔ ساغر نظامی۔ مقبول حسین احمد پوری۔ اندرجیت شرما وغیرہ کی شاعری اس کی گواہ ہے۔

اُردو شاعری کی اصلاح میں میر کا حصّہ

محمد شاہ کے زمانہ تک اُردو شاعری کا دلّی میں رواج ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس نے کوئی سنجیدہ اور موزوں قالب اختیار نہیں کیا تھا۔ بقول قائم ؎ ایک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

میرؔ نے شاعرانِ دکن کو "پُر بے رتبہ" کہا ہے۔ میر حسنؔ نے دکن کے قدیم شعرا حبیبؔ و حسنؔ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

اکثر اشعار ایں ہا در بحر کبت بہ نظر آمدہ چوں الفاظش ربط بیک دگر نداشتند بقلم نیاوردہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری مکروہ اور مبتذل الفاظ و معانی سے بھری ہوئی تھی اور اسی لئے شاہ سعد اللہ گلشن کو ولی سے یہ کہنا پڑا:

شما زبان دکنی را گزاشتہ، ریختہ موافق اردوئے معلّی شاہ جہاں آباد موزوں کنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب طبعانِ عالی مراتب گردد۔

اس دور کے نامور اور مشہور شاعر شاہ مبارک آبروؔ ہیں ان کا انداز اور اسلوب یہ تھا:

اٹھ چیت کہوں جنوں ستی خاطر بخنت کی
اے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

یارو ڈرو کمر سے مڑ و رڑ و نہ بھر کے انگ
آجا کہیں لچک تو ابھی لاگ جائے لنگ

شاہ مبارک آبرو صنعت ایہام کے بڑے دلدادہ تھے۔ جا بجا اس قسم کے اشعار کہے ہیں:

سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹتا ہوا
زر کی لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا

تذکرہ قدرت میں آبرو کے متعلق لکھا ہے:

بعد از طبقہ شاعران دکن کہ معاصر ولی بودند رواج ایہام بسیار شد سر دفتر و سر آمد ایہام گو نجم الدین عرف شاہ مبارک متخلص آبرو۔

یہی حال شاکر ناجی اور مصطفےٰ خاں یک رنگ کا ہے ان کی پوچ گوئی اور ایہام نگاری نے شاعری کو لطف و اثر سے محروم کر دیا تھا۔ سب سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں[۱] نے اس خرابی کو محسوس کیا اور اصلاح کی کوشش کی۔

قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے:

می گویند اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص وقت گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین قدوۃ الواصلین مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت۔

مصحفی نے ان کو "نقاش اول زبان ریختہ" لکھا ہے:

در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دور دور ایہام گویاں بود اول کسے کہ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست نقاش اول زبان ریختہ باعتقاد فقیر اوست۔[۲]

مرزا مظہر رح کی کوششیں بار آور ہوئیں اور درد۔ سودا۔ میر۔ میر حسن وغیرہ نے تجدید و اصلاح کے کام کو مزید ترقی بخشی اور اردو شاعری کے بہت سے عیوب مٹا ڈالے۔

میر کی اصلاحی خدمات بھی نہایت اہم ہیں وہ خود فرماتے ہیں۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے　　بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

---

[۱] حالات کے لئے ملاحظہ ہو معارف نمبر ۴ جلد ۵۰ [۲] تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۰۳۔

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبہ عالی میں میر

جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

میر نے ایہام گوئی پر ایک ضرب کاری لگائی اور اشعار کو سوز و گداز کا مخزن بنا دیا:

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے

کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

مصحفی نے مرزا مظہر کے متعلق لکھا ہے:

اوّل کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔

ہر چند کہ اس نقاشِ اول کو اردو میں زیادہ طبع آزمائی کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ان کی شمع ہدایت سے دوسرے شاعروں نے منزل کا سراغ پالیا۔

مصحفی نے لکھا ہے "بعدہٗ تتبعش بدیگراں رسیدہ"

میر فرماتے ہیں ؎

تتبیعت سے جو فارسی کے میں نے ہندی شعر کہے

سارے ترک بچے ظالم اب پڑھتے ہیں ایران کے بیچ

ان اصلاحات کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کا خزانہ اردو میں منتقل ہونے لگا اور اردو کے سخن ور بھی شعرائے فارسی کی نازک خیالیوں کی داد دینے لگے۔

چنانچہ میر حسن قائم کے بیان میں لکھتے ہیں:

طرزِ شش مانا بطرز آملی ماند

میر ضیا کی نسبت فرماتے ہیں:

طرزِ شش مانا بطرز مولانا نسبتی

شاہ واقف کے حال میں لکھا ہے:

طرزِ کلامش مانا بہ طرز ناصر علی و جلال اسیر است۔

میر نے محمد حسین کلیم کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

اکثر بزبان مرزا بیدل حرف می زند

میر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑے سلیقہ کے ساتھ ہندی اور فارسی کو ہم آمیز کیا ہے اور عام طور پر اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

فارسی غزل کی تاریخ میں سعدی و حافظ کا بڑا مرتبہ ہے اس دور کے اساتذہ نے ان سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً میر نے اس شعر میں:

سب پہ جس بار نے گرانی کی — اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

حافظ کے خرمن سے خوشہ چینی کی ہے:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

ایسے ہی ان کے دیوان میں بہت سے شعر سعدی سے ماخوذ ہیں۔ فغانی کا شعر ہے ؎

مشکل حکایت است کہ ہر ذرّہ عین اوست

اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند

میر نے اسے اردو کا لباس پہنایا ہے ؎

پایا نہ یوں کہ کریئے اس کی طرف اشارہ

یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

نظیری کا یہ شعر ہے ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

میرؔ نے اسے اردو میں اس طرح منتقل کیا ہے:

جس جائے سراپا میں نظر جاتی ہے اس کے

آتا ہی مرے جی میں یہیں عمر بسر ہو

اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں متاخرین شعرائے فارسی کی دھوم مچی ہوئی تھی شعرائے اردو نے بھی ناصر علی، جلال اسیر، کلیم اور بیدل کا تتبع کیا۔ لیکن میرؔ نے شفائی کی روش اختیار کی۔ چنانچہ میر حسن، میرؔ کے متعلق لکھتے ہیں "طرز ش مانا بطرز شفائی" لیکن بہت سے اشعار سعدی، عرفی و نظیری کے طرز میں بھی ہیں۔

میرؔ بڑے با اصول شاعر تھے انھوں نے اردو شاعری کے کچھ قواعد منضبط کیے اور ان پر خود بھی عمل کیا اور دوسروں کو بھی ترغیب دی مثلاً شعر کی زبان صاف اور رواں ہونی چاہیے:

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میرؔ

دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

اسی کے ساتھ بیان میں تازگی ندرت اور جدت ضروری ہے:

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے

ہماری زندگی کا ڈھب جدا ہے

میرؔ شعر میں تنافر پسند نہیں کرتے ہے

فہم حرفوں کے تنافر کا بھی یاروں کو نہیں

اس پہ رکھتے ہیں تنفر سب مری صحبت سے یاں

ان کے نزدیک محاورہ میں تصرف جائز نہیں ہے:

میرؔ کا خیال ہے کہ جو کچھ کہا جائے وہ تاثیر کے ساتھ ہے

بے سوز دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا　　گفتار خام پیش عزیزاں سند نہیں

میر کی ادبی اصلاحات کو سمجھنے کے لئے ان کے وہ خیالات بھی سامنے رکھنا چاہئیں جو انھوں نے ریختہ اور اقسام ریختہ کے متعلق نکات الشعرا میں ظاہر کئے ہیں :

اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ حضرت امیرؒ نوشتہ شد۔

دوم آں کہ نصف مصرعہ اش ہندی و نصف فارسی چنانچہ شعر میر معز کہ نوشتہ آمد۔

سوم آں کہ حرف و فعل فارسی بکار می برند و ایں قبیح است۔

چہارم آں کہ ترکیبات فارسی می آرند۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائز است۔ و ایں را غیر شاعر نمی داند۔ و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب باشد و انستنِ ایں نیز موقوف بسلیقہ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمیں است اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد۔

پنجم ایہام است کہ در شاعرانِ سلف دریں فن رواج داشت اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار شستگی بستہ شود۔ معنی ایہام ایں است کہ لفظے براو بنائے بیت بود۔ آں دو معنی داشتہ یکے قریب و یکے بعید۔ و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک او۔

ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است تجنیس۔ ترصیع تشبیہہ۔ صفائے گفتگو فصاحت، بلاغت۔ ادابندی خیال وغیرہ ایں ہمہ در ضمن ہمیں است و حقیر ہم از ہمیں وتیرہ محظوظم ہر کہ را در یں فن طرز خاصی است ایں معنی را می فہمد با عوام کار ندارم

ایں کہ نوشتہ ام برائے یاراں من سند است۔ نہ برائے ہر کس نیز اکہ عرصۂ سخن وسیع است و از تلون چمنستاں ظہور آگہم۔ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔

میر کے انداز کے متعلق اوپر بحث آچکی ہے جو مترنم بحروں اور تمام صنعتوں پر محیط ہے۔

میر کی خدمت زبان کے ساتھ

اردو کو ہند آریائی زبانوں میں جو اہمیت حاصل ہے وہ اتفاقی نہیں بلکہ سینکڑوں سال کی تمدنی اور سیاسی تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے[1] اس کا سماجی وجود قانون ارتقا اور تغیر کا پابند ہے اور اس میں جو عہد بعہد تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ تاریخی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ دہلی کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے زبانوں میں الٹ پھیر ہوا۔ جس نے بالآخر ایک نئی صورت اختیار کرلی۔ جب مغلیہ سلطنت کی شمع گل ہونے لگی تو شاعروں نے اس زبان کی نگہداشت اور پرورش کی اور اپنی تراش خراش صفائی و خوش سلیقگی سے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ دنیا کی جدید اور مہذب زبانوں کی ہم نشین بن سکے۔

اردو دراصل شورسینی اَپ بھرنش کا ورثہ ہے جو گیارہویں صدی عیسوی کے قریب کھڑی بولی کو منتقل ہوا۔ وہ قدیم مغربی ہندی کی شائستہ صورت ہے اس کے افعال ہندی ہیں ضمیریں ہندی ہیں اور تمام حروف فاعلی، مفعولی اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں۔ عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش نے اس کے دامن کو وسعت بخشی اور اس کی اصلی خوبی کو بڑھا دیا وہ لوگ جنھوں نے اردو شاعری پر اپنا نام ثبت کرکے اس کا ایک معیار قائم

---

[1] تاریخ زبان اردو: ڈاکٹر مسعود حسین ص ۹۹۔

کیا وہ فارسی شاعری کے دلدادہ تھے اور ان کی ذہنیت، رجحانات، خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تلمیحات، تشبیہات اور استعارات کا ایک بڑا حصہ فارسی سے اردو میں منتقل ہو گیا۔ بعد میں جادۂ اعتدال سے انحراف نے اردو شاعری کو تقلیدی اور روایتی بنا دیا تحسین اور آفرین کی ہوس اور استعارہ در استعارہ اور صنعت در صنعت کی کوششوں نے شاعری کو ایک تنگ دائرہ میں محبوس و مقید کر دیا۔

میر کا زمانہ اصلاح زبان و اسلوب کے اعتبار سے تاریخ ادب اردو میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سودا کا دعویٰ ہے کہ یہ سنگ ریزہ ان کی کوششوں سے "درعدن" بنا ہے۔ میر کو یہ فخر ہے کہ انھوں نے "عیب" کو "ہنر" سے بدل دیا ہے ان حضرات کی خدمات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم دور ماقبل پر ایک نظر ڈالیں اور معلوم کریں کہ اس وقت زبان میں کیا خامیاں یا خوبیاں تھیں۔

دلی سے قبل اردو نے اچھی خاصی نشو ونما حاصل کر لی تھی اور ریختہ گو شاعر بلکہ صاحب دیوان بھی وجود پذیر ہو چکے تھے لیکن یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ دکن میں دلی[1] سے پہلے اردو نظم کی ابتدا کب ہوئی اور کن حالات میں ہوئی ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے زمانہ میں اردو اس قابل ہو گئی تھی کہ وہ تصوف و اخلاق کے ابتدائی مسائل سلکِ نظم میں پرو سکے۔ خواجہ بندہ نوازؒ اور نظامی دکنی کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قبل بھی زبان کی درستی اور اصلاح کی کوششیں ہو چکی ہونگی۔

---

[1] یہاں یہ بات خارج از بحث ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا شمالی ہندوستان سے ہوئی یا دکن سے ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اردو شمالی ہندوستان سے دکن گئی ہے۔

دکن کی ادبی تاریخ کے بہت سے گوشے تاریکی میں ہیں فیروز اور محمود کا ہمیں کچھ حال نہیں معلوم لیکن وجہی اور ابن نشاطی وغیرہ نے ان کی قابلیت اور شاعرانہ کمال کا اعتراف کیا ہے قیاس چاہتا ہے کہ ان لوگوں نے زبان کی صفائی اور بیان کی بہتری کی بھی کوشش کی ہوگی۔ ورنہ اس دور کے بعد غزل، قصیدہ، مثنوی اور اخلاقی اور نیچر کی نظموں کا جو سرمایہ ملتا ہے وہ وجود میں نہ آتا۔

اس زمانہ کے شاعروں میں غواصی کا نام قابل ذکر ہے اس لئے کہ اس نے ہندی الفاظ کو بڑی عمدگی کے ساتھ دکنی زبان میں آمیز کیا ہے اور اس کا کلام تصنع اور تکلف کی قیود سے یکسر آزاد ہے۔ غواصی سے گذر کر جب ہم ابن نشاطی کی پھول بن پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پچیس تیس برس میں صنایع بدائع کا رواج ہو گیا ہے۔ اور شاعری کے اصلی خط و خال تکلفات میں چھپ گئے ہیں۔ لیکن یہاں بھی سلاست کا ایسا چشمہ نظر آجاتا ہے جو پہاڑوں میں پوشیدہ ہو۔

مثنوی گلشن عشق جو نصرتی کی رنگینیٔ تخئیل کا نتیجہ ہے اس میں تشبیہات و استعارات کے طلسم کے ساتھ ندرت اور جدت بھی موجود ہے۔ اس دور میں مثنویوں کے علاوہ غزلیں بھی ملتی ہیں لیکن ان کا بڑا حصہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ سلطان قطب شاہ اور ہاشمی وغیرہ کی جو غزلیں ملتی ہیں وہ اصلیت اور حقیقت کی حامل ہیں اور تشبیہ و استعارے سے معمور۔

دور ماقبل ولی میں رزمیہ شاعری کی طرف بھی توجہ کی گئی اس سلسلہ میں خاورنامہ اور فتح نامۂ نظام شاہ مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ نصرتی کے قصیدے بھی رزمیہ شاعری کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں اس کے علاوہ تاریخی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات پر بھی شعرائے دکن نے طبع آزمائی کی اور تراوش فکر کے کامیاب نمونے پیش کئے۔

اس زمانہ میں قصیدے بھی لکھے گئے لیکن سب فارسی کے طرز پر۔ دکنی ماحول کے

لحاظ سے ان میں کچھ جدتیں بھی ملتی ہیں جو خالی از لطف نہیں ہیں۔ نصرتی کے بعض قصیدے منظریہ شاعری کے اچھے نمونے ہیں۔ سلاطین گولکنڈہ و بیجا پور کے کلیات میں بعض قطعات ایسے ملتے ہیں۔ جو اپنے موضوع کے اعتبار سے دور حاضر کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔

دکھنی شاعری میں مرثیہ گوئی، واقعہ نویسی غزل سرائی اور منظر نگاری کا وافر مواد موجود ہے جو اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے قدیم دکھنی شاعری نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ان شعرا کا انداز پرانا ضرور ہے لیکن سیدھا سادا ہے۔ ان کے یہاں تشبیہیں نازک استعارے اور پیچیدہ خیالات نہیں ہیں۔ لفظی و معنوی صنایع جو کچھ بھی ہیں زیادہ تر اپنے ماحول سے ماخوذ ہیں زبان میں قدامت ہے اور ہر نوع کی خامیاں ہیں۔ دکنی الفاظ اس کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ان کا بیشتر حصہ شمالی ہندوستان والے بغیر فرہنگ کے نہیں سمجھ سکتے۔ ان شعرا کے یہاں دکنی الفاظ و روابط استعمال ہوئے ہیں مثلاً "سے" کے بجائے "سوں" "سیں" اور "سیتی"، "کو" کے بجائے "کوں" "ہمکو" کے بجائے "ہمن" "میرا دل" کے بجائے "مجھ دل" "تسبیح کے بجائے "تسبی" یہی باتیں تقریباً شعرائے دہلی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔

ولی اورنگ آبادی کی حیثیت ہماری شاعری میں میل راہ کی سی ہے اس سے قبل الفاظ و تراکیب کا سرمایہ جمع ہو چکا تھا۔ اور خیالات و جذبات کے بہت سے اصول دریافت ہو چکے تھے۔ لیکن ان کی تاریخی اہمیت زیادہ ہے اور ادبی کم۔ ولی کی ٹکسال میں بقول مولانا احسن مرحوم ایسے کھرے اور کامل العیار سکے ڈھالے گئے جن کے سانچوں میں وقت اور عہد کے تغیر و تبدل اور سن و سال کے سوا آجتک کوئی کھوٹ اور کسر نہیں[۱] ولی موجد ہوں یا نہ ہوں لیکن مصلح ضرور تھے۔ دور ماقبل

---

[۱] کلیات ولی مرتبہ مولانا احسن مارہروی (انجمن ترقی اردو) سنہ ۱۹۲۷ء

ولی کی شاعری لہجہ اور وزن کے لحاظ سے اجنبی ہے اس لئے نامطبوع ہے۔ ولی کے یہاں بھی چند غزلیں پرانی روش کی موجود ہیں لیکن "نفس گفتار" کے اعتبار سے ان میں اجنبیت نہیں ہے۔ اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ اورنگ آباد کی زبان دکنی سے دور اور زبان دہلوی سے قریب تھی[۱]۔ اس کو دلی کی زبان کے ساتھ تعلقات کو تازہ کرنے کے بہت سے مواقع ملے تھے لیکن ابھی اسے ارتقا کی بہت سی منزلوں سے گزرنا تھا اور وہ زبان اور مضمون دونوں حیثیتوں سے قابلِ اصلاح تھی۔ تذکرہ قدرت میں لکھا ہے کہ دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن نے ولی کو اس کی طرف توجہ دلائی اور یہ نصیحت کی کہ "شمار زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید تا موجب شہرت ورواج قبول خاطر صاحب طبعان عالی مزاج گردد"۔ اسی وجہ سے اردو ادب میں قدامت کے خلاف جو بغاوت ہوئی ہے اس کا پہلا علم بردار شاہ گلشن کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

ولی کا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے شاہ صاحب کی نصیحت کو قبول کیا۔ صفیر بلگرامی نے ولی کے اشعار کی تین قسمیں کی ہیں:۔

(۱) وہ اشعار جو خاص دکنی زبان میں ہیں۔

(۲) وہ جن میں دکنی اثر کم نمایاں ہے اور باندک تغیر موجودہ زبان کے اشعار کہلائے جا سکتے ہیں۔

(۳) وہ اشعار جو بالکل اس وقت کی زبان میں ہیں۔

ولی کی لفظی، نحوی، بیانی اور عروضی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ ان کے یہاں ہندی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً آئینہ کی جگہ درپن، جدائی کی جگہ برہ، محبت کی جگہ پریم، کھانے کی جگہ بھوجن، رات کی جگہ

---

[۱] کلیات ولی (بار دوم) ۱۹۴۵ء: ولی کی زبان مقالہ از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ص ۳۲۔

رین، معشوق کی جگہ سجن، اسی طرح سندر، پی، پتیم وغیرہ۔

۲۔ قواعد (الف) بعض الفاظ جو آج مذکر ہیں وہ ان کے یہاں مونث ہیں مثلاً مخمل۔ خواب، اسی طرح وہ الفاظ جو آج مونث ہیں وہ ان کے یہاں مذکر ہیں مثلاً زنجیر، قدر، فضیلت۔

(ب) ان کے یہاں فعلوں کی گردان مختلف ہے، ضمائر اور روابط مختلف ہیں مثلاً تمکو کی بجائے تمن، اسے کے بجائے سین ہمکو کے بجائے ہمن اور کی کے بجائے ہور۔

(ج) ان کے یہاں فاعل کی علامت اکثر جگہ نہیں پائی جاتی۔

(د) وہ ہندی۔ فارسی الفاظ کو ملا دیتے ہیں مثلاً جام نین۔ غنچہ مکھ، شیریں بچن یا دن ورات۔

(ہ) ولی بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیتے ہیں مثلاً غَرَض کو غرْض، زُلْف کو زُلَف، رین اور زمین کو رَین اور زمَین

۳۔ ان کے کلام میں ہندی تلمیحات بکثرت ہیں مثلاً لیلاوتی۔ سیتا۔ کرشن۔ ارجن کا بان۔ کام روپ کا جادو۔

۴۔ عروض (ا) وہ شعر کے وزن میں بعض حروف کو گرا دیتے ہیں مثلاً انکھیاں کے بجائے اکھاں صفحہ کی جگہ صفا، نزدیک کی جگہ نزک۔ رہتا ہے کی جگہ رتا ہے۔

(ب) بعض جگہ قافیئے ردیفوں کے ساتھ حروف تہجی کی ترتیب سے جوڑے گئے ہیں مثلاً ادا ہے ہوا ہے اس میں "ے" کو ردیف قرار دے کر ایسا قافیہ اختیار کیا گیا ہے جس کے آخر میں الف ہے۔ اس کے بعد ایسے قافیہ کے ساتھ اس ردیف کو جوڑا ہے جس کی آخر میں (ب) ہے مثلاً سیراب ہے کمخواب ہے

اسی طرح بالترتیب (دی)، تنگ قافیہ لائے ہیں۔

ولی کے بعد اردو شاعری میں ایک اور انقلاب ہوا۔ تذکرۂ قدرت میں لکھا ہے:

بعد از طبقۂ شاعراں دکن کہ معاصر ولی بودند رواج ایہام بسیار شد
سر دفتر و سرآمد ایہام گو نجم الدین عرف شاہ مبارک المتخلص بآبرو۔

یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ ان بزرگوں کو لفظی صنعت کا شوق کیونکر پیدا ہوا۔ آزاد کی رائے ہے کہ دوہروں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزۂ خودرو تھا اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔

شاہ آبرو نے ایہام گوئی کو بہت فروغ دیا اور اسے مستقل فن بنا لیا اُن کے کلام میں جو ابتذال اور سوقیت ہے وہ اسی وجہ سے ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

سیج اوپر غیر کے رہتا ہے اب لوٹا ہوا
زر کی لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا

اس زمانہ میں لوگ ایہام کے دلدادہ تھے۔ میر نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

کیا جانوں دل کو کھینچیں ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

اس زمانہ کے نقادوں نے بھی اس مذاق سخن کی رعایت کی ہے۔ چنانچہ میر جیسے سخت نقاد آبرو کے متعلق لکھتے ہیں "شاعرے نادرہ گوئے ریختہ" میر حسن لکھتے ہیں (لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ) "شاعر خوش گو در وقت خود بود" لیکن جہاں تک طرز اور زبان کا تعلق ہے وہ بہت کچھ اصلاح کی محتاج تھی، اس لئے کہ اب تک شاعری نے کوئی موزوں اور سنجیدہ قالب اختیار نہیں کیا تھا قائم نے اس ریختہ کے متعلق سچ کہا ہے۔ ع

اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

تاریخ شعرائے اُردو میں لکھا ہی کہ اس وقت اردو شاعری کروہ سبک اور متبذل الفاظ و معانی کا مجموعہ تھی اور اس حیثیت سے قدیم دکنی شاعری اور اس میں کچھ تھوڑا ہی سا فرق تھا۔

ایہام گوئی کی اس سفیہانہ روش کے خلاف جن لوگوں نے بغاوت کی اُن میں شاہ ظہور الدین حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں رح پیش پیش ہیں۔ حاتم ولی کے شاگرد تھے اور قدیم طرز میں شعر کہتے تھے۔ انھوں نے پہلے دیوان سے انتخاب کر کے ایک دیوان مرتب کیا اور اس کا نام دیوان زادہ[1] رکھا۔ اس میں بہت سے ہندی کے الفاظ نکال دیئے۔ اور ان کی جگہ عربی و فارسی کے قریب الفہم اور کثیر الاستعمال الفاظ شامل کر دیے۔ دیوان زادہ کا دیباچہ اصلاح زبان کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہی:

> خوشہ چین سخنوران عالم۔ بصورت محتاج و بہ معنی حاتم کہ از سنہ ۱۱۲۹ھ تا سنہ ۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد عمر دریں فن صرف کردہ در شعر فارسی کہ پیرو مرزا صائب و در ریختہ ولی را استادمی داند۔ اول کسیکہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود۔ فقیر دیوان قدیم پیش از نادر شاہی در بلاد ہند مشہور دارد بعد ترتیب آں تا امروز کہ سنہ ۳ عزیز الدین عالمگیر ثانی باشد۔ ہر رطب و یابس کہ از زبان ایں بے زبان آمدہ داخل دیوان قدیم نمودہ کلیات ترتیب ساختہ از ہر ردیف دو سہ غزلے و از ہر غزل دو سہ بیتے ورائے مناقب مرثیہ و چند مخمس و مثنوی از دیوان قدیم نیز داخل نمودہ بہ دیوان زادہ مخاطب ساختہ و سرخی غزلیات بہ قسم منقسم ساختہ۔ یکے طرحی۔ دوم فرمائشی سوم

[1] ملاحظہ ہو سرگزشت حاتم: ڈاکٹر محی الدین زور

جوابی تا تفریق آں معلوم گردد و معاصران فقیر شاہ مبارک آبرو و شرف الدین مضمون و مرزا جان جاناں مظہر و شیخ احسن اللہ احسن و میر شاکر ناجی و مصطفیٰ خاں یکرنگ است و لفظ در۔ و۔ بر۔ و۔ از۔ و الفاظ و افعال دیگر کہ در دیوان خود تقید دارد۔ دریں ولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرہ دہلی کہ مرزایان ہند و فصیحان رند محاورہ آرند منظور دارد.....

پھر لکھتے ہیں:

زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند باشند اختیار نمود۔ و شمۂ ازاں الفاظ کہ تقید دارد بہ بیاں می آرد چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تبیح را تبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ و مانند آں یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک مَرَض را مَرْض و نیز الفاظ ہندی مثل نین و جگ و نت وغیرہ و لفظ مراد میرا و ازیں قبیل کہ برائے آں قباحت لازم آید یا بجائے سی ستی۔ یا ادھر را اودھر و کدھر را کیدھر کہ زیادتی حرف باشد یا بجائے پر۔ پہ۔ یا یہاں را یاں و وہاں را واں کہ در مخرج تنگ بود یا قافیہ را با ڑائے ہندی (ڑ) مثلاً گھوڑا و بورا و دھڑ و سر و مانند آں۔ مگر ہائے ہوز را بدل کردن کہ از عام تا خاص در محاورہ دارند بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور است چنانچہ بندہ را بندا و پردہ را پردا و آں چہ از قبیل باشد و ایں قاعدہ را تا کسے شرح دہد مختصر کہ لفظے غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود۔

تذکرۂ قدرت میں لکھا ہے کہ طرز ایہام گوئی ترک کرنے کا سہرا مرزا مظہر جان جاناں رح کے سر ہے۔ مصحفی نے انہیں زبان ریختہ کا نقاش اول کہا ہے

آزاد نے لکھا ہے کہ زبان کی اصلاح اور انداز سخن اور طرز کی ایجاد میں انھیں ویسا ہی حق ہے جیسا کہ سودا اور میر کو۔ انھیں نے زبان کو صاف کیا اور فارسی کی آمیزش سے اس کی رونق بڑھائی" اول کسیکہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست" (مصحفی) ہر چند کہ انھیں اردو میں زیادہ فکر کا موقع نہیں ملا۔ لیکن انھوں نے مستقبل کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا۔ مصحفی نے لکھا ہے " بعدہٗ تتبعش بدیگراں رسیدہ" (تذکرہ مصحفی سنہ ۱۲۰۹ھ)

مرزا مظہر جان جاناں رح کے بعد دوسرے اساتذہ نے اصلاح زبان و اسلوب کی کوششیں جاری رکھیں اور اردو شاعری کی بہت سی خرابیوں کو دور کر دیا چنانچہ قائم کو اس بات کا فخر ہے کہ انھوں نے اسے "خلعت قبول" بخشا ہے۔ میر فرماتے ہیں۔

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

صفیر بلگرامی نے قدیم محاورات و الفاظ میں جو تغیرات ہوئے ہیں ان کی ایک طویل فہرست دی ہے ہم ان سے چند الفاظ نقل کرتے ہیں۔

زمانۂ ولی	زمانۂ میر
جھوں آگے	جھوں کے آگے
نمن	طرح
ساجن	معشوق
نغمہ بولنا	نغمہ کرنا
سرج	سورج
جھلکار	جھلک
جن کن اچھے ہے	جن کے پاس ہے

آرسی	آیئنہ
تن من	جان و دل
آنچھو	آنسو

اردو کا پودا ہریانہ کی زمین میں اُگا اور فارسی کی ہوا سے سرسبز ہوا۔ مرزا مظہرؒ، میر اور خواجہ میر درد کی تقلیدی کوششوں سے اردو میں وسعت اور صفائی ضرور پیدا ہوئی لیکن آگے چل کر اردو شاعری فارسی کے قالب میں ڈھل گئی اس کا انداز، لب ولہجہ، آہنگ سب بدل گیا اس کی ترکیبیں، تشبیہیں، بیش از بیش فارسی سے لی جانے لگیں۔ سعدی، حافظ، طالب آملی، کلیم شفائی ناصر علی۔ جلال اسیر اور بیدل وغیرہ کی پیروی ہونے لگی۔ اور میر، سودا، اور قائم وغیرہ نے فارسی اشعار کے ترجمے کئے۔ اور بعض نے متعدد شعرائے فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں۔ اس تقلید وتتبع کا یہ نتیجہ ہوا کہ فارسی الفاظ ومحاورات کا بھی ایک بڑا سرمایہ اردو میں منتقل ہو گیا۔

ولی سے لے کر میر بلکہ غالب تک فارسی کی ترکیبیں اور محاورے اُردو کے لباس میں پیش ہوتے رہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں:

خوش آمدن	خوش آنا	اچھا معلوم ہونا
گوش کردن	گوش کرنا	(سننا)
زنجیر کردن	زنجیر کرنا	(قید کرنا)
داغ شدن	داغ ہونا	(رشک سے جلنا)
دل دادن	عاشق ہونا	

ع ایسا نہ ہو دل دادہ کوئی جاں سے گذر جائے (میر)

از جامہ بیروں شدن۔ ع نکلا پڑے ہے جامے سے کچھ ان دنوں رقیب

نماز کردن	نماز کرنا (یعنی پڑھنا)	
خوشا حال کسانیکہ	احوال خوش انھوں کا	(یعنی ان کا حال کیا ہی اچھا ہے)
تو گوئی	کہے تو	(گویا)
طرف شدن	طرف ہونا	(ہمسری کا دعوی کرنا)

بعض جگہ فارسی اصطلاحوں پر شعر کی بنیاد قائم ہے۔

چراغِ سحری: بیمار جاں بلب۔ میر فرماتے ہیں ؎

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

تردامن: (پر گناہ) درد ؎

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

فارسی مرکب الفاظ بھی بے شمار استعمال ہوئے ہیں۔ میر کا دیوان ان سے بھرا پڑا ہے۔ مثلاً ہنگامہ گرم کن۔ حلقہ در گوش۔ حرف زیر لبی، برق خرمن صد کوہ طور، تر بال، ستم کشتہ، غبار ناتواں، دل غفراں پناہ۔

میر کے یہاں بعض مصرعے بالکل فارسی ہیں۔ غالب کی ابتدائی شاعری میں بھی اکثر جگہ "یا" "ہے" وغیرہ چھوڑ کر باقی سب فارسی ہے۔

میر کی زبان

(۱) میر نے زبان اور زندگی کا رشتہ کبھی منقطع نہیں کیا۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا خاقانی اور سعدی کا کلام سمجھنے کے لئے فرہنگ کی ضرورت ہے۔ لیکن میرا کلام صرف اس شخص کی سمجھ میں آسکتا ہے جو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کی زبان سے آشنا ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قرآن کو قران، پلید کو پلیت، شتاب کو شتابی، امیری کو امرائی اور دستخط کو دسخط نظم کیا ہے۔

میر کے زمانہ کے قواعد[1] بھی مختلف ہیں۔ سب سے نمایاں فرق تذکیر و تانیث میں ہے۔ مثلاً جراحت، دید، جان، گلگشت، مذکر ہیں۔ اور خراب، گلزار، نشتر مؤنث
(ب) ندا کی حالت میں حرف مغیرہ کے ساتھ الفاظ کی فارسی جمع لاتے ہیں۔ مثلاً
اے تباں، اے ہم صفیراں۔
(ج) عربی فارسی اسمائے کے آخر میں (ے) لگا کر صفت بنا لیتے ہیں مثلاً سفرے، حیرتی، اسی طرح ہندی اور فارسی کے لفظ ملا کر بھی صفت بنا لیتے ہیں مثلاً
کم گھیر، شیریں بچن۔
(د) صفات ضمیری کا استعمال بھی موجودہ زمانہ سے الگ تھا ضمیر شخصی واحد غائب کبھی وہ بالضم کبھی بالفتح اور کبھی وہ بروزن لو استعمال کرتے تھے۔ جمع غائب کے لئے
"وے" اضافی حالت میں جن نے، کن نے، جھنوں کا، کنھوں کا، بولتے تھے۔
ضمیر واحد مخاطب اور ضمیر واحد متکلم جب حالت اضافی میں لائی جاتیں تو اس طرح بولتے تھے۔ مجھ عشق یعنی میرا عشق۔ تجھ صفت یعنی تیری صفت۔ اسی طرح جب ضمیر حالت اضافی میں جمع لائی جاتی تو کہتے راتیں ہماریاں، باتیں تمہاریاں۔
(ر) میر کے زمانہ میں فعل متعدی کا استعمال بالکل دکنی تھا۔ مثلاً میں کام کیا۔ ہم شہر دیکھا۔
(ز) ماضی مطلق میں آئیں اور لائیں کی جگہ آئیاں۔ لائیاں بولتے تھے مثلاً تم عورتیں لائیاں۔ زلفیں دکھلائیاں۔ باتیں نہ بنائیاں، اسی طرح آنکھیں ترسیاں ہیں (ماضی قریب)، باتیں بہت بنائیاں تھیں (ماضی بعید) وہ آنکھیں مارتیاں تھیں،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہوں: جلوۂ خضر، افاداتِ سلیم، قواعد زبان میر: عشرت لکھنوی مرحوم۔

(ماضی ناتمام) وہ آئیاں ہوں گی (ماضی احتمالی) کاش وہ لڑتیاں (تمنائی)، تم کاہیکو لڑتیاں جھگڑتیاں ہو (حال)، ماضی تمام اور فعل حال کے ساتھ فعل امدادی اس طرح استعمال ہوتا تھا۔ وہ چلا جاوے تھا۔ تم چلی جاویں تھیں۔ ہم چلی جاویں تھیں۔

(س) فعل کی بعض اور شکلیں:

ٹوٹا گیا: (ٹوٹ گیا)

دیکھ رہتا ہوں: (دیکھتا رہتا ہوں)

آتے ہیں گے: (آتے ہیں)

ڈھائے کر، کھائے کر، گائے کر

(ش) طرف کے بجائے اُدر۔ ذرا کی جگہ ٹک۔ بالکل کی جگہ نپٹ یا اضافت نہیں لاتے۔ مثلاً بلبلں کنے۔ دل ساتھ۔ پالکی ادر۔

(ص) تئیں بمعنی تک، کو، (جیسے محشر تئیں) بیچ بمعنی میں (مثلاً چمن کے بیچ)

(ض) بعض اوقات میرؔ نے مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان سے حرف اضافت حذف کر دیا ہے۔ مثلاً آجکل، مروت، قحط ہے۔ یعنی مروت کا قحط ہے۔ یہ فارسی کا اثر ہے۔

(ط) میرؔ اور ان کے معاصرین واؤ کے استعمال میں آزاد تھے۔ اور فارسی و ہندی کا خیال نہیں کرتے تھے۔ مثلاً چوری و نیکھا۔ تاکے بدشت گردی و کب تک یہ خستگی۔ اسی طرح بیڑۂ پان۔ ترکیب اضافی میں جائز تھا۔

حرفِ علّت کا استعمال: ع جو جو ظلم کئے ہیں تم نے سو سو ہم نے اٹھائے ہیں

حرف تشبیہ کا استعمال: ع دل جانے ہے جوں رو کر شبنم نے کہا گل سے

(اس کے علاوہ نمط، برنگ، لبساں۔ کے الفاظ بھی ان ہی معنوں میں استعمال ہوتے تھے)

(ظ) فارسی مرکب الفاظ جو میر نے استعمال کئے ہیں :
سخن مشتاق، حرفِ ناشنو، خاک افتادہ ویرانہ، نرم شانہ، سرنشین رہ میخانہ، عاجز سخن، قادر سخن، غنچہ پیشانی، ناقباحت فہم، سر بہ جیب تفکر، تنگ شراب، صحرا صحرا وحشت، دنیا دنیا تہمت، یک بیاباں، بیکسی وتنہائی، عالم عالم جنوں، صد سخن آغشتہ بخوں،
میر کے کلام میں خاص الفاظ و محاورات کا بھی ذخیرہ ملتا ہے:
پاکھر، کوتل، گنج، باڑھ جھڑی، ہوائی، انار، مہتابی، بان، کنلائی، کھانچہ، ٹٹنی، مرغ باز، کبنل، روا، منڈیر، پھبھیری، ڈانس، جھینگر، پیچپڑی، کیچوا، بنڈیلا، پڈڑی، برہ، اڑانا، اڑواڑ، ارنا، اُسارا، اُلیچنا، باندھنو، بہروبیہ، پرتل، پیٹھ، پرچھنی، کھتا، تورہ بندی، نوشہ کی روٹی، ٹھڈیاں، تھانگ، تیول تیغہ، تیرمار، تبس، سپنولیا، جامہ خانہ، جناغ، جھانجھ، چھپاکا، جھمکا، جھوجرا، جھینگا، چراغی، چوبالا، قلیچی، چلاچلی، چھونیا، چلیم، چیت، چھڑیاں، داسا، سالنا، سِلّی، سوس، شیربرنی، فنارہ، قور قراد، قرقرا، قاقم، کپّی، کنے وال، کجلی بن، کٹکھنا، کچی نرد، کاکا، کاغذیں باغ، کنکنی، گڈی، گڈا بنانا، گاتی، گھیتا، گھوپا، گزپا، کھکی، بک بیچہ، اتارا، اگاس، انگداں، بیہڑ، تلنگا، ٹھکورے۔
میر نے سودا کی طرح کثرت سے الفاظ محاورے اور ترکیبیں اُردو میں داخل کیں۔ اور بہت سے لفظوں کو صرف ونحو کی خراد پر چڑھا کر اُردو بنالیا۔ یہ اصول بڑا مستحسن ہے۔ اور ضرورت ہے کہ اس پر دوبارہ عمل کیا جائے۔

میر کا اثر شعرائے اُردو و فارسی پر

میر کو شہرت اور مقبولیت ان کی زندگی ہی میں حاصل ہو گئی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے:

شعر ہندی را نسبت بدیگر شعرائے ریختہ گویاں بپاکیزگی و صفا گفتہ کہ فارسی گویاں را از رشک ریختہ اش خون در دل افتادہ بلکہ اکثر اشخاص موزوں طبع کہ ریختہ اش شنیدہ و مزہ ایں زبان از زبان اُو دریافت کردہ فارسی گوئی را بر طاق بلند گزاشتند و توجہ بر ریختہ ریختہ اند۔[1]

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کو دیکھ کر دوسروں کو شوق پیدا ہوا اور اردو نے فارسی سے زیادہ مقبولیت حاصل کرلی۔ لیکن میر جس پایہ کے استاد تھے اس درجہ کے ان کو شاگرد نہیں ملے۔ اگر آزاد کی روائتیں صحیح ہیں کہ انھوں نے قمرالدین منت۔ سعادت یار خاں رنگین اور ناسخ کو شاگردی کے قابل نہیں سمجھا تو ماننا پڑے گا کہ ان کی شاگردی کے خاص اصول تھے اور بہت کم لوگ ان سے مستفید ہو سکتے تھے۔

بایں ہمہ میر عبدالرسول نثار، میاں جگنو، محمد حسن، مجنوں، عبداللہ خاں مشتاق، خواجہ محمد اکرم نزار، منشی بندرا بن راقم، شکیبا وغیرہ کو مختلف تذکرہ نگاروں نے (اور بعض کو خود میر نے) اپنا شاگرد بتلایا ہے۔ لیکن ان کے طرزِ کلام کی تعریف ہمیشہ ہر دور میں ہوتی رہی اور آج بھی ان کے حسن قبول اور شہرتِ عام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ریختہ رتبہ کو پہنچایا ہوا اس کا ہے　　　معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

---

[1] عقدِ ثریا ص ۵۳، ۵۴۔

زندگی میں بھی انہیں وہ شہرت حاصل ہوگئی تھی جو اردو کے بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے :

سرسبز ہند ہی میں نہیں کچھ یہ ریختہ
ہے دھوم میرے شعر کی سارے دکن کے بیچ

میر کی زندگی میں بعض لوگوں نے عقیدت مندانہ اور بعض نے حریفانہ ان کے طرز میں لکھنے کی کوشش کی، آشفتہ، سوز کے شاگرد ہیں۔ لیکن انہوں نے میر کا تتبع کیا ہے۔ مجذوب (جن کو لطف نے سودا کا بیٹا بتلایا ہے[1]) نے دو دیوان میر کے جواب میں لکھے ہیں[2]۔ لیکن یہ اچھی طرح نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس حد تک کامیاب ہوئے[3]
سودا اور مصحفی دونوں نے میر کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

مصحفی کا شعر ہے۔

اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعویٰ
پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منہ پر

متوسطین کے دور میں ناسخ نے میر کے کمال کا نہایت خلوص سے اعتراف کیا ہے۔ "آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"۔ لیکن ان کے کلام میں کہیں میر کی جھلک نہیں۔ آتش فرماتے ہیں ؎

آتش بقول حضرت سودا شفیق من
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

---

[1] گلشن ہند ص ۲۲۶ [2] ایضاً [3] گلشن ہند میں ان کے صرف چھ شعر درج ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ میر نے لکھنوی شاعری پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑا۔ ناسخ و آتش ان کی استادی کو ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان سے کوئی معنوی علاقہ نہیں رکھتے۔ آخری دور کے شعرائے لکھنؤ البتہ اپنے دبستانِ شاعری کو چھوڑ کر میر کے حلقہ بگوش نظر آتے ہیں۔ اس لئے کہ زمانہ کی تبدیلی سے لکھنؤ اور دہلی کے امتیازات اٹھتے جاتے تھے۔ لکھنؤ کی اس پُرتکلف فضا میں جو "مے ورامش و رنگ و بو" سے عبارت تھی۔ میر کے نغمے بے وقت سے معلوم ہوتے تھے۔ جب سلطنت کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور یہ محفل درہم برہم ہوگئی تو ان نغموں کی صدائے بازگشت قدرتی طور پر پھر سنائی دینے لگی۔ اور جلال۔ ثاقب، اور اثر کا میلان میر کی طرف زیادہ ہوگیا۔

مرزا غالب نے جہاں میر کی پیروی کی ہے نہایت کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ مثلاً ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

میں بھی منہ میں زباں رکھتا ہوں کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امّید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

اُن کا شعر ہے:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

حضرت ذوق کا یہ اعتراف بھی ملاحظہ ہو:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

شیفتہ نے بھی میر کا تتبع کیا ہے؛

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

میر مہدی مجروح لکھتے ہیں۔

یوں تو ہیں مجروح شاعر سب فصیح   میر کی پر خوش بیانی اور ہے

رند کے یہاں جو غزلیت ہے وہ بھی پیروی میر کا نتیجہ ہے ؎

تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں رند ہم تو اُسی بول چال کے

طرزِ میر نے جلال لکھنوی کو بھی متاثر کیا ہے ؎

کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات

یہ اسی طرز کا فیضان ہے کہ جلال نے لکھنوی لباس میں دہلی کے حسن معنی کو پیش کیا اور غزل جدید کے لئے راہ کھول دی۔

امیر نے گوہر انتخاب اور جوہر انتخاب میں میر کی تقلید کی ہے اور اسی برجستگی وسادگی کو جمع کر دیا ہے جو طرزِ میر کی خصوصیت ہے۔ ملاحظہ ہو:

اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر   کچھ تمہارا غریب لیتا ہے

کوئی امیر ترا درد دل سنے کیوں کر
تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

سید امداد امام اثر بھی میر کے معترف ہیں ؎

کوئی غزل سرا نہ ہوا میر کی طرح

انھوں نے بہت سے اشعار اسی انداز میں کہے ہیں ؎

یہاں تک بتوں نے ستایا ہمیں ۔۔۔ کہ آخر خدا یاد آیا ہمیں
ترا نام لے کر رکھا دل پہ ہاتھ ۔۔۔ کسی دم اگر ہوش آیا ہمیں

حالی دورِ جدید کے پیامبر ہیں لیکن ان کے یہاں بھی میر کا رنگ نمایاں ہے۔ خود فرماتے ہیں:

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

اکبر الہ آبادی لکھتے ہیں:

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر
ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

عصر حاضر کے غزل گو شاعروں میں حسرت موہانی کا نام سرفہرست درج کرنے کے قابل ہے وہ بھی ان کی طرز سے متاثر ہیں۔ فرماتے ہیں:

شیرینیٔ نسیم ہے سوز و گداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطف سخن تمام

گذرے بہت استاد مگر رنگ اثر میں
بے مثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک

شعر میرے بھی ہیں پُر درد ولیکن حسرت
میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

اس کے علاوہ شاد عظیم آبادی، ثاقب لکھنوی اثر لکھنوی اور فانی بدایونی کے یہاں بھی بعض شعر میر کے رنگ میں مل جاتے ہیں۔

میر کی شہرت لازوال ہے اس کے آرٹ میں ابدیت کا جوہر ہے اس کا طرز و اسلوب ہر زمانہ اور ہر عہد میں مقبول رہے گا یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے آج تک میر کی شاعرانہ شخصیت غزل پر حاوی رہی ہے:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

از عجب پدر ہم دارد۔

رسالہ فیض میر میں پانچ حکایتیں ہیں جن میں اللہ والوں کے حالات اور کرامات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی آنکھوں دیکھی باتیں لکھی ہیں۔

فیض میر میر کی سیرت کی سچی تصویر ہے اس آئینہ میں ان کے مذہبی معتقدات صاف نظر آتے ہیں جس کی تربیت علی متقی اور امان اللہ کی آغوش میں ہوئی ہو اس کا فقیر منش اور درویش صفت ہونا حیرت انگیز نہیں ہے۔

میر کی فارسی عبارت صاف اور شگفتہ ہے جملے پختہ اور بے رخنہ ہیں۔ قافیے کے التزام میں عبارت کی روانی اور بے ساختگی میں فرق نہیں آتا ان کے جوابی جملے بھی ایک علیحدہ مفہوم رکھتے ہیں اور وہ بالعموم چست اور برجستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً

نومیدی از برائے چہ مقصود ہمکنار است۔ دل تنگ چرا نشستہ کہ عالم ہموار است برخیز و سیاحت کن خوش باش و فراغت کن برفاستم ہمراہ شدم آگاہ بود آگاہ شدم۔

میر بالعموم مقفی عبارت لکھتے ہیں لیکن قافیوں میں الجھ کر نہیں رہ جاتے توصیفی فقرے خوب لکھتے ہیں مثلاً

مردے بود کامل ہمہ تن دست و دل بالا بلند وقت پسند گرم جوش سراپا ہوش چسپاں اختلاط، خوش ارتباط۔ وضع مربوط حال مضبوط۔ دل با یار دست درکار قائم اللیل صائم النہار۔

یا

دلیل راہِ عرفاں۔ میاں شاہ برہان دست از دنیا بردا شتہ قدم براہ فنا گذاشتہ آوارہ بمنزل رسیدہ، بگلیم سیہ سر درکشیدہ سفید گو و برہنہ تن با معنی در یک پیرہن۔

میر کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور ان کے پاس الفاظ و محاورات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جس کو وہ برمحل استعمال کرتے ہیں میر حسن نے اُن کی نثر کے متعلق صحیح لکھا ہے۔

چراغ نثرش روشن و ساحت نظمش گلشن۔ تذکرہ میر حسن ص ۱۷۵۔

نکات الشعراء

تذکرہ نکات الشعراء تنقید کی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ میر نے اسے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء میں بہ عہد احمد شاہ لکھا ہے۔ اس میں حالات زیادہ تفصیل سے نہیں ہیں لیکن جو باتیں معاصر شعراء کے متعلق درج ہیں وہ اختصار کے باوجود قابلِ قدر ہیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے اردو تنقید کے متعلق لکھا ہے۔ اردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے، یہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر۔

یہ اعتراض بہت سخت ہے اگر اردو کے قدیم تذکروں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت بھی اردو ادب کے ساتھ ساتھ تنقید کے سانچے موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ تخلیقی قوت بغیر تنقیدی قوت کے ممکن ہی نہیں ہے۔ تنقید کا ادب سے وہی تعلق ہے جو لٹریچر کا زندگی سے ہے۔ یہ فلسفہ بھی ہے اور مذاق علمی کی تاریخ بھی یہی وجہ ہے کہ جس طرح ہماری شاعری ایک زمانہ تک مقررہ روش پر چلتی رہی اور چند بندھے ٹکے مضامین نظم کرنے کا نام شاعری ہو کر رہ گیا۔ اسی طرح تنقید پر بھی سکون اور جمود طاری رہا۔ اور وہ بھی تعمیری اور تخلیقی نہیں بلکہ رسمی اور میکانکی ہو کر رہ گئی۔

اردو شاعری نے جب آنکھ کھولی تو سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ معاشرہ پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی سکر دوام میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہر شخص یک گونہ بے خودی کے عالم میں مست و خراب تھا۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام ہمارے شعور پر اثر انداز نہ ہوتا۔ اس زندگی میں جو فرسودگی، تصنع، اور یکسانیت ہے۔ وہ ادب کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔

ہماری تنقید بھی اپنی تہذیبی اور تاریخی بنیادوں سے بیگانہ نہیں ہے۔ اس میں بھی وہی انسانی اور سماجی تصور موجود ہے، جو ہماری زندگی میں کارفرما تھا۔ اس میں ان ہی تہذیبی قدروں پر زور دیا گیا ہے جو اس وقت ہمیں عزیز تھیں۔ اس زوال آمادہ ماحول میں ہمیں معنی و مواد کے مقابلے میں صورت و ہیئت، حرکت اور تبدیلی کے بجائے جمود اور آسودگی اور واقعیت و اصلیت کے بجائے آرائش اور تکلف ہی عزیز ہو سکتا تھا۔ تنقید ایک سماجی عمل ہے اس لیے میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعرا بھی اپنے عہد کے عمومی رجحانات کا پابند ہے لیکن میر کی ادبی شخصیت اتنی بلند تھی کہ انھوں نے شعر و ادب کی تمام مروجہ روایتوں کو الہامی سمجھ کر قبول نہیں کیا۔ بلکہ ان پر تنقیدی نظر ڈالی، بعض کو قبول کر لیا، بعض سے رشتہ توڑ لیا اور بعض بالکل نئی روایتیں قائم کیں، یہ اجتہاد بغیر ادبی بصیرت اور تنقیدی شعور کے ممکن نہیں ہے۔

میر کا تذکرہ نکات الشعرا، دنیائے تنقید میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے:

> در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوئے معلی شاہ جہاں آباد کتابے تا حال تصنیف نشدہ کہ احوال شاعران ایں فن بہ صفحۂ روزگار بماندہ۔[1]

لیکن یہ خیال درست نہیں کہ میر تذکرہ نگاری کے موجد ہیں حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں تذکرہ نویسی کے فن کو بہت فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ اور شعر و سخن اور ادبی مجلسوں اور مراختوں کے عام ذوق و شوق نے بھی ادب کی اس شاخ کو بہت ترقی دے دی تھی۔ طبقات الشعرا میں کریم الدین نے لکھا ہے:

> تذکرہ اور طبقات چوں کہ شاخیں فنِ تاریخ کی ہیں. خصوصاً زبانِ عرب

---

[1] نکات الشعرا، ص ۱۔

اور فارسی میں اس قسم کی بہت سی تصنیف ہوئی ہیں ان کی دیکھا دیکھی زبان اردو میں بھی اس طریقِ تصنیف کا استعمال کیا ہی مگر یہ شوق، تذکرہ نویسی کا ان ایام میں پیرا مون خاطر لوگوں کا ہوا جب بنیاد اردو کی کامل ہوئی شروع ہوئی۔[۵۱]

دتاسی کا خیال ہی کہ میر کے تذکرے سے بھی پہلے کئی تذکرے موجود ہوں گے۔[۵۲] تذکرہ امام الدین، تذکرہ خان آرزو، تذکرہ سودا اور معشوق چہل سالہ خاکسار وغیرہ تو بالیقین میر کے تذکرے سے پہلے لکھے گئے۔ قائم نے بھی "مخزنِ نکات" میں یہی دعویٰ کیا ہی جو میر نے، کہ ابھی تک "بیانِ اشعار اور احوالِ شعرا" میں کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔ لیکن یہ دعویٰ بھی میر کے دعویٰ کی طرح غلط ہی۔ اس لئے کہ تذکرہ قائم تو تذکرہ میر کے بعد لکھا گیا: مخزنِ نکات" ۱۱۶۸ھ میں لکھا گیا۔ اور "نکات الشعرا" کا سال تصنیف ۱۱۶۵ھ یا ۱۷۵۰ء ہے۔ اب امام الدین، خان آرزو، سودا اور خاکسار کے تذکرے موجود نہیں ہیں اس لئے یہ کہا جا سکتا ہی کہ اس وقت جتنے تذکرے موجود ہیں ان میں تذکرہ نکات الشعرا کو تقدم حاصل ہی۔

میر کی تنقیدوں پر سخت اعتراضات ہوئے ہیں۔ ان کی تنقید کو خردہ گیری عیب چینی، اور ہنر پوشی سب ہی کچھ کہا گیا ہی۔ ان معترضین میں خاص طور پر قابل ذکر فتح علی گردیزی (صاحبِ تذکرہ ریختہ گویاں) میر محمد یار عرف کلن (تذکرہ خاکسار کے مصنف) حکیم قدرت اللہ قاسم (صاحب مجموعہ نغز) شفیق اورنگ آبادی (صاحبِ چمنستان شعرا) مولوی کریم الدین (صاحبِ طبقات الشعرا) اور مولانا آزاد (صاحبِ آبِ حیات) ہیں۔ لیکن اس مخالفت کے باوجود، نکات الشعرا کی مقبولیت اور وسعت اثر میں فرق نہیں آیا۔ شفیق اورنگ آبادی نے لکھا ہی کہ

---

۵۱ دیباچہ ص ۱ ۵۲ دتاسی۔ خطبات ص ۷۳-۷۴۔

تذکرہ نکات الشعرا...... شورے در عالم انداخت'

گردیزی کو میر کی "خردہ گیری اور ستم ظریفی" کے علاوہ اس کی شکایت ہے کہ انھوں نے اکثر نازک خیالانِ رنگین نگار" کو قلم انداز کر دیا ہے اور بعض کے "تصحیح اخبار و تحقیق احوال" میں نمایاں غلطیاں کی ہیں۔ میر محمد یار عرف کلن نے نکات الشعرا کا جواب لکھا تھا، یہ تذکرہ موجود نہیں لیکن میر کا تذکرہ موجود ہے۔ اس میں بھی انھوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بسیار سفلگی می کند بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ چنانچہ علی الرغم این تذکرہ نوشتہ است۔ بنام معشوق چہل سالہ خود۔ احوال خود را اول از ہمہ نگاشتہ۔ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ۔ آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است۔ چوں کیا بم بو می دہد این قسم پے من رسیان مے تابد۔ کہ گوئی پسر رسن تاب است محمد معشوق لکھنوہ کہ مردے است نائب میر بحر بسیار گر مجوش دیار باش چوں شنید کہ خاکسار کلو ہم نام دارد دہدا گفتہ۔ ع کہتا ہے دریار کا کلو اس کا نام

چوں کلو اکثر نام سگہا می گزارند۔ لطف بہم رسانید۔ ہر کہ دم لایہ او دیدہ است می داند۔ فخر او ہمہ بر ریختہ است۔ طرفہ این کہ آں ہم نا مربوط و خود او ہم نادرست ...... الغرض بسیار کم فرصت و بے تہ است[1]

قدرت اللہ قاسم نے بھی میر کے کبر و غرور پر سختی سے نکتہ چینی کی ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا خیال ہے کہ آب حیات "میں میر صاحب کی سیرت کی جو بد نما تصویر اتاری گئی ہے۔ اس کے بعض رنگ حکیم صاحب ہی کے تیار کردہ ہیں[2]۔ چمنستان شعرا میں شفیق اورنگ آبادی نے میر کے خلاف خوب زہر اگلا ہے اور جتنی میر نے انعام اللہ خاں یقین

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۲۱، ۱۲۲ [2] دیباچہ مجموعہ نغز۔

کی بُرائی کی تھی اتنی ہی شفیق نے یقین کی تعریف کی ہے:

شہنشاہِ قلمروِ سخن دانی و یوسف کنعانِ معانی است۔ طوطی شکر مقال
از گلستان ہند برنخاستہ کہ باآں عندلیب ہزار داستان سخن بہ تشابہ گراید۔[1]

یہی نہیں بلکہ سودا نے جو میر کی ہجو لکھی تھی۔ اس کی خوش ہو ہو کر داد دی ہے۔

مرزا رفیع السودا در حق میر گفتہ و گوہرِ انصاف سفتہ :۔

ہے جو کچھ نظم و نثر دنیا میں — زیر ایراد میر صاحب ہے
ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح — لوگ کہتے ہیں سہوِ کاتب ہے[2]

میر نے بھی تذکرہ نکات الشعرا میں یقین پر طعن و تعریض کی انتہا کر دی ہے اور اسے "کم فہم"، "مبتذل بند" اور "سارق" سب ہی کچھ کہا ہے[3] اور آخر میں "ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد" کہہ کر اس کی سخن ناشناسی پر مہر لگا دی ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم نے نکات الشعرا کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

> تمام تذکرے میں ایک لفظ بھی میر کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس سے
> اس کی خود بینی اور خود پسندی یا بد دماغی اور تعلی عیاں ہو۔

افسوس ہے کہ حاتم (ص ۷۹)، یقین (ص ۸۴)، حشمت (ص ۷۶)، خاکسار (ص ۱۲۱) اور بیکرو (ص ۸۳) کے متعلق میر نے جو کچھ اپنے تلخ اور زہرناک لہجہ میں لکھا ہے۔ اس سے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی۔ میر کی تنقید میں ان کی سیرت پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ دوسروں کی سیرت سے بحث کرتے ہیں خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب اٹھ گیا ہے اور دوسرے شاعروں کے جوہر پرکھنے میں خود ان کے جوہر بھی کھل گئے ہیں۔ میر میں تنقیدی قوت تو بدرجہ اتم موجود ہے اور اس کا اظہار بھی وہ بڑی بے باکی اور بے دردی سے کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے لب و لہجہ میں تلخی اور ترشی ہے۔ اور اس نے ہمدردی کے

---

[1] چمنستان شعرا ص ۱۶۱ [2] ایضاً ص ۱۶۸ [3] نکات الشعرا ص ۸۵، ۸۶، ۸۷۔

اس عنصر کو نقصان پہنچایا ہے جو اچھی تنقید کا لازمی جزو ہے۔ لیکن بقول ڈاکٹر سید عبداللہ تذکرہ میر کی امتیازی خصوصیت اس کی یہی تلخ تنقید ہے۔ وہ اندھی اور بہری عقیدت جو قدیم مشرقی اخلاق کا ایک جزو ہے اور وہ عام رواداری جو اکثر حالات میں ہیرو کے معائب بیان کرنے سے روکتی ہے، نکات الشعرا سے عموماً مفقود ہے۔[۱] انہوں نے آگے چل کر لکھا ہے

> نکات میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے۔ اور تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور دانشگاف رائیں پائی جاتی ہیں جن کو پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یوں بھی یہ بات زمانے کی فضا کے خلاف تھی۔ پھر یہ بات اور بھی مستزاد ہوئی کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے میر نے ان کی دل شکنی کی مطلق پروا نہیں کی۔

میر کی اصابت رائے، ان کی دیدہ وری اور بصیرت میں شبہ نہیں لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ ان کی خود بینی اور انتہا پسندی نے اُن کی تنقیدوں کو نقصان پہنچایا ہے۔

میر نے حاتم کو جاہل و متمکن و دیر آشنا کہا ہے۔ اور ان کے ایک شعر کی اصلاح اس طرح کی ہے۔

حاتم ؎

ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا   آگے آیا مرے کیا میرا

میر ؎

مبتلائے تشنگی میں ہوں اب میں   آگے آیا مرے کیا میرا

اصلاح کے بعد لکھتے ہیں: "پیش گرمی ایں مصرع خنکی آں شعر روشن است" یہ باتیں

۱۔ شعرائے اردو کے تذکرے۔ رسالہ اردو ج ۲۲ نمبر ۸۶۔

میر کو زیب نہیں دیتیں۔

میر حسن اور مصحفی دونوں نے حاتم کی تعریف کی ہے اور ان کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ مصحفی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جواں بود، بعد ازاں نقش بدیگراں رسیدہ۔

یقین کے متعلق بھی جو کچھ میر نے لکھا ہے۔ اس میں تعصب کی جھلک موجود ہے۔ ان کے کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شعر و سخن کا بہت اچھا مذاق تھا اور ان کو ناشاعر تو کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔

میر نے شعرائے دکن کو "پُر بے ربتہ" کہا ہے اور ان کے مفصل حالات پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ دلی کے شیوا بیان جن کی تربیت فارسی کے ماحول میں ہوئی تھی، اس دکنی زبان کو پسند نہیں کر سکتے تھے جس میں ہندی، سنسکرت اور مرہٹی کی آمیزش تھی۔ اس لئے میر نے تقریباً وہی رائے ظاہر کی ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کی تھی۔ اس کے علاوہ میر ان لوگوں میں سے تھے جو اردو کو فارسی کی سطحِ امتیاز پر لانا چاہتے تھے اس لئے اور بھی یہ شعرا ان کی نظر میں ہیچ تھے۔ ولی جو بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں انھوں نے "شاعریست از شیطان مشہور تر" تو نہیں لکھا جیسا کہ آزاد کا خیال ہے لیکن وہ حقیقتاً "از کمالِ شہرت احتیاج تعریف ندارد و احوالش کما ینبغی معلوم من نیست" سے زیادہ توجہ اور التفات کا مستحق تھا۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ میر کی تنقیدوں سے ان کی سیرت اور شخصیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ شہادت چونکہ بالواسطہ ہے اس لئے نہایت اہم ہے۔ ان کی پسند اور ناپسند ان کی طبیعت کی افتاد اور اصلی صفات کا اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب "سرِ دلبراں" کو "حدیث دیگراں" میں ڈھونڈا جائے اس طرح میر کی جو تصویر مرتب

ہوتی ہے وہ اس خیالی تصویر سے بالکل مختلف ہے جس میں عام طور پر یہ دکھلایا گیا ہے کہ میر نہایت خلوت پسند اور کم اختلاط آدمی تھے۔ ان کا حال اس فاختہ کا سا تھا جو اپنے سر کو اپنے پروں میں چھپائے رہتی ہے۔ وہ کسی سے ہنس کے اور بے تکلفانہ بات کرکے جانتے ہی نہ تھے لیکن تذکرہ نکات الشعرا کو اگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل مختلف تصویر مرتب ہوتی ہے۔ اُن کی میزانِ قدر میں جس صفت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ شگفتگی اور خوش خلقی ہے۔ میر نے اپنے تذکرہ میں ایک سو ساٹھ شاعروں کے قلمی چہرے پیش کئے ہیں لیکن ان زنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصلی جھلک موجود ہے۔ میر نے بعض صفات پر بہت زور دیا ہے اور ان کو اکثر شاعروں کی سیرت میں ڈھونڈھنے کی کوشش کی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان صفات کو دوسری صفات کے مقابلہ پر زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

امید کے حال میں لکھا ہے۔

عزیز دلہا، خوش اختلاط ہمیشہ خنداں و شگفتہ رو۔ (ص ۷)

مبارک کے متعلق لکھتے ہیں:

طبعے شوخے داشت (ص ۹)

میاں شرف الدین مضمون کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

ظریف، بشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلس ہا (ص ۱۴)

یک رنگ کے متعلق لکھتے ہیں:

بسیار چسپاں اختلاط و آشنائے درست بود (ص ۱۸)

خواجہ میر درد کے متعلق لکھتے ہیں:

خلیق، متواضع، آشنائے درست۔ (ص ۵۰)

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میر کے بیانات میں شگفتگی اور یار باشی

کی خصوصیات رستا نہیں آئی ہیں بلکہ وہ انہیں اچھی زندگی کا لازمی جزو سمجھتے ہیں۔

میر نے متذکرہ بالا صفات کا ذکر اپنی محرومی کو چھپانے کے لئے بھی نہیں کیا ہے جیساکہ اسٹیونسن اور عظیم بیگ چغتائی کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے —— یہ دونوں مصنف مریض اور منحنی قسم کے تھے لیکن ان کے یہاں بلا کی زندگی، توانائی اور شوخی ہے۔ اس طرح دراصل وہ اپنی کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں لیکن میر کے یہاں گرم جوشی کا ذکر کسی محرومی کو چھپانے کے لئے نہیں کیا گیا بلکہ ان کے یہاں یہ صفت ایک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے پاس کچھ دوسری شہادتیں بھی ہیں جو اس دعویٰ کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ روتے ہوئے اور بسورتے ہوئے آدمی نہیں تھے۔ نکات الشعرا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرسوں اور میلوں میں شرکت کرتے تھے (ص ۷) مراختوں میں جاتے تھے اور خود اپنے گھر مشاعرے کرتے تھے۔ وہ لوگوں کے پاس ملنے کے لئے جاتے تھے۔ اور لوگ ان کے پاس ملنے کے لئے آتے تھے۔ (ص ۲۸، ۵۴، ۷۷) یہی نہیں بلکہ میر اپنے دوستوں کے ساتھ باہم بیٹھتے، شعر کہتے اور ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے۔ (ص ۲۸) سلام کے بیان میں لکھا ہے۔

فقیر را با او ازبسکہ دل اخلاص است چنانچہ اکثر اوقات اتفاق باہم
فکر شعر کردن و گپ زدن و مزاح نمودن مے افتد (ص ۱۴۱)

اسی چیز کو میر دوسروں کے یہاں بھی پسند کرتے ہیں۔ بیدار کے بیان میں لکھا ہے:

یادش بخیر یک آشنائے با مزہ داشتم۔ بسیار خوش ظاہر بود۔

میاں حسن علی کے بیان میں لکھتے ہیں۔

بندہ را بخدمت او ربط کلی است، اکثر اتفاق ملاقات می افتد۔

میر علی نقی کے بیان میں لکھتے ہیں: "با فقیر ربط دلی دارد۔"

کلیم کے بیان میں لکھا ہے:

یک اخلاص تہ دلی دارم

فغاں اور سلام کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ میر ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے تھے۔ اور دوسروں کے مزاح سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ لکھتے ہیں۔

دریں ایام طبع او مائل لطیفہ بسیار است۔ چنانچہ ناگرمل راکہ دیوان تن و دخیل بادشاہی است۔ گھی کی منڈی کا ساند گفتہ، ہر کہ دیدہ دیدہ باشد وفہمیدہ باشد و حکیم معصوم را در دربار معلّی گاؤ گجراتی نام کردہ، ہر کہ حکیم صاحب را بیند داند۔ بندہ بخدمت او بسیار مربوطم (ص ۷۴)

فضل علی دانا کے بیان میں لکھتے ہیں۔

اتفاقاً در موسم ہولی تاریخ پانزدہم کہ مجلس خانۂ فقیر مقرر است واقع شد میاں دانا نیز تشریف داشت لیکن بہ لباس عجبے، یک تنی سیاہ ببر کردہ کہ دامنش تا بزانو بود چوں رنگِ ذات شریف وریش از حد زیادہ ہر دو سیاہ بود، مرزا رفیع کہ سابق گزشت بمجرد مشاہدہ کردنِ او گفت کہ "بادہ ہولی کا ریچھ آیا...... ایں لطیفہ بسیار بموقع افتاد بلکہ صورت گرفت....."

(ص ۱۳۷)

میر صاحب خود بھی فقرے چست کرتے تھے۔ غریب کے متعلق لکھتے ہیں۔

چوں اکثر در باغات مغل پورہ می رفت بندہ او را ازنڈ باغاتی می گفتم۔

معاصرین کی تعریف کرنے کے لئے بڑی وسیع القلبی کی ضرورت ہے۔ میر، سودا کے متعلق لکھتے ہیں۔

سر آمد شعرائے ہندی...... چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شایدہ[1]

---

[1] نکات الشعرا ص ۳۲۔

کرم اللہ خاں کے متعلق لکھتے ہیں۔

بسیار خوش فکر، عاشق سخن۔[1]

میر حسن کے متعلق لکھتے ہیں۔

وضع مرد آدمیانہ دارد۔[2]

میر عبدالرسول نثار کے متعلق لکھتے ہیں۔

سید نجیب جواں سعادت مند۔[3]

عہدِ وسطیٰ میں یہی خصوصیات سب سے زیادہ عزیز تھیں اس لئے میر نے خاص طور سے ان ہی پر زور دیا ہے۔

میر عاشق مزاج اور حسن پرست واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے بعض شاعروں کا ذکر جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی کیا ہے۔ میر عبدالحیٰ تاباں کے متعلق لکھتے ہیں کہ ایسا حسین شخص آدم سے اب تک ظہور میں نہیں آیا۔ آخر میں لکھا ہے۔

معشوق عجبے از دست روزگار رفت افسوس، افسوس، افسوس۔[4]

اگر تنقید ایک سماجی عمل ہے تو اس سے سماجی حالات بھی واضح ہو سکتے ہیں میر کی تنقیدوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) اس زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں میں بڑا اتحاد اور میل جول تھا! اور بعض شعرا قید مذہب و ملت سے آزاد تھے۔[5]

(۲) اہلِ قلم، اہلِ سیف بھی تھے اور سخن فہمی اور شمشیر شناسی میں تضاد نہیں تھا

(۳) درویشی اور شاعری دوش بدوش چلتی تھیں۔

(۴) زمانہ پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے بعض شعرا ہزل کی طرف مائل تھے (ص ۲۳، ۳۱، ۱۵۶)

---

[1] نکات الشعرا (ص ۷۷)، [2] ایضاً ص ۱۴۵ [3] ایضاً ص ۱۴۳ [4] ایضاً ص ۱۱۶ [5] ملاحظہ ہو میر کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ از راقم الحروف۔ مطبوعہ آجکل یکم ستمبر ۱۹۴۵ء۔

(۵) مشاعرے معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کی حیثیت ادبی جلسہ کی ہی نہیں تھی، تنقیدی ادارے کی بھی تھی۔[۵۱]

(۶) سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی بھی زوال پذیر تھی اور اس کی خاکستر اردو کے لئے سامانِ وجود بن گئی تھی۔

یہ سماجی حالات اس جگہ ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہیں۔ اس لئے ہم نے ان پر تفصیلی بحث نہیں کی ہے۔

میر کی تنقیدوں سے ان کا نظریۂ شاعری بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ شاعری کو گل وبلبل میں محدود کرنا نہیں چاہتے تھے (ص ۱۱۵) وہ ایہام کے سخت مخالف تھے۔ (ص ۲۸) اور "لفظِ تازہ کی تلاش" پر زور دیتے تھے (ص ۱۶) اس کے علاوہ وہ دردمندی کو جو انسانیت کے لئے لازمی ہے شاعری کی بھی ضروری شرط قرار دیتے تھے (ص ۹۸) میر کی تبلیغ اور استادانہ اصلاحوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کو بے جان اور بے روح چیز نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ ہر لفظ میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ ہوتا ہے اور اس کا صحیح اور مناسب استعمال ہی شعر میں آب و رنگ پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے لئے بقول میر سلیقۂ شاعرانہ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ وہ تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو فصاحت وبلاغت اور ادا بندی خیال کو بھی اچھی شاعری کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔

کوئی نقاد اس وقت تک بڑا نہیں ہو سکتا جب تک اس کا ہاتھ تاریخ کی نبض پر نہ ہو۔ میر سے یہ توقع رکھنا کہ وہ تاریخ کے موجودہ مفہوم سے آشنا تھے۔ سراسر زیادتی ہے لیکن اس کا ایک عمومی شعور ان کو ضرور تھا وہ شاید پہلے شخص ہیں جنہوں نے دکن کے تاریخی تقدم کو مانا ہے۔ اگرچہ وہ اس کے ادبی کمالات کے منکر ہیں۔ یہ معاملہ معاصرانہ رائے کا ہے۔ اس کے لئے میر کو معذور سمجھنا چاہیے۔

---

[۵۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو عنوان "میر کے زمانہ کی ادبی محفلیں" (کتاب ہذا) ص ۵۵۲

میر کی تنقیدوں کی زبان صاف، پراثر، اور بے باکانہ ہے۔ انھوں نے چند لفظوں میں پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ یہ تصویریں بے جان نہیں ہیں۔ بولتی ہوئی اور جیتی جاگتی ہیں ان کی رائے بے لاگ، بے باک اور بعض جگہ زہرناک ہے۔ ان کی پسند اور ناپسند دونوں میں ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ حاتم کو انھوں نے "جاہل" کہا ہے اور میر سجاد جو طالب علم تھے ان کے اشعار پر سر دھنا اور ان کو سو جگہ لکھنے کی تمنا کی ہے۔ یہ توازن کی کمی، ان کی شخصیت میں بھی ملتی ہے۔ ان کے جذباتی نفس اور عقلی نفس میں ایک قسم کی کش مکش ہے۔ اسی وجہ سے بعض جگہ اعتدال اور توازن کی کمی ہے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی ان کی تنقید موثر اور بے لاگ ہے اور دراصل اسی قسم کا نقاد پرانے بتوں کو توڑ سکتا ہے لیکن "نکات الشعرا" میں اس کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ ان کی تنقید تخریبی ہی نہیں، تعمیری بھی ہے۔ انہوں نے اگر ایک کعبہ گرایا ہے تو دوسرا بنایا بھی ہے۔ یہ جرأت ان کی عظیم الشان شخصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیس برس کی عمر میں وہ "میرِ مجلس" ہو گئے تھے اور اس اعتماد اور یقین کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے کہ "باعوام کار ندارم۔ ایں کہ نوشتہ ام برائے یارانِ من سند است"۔

دریائے عشق (نثر)

نیرنگ رام پور کے میر نمبر سے معلوم ہوتا ہے کہ میر نے اپنی مثنوی دریائے عشق کو فارسی نثر میں لکھا ہے۔ یہ رسالہ غیر مطبوعہ ہے اور اس کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ اڈیٹر نے لکھا ہے۔ کہ یہ رسالہ ایک قلمی بیاض میں دستیاب ہوا ہے اسی میر نمبر سے اس کے چند اقتباسات دیے جاتے ہیں۔ تمہید میں لکھا ہے:

عشق بے محابا چند بزرگاں را شور در سر گردید و چہ جواناں را جامہ در خون کشید دیدی کہ بیعقوب چہ دید در سر شیخ صنعاں چہ رسید یوسف را در زنداں بگذاشت و پردہ از روئے کار زلیخا برداشت۔

داستان اس طرح شروع کی ہے:

در شہر ماہروئے بود جوان رعنا در خوبصورتی و تناسب اعضا یکتا گل بود و گل پیرہن افزائیدہ رشک چمن بخوبی و خوش اسلوبی آراستہ چوں سرو سہی نو خواستہ خوش چشم قامت بلندے معشوق عالم پسندے۔ رنگین خرام رنگین ادا۔ بہار جلوہ نما نرگس مہتابی، نعلش عنابی طرز نگاہ دلہا کشیدے جنبش مژگاں بجاں خلیدے .....

اس کے بعد جوان رعنا کا مہ پارہ پر عاشق ہونا اس کی پریشانی۔ دایہ کی مکاری۔ عاشق کا ڈوبنا، مہ پارہ کو لے کر دایہ کو پلٹنا۔ اور مہ پارہ کا بھی اسی جگہ ڈوب جانا یہ تمام واقعات اسی انداز میں درج ہیں۔

اختتام پر لکھتے ہیں:

میر اگرچہ نوشتن حالات عشق ہوس است۔ ہمیں قدر بس است بیا در گ ہوس کن و خاتمہ را بگذار و بس کن، عشق شعبدہ بازی است معروف و مشہور نفر قاتش بر السنہ مذکور چوں شعبدہ سر می کند از آب آتشے بر می کند

عشق از محیط شعبدہ چوں سر بر آورد

از پردۂ محیط سمندر بر آورد

ذکرِ میر دریائے عشق کی طرح ذکر میر کا بھی تذکروں میں ذکر نہیں ہے۔ صرف اشپرنگر نے اپنی فہرست میں ذکر کیا ہے۔ خوشی کا مقام ہے کہ اس کتاب کو انجمن ترقی اردو نے شائع کر دیا ہے۔

ذکر میر میر کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ اور اس سے میر کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ انکشافِ ذات یا اظہار حال کا شوق، انسان کے خمیر میں داخل ہے اسی وجہ سے ادب کے وہ اصناف جن کے ذریعہ سے ہم کسی شخصیت کے پورے خط و خال

معلوم کر سکیں، ہمیشہ دل چسپی کا باعث رہیں گے۔ خود نوشت کے ذریعہ ہم مصنف کی روزمرہ کی زندگی، اس کے جذبات و احساسات، اس کے اعمال و اشغال کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ہم دوسروں کی زندگی معلوم کرکے خاص طور پر دل چسپی محسوس کرتے ہیں۔ اس کی دراصل وجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی ذات سے دل چسپی رکھتے ہیں۔ دوسروں کی محبّت و نفرت، ان کا رنج و غم، ان کی کامیابی و ناکامی ہمارے لئے کوئی غیر چیز نہیں ہے۔ انسانی فطرت تقریباً ہر جگہ ایک ہی سی ہے۔ اس آئینہ میں ہمیں دوسروں کی صورت کے ساتھ اپنی صورت بھی نظر آتی ہے۔ اس لئے اچھی خود نوشت وہی سمجھی جائے گی جس میں زندہ شخصیت یا فردیت پورے طور پر جلوہ گر ہو۔

خود نوشت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس سے ہم تاریخی معلومات حاصل کر سکتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ڈائری، خود نوشت اور خطوط سے جتنے مستند تاریخی واقعات معلوم ہو سکتے ہیں، اتنے کسی دوسرے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ انگلستان کے عہدِ اعادۂ شاہی کی تاریخ Pepys اور اٹھارہویں صدی کے فرانس کو St. Simon کی تحریروں کے بغیر سمجھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اسی طرح سلاطین ترکی اور شاہانِ صفویہ کے تعلقات منشات السلاطین یا منشات فریدوں کے بغیر واضح نہیں ہو سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ براؤن نے ان کو تاریخ ادبیات ایران میں بہت فراخ دلی سے استعمال کیا ہے[۱]۔ لیکن ان چیزوں سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، جب مصنف کا مشاہدہ وسیع ہو۔ اس میں قوت نقد و تمیز موجود ہو اور ساتھ ہی ساتھ وہ بے لوث غیر جانب دار اور بے تعصّب ہو۔

نفسیاتی اعتبار سے بھی خود نوشت کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں۔ جب ان

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران ج ۴ ص ۶۶، ۶۷۔

کے مصنفین دوسروں کا ذکر کرتے ہیں تو خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب بھی اٹھ جاتا ہے اور اس "حدیث دیگراں" سے "سرِ دلبراں" بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ خوں گشتہ تمناؤں اور چھپی ہوئی آرزوؤں کا ذکر ان کے ذہن اور دماغ کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیتا ہے اور اس طرح اُن کے اجمال و عواطف کے بہت سے سربستہ راز کھل جاتے ہیں۔ میر خود پوشی اور خود نمائی کے درمیان برابر جھولتے رہتے ہیں۔ اس لئے محمد حسین خان آرزو، میر جعفر عظیم آبادی، سعادت امروہوی راجہ جگل کشور، راجہ ناگرمل اور نواب آصف الدولہ وغیرہ کے متعلق ان کے بیانات دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ دوسروں کی سیرت نگاری کی کوشش میں خود ان کی سیرت کے بھی بہت سے پہلو بے نقاب ہو گئے ہیں۔

خود نوشت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک داخلی یا نفسی۔ جس میں اشیاء یا خیالات اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ مصنف کے نقطہ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کئے جاتے ہیں۔ دوسری قسم، خارجی یا معروضی ہے۔ جس میں حالات و واردات، واقعیت پسندانہ طور پر، جیسے کہ وہ فی الحقیقت ہیں۔ قلم بند کئے جاتے ہیں۔ میر کی خود نوشت میں یہ دونوں طرز شیر و شکر ہو گئے ہیں۔ بعض حصے البتہ معروضی ہیں۔

خود نوشت میں سب سے اہم چیز توازن ہے۔ وہ نہ تو اپنے پندار ہی کا صنم کدہ ہو اور نہ محض اپنے مخصوص فلسفے ہی کا تذکرہ اگر ایسا ہوا تو وہ خود نوشت تو ہو گی لیکن لطف سے محروم، میر کی خود نوشت اس اعتدال و توازن سے خالی نہیں ہے۔ شروع میں انہوں نے کچھ بزرگوں کے محیّر العقول کارنامے بیان کئے ہیں۔ لیکن ان کو صرف بیان کر دیا ہے۔ ہمیں ماننے یا نہ ماننے پر مجبور نہیں کیا۔ دوسرے ان واقعات کو اس زمانے کے مخصوص معاشرتی حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے جب ہماری زندگی کی تھکی اور سسکتی ہوئی قوتیں تصوف کے دامن میں پناہ لے رہی

تھیں اور وہ اس وقت خود روبہ انحطاط اور زوال پذیر تھا۔

ذکر میر میں "عم بزرگوار" کا انتقال، میر محمد علی کی وفات آرزو کی بدسلوکی، میر کی مجنونانہ حالت، امیر خاں کی حویلی کا قیام، میر کی پریشان حالی، روزگار کی نیرنگی، دُرانیوں کی غارت گری، مرہٹوں کے پے بہ پے حملے —— یہ تمام واقعات ایسے ہیں جو بڑے پرسوز طریقے سے بیان کیے گئے ہیں اور ہمارے دل میں ہمدردی کی ایک لہر پیدا کر دیتے ہیں۔ میر نے اپنی شخصیت کی تمام تہیں نہیں کھولی ہیں لیکن اس کم گوئی اور دیر آشنائی کے باوجود اس سے میر کے رجحانات اور احساسات کا جتنا اندازہ ہوتا ہے، اتنا غالباً کسی اور تصنیف سے ممکن نہیں۔ انسان اپنے لیے خود ایک معمّہ ہے، اس کا پندار ذاتی گتھیوں کے سلجھانے میں معاون نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میر نے جتنا بھی اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے وہ کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ پھر اس زمانہ میں اصحاب درد و ذوق کا یہ شیوہ نہیں تھا کہ اپنے متعلق ہر بات لکھتے پھریں اور اپنی چھپی ڈھکی باتیں منظر عام پر لے آئیں، لیکن "سراپ شیشہ فرو بند" اور اخفائے حال کی کوشش کے باوجود ذکر میر میں کہیں کہیں یہ شراب تیز و تند صراحی سے باہر آگئی ہے۔

میر اور خان آرزو کے تعلقات تاریخ ادب کا ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہیں اس خود نوشت سے ان پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اور اس میں میر کی سیرت کے بعض ایسے پہلو نظر آجاتے ہیں، جو اب تک تاریکی میں تھے۔

باپ[1] کے مرنے کے بعد میر کو تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ شروع میں وہ اطراف اکبرآباد میں پھرتے رہے لیکن جب کوئی صورت کامیابی کی نظر نہیں آئی تو دلی کا رخ کیا

---

[1] ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے: "آب حیات میں نیز گلزار ابراہیمی میں میر صاحب کے والد کا نام میر عبداللہ
(باقی نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھیے)

یہاں امیر الامرا صمصام الدولہ کے دربار میں رسائی ہو گئی اور انھوں نے میر کا روزینہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۳۵ ملاحظہ ہو) لکھا ہے۔ میر صاحب اس کتاب (ذکر میر) میں ہر جگہ "میر علی متقی" لکھتے ہیں اور کہیں ایک مقام پر بھی میر عبداللہ نہیں آیا" (مقدمہ ذکر میر صفحہ د) اس بیان میں بہت سی غلطیاں ہیں:

(۱) گلزار ابراہیم میں میر کے والد کا نام درج نہیں ہے۔

(۱۱) ذکر میر میں ایک جگہ بھی میر علی متقی نہیں ہے لفظ میر اضافہ عبدالحق صاحب کا ہے۔ چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

بخطاب علی متقی امتیاز یافت ص ۵

علی متقی در اکبر آباد است ص ۱۶

برادر خورد علی متقی کہ مشہور آفاق است ص ۲۲

سلام من بعلی متقی خواہی رسانید ص ۲۸

فرزند علی متقی است ص ۳۸

اما یک بار برخوردن تو با علی متقی ضرور ص ۵۰

ص ۶۲ پر لکھا ہے: گفت از میر محمد علی است۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علی متقی لقب تھا اور محمد علی نام۔ آزاد نے میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ نہیں دیا (آب حیات ص ۲۰۳)، تذکرہ سعادت خاں ناصر میں میر کا نام محمد تقی اور والد کا نام عبداللہ لکھا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"استاد استاداں، امام شرع سخن وراں، عدیم المثال و بے نظیر، محمد تقی، تخلص بہ میر پسر رشید عبداللہ"

تذکرہ سراپا سخن میں بھی میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آب حیات اور سراپا سخن کا ماخذ تذکرہ ناصر ہی ہو جو میر کے متعلق قدیم کتابوں میں ہے۔ سراپا سخن کی عبارت یہ ہے:

"سخن ور بے نظیر میر تقی مغفور ولد میر عبداللہ" ص ۲۶۵) عبدالغفور نساخ نے بھی میر کے والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے (سخن شعرا، ص ۴۷۹)

(اس صفحہ کا نوٹ ۱۔ اگلے صفحے پر ملاحظہ کیجیے)

مقرر کردیا۔ میرؔ نے ان واقعات کو ذکرِ میرؔ میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہی:

"خواجہ محمد باسطؔ کہ برادر زادۂ صمصام الدولہ امیر الامراء بود عنایتے بحالِ من کردہ پیش نواب برد۔ چوں مرا دید پرسید کہ ایں پسر از کیست؟" گفت "از میر محمد علی است" فرمود "از آمدنِ ایں پیدا ست کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند۔ پس از افسوس بسیار سخن زد کہ آں مرد بر من حقہا داشت۔ یک روپیہ روز از سرکارِ من بایں پسری دادہ باشند" التماس نمودم" اگر نواب

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۳۶ ملاحظہ کیجیے) علی ابراہیم نے لکھا ہی: "یہ عام طور پر خواجہ محمد عظیم کہلاتے تھے اور فرخ سیر کے امیر تھے۔" تذکرہ شورش میں ہے " اگرچہ بظاہر محمد شاہ کے امیر الامرا تھے لیکن در حقیقت ان کے وزیر تھے۔ نادر شاہ کی لڑائی میں کام آئے۔" (بحوالہ یادگار شعرا ص ۱۲۷) امیر الامرا در بخشی کا درجہ کتنا بڑا تھا اس کا اندازہ مراۃ الاصلاح مصنفہ انند رام مخلص کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوسکتا ہی:

وزیر اعظم و میر بخشی کہ پایہ ایں ہا بلند تر از امرائے دیگر است در سلام گاہ ایستادہ شدہ سلامے نمایند۔ (نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ ورق ۱۷)

صمصام الدولہ کا انتقال ۶۸ برس کی عمر میں ۱۹ ذی قعدہ ۱۱۵۱ھ کو ہوا (تاریخ محمدی نسخہ رام پور)

۱؎ محمد علی خاں عاصی صاحب تاریخ مظفری اپنی ایک دوسری کتاب تالیفِ محمدی (نسخہ پٹنہ) میں خواجہ محمد باسط کے متعلق لکھتے ہیں:

مرید و جانشین پدر خود خواجہ جعفر است از علم دینی و معارف یقینی بہرۂ وافی داشت در سنہ یک ہزار و ہفتاد و ہشت بہ استیلائے مرض یرقان بفردوس بریں شتافت عزیزے مادہ تاریخ چنیں یافت "فیضِ مومنین باسط" در لکھنؤ متصل سرائے معالی خاں مدفون گشت۔ زندگانیش ہفتاد سال" خواجہ باسط کا مذہب امامیہ تھا اور جناب قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ بارھویں صدی ہجری میں اہل تشیع میں بھی پیری مریدی رائج تھی (نقوش ش ۳۳، ۳۴)

لطف می فرماید دستخط کردہ بدہد کہ جائے سخن مقصدیان نماند۔" التماسے کہ نوشتہ بودم از کیسہ برآوردم ۔ ناگاہ از زبان خواجہ مذکور برآمد کہ وقت قلمدان نیست ۔ چوں ایں سخن شنیدم بقاہ قاہ خندیدم ۔ نواب در روئے من دید و سبب خندہ پرسید عرض نمودم کہ ایں عبارت را نفہمیدم ، اگر ایشاں می گفتند قلمدان بردار حاضر نیست ایں حرف گنجائش داشت یا آں کہ وقتِ دستخطِ نواب نیست باتی بود ۔ وقت قلمدان نیست ، انشائے تازہ است ۔ قلم دان چوبی بیش نمی باشد او وقت و غیرِ وقت نمی داند ۔ بہر نفرے کہ اشارت رود برداشتہ بیارد ۔ نواب بخندہ درآمد و گفت کہ معقول می گوید ۔ غرض تکلیف مرا برخاک نیفگندہ قلمدان طلبید و آں التماس بشرف دستخط رسید ۔ روز دربار بادشاہ بود کمر بستہ باشاد ، بہ عنایتِ تمام میان داد ۔ تا عہدیکہ نادشاہ بر محمد شاہ کہ حالا بفردوس آرام گاہ ملقب است مسلط شد و نواب مذکور بسبب میش جنگی کشتہ افتاد ، آں روزینہ می یافتم ، نان و نمک می خوردم و بسر می بردم[۱]

جناب قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ "وقتِ قلمدان نیست" کا واقعہ صحیح نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں :

میر اواخر ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے ہیں (مقدمہ کلیاتِ میر ص ۹) اور وہ صمصام الدولہ کی وفات سے ایک سال قبل بھی ان کے پاس گئے ہیں تو ان کی عمر اس وقت پندرہ سے زیادہ نہ تھی ۔ یہ بات ہرگز باور کرنے کی نہیں کہ ایک طفل پانزدہ سالہ امیر الامرائے ہند کے سامنے جو عمر میں کم و بیش ۵۰ سال بڑا بھی ہو ، قہقہہ مار کر ہنسے اور اس کا سبب دریافت کیا جائے تو

---

[۱] ذکر میر ص ۶۲ ، ۶۳ ۔

ان الفاظ میں ایک لفظی گرفت کرے :

من عبارت ترا نہ فہمیدم الخ

قلمدان کا وقت نہیں سو یہ مراد لینا کہ قلم دان کے استعمال کا وقت نہیں، اگر غلط بھی ہو تو ایسی بات نہیں جس پر ہنسی آئے۔ ہاں کسی کی تضحیک خاص طور پر مد نظر ہو تو اور بات ہے[1]

لیکن یہ واقعہ خود میر نے لکھا ہے جن کی بے باکی اور جرأت تقریر بیاناً مسلّم ہے اور وہ ان کی افتاد طبیعت اور احساس برتری کے عین مطابق ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو غلط سمجھا جائے۔ میر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو یہ اعتراض البتہ بہت وزنی تھا۔ دوسرے اس محفل میں میر کم عمر ہی لیکن مرشد زادے تھے۔ انھوں نے بچپن کی سادگی سے ایک بات کہی تھی۔ طنز و تضحیک ان کا مقصد نہ تھا۔ اسی لئے صمصام الدولہ کو بھی ان کا اعتراض ناگوار نہیں ہوا۔

نواب بخندہ در آمد و گفت کہ معقول می گوید[2]

بہر حال ——— یہ آسائش دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔ امیر الامرا، نادر شاہ کے ہنگامہ و آشوب میں مارے گئے اور میر پھر بیکار اور پریشان روزگار ہو گئے۔ اس لئے مجبوراً اکبر آباد آئے لیکن وطن میں جو لوگ ان کی خاکِ پا کو سرمہ سمجھ کر آنکھوں میں لگاتے

---

[1] نقوش لاہور نمبر ۳۳، ۳۴ ص ۲۱ [2] ذکر میر ص ۶۳۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ امیر الامرا صمصام الدولہ میر کے والد کا بڑا خیال کرتے تھے اور وہ ان سے ملاقات کے بھی روادار نہیں تھے۔ ذکر میر میں لکھا ہے: آوازہ درافتاد کہ درویشے بایں حالت وارد شہر است۔ امرا التماس ملاقات نمودند۔ قبول نکرد کہ من فقیر و شما امیر، میان من و شما نسبت نمی گنجد۔ امیر الامرا صمصام الدولہ نظر بر حقوق سابق باز آغاز کرد کہ مرا از دولت دیدار محروم نباید گذاشت۔ اگر از لطف اشارہ رود ایں روسیاہ داخل صحبت رو سفید شود۔ تبسمے کرد و گفت برائے ملاقات مناسبت شرط است۔ امید کہ معذور داری بحال خودم وگذاری (ذکر میر)

تھے انھوں نے یک بارگی آنکھیں پھیرلیں ناچار میر دوبارہ دلّی آئے اور سراج الدین علی خاں آرزو[1] کے ساتھ رہنے لگے لیکن وہ بھی ان کے سوتیلے بھائی محمد حسین کے لکھنے پر کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار ہے، ان کے درپے آزار ہو گئے۔ میر لکھتے ہیں:۔

آں عزیز دنیا دار واقعی بود، نظر بہ خصومتِ ہمشیر زادۂ خود بد من اندیشید
خصمیٔ او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید، دفترے جداگانہ می باید۔ خاطر گرفتۂ من
گرفتہ تر شد، سودا کردم، دل تنگم تنگ تر گردید۔ وحشتے پیدا کردم....
شائستہ کنارہ گیری شدم۔ زندانی و زنجیری شدم[2]

میر نے نکات الشعرا میں آرزو کو "استاد و پیر و مرشد بندہ"[3] لکھا ہے لیکن ذکر میر میں جو نکات الشعرا کے بہت بعد لکھی گئی ہے، ان کی "خصمی و حلاجی" کا رونا رویا ہے۔ اور ان کو اپنا استاد بھی نہیں گنا۔ حالاں کہ انھوں نے سعادت علی امروہوی[4]، اور جعفر عظیم آبادی[5] سے لے کر "یارانِ شہر" تک سب ہی کے فیضان کا اعتراف کیا ہے۔

میر نے خان آرزو سے استفادہ کیا ہے اس کے ثبوت میں بہت سے بیانات نقل کئے جا سکتے ہیں۔

مبتلا لکھنوی نے گلشن سخن میں لکھا ہے:

۱؎ خانِ آرزو میر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسین کے سگے ماموں تھے (ذکر میر ص ۶۳)

۲؎ ذکر میر ص ۶۴، ۶۵ ۳؎ نکات الشعرا ص ۴

۴؎ و ۵؎ ذکر میر ص ۶۶، ۶۷ سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ "خان آرزو نے کہا کہ اے عزیزم کلام موزوں علاے ناموزوں سے بہتر اور ریختہ کے پارہ کرنے سے تقطیع شعر خوش تر ہے" لیکن ذکر میر میں میر نے صراحتہً لکھا ہے کہ ریختہ گوئی کا آغاز سعادت امروہوی کی ترغیب سے ہوا (ص ۶۷) لیکن میر نے اس جگہ یا کہیں اور ان کو استادی کا شرف نہیں بخشا۔

میر محمد تقی متخلص بمیر، شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو است[1]۔

حدائق الشعرا میں لکھا ہے:

میر محمد تقی ہمشیر زادہ و پرورش یافتہ و شاگرد آرزو۔[2]

تذکرہ عشقی میں بھی یہی لکھا ہے:

میر مجلس سخن پروری میر محمد تقی میر تخلص ہمشیر زادہ و تربیت کردۂ سراج الدین علی خاں آرزو۔[3]

ان کے علاوہ قائم، میر حسن، علی ابراہیم خاں، قاسم، اور محسن[4] کے بیانات اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ میر نے دیدہ دانستہ آرزو کی شاگردی سے انکار کیا ہے۔

تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میر ایک پری تمثال لڑکی سے جوان کی قرابت دار تھیں، در پردہ عشق و تعلق خاطر رکھتے تھے، "آخر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ می خواست کہ بجنبہ بہ چار سوے رسوائی کند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید"۔

بہارِ بے خزاں کا لب و لہجہ میر کے ساتھ کافی درد مندانہ اور ہمدردانہ ہے۔ اس میں مجموعۂ نغز کی سی تلخی اور عصبیت نہیں ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس بیان کو صحیح نہ مانا جائے۔ پھر میر کے کلام کی اندرونی شہادت بھی اس کی تصدیق کرتی ہے۔ اس ابتدائی زمانہ میں جو بھی میر کے حال پر عنایت کرتا تھا وہ زیادہ تر اسی رشتے سے کہ میر ایک بڑے صوفی صافی اور درویش دل ریش کے بیٹے تھے۔ سید مکمل خاں، خواجہ

---

[1] گلشن سخن (قلمی) نسخہ رام پور (۸۷ ب)

[2] حدائق الشعرا: نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

[3] تذکرہ عشقی: نسخہ پٹنہ (قلمی)

[4] میر کے بھتیجے محسن کا قول محاکمات الشعرا کے دیباچہ میں نقل ہے (بحوالہ نقوش ص ۴۳، ۴۴)

باسط، امیر الامرا ان رئیسوں کے علاوہ معمولی آدمی بھی ان کی بزرگ زادگی کا بڑا پاس اور لحاظ کرتے تھے۔ اب جو اکبر آباد سے لے کر دہلی تک محبت کے سارے چشمے ایک دم خشک ہو گئے اس کا کوئی قوی سبب ہونا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ اس کا سبب وہی عشق[1] کا واقعہ ہو جس نے اب "خاصیت مشک" اختیار کر لی تھی۔ اور جس کا ذکر تذکرہ بہار بے خزاں میں موجود ہے۔ لیکن ذکر میر میں نہیں۔

میر تیتیس[3] برس کے بعد پھر آگرہ گئے ہیں اور چار مہینے رہے ہیں اس وقت لوگوں نے یہ بے رخی نہیں برتی۔ مانا کہ ان کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا لیکن ان پر قربان ہونے والوں میں شاعروں کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ انسانی حافظہ یوں بھی بہت قوی نہیں ہے۔ بات رفت گزشت ہو گئی تھی لوگ مر کھپ گئے تھے اور آگرہ بھی وہ آگرہ نہیں رہا تھا۔ میر لکھتے ہیں:

...... مژگاں سیاہاں، خوش ترکیباں، جامہ زیباں، پاکیزہ طینتاں، موزوں طبیعتاں، مراالتی گزاشتند و بعزت می داشتند[2]

ذکر میر غلطیوں سے پاک نہیں ہے۔ میر نے ص ۳۲ پر فقیر احسان اللہ کے ذیل میں لکھا ہے:

سخن ایں جا رسانیدہ بود کہ جلودارے از صوبہ دار شہر رسید و نیاز او التماس نمودہ۔ گفت کہ نصرت یار خاں برائے قدم بوس می رسد، (احسان اللہ

---

[1] تذکرہ ناصر میں لکھا ہے "آخر آخر میر صاحب کو ولولۂ عشق پیدا ہوا ..... پیر جواں ہمت ایسوں کو کہتے ہیں"۔ میر کے بڑھاپے کے عشق کا حال تحقیق سے نہیں معلوم لیکن انہوں نے پایان عمر میں دوسری شادی کی ہو تو تعجب نہیں۔ میر کے دو بیٹوں فیض اور عرش کی عمروں میں بھی بڑا فرق تھا۔ [2] ذکر میر ص ۱۰۴۔

فرمود کہ خوش باشد، ہر چند دہن ملاقات فقیراں ندارد، اما مرا از روئے او شرم می آید کہ بارہا برگشتہ رفتہ است، اگر ایں بار ہم برود خدا داند کہ باز ملاقات شود یا نشود۔ چوں بدروازہ رسید، از فیل فرود آمدہ، دوید۔ بسعادت پابوسی سر بر آسماں رسانیدہ پنج اشرفی نذر گزرانیدہ گفت کہ خوش آمدی وصفا آوردی[1]

میر سات برس کی عمر سے سید امان اللہ کے ساتھ رہتے اور درویشوں کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ذکر میر میں لکھا ہے:

من دراں ایام ہفت سالہ بودم با خودم مانوس ساخت و در گریبانم انداخت ...... چناں چہ روز و شب با او می ماندم و قرآن شریف بہ خدمت او می خواندم[2]

میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) کی ہے اس لئے نصرت یار خاں کے آنے اور پانچ اشرفیاں نذر دینے کا واقعہ ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) یا اس کے بعد کا ہے۔ لیکن تاریخ محمدی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصرت یار خاں کا انتقال میر کی ولادت سے ایک سال قبل یعنی ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں ہو چکا تھا:

ہدایت اللہ رکن الدولہ سید نصرت یار خاں بہادر ...... از کبار امرائے فرخ شاہی و محمد شاہی است ۲۲ رمضان (۱۱۳۴ھ ۱۷۲۱ء) در دہلی فوت شد۔ عمرش تخمیناً قریب شصت سال[3]

اس کے علاوہ نصرت یار خاں کبھی آگرہ کے صوبہ دار نہیں رہے۔ البتہ کچھ دنوں کے

---

[1] ذکر میر ص ۳۲ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] تاریخ محمدی (قلمی) نسخہ رام پور۔ جناب قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ اس تاریخ کی تصدیق کامور خاں کی تاریخ نسخہ پٹنہ سے بھی ہوتی ہے۔

لئے نائب صوبہ دار رہے تھے۔[1] لیکن اس وقت میر کی عمر بہت کم تھی۔ نام کے لکھنے میں سہو ہو سکتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان سے اس قسم کی غلطیاں بہت کم ہوئی ہیں۔

ذکر میر کے مطالعہ سے یہ نظریہ بھی باطل ہو جاتا ہے کہ میر بالکل قانع اور متوکل آدمی تھے اور ان کی لوحِ دل پر آرزو کا کوئی نقش تھا ہی نہیں۔ دلی میں ان کے محسنوں اور قدردانوں کی فہرست کافی طویل ہے۔ صمصام الدولہ (ص ۶۲) رعایت خاں[2] (ص ۶۷)، نواب بہادر (ص ۷۱)، مہانرائن (ص ۷۲)، راجہ جگل کشور (ص ۷۵)[3] راجہ ناگرمل (ص ۷۵)

---

[1] صدائے عام پٹنہ: عید نمبر ۱۹۵۳ء ص ۲۹۔

[2] ڈاکٹر عبدالحق نے ذکر میر کے صفحہ ۷۰ پر یہ عنوان قائم کیا ہے "سادات خاں اور بخت سنگھ کی نزاع" اور مقدمہ میں صفحہ ی پر لکھا ہے "(میر) سادات خاں ذوالفقار جنگ بخشی کے ہاں ملازم ہیں۔ ایک روز خان موصوف مہتابی پر بیٹھے تھے اور قوال کا لڑکا ان کے سامنے بیٹھا کچھ گا رہا تھا اتنے میں میر صاحب پہنچے۔ خان نے کہا میر صاحب اسے اپنے ریختے کے دو چار شعر بتا دیجئے تو یہ اپنے طور پر درست کر کے گا لے گا۔" یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ میر رعایت خاں کے ساتھ راجپوتانہ گئے تھے اور بخت سنگھ سے جھگڑا بھی رعایت خاں ہی سے ہوا تھا۔ میر کبھی سادات خاں کے ملازم نہیں رہے اس لئے اشعار یاد کرانے کا قصہ بھی رعایت خاں کے یہاں پیش آیا۔ ص ۷۰ پر جہاں بھی خاں کا لفظ آیا ہے اس سے مراد رعایت خاں ہے، سادات خاں ہرگز نہیں۔ جناب قاضی عبدالودود اور جناب امتیاز علی خاں عرشی کی بھی یہی رائے ہے۔ (ان کے خطوط راقم الحروف کے نام) رعایت علی خاں ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ کا بھانجا اور داماد تھا۔ میر کے الفاظ یہ ہیں: "رعایت خاں کہ پسر عظیم اللہ خاں یزنۂ اعتماد الدولہ قمرالدین خاں باشد۔" مولوی عبدالحق نے یزنہ کا ترجمہ نواسہ کیا ہے۔ جو صریحاً غلط ہے۔ (رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۶ء ص ۲۰۹) یزنہ بہنوئی (شوہرِ خواہر) کو کہتے ہیں۔

[3] قدرت اللہ شوق نے میر کے حال میں لکھا ہے "از مدتے بہ سبب افراط و تفریط روزگار

(نوٹ ۳ کا باقی ص ۵۴۵ پر ملاحظہ فرمائیے)

رائے بہادر سنگھ (ص ۹۱)، رائے بشن سنگھ (ص ۹۳) غرض سب ہی انھیں آنکھوں میں جگہ دیتے تھے۔ لیکن وہاں اس قسم کے واقعات بھی پیش آئے ہیں کہ دربان نے اندر جانے سے روکا ہے۔ (تر آمدم و بر آمدم) رائے بہادر سنگھ کے بھائی سے ملنے گئے، وہاں بھی دربان مانع ہوا" ناچار برگشتہ آمدم" اس طرح بھی ہوا ہے کہ وہ ان رئیسوں کے دربار میں دو دو پہر رات تک ملازموں کے قاعدے سے حاضر رہے "گل ایں خدمت آں بود کہ بشگفتگیٔ خاطر اوقات می گزرانیدم" ان مثالوں سے یہ ثابت کرنا مقصود نہیں ہے کہ میر کو جہاں گیر و شاہ جہاں یا طغرل و سنجر کی سی داد و دہش نصیب تھی بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ انھوں نے جہد حیات میں پورا حصہ لیا ہے اور ان کی حیثیت احسان اللہ یا بایزید درویش کی سی نہیں ہے۔ اسی طرح لکھنؤ میں میر کی بڑی قدر کی گئی اور تین سو روپے ماہوار مقرر ہو گئے۔ لیکن انھیں "خریدار" کی تلاش اور یہ شکایت برابر رہی کہ

دستِ کوتاہ تا سبو نہ گیا!

اس سلسلہ میں تذکروں کے یہ بیانات نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ یکتا لکھنوی نے لکھا ہے:

(بقیہ نوٹ ص ۵۴۴ یہ ہے)

ناہنجار ہمراہ ناگرمل کہ دیوان تن و دخیل پادشاہی بود در قلعۂ ڈیگ شنیدہ می شود، حق تعالیٰ زندہ دارد۔" میر نے ناگرمل کے متعلق لکھا ہے۔ "بہ نیابت وزارت خطاب مہاراجگی و عمدۃ الملکی سرفراز شد۔" (ذکر میر ص ۵)، مجمع النفائس (قلمی نسخہ رام پور) میں مہاراجہ عمدۃ الملک کے بیان میں لکھا ہے۔ "روزے در صحن چمن خیابان گلشن باقبال جاوداں فراغی کناں بداہتہ از بہارستان خاطر ایں گل مصرعی سر زد ع چو غنچہ سر بگریبان عقدہ خوشیم بآں کہ اکثرے بتلاش مصرع دوم فکرہا کردند خوب میسر نیامد۔ میر مرزا بود مصرع ثانی را آں کہ ایں ہم در تقابل تتمہ مصرع اول دوئیم است بہم رسانید ع کشاد کار ندانم چہ آمدہ بشیم۔ راجہ ناگرمل کا انتقال ۲۱ جنوری ۱۷۷۴ء کو ہوا۔ (بحوالہ دہلی کرونکل: تلخیص از سر جدو ناتھ سرکار)

نواب آصف الدولہ ...... میر را از شاہ جہان آباد فخریہ طلب داشت بمنصب عالی ملازم ساخت۔[1]

شوق رام پوری نے تکملۃ الشعرا میں لکھا ہے:

از چند سال در بلدۂ لکھنؤ بطلب وزیر الملک آصف الدولہ رفتہ است و نواب موصوف با او برعایت پیش آمد تا حال کوس سخن دری در لکھنؤ می نوازد۔[2]

تذکرہ عشقی میں لکھا ہے:

در آخر باستدعائے نواب آصف الدولہ بہادر وارد شہر لکھنؤ گردیدہ باعزاز و اکرام می گزراند۔[3]

تذکرہ ناصر میں میر اور آصف الدولہ کے بگاڑ کے جو واقعات درج ہیں،[4] وہ کچھ مشتبہ ہیں اور ان پر پوری طرح اعتبار کرنا مناسب نہیں۔ گلشن ہند میں تو یہاں تک لکھا ہے:

نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا۔ اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں کے عہد میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہے وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

---

[1] دستور الفصاحت ص ۲۵ [2] تکملۃ الشعرا (مخطوطہ، رام پور)
[3] تذکرۂ عشقی، قلمی۔ نسخہ پٹنہ۔
[4] تذکرہ ناصر (قلمی نسخہ مملوکہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ) کتاب اٹھانے، سودا اور سوز کی برائی کے واقعات۔ ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

تنخواہ کے ناغہ ہونے اور دیر سویر کی رعایت کرنے کے باوجود لکھنؤ میں میر کا حال، دہلی سے بہتر تھا۔ لیکن یہاں ان کے لئے ذہنی اور جذباتی آسودگی مفقود تھی۔ خواجہ میر درد نے موجِ خوں سر سے گزر جانے کے باوجود دلی نہیں چھوڑی لیکن میر نے ایک کمزور لمحہ میں لکھنؤ کا ارادہ کر لیا حالاں کہ جب خان آرزو نے یہی قصد کیا تھا تو میر نے اپنے طنز و تشنیع کا سارا ترکش ختم کر دیا تھا:

خالوئے من بادیہ پیمائے طمع شد ..... جز باد بدستش نیاید۔ لکد زمانہ خورد و ہم آں جا مُرد[1]

طرفہ لطیفہ ہے کہ میر کو لکھنؤ بلانے والے بھی خانِ آرزو کے یہی مربی اور قدردان تھے۔[2] ہمیں ہرگز اس سے انکار نہیں کہ میر فطرتاً خوددار، باحمیت اور آزاد منش واقع ہوئے تھے۔ ان کو خوے گدایانہ چھو کے بھی نہیں گزری تھی۔ انھوں نے اس زمانہ میں اپنی دستار کو سنبھالا جب وہ دونوں ہاتھوں سے بھی نہ سنبھلتی تھی۔ اگر انھوں نے ہاتھ پھیلایا ہے تو بڑی مجبوری میں، اور کسی کے سامنے مفلسی کا دکھڑا رویا ہے تو یہ سمجھ کر کہ "یہ جانِ غیور" پر بڑا ستم ہو رہا ہے۔ ان ناساعد حالات میں جن کا ذکر پچھلے اوراق میں آچکا ہے، میر کا ثابت قدم رہنا اور "زندگی کرنے" کا ایک نیا ڈھنگ نکال لینا،

---

[1] ذکرِ میر ص ۵، [2] ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے سالار جنگ کو آصف الدولہ کا خالو لکھا ہے (رسالہ اردو اپریل ۲۶ء ص ۲۴۶) یہ غلط ہے۔ عربی میں خال ماموں کو کہتے ہیں۔ فارسی میں یا خال کر خالو ہو گیا جیسے عم سے عمو لیکن معنی وہی رہے۔ خالو کے معنی شوہرِ خالہ ہندوستان میں ہوئے ہیں۔ سالار جنگ، آصف الدولہ کے حقیقی ماموں تھے اور انھوں نے ہی نواب صاحب کی خواہش دیکھ کر میر کو بلایا تھا۔ ذکرِ میر میں لکھا ہے: "نواب سالار جنگ ..... کہ خالوئے وزیرِ اعظم می شوند، نظر بر ربطِ قدیم کہ خالوئے من بایشاں بود گفتہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت جہت زادِ راہ چیزے عنایت نمایند میر البتہ بیاید۔" (ذکرِ میر ص ۱۲۹)

ان کی سیرت اور شخصیت کا عجیب و غریب معجزہ ہی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہی کہ انھوں نے قصیدے اور شکار نامے بھی موزوں کئے، ستائش گری اور مداحی بھی کی۔ تلاشِ معاش میں صفت جام بھی پھرے اور ہو سکا تو گل و گلشن، اور چاندنی اور گلابی سے قطع نظر بھی نہیں کیا۔ —— اِن حقائق کے سامنے آنے سے میر کی عظمت کم نہیں ہوتی بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسے ایک ریشمی خول کا باشندہ قرار دیا ہی جس نے کبھی اپنے پائیں باغ پر بھی نظر خوار نہیں کی، بعض نے اسے فوق البشر کا مرتبہ دیا ہے جو اس خاک دانِ ارضی کے رہنے والوں پر کبھی نظر ڈالتا ہی تو اس طرح جیسے احسان کر رہا ہو۔ بعض نے اسے ایک مریض سمجھا ہی جو آغوشِ غم اور پہلوئے حرماں میں صرف اپنے زخموں سے کھیلتا رہتا ہی —— ان میں سے ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ذکر میر کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ اقلیم سخن کا یہ تاج دار انسان ہے، ہزاروں لاکھوں سے اچھا انسان، وہ ولی اور فرشتہ نہیں ہے بلکہ اسی عالمِ آب و گِل کا رہنے والا اور اسی گوشت و پوست کا بنا ہوا ہی۔ میر شاید اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے شرف انسانی پر اتنا زور دیا ہی۔ دردمندی جو لازمۂ انسانیت ہے، اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ وہ اپنی عزت بھی کرتا ہی۔ اور دوسروں کی بھی۔ یہی انداز کلیات میں ہے اور یہی سوانح عمری میں ہے۔

میر نے ذکر میر میں تاریخیں نہیں دیں۔ یہ بڑی اہم فروگذاشت ہی۔ لکھنؤ جانے کی تاریخ کتنی ضروری ہی مگر وہ بھی نہیں دی۔ لیکن ذکر میر کے بعض واقعات کی مدد سے اس کا تعیّن کیا جا سکتا ہی۔

میر نے لکھا ہی:

آخر (نجف خاں) بمرض سل گرفتار شد۔ اطبا کوشش بسیارے در علاج

او بکار بردند۔ اما فائدہ مترتب نشد۔ چوں مایوس شد۔ بہ حسرت
می گفت کہ من، ہیچ نمی خواہم، جز ایں قدر کہ زندہ بمانم۔ در بیماری او زمانہ
رنگ دیگر گرفت۔[1]

نجف خاں کی بیماری ہی کے زمانے میں میر لکھنؤ چلے گئے تھے۔ ان کو اس کے انتقال کی خبر لکھنؤ میں ملی ہے:

بعد از آمدن من ایں طرف آں جا کہ نجف خاں بر بستر افتادہ بود فوت
کرد۔[2]

خیرالدین محمد نے نجف خاں کی بیماری کے متعلق لکھا ہی:

از دوم ربیع الثانی سنہ یک ہزار و نود و ششم از حویلی قمرالدین
خاں در حویلی صفدر جنگ ..... آوردند لیکن مرض روز بروز در تزاید و
اشتداد بود حکما از معالجہ دست برداشتند۔[3]

عبرت نامہ میں نجف خاں کے انتقال کی تاریخ ۲۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء دی ہی اس لئے میر ۲۲ ربیع الثانی سے پہلے اور ۲ ربیع الثانی کے بعد لکھنؤ گئے ہیں۔[4]

اسی طرح ذکر میر کی مدد سے میر کی زندگی کی اور بہت سی تاریخیں متعین کی جا سکتی ہیں۔ ہم نے مناسب مقامات پر ان کا ذکر کیا ہی۔

---

[1] ذکر میر ص ۱۳۸ [2] ذکر میر ص ۱۴۰۔

[3] عبرت نامہ ج ۲ : خیرالدین محمد (نسخہ پٹنہ)

[4] ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے گلشن ہند کے حوالے سے میر کے لکھنؤ جانے کا سنہ ۱۱۹۷ھ لکھا ہی۔ یہ صحیح نہیں۔ (مقدمہ ذکر میر صفحہ ص۔ نیز گلشن ہند ص ۲۰۹ و ۲۱۰۔

ذکرِ میرؔ سے میرؔ کے مذہبی معتقدات کا بھی اندازہ ہوتا ہی۔ ان کی پرورش ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو صوفیوں کا ملجا و ماوا اور رشد و ہدایت میں کافی مشہور تھا۔ ذکرِ میرؔ اور فیضِ میرؔ دونوں تذکرے اس کے گواہ ہیں۔ لیکن میرؔ کو اہلِ بیت سے بھی والہانہ محبّت تھی۔ کلیات میں اس کی شہادتیں جا بجا ملتی ہیں۔ بارہویں صدی ہجری میں اہلِ تشیع میں پیری مریدی رائج تھی۔ چنانچہ ذکرِ میرؔ کے ایک واقعے سے ان کو شیعہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ میرؔ، جب تیس برس کے بعد آگرے گئے ہیں تو ایک عالم کی خدمت میں پہنچے۔ انھوں نے میرؔ کی "تسبیحِ خاکِ شفا" پر اعتراض کیا اور پوچھا آپ شیعہ تو نہیں ہیں۔ میرؔ صاحب نے فرمایا:

مرا نیز ہمیں تردد بود۔ الحمد للہ کہ صاحب سنی بر آمدند

اس کے بعد میرؔ صاحب لکھتے ہیں کہ وہ احمق میرے کنائے کو نہ سمجھا اور بہت خوش ہوا۔ "بے مزہ تر شدم و برخاستہ آمدم"[۵۱]

ذکرِ میرؔ سے میرؔ کی معاشرت اور خانگی زندگی کے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوتیں، اس میں جدِّ کلاں، والدِ ماجد، "عمِ بزرگوار" بھائی محمد حسین، بھائی محمد رضی چند لواحقین، اور نورِ چشم میر فیض علی کا تذکرہ ہے۔ لیکن انھوں نے علی متقی میر امان اللہ اور محمد حسین کے علاوہ کسی کے کردار پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ فیضِ میرؔ سے اتنا اور معلوم ہوتا ہی کہ میرؔ کے پاس ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی۔ ہاتھ منہ دھونے کے لئے طشت اور آفتابہ تھا۔ شہسواری جانتے تھے لیکن گھوڑا نہیں تھا۔[۵۲]

ذکرِ میرؔ، تاریخی معلومات کا گنجینہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے مورخوں نے ابھی تک اس کو تاریخی ماخذ کے طور پر استعمال نہیں کیا۔ اس میں محمد شاہ کے انتقال

---

[۵۱] ذکرِ میر ص ۱۰۳ [۵۲] فیضِ میر: حکایت اول۔

سے لے کر غلام قادر روہیلہ کے جور وستم تک تمام واقعات دیئے ہیں۔ آخری دورِ مغلیہ، مرہٹوں سکھوں جاٹوں اور انگریزوں کے متعلق اس میں ایسی معلومات درج ہیں جو دوسری جگہ اس انداز سے نہیں ملتیں۔

اس زمانے میں سیاسی انقلابات کے باوجود ہماری معاشرت کتنی مضبوط تھی، ہندو اور مسلمان کس محبت سے رہتے تھے۔ فوج کس طرح عامی و عالم کے لئے ملجاو ماوا بن گئی تھی۔ یہ سب باتیں بھی ذکرِ میر کے مطالعے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

اس عجیب و غریب تاریخی پس منظر میں میر کی حیثیت درویش زادے کی بھی ہے۔ طالب علم کی بھی، عاشق کی بھی، شاعر کی بھی، مصاحب کی بھی، ایلچی کی بھی —— جس طرح شراب، کھچ کے تلوار بن جاتی ہے ایسے ہی یہ تاریخی پس منظر، میر کے یہاں "غزل" میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ٥

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
اب آخر آخر ان نے ہے ریختہ کہا

٥ ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے ——— خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر ——— مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

ذکرِ میر کا اندازِ بیان موثر، دل آویز اور بے باکانہ ہے۔ قافیوں کا اہتمام ہے لیکن اس سے روانی میں فرق نہیں آیا۔ جملوں کی ساخت پختہ اور بے رخنہ ہے۔ ان کی نثر، غالب کی فارسی نثر سے سلاست اور سادگی میں زیادہ اور درخشندگی و شگفتگی میں کم ہے۔ اس فارسی میں وہ غرابت اور "ہندیت" بھی ہے جس سے غالب خفا تھے۔ میر حسن نے ان کے متعلق لکھا ہے:

چراغِ نثرش روشن ساحت نقلش گلشن [۱]

---

[۱] تذکرہ میر حسن ص ۱۵۱۔

اور یہ رائے مجموعی حیثیت سے صحیح ہے چھوٹی بحر کی غزلوں کی طرح ان کا کمال مرقع نگاری میں نظر آتا ہے۔ جہاں انھوں نے چھوٹے چھوٹے فقروں اور اشاروں میں جہانِ معنی کو پیش کر دیا ہے۔

میر کے زمانے کی ادبی محفلیں

لٹریچر زمانہ کا آئینہ ہوتا ہے۔ میر کی تصانیف سے بھی اُس عہد کے رسم و رواج، طرزِ معاشرت، اخلاق و عادات اور سیاسی و معاشی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ادبی معلومات کا گنجینہ بھی ہیں اگر ان کو غور سے پڑھا جائے تو اس زمانہ کی ادبی محفلوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے جن سے ملک کے عام ذوقِ سخن اور معیارِ ادب کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مشاعرہ کی موجودہ شکل ہندوستانی ہے اس کا اردو میں باقاعدہ رواج میر کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ دلی کے شاعروں نے باہم شعر کہنے کے لئے مجلس مراختہ قائم کی تھی۔ میر کمترین کے بیان میں، اس لفظ کے متعلق تذکرہ نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:

> گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بروزن مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود۔[1]

قائم فرحت کے متعلق لکھتے ہیں:

> گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں اختراع بروزن مشاعرہ است بنظر می آید[2]

غالباً اس زمانہ کا سب سے قدیم مراختہ وہ ہے جو خان آرزو کے مکان پر منعقد ہوتا تھا۔ اور جس میں سودا۔ میر۔ درد۔ جرات وغیرہ شرکت کرتے تھے۔

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۴۷ [2] مخزن نکات ص ۶۴۔

مولوی محمد حسین آزاد نے تذکرہ آب حیات میں ایک دلچسپ لطیفہ اس مشاعرہ کے متعلق لکھا ہے[1]:

سودا نے اس مراختہ میں ایک شعر پڑھا جو دراصل قدسی[2] سے ماخوذ تھا

وہ شعر یہ ہے ؎

آلودۂ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو — اختر پڑے جھانکے ہیں فلک پر سے زمیں کو

خان آرزو نے برجستہ کہا ؎

شعر سودا حدیث قدسی ہے

چاہیئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

سودا، خان آرزو سے لپٹ گئے اور یہ ظاہر کیا کہ آرزو نے واقعی اس شعر کو حدیث قدسی کا مرتبہ دیا ہے۔

خان آرزو کے مراختہ کا ذکر میر حسن اور شفیق اورنگ آبادی نے بھی کیا ہے چمنستان شعرا میں لکھا ہے کہ یہ مراختہ ہر پندرھویں تاریخ کو ہوا کرتا ہے۔

(ذکر درد) شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری می گوید کہ ایں عزیز بزرگ عالی دودمان را فقیر مکرر بہ خانۂ خان آرزو روز مراختہ یعنی صحبت ریختہ گویانِ ہندی کہ دریا نزدھم ہر ماہی مقرر بود دیدہ ام[3]

جب خان آرزو کا مراختہ بند ہو گیا تو یہ مجلس خواجہ میر درد کے یہاں ہونے لگی اور جب وہاں بھی اس کا انعقاد نہ ہو سکا تو میر کے یہاں یہ محفل قائم ہو گئی۔ میر

---

[1] آب حیات ص ۱۵۹ [2] قدسی کا شعر ہے ؎

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را — اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

[3] چمنستان شعرا (انجمن ترقی اردو ہند)

خواجہ میر درد کے بیان میں لکھتے ہیں :

مجلس ریختہ کہ بخانۂ بندہ بہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است بہ ذات
ہمیں بزرگ است زیراکہ پیش ازیں ایں مجلس بہ خانہ اش مقرر بود۔[1]

اس کے علاوہ میر نے مراختۂ میر علی نقی اور مشاعرۂ حافظ حلیم کا بھی ذکر کیا ہے[2] لیکن ان اشعار میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ کس مشاعرہ کا ذکر ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب — لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں
میر و مرزا رفیع و خواجہ میر — کتنے یہ اک جوان ہوتے ہیں

یہ مشاعرے روز بروز مقبولیت حاصل کرتے جاتے تھے۔ ہر تقریب پر ان کا انعقاد لازمی تھا۔ قدرت اللہ قاسم "عاشق" کے بیان میں لکھتے ہیں :

قریب دوازدہ سال بلاناغہ بروز جمعہ بہ انعقاد مشاعرہ بخانۂ خود پرداخت
و بہ ہیچ مانع قوی بل اقوا موقوف نہ ساخت حتیٰ کہ صبح فاتحہ روز سیوم فرزند
ارجمند خود نمودہ و بعد ظہر مجلس مراختہ منعقد نمود۔

حقیقت یہ ہے کہ مشاعرہ یا مراختہ ہماری معاشرت کا جزو بن گیا تھا اور اس کی بدولت اردو کو فارسی کے مقابلہ پر فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ مصحفی تذکرہ ہندی گویاں میں لکھتے ہیں :

بہ مقتضائے رواج زمانہ آخر کار خود را مصروف ریختہ گوئی داشتہ
برائے ایں کہ رواج شعر فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ
ہم فی زمانہ بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ بلکہ ازو بہتر گردیدہ۔[3]

لیکن یہ مجلسیں دیرپا نہیں ہوتی تھیں۔ مصحفی لکھتے ہیں :

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۲۸۔ [2] ایضاً ص ۱۴۸ و ۱۷۸ [3] تذکرہ ہندی گویاں ص ۲۴۸۔

این مجلس از یک سال طول نمی کشد و تفرقہ و خللے برو بالضرور واقع

می شود۔

میر شاعری کو فن شریف' سمجھتے تھے ان کو بڑی شکایت تھی کہ بزازوں اور نداقوں نے بھی اس فن کو اختیار کر لیا تھا۔ اور شعرا کے باہمی تفرقوں نے اس فن کو رسوا کر دیا تھا۔

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا　　شعر سے بزّازوں ندّافوں کو کیا

الغرض یاروں نے قیدیں ویں اٹھا　　جو کوئی آیا اُسے دی پاس جا

ٹک نہ استعداد سے کی گفتگو　　کچھ نہ رکھی شاعری کی آبرو

چار سکھیاں کہہ کے دیں ناکس کے ہاتھ　　پھر اسے مجلس میں لائے اپنے ساتھ

آپ بیٹھے صدر میں وہ دست چپ　　کرنے لاگے شاعری سے حرف گپ

بولے ان کو آجکل سے ہے خیال　　ذہن ان کا تیز ی رکھتا ہے کمال

ہو رہیں گے کچھ اگر صحبت رہی　　اور ہم سے بھی انہیں الفت رہی

جب ہوا ثابت وہ ان کا مستفید　　سب نے جانا ان کا شاگرد رشید

کی اشارت تا کہ وہ کھولے دہن　　آگے استادوں کے ہو گرم سخن

ان کی ایما سے وہ کچھ پڑھنے لگا　　صاحبانِ فن کے منہ چڑھنے لگا

نیم قد اٹھ اٹھ کے یہ سننے لگے　　جا و بیجا سر کے تئیں دھننے لگے

وہ سراپا جہل ناگہ وقت کار　　ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

سر میں رکھ کر دعوی طبع لطیف　　میر و مرزا کا ہوا آخر حریف [1]

میر کو اپنے کمالِ فن کا غیر معمولی احساس تھا۔ اگر چہ بعض اشعار میں اور بعض شکوؤں

---

[1] مثنوی تنبیہ الجہال ۔ نیز تذکرہ میر حسن (مقدمہ)

کے تذکرے میں انھوں نے اپنی نسبت منکسرانہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن یہ بھی اس تمکنت کی ایک ادا ہے جو ان کی سرشت میں داخل تھی۔ مثنوی اژدر نامہ ان کے فطری غرور کی روشن مثال ہے:

حکایت بعینہ یہ دل سوز ہے میر | سر راہ کہتا تھا جو اک فقیر
کہ تھا دشت میں ایک اژدر مقیم | درندوں کے بھی دل تھے اس سے دو نیم
نکلتے نہ تھے اس طرف ہو کے شیر | پلنگ و نمرواں نہ رہتے تھے دیر
جہاں شیر کا زہرہ ہوتا تھا آب | شغال اور روبہ کا واں کیا حساب

جنگل کے حشرات الارض (شعرائے عصر) جمع ہو کر اس خونخوار اژدہے (میر) سے لڑنے کے لئے پہنچے۔ جب سامنا ہوا تو ؎

بھرا ایک دم اس نے وا کر دہاں | کہ پایا اس انبوہ کو نیم جاں
دم دیگراں سے نہ کوئی رہا | وہی دشت خالی وہی اژدہا

آخر میں فرماتے ہیں:

مری قدر کیا ان کے کچھ ہاتھ ہے | جو رتبہ ہے میرا مرے ساتھ ہے
کہاں پہنچیں مجھ تک یہ کیڑے حقیر | گیا سانپ پیٹا کریں اب لکیر

(مثنوی اژدر نامہ)

محمد امان نثار شاہ حاتم کے شاگرد تھے ان کو یہ مثنوی خصوصیت کے ساتھ ناگوار گذری۔ وہیں ایک قطعہ لکھا اور برسر مشاعرہ پڑھا۔

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

میر کا یہ شعر محض شاعرانہ بات نہیں بلکہ حقیقت ہے:

ایک ہی عہد میں اپنے وہ پراگندہ مزاج | اپنی آنکھوں میں نہ آیا کوئی ثانی اس کی

میرؔ نے کلیات میں جابجا معاصرین پر چوٹ کی ہے۔ اور اپنی فضیلت و برتری کو جتلایا ہے۔ ؎

کہاں عاجز سخن قادر سخن ہوں
ہمیں ہے شبہ یاروں کے سخن میں

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں
یوں ہی سوداؔ کبھو ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

فکر کو نازک خیالوں کی کہاں پہنچے ہے یار ورنہ ہر مصرع یہاں معشوق شوخ و شنگ ہے

کس کا ہے قماش ایسا گودڑ بھرے ہیں سارے
دیکھو نہ جو لوگوں کے دیواں نکلتے ہیں

بعض جگہ کھلا ہوا چیلنج ہے ؎

۱؎ میر کے یہ اشعار بھی غور کے قابل ہیں ؎

مجھے مرزا میر کو، مرزا کو میر نے وہ رگ زن جو نہ مجھے سیر شیر
مجھ میں مرزا میں تفاوت ہے بہت یاں تاثیر واں عجالت ہے بہت
جس جگہ میں نے رکھی منہ میں زباں ہوتے اس جا گہ جو مرزا بے گماں
استرے کانوں میں اپنے باندھ کر کب کے اب تک گھس گئے ہوتے ادھر

(کلیات میر ص ۸۳۱)

بات بنانا مشکل سا ہے شعر سب ہی یاں کہتے ہیں
فکر بلند سے یاروں کو اک ایسی غزل کہہ لانے دو

مخالفین بھی کب چُپ بیٹھنے والے تھے برملا کہنے لگے:

پگڑی اپنی سنبھالئے گا میر   اور بستی نہیں، یہ دلّی ہے

یہ فضا انشاء اور مصحفی کے زمانہ میں اور خراب ہو گئی۔

میر کی تصانیف سے ملک کے عام ادبی رجحانات بھی معلوم ہوتے ہیں میاں گلشن نے جو نصیحت ولی کو کی تھی۔

ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببر۔

اس پر اکثر شعرا عمل کر رہے تھے۔ ایہام گوئی ختم ہو رہی تھی اور صفائے گفتگو پر زور دیا جا رہا تھا۔ میر احسن اللہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود از یں جہت شعر اولے رتبہ ماند۔

اسی طرح اہل ذوق محض گل و بلبل کی شاعری پسند نہیں کرتے تھے:

(ذکر میر عبدالحی تاباں) ہر چند عرصہ سخن او ہمیں در لفظہائے گل و بلبل تمام است اما بسیار برنگیں می گفت۔[1]

بلکہ صفائے گفتگو اور ادا بندی خیال پر زور دیتے تھے۔[2]

یہ فن شریف (شاعری) بعض لوگوں کے ہاتھوں میں ذلیل بھی ہو گیا تھا۔ میر جعفر زٹلی ایک کاغذ پہ ہجو اور ایک کاغذ پر مدح لئے لئے پھرتے تھے۔ کسی نے کچھ دے دیا تو خیر۔ ورنہ ہزل پڑھ دی اور اس کی کوچہ و بازار میں رسوائی ہو گئی ایسے جاگیری ماحول میں جس میں شاعری امیر رسی کا ذریعہ بن گئی تھی۔ ان صورتوں کا

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۰۸ [2] نکات الشعرا ص ۱۸۷۔

پیدا ہونا لازمی تھا لیکن ان ادبی صحبتوں میں مذاق کی درستگی اور پختگی کے بھی پورے مواقع تھے۔ ذرا سی اصلاح سے شعر آسمان پر پہنچ جاتا تھا۔ میر سجاد اکبرآبادی کا شعر ہے:

کس طرح کوہکن پہ گذریں گی　　　ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

میر نے اس کی اصلاح اس طرح کی ہے:

ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا　　　کوہکن یہ پہاڑ سی راتیں

میر نے مضمون کے حال میں لکھا ہے کہ میں ان کے شعر انتخاب کر رہا تھا محمد حسین کلیم میرے پاس بیٹھے تھے اس وقت میں نے مضمون کا یہ شعر

میرے پیغام کو تو اے قاصد　　　کہیو سب سے اسے جدا کر کے

اس طرح پڑھا:

میرا پیغام وصل اے قاصد　　　کہیو سب سے اسے جدا کر کے

غور فرمایئے کہ شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

محنت اور اصلاح مناسب طبیعتوں کو کندن بنا دیتی تھی۔ باکمال اور پختہ کار شاعروں کی کثرت کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ساری فضا شاعر خیز و شاعر گر تھی۔ اور ادب کی خدمت میں بزرگان دین، امرار، طبقۂ اوسط اور اہلِ سیف سب ہی لگے ہوئے تھے۔ درویشی و شاعری، فارسی و اردو شعر گوئی، شمشیر شناسی اور علمی ذوق میں تضاد نہیں تھا بلکہ اکثر لوگ ان اوصاف کے جامع تھے۔

اس زمانہ میں جا بجا ادبی مجلسیں قائم تھیں خاص طور پر سیر اور تماشے کے موقعوں اور مذہبی جلسوں میں اہلِ کمال جمع ہوتے تھے اور باہم شعر و سخن کے تذکروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ قزلباش خاں امید بڑے امیروں میں سے تھے ایک روز حسن رسول نما رح کے عرس میں میر کی اور ان کی ملاقات ہو گئی وہ

میر کو دور سے دیکھتے ہی بولے "خوش باشید اس عرصہ میں میں نے بھی دو شعر ریختہ کے موزوں کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

در و دیوار سے اب صحبت ہے   یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں   الحفیظ الحفیظ پڑھتا ہوں[1]

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں اردو کو ایسا فروغ حاصل ہو رہا تھا کہ فارسی کے شاعر بھی تبدیلیٔ ذائقہ کے لیے ریختہ میں کہنے لگے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل (ص ۲) خان آرزو (ص ۳) مرزا معز فطرت (ص ۴) قزلباش خاں امید (ص ۷) مرزا گرامی (ص ۸) اور رائے آنند رام مخلص (ص ۹) کے نام اس کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اس وقت سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور چاروں طرف لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے۔ لیکن ادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئی تھیں ان میں صوفی بھی شریک تھے اور سپاہی بھی، امیر بھی اور غریب بھی، خوش طبع بھی اور پریشان روزگار بھی لیکن وہ باہم مل بیٹھتے تھے تو غم روزگار کو بھول جاتے تھے اور ایسے نامساعد حالات میں ادب کی شمع کو اپنے دل کی گرمی اور تپش سے فروزاں رکھتے تھے۔

میر کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے تمدنی تعلقات

میر کی تصانیف سے آخری

دورِ مغلیہ کے تاریخی مآخذ میں مفید اور معاصرانہ اضافہ ہوتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے

---

[1] نکات الشعراء ص ۷، ۸۔

ہندوستانی کلچر کی وحدت، وسعت، گہرائی اور گیرائی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس پر آشوب زمانہ میں بھی جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے، مختلف رنگوں میں یک رنگی، اور بہت سے اختلافات میں یک جہتی صاف نظر آتی ہے۔

گنگا اور جمنا کی دھاریں جہاں آکر ملتی ہیں وہ صاف الگ الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ اس طرح ملی ہوئی بھی ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا مشکل ہے۔ یہی حال ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا ہے۔ یہاں بہت سی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، بہت سے سیاسی انقلابات رونما ہوئے، بہت سے حملہ آور فاتحانہ پرچم کے ساتھ داخل ہوئے لیکن اِن موجوں نے تہذیب اور تمدن کی مٹی کو اور زیادہ زرخیز کر دیا اور اس ملک کے دامن کو گلہائے رنگارنگ سے معمور کر دیا۔ اتحاد و امتزاج کا یہ سرچشمہ جو موہنجداڑو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہد قدیم اور عہدِ وسطیٰ کے میدانوں سے گزرتا ہوا، برابر رواں دواں ہے۔

تزکِ جہاں گیری میں لکھا ہے[1] کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اپنی خانقاہ کی چھت پر کھڑے تھے۔ نیچے دیکھا کہ کچھ ہندو اپنے خاص قاعدہ سے بتوں کی پوجا کر رہے ہیں۔ آپ نے اس پر کسی قسم کی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ یہ مصرع پڑھا:

ہر قوم راست راہے، دینے و قبلہ گاہے

حضرت امیر خسرو رحمۃ قریب موجود تھے، انھوں نے برجستہ فرمایا:

من قبلہ راست کردم برطرف کج کلاہے

فوائد الفوائد میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے بابا فرید شکر گنج کی خدمت میں قینچی پیش کی

---

[1] تزکِ جہانگیری مرتبہ سر سید احمد خاں، مطبوعہ علی گڑھ۔

آپ نے فرمایا مجھے تو سوئی دو۔ میں کاٹتا نہیں، جوڑتا ہوں[۱]

یہی دراصل وہ بنیاد تھی جس پر عہد وسطیٰ میں مذہبی مفاہمت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اختلافات کی سطح کے نیچے جو ذہنیت کارفرما تھی، وہ اختلافات پر متحد ہو جانے کی تھی۔ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف کی آمیزش نے خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف قسم کے فلسفوں اور خیالوں کو برداشت کیا جا رہا تھا، وہاں اسلام بھی ایک نظام فکر کو پیش کر رہا تھا۔ اور جہاں بہت سے طبقے اور گروہ تھے وہاں ایک طبقہ مسلمانوں کا بھی تھا۔

یہی رنگ معاشرت کے آئینے میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور کتاب ہندوستانی کلچر پر اسلامی اثرات میں لکھا ہے کہ ہندو مسلمان بزرگوں کے مزاروں پر نذریں چڑھاتے تھے، فال کے لئے قرآن شریف دیکھتے تھے۔ اور بھوت پریت کے اثر سے بچنے کے لئے قرآن کو اپنے گھروں میں رکھتے تھے۔ اور اسلامی تہواروں اور رسموں میں شرکت کرتے تھے۔ یہی حال مسلمانوں کا تھا[۲]

موسیو تھونو فرانسیسی سیاح دکن کی نسبت لکھتا ہے کہ عام لوگ جن کی بڑی بڑی تنخواہیں ہیں، مسلمان ہوں یا ہندو، سب ہندوؤں کی تقلید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ سلاطین مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن ان پرانی رسموں (مثلاً میلہ، سورج گرہن) کے آزادانہ طور پر بجا لانے کو یا تو اس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دست اندازی نہیں کرنا چاہتے۔ یا دست اندازی کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

---

[۱] فوائد الفوائد (ملفوظات حضرت شیخ نظام الدین اولیا) از خواجہ میر حسن علا سنجری۔ مطبوعہ نول کشور [۲] اِن فلوئنس آف اسلام ص ۲۱۶۔

دیوالی کے موقع پر مغل بادشاہ ایک ایسے برتن سے نہاتے تھے، جس میں اکیس[۲۱] چھید ہوتے تھے، بادشاہ کو تولا جاتا تھا اور وہ رقم غریبوں میں تقسیم کردی جاتی تھی اسی طرح ہولی کا تہوار جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ میر کی مثنویات ہولی اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ بسنت کے موقع پر سب بسنتی کپڑے پہنتے تھے اور ایک بڑا دربار منعقد ہوتا تھا۔ پھول والوں کا میلا (سیر گل فروشاں) ہندو مسلمانوں کا مشترک تہوار تھا۔ اکبر ثانی کو اس میں شرکت اتنی عزیز تھی کہ ایک مرتبہ بیماری کے عالم میں مسہری پر لیٹے لیٹے اس میلہ کو دیکھا اور انعامات تقسیم کئے۔ یہ تمام رسمیں بہادر شاہ ثانی کے وقت تک اہتمام کے ساتھ ہوتی رہیں[۱]۔

نیظر کے دیس پریم میں نظامی مرحوم نے لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں میں شریک ہوتے تھے۔ نظیر اکبر آبادی کا کلام اس کا شاہد عادل ہے۔ اس کی رکشا بندھن وغیرہ نظمیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس پہلے تک جب کہ ہمارا سیاسی انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا، اتحاد اور یگانگت کے رشتوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

عہد وسطیٰ میں ہمارا فنی اور جمالیاتی شعور بھی فضا کے ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ موسیقی میں دونوں قوموں کا اتحاد صاف نظر آتا ہے۔ خیال، مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ وہ ہندوؤں میں بھی مقبول ہوا۔ اور دھرپد جو قدیم ہندو طرز تھا، اس کو مسلمانوں نے شوق سے قبول کیا۔ سلاطین بیجاپور و جون پور اور صوفیائے کرام کی کوششوں نے موسیقی کے ذریعہ ہندو اور مسلمانوں کے دلوں کو ملادیا۔ اور ان کے جذبات واحساسات میں یک رنگی پیدا کردی۔ اکبر کے زمانہ میں

---

[۱] اسلامک کلچر حیدرآباد دکن جولائی ۱۹۴۳ء؛ "دہلی ۱۸۳۷ء میں" ص ۲۸۹ -

یہ موسیقی **کمال** کو پہنچ گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر ہندوستانی کا دل ایک ہی تال، ایک ہی سُر اور ایک ہی لَے پر دھڑکتا ہے۔

سلاطین دہلی کی تمام عمارتیں ہندو اور مسلم خصوصیات کی آئینہ دار اور اختلاط باہمی کی مظہر ہیں۔ دکن کی عمارتوں میں بھی ہندوانی خصوصیات نمایاں ہیں۔ اجمیر کی جامع مسجد، کوہ آبو کے جین مندر کا چربہ معلوم ہوتی ہے۔ قطب مینار کا تمام آرائشی کام جینی طرز کا ہے۔ اسی طرح رن پور کے ستون، بالکل مسجد کے ستون معلوم ہوتے ہیں۔ گوالیار کے راجہ مان کے محلات اس نئے طرز کے نمونے ہیں۔ مغلوں کو پیوندکاری کا تجربہ، ترکوں سے زیادہ تھا۔ اور وہ ان کے مقابلہ پر ذوق بھی زیادہ پاکیزہ اور خیال بھی زیادہ ستھرا رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلم فن تعمیر ان کے زمانہ میں معراج کمال کو پہنچ گیا۔ اکبر کی تمام عمارتیں اسی اشتراک خیال اور اتحاد ذوق کا ثبوت ہیں۔ تاج محل کا خاکہ ممکن ہے کہ بیرونی اثرات کا نتیجہ ہو لیکن "ہے وہ ہندوستانی محبت کی یادگار اور ہندوستان کی پُردرد اور پُرامن روح کا مظہر"۔

اکبر نے ہندی اصلیت اور ایرانی نزاکت کی حسین آمیزش سے مصوری میں ایک نیا اسکول قائم کیا۔ جو نہ ہندو ہے، نہ مسلم، اگر اس کے لئے کوئی نام ہو سکتا ہے تو ہندو مسلم۔ اجنتا اور دہلی کے نقوش میں بڑا فرق ہے۔ خط، رنگ۔ سب بدل گئے ہیں لیکن دہلی، جے پور اور کانگڑے کے نمونوں میں وہی فرق ہے جو ایک ہی اسکول کے دو فن کاروں کی تخلیقات میں ہوتا ہے۔ ایران اور وسط ایشیا کا اثر پوری طرح نمایاں ہے۔ لیکن ہندوستانی آرٹ نے چاہے وہ مغلوں کی سرپرستی میں پیدا ہوا ہو یا راجپوتانہ اور تنجور کے ہندو راجاؤں کی سرپرستی میں، کسی جگہ بھی غیر ملکی نمونوں کی کورانہ تقلید نہیں کی اور اپنی اتحاد پسندی اور مفاہمانہ روش کو نہیں چھوڑا۔

عہد وسطیٰ میں اگر یہ اتحاد و اتفاق نہ ہوتا تو ہمارا لٹریچر جو زندگی کا آئینہ دار

ہے۔ کبھی بھی دلوں پر اثر نہ کرتا۔ ہندو مصنفین جب کبھی فارسی زبان لکھتے ہیں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے ہیں اور تمہید کے طور پر حمد و نعت ضرور لکھتے ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان، ہندی میں لکھتے ہیں تو ابتدا میں شری گنیش جی اور سرسوتی جی کی تعریف و توصیف ضرور کرتے ہیں۔ رحیم نے "مدناستکا" کا آغاز سری گنیش نامہ سے کیا ہے اسی روش کی پابندی احمد معاصر جہاں گیر نے سامدریکا میں کی ہے یعقوب خاں اور غلام بنی نے گنیش جی، سرسوتی جی، شری رادھا کرشن جی اور شری گوری شنکر جی کی تعریف کے بعد اصل موضوع کی طرف رجوع کیا ہے۔ ملک محمد جائسی کی شاعری ہند و مسلم کلچر کی ترجمان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے بھگتی کے عقائد، اسلامی تصوف سے ہم آغوش ہو گئے ہیں۔ اس کی تشبیہات، تلمیحات سب ہندی ہیں اور بھگتی سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح بعض مسلمان شعرا مثلاً عالم، قادر، جمال، مبارک، احمد اور تاج نے کرشن جی سے غیر معمولی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

کنور پریم کشور فراقی کا نجی روزنامہ وقائع عالم شاہی رام پور سے چھپ گیا ہے۔ اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یا فتاحُ، حمد و ثنا اور درود و تحیات و سلام سے ہوتی ہے۔ اگر مصنف کا نام نہ ہو تو آغاز دیکھ کر یہ پہچاننا مشکل ہے کہ لکھنے والا ہندو ہے یا مسلمان۔

عہد وسطیٰ کے حکمرانوں نے ہندی اور سنسکرت کی جو سرپرستی کی وہ ہنگامی یا ملکی مصلحتوں کی بنا پر نہیں کی بلکہ وہ ان زبانوں کی خوبیوں سے آگاہ تھے اور ایک دوسرے کے خیالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں مہابھارت کا فارسی ترجمہ ہوا۔ ابوالفضل نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے:

خاطر نکتہ داں بر اں قرار یافت کہ کتب معتبر طائفین بزبان مخالف ترجمہ کردہ آید تا ہر دو فریق ...... از شدت عناد برآمدہ جویائے حق

شوند و بر محاسن وعیوب یک دیگر اطلاع یافتہ در اصلاح حال خود مساعی جمیلہ نمایند۔

غلام علی آزاد ہندی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

معنی آفرینیانِ عربی و فارسی خون از رگ اندیشہ چکانیدہ اند و شیوہ نازک خیالی را بہ عالی مراتب رسانیدہ لیکن افسول خوانانِ ہند ہم دریں وادی پایہ کمی نہ دارند۔

سنسکرت، بنگالی، اودھی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ سے یہ دلچسپی صرف امراء اور سلاطین تک محدود نہیں تھی بلکہ عام مسلمانوں نے بھی ان زبانوں کو علم کے شوق میں پڑھا اور ان میں کمال پیدا کیا۔ ڈاکٹر جودھری نے اپنی کتاب "سنسکرتی ادب پر مسلمانوں کے احسانات" میں اس سے بحث کی ہے[۱]۔ "ہندی کے مسلمان کوی" میں ان مسلمان شعرا کے نام اور کارنامے درج ہیں جنھوں نے گیسوئے ہندی کو سنوارا ہے، اسی قسم کی ایک فہرست پنڈت شیام بہاری مصرا نے اپنی تاریخ ادب ہندی میں شامل کی ہے[۲]۔

ان لوگوں نے محض خانہ پری نہیں کی بلکہ اپنے رنگ و آہنگ سے ادب و شعر میں مستقل اضافے کئے ہیں۔ ابوریحان البیرونی سے لے کر سید علی بلگرامی تک اگر سنسکرت کے ادیبوں کی پوری فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ عہد گپتا کی علمی ادبی روایات عہد مغلیہ میں بھی قائم رہیں۔ شاید ہی سنسکرت

---

[۱] نیز ملاحظہ ہو رسالہ رتناکر ۱۹۳۲ء میں سی جی کردے کا مقالہ بعنوان "غیر ہندو مرہٹی ادب" اور رسالہ اردو اپریل ۱۹۳۷ء میں پروفیسر سی ان جوشی کا مقالہ "مسلمانوں کا مرہٹی ادب میں اضافہ"۔

[۲] نیز ملاحظہ ہو الندوہ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء و فروری ۱۹۱۱ء۔

کی کوئی ایسی مشہور کتاب ہو جس کا ترجمہ فارسی میں نہ ہوا ہو اور اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ ترجمہ کرانے والے بیشتر مسلمان ہی تھے۔

اس اتحاد و اتفاق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور سندھی پر فارسی کا گہرا اثر پڑا۔ یہ نقش ان کے الفاظ، تشبیہات، قواعد و اسالیب پر ثبت ہو گیا ہے اور آج بھی نظر آ سکتا ہے۔ اسی طرح ہندی کے ہزاروں الفاظ فارسی میں مل گئے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ہمایوں نامۂ گلبدن بیگم سے ان ہندی الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے جس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں نے بلا تعصب ہندی رسم و رواج کو قبول کر لیا تھا۔ اور اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا سراج الدین علی خاں آرزو اور غلام علی آزاد بلگرامی فارسی ادب میں ہندوستانی رنگ کے حامی تھے۔ آرزو و حزیں اور حامیانِ قتیل و غالب[1] کے ادبی معرکوں کو بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔

اسی طرح ہندی شاعری میں فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ بہاری لال کے ۷۰۰ اشعار میں ۹۰ الفاظ عربی فارسی کے ہیں۔ اور خسرو و رحیم کے یہاں تو ایک مصرع فارسی کا اور ایک ہندی کا ہے۔

یہ اثر صرف چند الفاظ تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ فارسی کی بعض اصناف بھی ہندی شاعری میں داخل ہو گئیں۔ قطبن، منجھن اور جائسی نے مرگاوتی مادھومالتی، اور پدماوت میں مثنوی کا طرز اختیار کیا ہے۔ سنسکرت، پالی اور پراکرت کی شاعری میں قافیہ اور تخلص نہیں ہوتا لیکن فارسی کے اثر سے ہندوستانی

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے: احوال غالب میں "معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل": مقالہ از راقم الحروف؛

شاعری میں ان کا بھی رواج ہوا[1]۔

سنسکرت اور ہندی شاعری میں جسمانی اعضا کی قلمی تصویریں کثرت سے ملتی ہیں۔ ضیاءالدین نخشی نے جزئیات و کلیات میں، حسن بن محمد شرف الدین نے انیس العشاق میں اور ایک نامعلوم مصنف نے سراپا میں اس کی تقلید کی ہے[2]۔ اردو شاعروں کے کلام میں بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں یگانگت اور اتحاد کا پرتو نظر نہ آتا ہو۔ اس اختلاط باہمی کی گواہ ہماری مصوری ہماری موسیقی، ہماری شاعری، ہماری عمارتیں اور ہماری مذہبی تحریکیں ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ تخلیقی کوششیں ہمیشہ زمان و مکاں کے قوی موثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

سب سے اہم چیز جس نے نئے حملہ آوروں اور قدیم ہندیوں میں یک جہتی کا ماحول پیدا کیا وہ بھگتی کی تحریک ہے۔ اس مذہبی بیداری نے جو ہندو مذہب اور اسلام کے باہمی عمل اور ردعمل سے پیدا ہوئی تھی، ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ چیتن کے ماننے والوں میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمان بھی تھے۔ اجمیر کے جینی پنڈت آج تک مشہور ہیں۔ لنگایت فرقہ کے تمام تر عقائد اسلام سے مستعار ہیں۔ رامانند، کبیر، نانک، اور تکارام اسلام اور ہندو دھرم کی روحانی بنیاد کو ایک سمجھتے تھے۔ شیخ اسماعیل لاہوری کی مجالس وعظ میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو شریک ہوتے تھے۔ بابا فرید شکر گنج کی خانقاہ میں

۱؎ ڈاکٹر تاراچند کا خطبہ صدارت انڈین ہسٹری کانگریس کلکتہ۔

۲؎ ایضاً۔

جوگی آتے تھے اور تصوف کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی۔[1] حد یہ ہے کہ تصوف و معرفت کے مسائل میں جو اصطلاحات ابتداءً استعمال ہوئیں وہ بھی وہی تھیں جو ہندو سنت اور بھگت استعمال کرتے تھے۔[2]

مسلمانوں نے ہندوؤں کے عقائد اور فلسفہ کا غور سے مطالعہ کیا اور ان کی مشہور کتابوں کو فارسی میں منتقل کیا۔ اُن ہی کے اثر سے ان کے یہاں روشینہ، الٰہیہ اور تناسخیہ فرقے پیدا ہوئے یوگ کا اثر چشتیہ اور شطاریہ کے ذکر اور مراقبہ میں نظر آسکتا ہے۔ دھیان گیان، پراشچت اور ذکر، مراقبہ اور ریاضت میں بھی ایک قسم کی یکسانیت پائی جاتی ہے۔[3] جو اہمیت سے خالی نہیں۔ میر نے ذکرِ میر کے شروع میں جن صوفیوں اور بزرگوں کے خیالات کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہندو باطنیت سے بہت قریب ہیں۔[4] ان کے ہم عصر مرزا مظہر جانِ جاناں نے تو ویدوں کو الہامی کتاب مانا ہے اور ہندوؤں کو اہلِ کتاب کا درجہ دیا ہے۔[5]

اس تمہید سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ کلچرل اتحاد اگر مصنوعی ہوتا یا محض ملکی مصلحتوں کے سہارے قائم ہوتا تو انحطاطِ سلطنت کے بعد اس کا فنا ہوجانا یقینی تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تناور درخت کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور اس کی سرسبزی و شادابی برسوں کی آبیاری اور دونوں

۱؎ فوائد الفواد ص ۸۵، ۲۴۵ ۲؎ ملاحظہ ہو معراج العاشقین (حضرت گیسو دراز ؒ)

۳؎ معارف ج ۵۴ ش ۳، ۴۔

۴؎ ذکرِ میر ص ۱۳، ۱۷، ۳۰، ۳۹۔

۵؎ کلماتِ طیبات ص ۲۷، ۴۰: مکتوب چہارم دہم (مطبع نامی گرامی مفید عام آگرہ ۱۹۱۴ء)

قوموں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ تھی۔ اسی لئے اس دورِ خزاں منظر میں بھی ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نہایت شگفتہ رہے۔

میر تقی میر (۱۷۲۲ — ۱۸۱۰ء) کی تصانیف دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ سیاسی ابتری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار کے ہنگامے برپا تھے۔ تیموری جاہ و جلال ختم ہو چکا تھا۔ اور سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ہماری معاشرت اتنی مضبوط تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات میں فرق نہیں آیا تھا اور ان کی ہمدردی اور یکدلی بدستور قائم تھی۔

میر کے والد کا انتقال ۱۷۳۲ء میں ہوا۔ باپ کے مرتے ہی ان کے اوپر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خود لکھتے ہیں:

دریا دریا گریستم ۔ لنگر از کف دادم (ذکرِ میر ص ۶۰)

اس کم عمری میں انھیں تلاشِ معاش میں گھر چھوڑنا پڑا۔ کچھ دنوں اطرافِ اکبرآباد میں پھرتے رہے، پھر دلی گئے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ "بسیار گردیدم، شفیقے ندیدم" امیر الامرا نے نان و نمک کا انتظام کر دیا لیکن ان کے مرنے کے بعد یہ سہارا بھی جاتا رہا۔ میر پھر اکبرآباد گئے لیکن یہاں بھی لوگوں نے بے رخی برتی۔ ناچار دوبارہ دلی گئے (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء)[1] یہ زمانہ بڑا پرآشوب تھا۔ عزت سنبھالنا مشکل تھی۔ شاعروں کا تو کیا ذکر، بڑے بڑے امرا پریشان اور مضمحل تھے۔ دلی چاروں طرف سے آفات کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے دلی کو لوٹ کھسوٹ کے ویران کر دیا تھا۔ مرہٹوں، جاٹوں اور روہیلوں کی دست بردنے

---

[1] دیوان چہارم قلمی (محمود آباد) میں نوادر الکملا کے حوالہ سے لکھا ہے:
"بہ عمر ہفت دہ سالگی در دہلی رفت و بہ خانہ سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزید"
نیز رسالہ اردو جنوری ۳۸ء۔

رہا سہا امن وسکون بھی غارت کر دیا تھا۔ ہر طرف دنیا کی بے اعتباری اور یاس کی تاریکی ہی نظر آتی تھی۔ اس سیلاب بلا میں میرؔ جیسے آشفتہ مزاج اور نازک دماغ کی دستگیری اور ناز برداری چند ہندو رئیسوں نے کی جن کی فہرست کافی طویل ہے:

(۱) مہا نرائن دیوان : میرؔ ان کے متعلق لکھتے ہیں:

جہانرائن دیوان وزیر بہ دست درو غۂ دیوان خانہ خود.... چیزے فرستاد و باشتیاق بسیار مرا طلبید۔ دست در دامنِ پہلودار اُو زدم و چندماہ بفراغت گزرانیدم۔ (ذکر میر ص ۷۲)

(۲) راجہ جگل کشور : میرؔ ان کے متعلق لکھتے :

راجہ جگل کشور کہ در وقت محمد شاہ وکیل بنگالہ بود بہ ثروت تمام می گزرانید مرا از خانہ برداشتہ برد و تکلیف اصلاحِ شعر خود کرد۔ قابلیت اصلاح نہ دیدم۔ بر اکثر تصنیفات او خط کشیدم۔ (ذکر میر ص ۷۵)

لیکن اس پر بھی راجہ جگل کشور نے محبت اور مروت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ان ہی کی سفارش سے میرؔ کی راجہ ناگر مل کے یہاں رسائی ہوئی خود لکھتے ہیں:

روزے سوار شدہ بخانۂ راجہ ناگرمل رفت و تقریب من کردہ طلب داشت۔ (ذکر میر ص ۷۸)

(۳) راجہ ناگر مل کے میرؔ پر بڑے احسانات ہیں۔ راجہ بھی اس زمانہ کی شرافت اور وضع داری کا نمونہ تھے۔ جب وہ جاٹوں کی چیرہ دستی سے تنگ آکر دلیرانہ قلعہ چھوڑتے ہیں تو اپنے ساتھ بیس ہزار آدمیوں کو جس میں ہندو مسلمان سب ہی تھے۔ اور جو ان کی وجہ سے وہاں آباد تھے، ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ وقت خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ میرؔ لکھتے ہیں:

چناں ہمت بہ امداد غربا گماشت کہ ناموس نفرے ہم آں جا نہ گذاشت۔

راجہ ناگرمل کی رفاقت میں میرؔ عرصہ تک رہے اور اکثر جگہ ان کے ساتھ گئے۔ یہ اس زمانہ میں نائب وزیر، عمدۃ الملک اور مہاراجہ کے خطاب سے ممتاز تھے اور میرؔ کی بڑی عزت کرتے تھے۔ قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے:

> از مدتے بہ سبب افراط تفریط روزگار ناہنجار ہمراہ ناگرمل کہ دیوان تن و دخیل پادشاہی بود۔ در قلعہ ڈیگ شنیدہ می شود۔

مخزن نکات میں بھی میرؔ اور ناگرمل کے تعلقات کا ذکر ہے۔ مجمع النفائس (قلمی: رام پور) میں لکھا ہے کہ راجہ ناگرمل نے ایک مصرع کہا "چو غنچہ سر بگریباں عقدہ خویشم" دوسرا مصرع نہیں ہوتا تھا۔ میر صاحب نے فرمایا: "کشادکار ندانم چہ آورد پیشم"

(۴) بہادر سنگھ کے متعلق میرؔ لکھتے ہیں:

> بہادر سنگھ پسر لالہ رادھا کشن کہ بیشتر خزانچی گری صفدر جنگ داشت ...... شام آمد و سر دستی بمن گرفتہ او میانہ سر کرد۔ احسان مند اویم کہ غیر از دوست روئے حقے بر نداشتم۔ چندے بفراغت ماندم و روز و شب گزراندم۔ (ذکر میر ص ۹۱)

(۵) اسی طرح رائے بشن سنگھ کے متعلق لکھتے ہیں:

> پسر خورد راجہ (رائے بشن سنگھ) مرا طلبیدہ۔ بشگفتگی خاطر باحتیاج مرا می رسانید۔ (ذکر میر ص ۹۳)

یہ زمانہ انتہائی سیاسی ابتری اور بدحالی کا تھا۔ ہر طرف خود غرضی، جاہ طلبی، بدمعاملگی، غداری اور بے وفائی پھیلی ہوئی تھی لیکن مذہبی تعصب اس زمانے میں بھی نظر نہیں آتا۔ ہندو اور مسلمانوں میں اس قدر یک جہتی تھی کہ دونوں کا اندازِ فکر اور طرزِ خیال بھی ایک ہی تھا۔ ایک زمانہ میں میرؔ بڑے تنگ دست اور پریشان روزگار تھے۔ راجہ ناگرمل کے یہاں سے کچھ مقرر نہیں ہوا تھا۔ اسی

پریشانی اور اضطراب میں ایک روز صبح کی نماز کے بعد ان کے مکان پر پہنچے۔ آگے کے واقعات خود میر کی زبانی سنئے:

> جے سنگھ نام میر دہ چوبدان پیش آمد و گفت کہ این کدام وقت دربار است۔ گفتم کہ حالت اضطرار است گفتا شمارا مردمان درویش می گویند گرگوش زد نشدہ کہ لاتحرک ذرہ الّا باذن اللہ..... صابر و شاکر باید بود۔ ہمہ چیز در گرد وقت است۔ (ذکر میر ص ۷۸)

جے سنگھ کے بجائے کوئی مسلمان ہوتا تو وہ بھی یہی کہتا۔

میر کا تذکرہ نکات الشعرا دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی مشاطگی میں ہندو اور مسلمان دونوں مصروف تھے۔ اکبر اعظم نے مشترکہ تعلیم کو ہندو مسلمانوں میں رواج دیا تھا اس کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ اٹھارہویں صدی کے مشہور معلّم لالہ جینی لال ذرہ تھے جن سے ہندو اور مسلمان دونوں کسب فیض کرتے تھے[1]۔ مفتی لطف اللہ مرحوم کے استاد فارسی، منشی سوہن لال تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ، جعفر علی حسرت کے استاد تھے، (حسرت، جرأت کے استاد تھے) مرزا عبدالقادر بیدل کے بیسیوں ہندو شاگرد تھے۔ امام المتاخرین خان آرزو نے مجمع النفائس میں بال مکند شہود، جے کشن عشرت، انند رام مخلص، بندرابن داس خوشگو، ٹیک چند بہار کو اپنے عزیز شاگردوں کی فہرست میں شامل کیا ہے[2]۔ آرزو اور مخلص میں بڑی محبت تھی۔ آزاد بلگرامی اور شفیق اورنگ آبادی میں بڑا اتحاد تھا۔ غالب اور "کاشانۂ دل کے ماہ دو ہفتہ" مرزا تفتہ میں جو تعلق

---

[1] ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصّہ: ڈاکٹر سید عبداللہ۔

[2] مجمع النفائس قلمی: نسخۂ رام پور۔

خاطر تھا، اس کا اندازہ غالب کے خطوں سے کیا جا سکتا ہے۔

میر نے نکات الشعرا میں حسب ذیل ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے[1]:

(۱) رائے رایان انند رام مخلص : میر ان کے متعلق لکھتے ہیں :

شاعرے مقررے فارسی در عنفوان جوانی مشق سخن بخدمت مرزا بیدل می کرد۔ دریں ایام اشعار خود را از نظر خان صاحب سراج الدین علی خاں آرزو می گزرانید۔[2] (ذکر میر ص ۸، ۹)

آرزو اور مخلص میں خصوصی تعلقات تھے۔ انند رام ہی کی بدولت خان آرزو کو بادشاہ سے جاگیر، منصب اور خطاب خانی حاصل ہوا۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ:

برابر فکر او در ہنود کسے نیست

مخلص کی متعدد تصانیف ہیں۔

(۲) رسوا ۔ ان کے متعلق میر لکھتے ہیں :

شخصے بود ہندو۔ حالا قید مذہب نداشت۔ پیش ازیں در توپ خانہ نوکری کرد۔ از چندے ترک روزگار گرفتہ آوارۂ دشت گمراہی شدہ۔ ...... عریانی را لباس خود مقرر کردہ می گشت آخر در ہماں برہنگی جامہ گزاشت[3] (ذکر میر ص ۱۲۹)

(۳) لالہ ٹیک چند بہار (صاحب بہار عجم)

---

[1] میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں سترہ ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے (ص ۱۳، ۱۴)۔

[2] ذکر میر ص ۸، ۹۔ مخلص اور عام رئیس زادوں کے لباس میں بھی کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ ڈاکٹر اطہر علی نے سفرنامہ مخلص کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میر تقی میر کا لباس بھی اسی وضع کا ہوگا (سفرنامہ ص ۱۸ طبع رام پور)

[3] ذکر میر ص ۱۲۹۔

از یاران سراج الدین علی خاں، صاحب تصانیف بسیار...... از

از لفظ لفظش ہزار ہزار رنگ معنی گل می کند۔ با فقیر ہم آشنا است[1]

(ذکر میر ص ۱۴۲)

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے کہ بہار ہندی اُردو اور فارسی میں بہت سی کتابیں چھوڑ کر مرا[2] تذکرہ گلزار ابراہیم کی روایت ہے کہ بہار نے ایران کی بھی سیاحت کی تھی۔[3]

(۴) بندرابن راقم : میر لکھتے ہیں :

از شاہ جہاں آباد است۔ مشق شعر از مرزا رفیع می کند۔ قبل ازیں

با فقیر نیز مشورت شعری کرد۔

راقم نومشق تھے اور میر کو چھوڑ کر سودا سے اصلاح لینے لگے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میر نے راقم کا ذکر محبت سے کیا ہے اور ان کے بہت سے شعر نقل کئے ہیں[4]

میر خود بھی نہایت پاک مشرب اور وسیع النظر واقع ہوئے تھے ان کا مسلک ظواہر و رسوم سے بالاتر تھا : ؎

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اِن نے تو

قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

ایک اور جگہ فرماتے ہیں :

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل

اب یہ دعویٰ حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

---

[1] ذکر میر ص ۱۴۲ [2] تذکرہ کریم الدین ص ۵۶ [3] تذکرہ گلزار ابراہیم

[4] ذکر میر ص ۱۵۳ تا ۱۵۶۔

بابِ پنجم : میر کا مرتبہ

مجمعُ النفائس (قلمی)

میر محمد تقی المتخلص بمیر، مولدش مستقر الخلافۂ اکبرآباد است درادل بمشقِ اشعار ریختہ، کہ بزبانِ اُردو شعریست بطرزِ شعرِ فارسی، توغل بسیار نمودہ چناں چہ شہرۂ آفاق ست۔ بعدآں بگفتنِ اشعار فارسی بطرزِ خاص گردیدہ، قبول خاطر ارباب سخن و دانایانِ ایں فن گشت۔ طبعش بمضامین تازہ وغیر مبتذل معنی پرداز است۔ و اشعار او بلطافت ادا و انداز۔ از لیکہ ذہن مناسب و طبع ثاقب یافتہ۔ درابتدائے مشق شعر رتبۂ سخن را بپایۂ انتہا رسانید۔ از چند سال بجناب معالی القاب.. گرامی دُرِ عمدۃ الملک مہاراجہ بہادر کہ آفتاب ابد فروغ اقبالش برب بیت اشرف ترقی ہموارہ متصاعد و دولت و جلالش ہر روز در تزاید باد، کامیاب فراواں فیوضات و بہرہ اندوزِ انواع احسان و پرداخت و احوال بفراغبال می گزراند۔ مہاراجہ مستغنی التوصیف از ابتسام صبح دولت و کامرانی بہ بسیاری اشتغال امور مملکت و جہاں بانی کہ در عہدِ فرخندہ مہد حضرت فردوس آرام گاہ و بعد آں در زمانِ خلافت و اوانِ سلطنتِ احمد شاہ بادشاہ مربع نشین جاریالش دیوانی خالصہ

شریفہ و دیوانی تن و مرجع و مآب اقاصی و ادانی زمان و زمن و ازاں باز
کہ کوکب اقبال شاں پیوستہ صاعد مصاعد اجلالست، برتبۂ عالی منزلت
نائب الوزارہ کامروائی نامداران عالم و صاحب السیف والقلم شدند۔
و بے اغراق تکلف کہ نام نامیش در عرصۂ شش جہات بجہاں جہاں نیک
نامی شہرہ و صیت اخلاق خوش و اشفاق دلکش آں جناب در بلادِ ربع
مسکون مشہورتر، بنا بر کثرتِ امورِ مملکت و قلتِ فرصت تبلاش شعر
توجہہ نفرمودند لیکن کمالاتِ سخن دانی و معنی یابی و بدیہہ رسی و خوبیٔ
ذہن رسا و دقتِ طبیعت عالی زائدالوصف است۔ دفترہا باید کہ
تحریر نماید اما ...... بقلم می آید کہ روزے در صحن چمن و خیابان گلشن
باقبال جاوداں خرام کناں بداہتہً از بہارستان خاطر عاطر ایں گل
مصراعی سرزد ع

چوں غنچہ سر بگریباں عقدہ خویشم

باآں کہ اکثری تبلاش مصرع دو یمش فکرہا کردند، خوب بیسر نیامد۔ میر
مزبور مصرعِ ثانی را باآنکہ ایں ہم در تقابل رتبۂ مصرع اول دویم است
بہم رسانید ع

کشاد کار ندانم چہ آورد پیشم

ہر چند میر دیوان مختصر دارد، اما غزل ہائے دردمندانہ و عاشقانہ
می گوید۔[1]

---

[1] مجمع النفائس خان آرزو ــ مخطوطہ، رضا لائبریری رام پور۔ مجمع النفائس کا وہ حصہ جو
میر اور ان کے اشعار سے متعلق ہے، اصل کاتب نسخہ کے قلم کا نہیں ہے بلکہ بعد میں کسی نے،
(بقیہ نوٹ ص ۵۷۸ پر ملاحظہ کیجیے)

دیوان چہارم میر (قلمی) بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار دو صد و بست و پنج ہجری بود کہ میر محمد تقی صاحب میر تخلص، صاحب این دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹہٹی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوار رحمت ایزدی پیوستند و بروز شنبہ بست و کم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دو پہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند[1]

البقیہ نوٹ ص ۵۷۷ — دوسرے زیادہ خوش خط کاتب سے لکھوا کر شامل کر دیا ہے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا خیال ہے کہ یہ کام خود راجہ عمدۃ الملک ہی کی فرمائش پر کسی نے کیا ہے اس لئے کہ یہی راجہ صاحب ہیں جن کے لئے رام پور والا نسخہ لکھا گیا ہے اور وہ شخص جو ان سطور کا محرر ہے، بعید نہیں کہ خان آرزو نہ ہو۔

قائم نے مخزن نکات میں لکھا ہے: "(میر) اوائل حال پیش ظہیر الدولہ بہادری گزرانید چوں باد شکر آبی رسید رفیق راجہ ناگرمل گردید چنانچہ تاحال باعز و امتیاز در رفاقت اوست" ص ۴۰ -

[1] دیوان چہارم میر (قلمی)، کتاب خانہ ریاست محمود آباد اودھ ص ۱ - یہ دیوان میر حسن علی تجلی داماد میر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اسے میر نے اپنے شاگرد محمد محسن کو عنایت فرمایا تھا۔ یہ عبارت موخر الذکر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

جناب قاضی عبدالودود کا بیان ہے کہ مرزا احمد فتشا داماد سید انشا کے کلیات فارسی میں ایک صفحے سے زیادہ کی عبارت ہے جس کے ہر فقرہ سے میر کا سال وفات نکلتا ہے۔ ایک فقرہ ہے "سنہ یک ہزار و دو صد و بیست (ی کے ساتھ) و پنج ہجری" ذیل کے کل فقروں سے بھی ۱۲۲۵ھ مستخرج ہوتا ہے۔ اس میں سے دو ایسے ہیں جن سے دن تاریخ اور مہینہ بھی معلوم ہوتا ہے۔

(باقی نوٹ ص ۵۷۹ پر دیکھیے)

نوادر الکملا

اصلش از اکبرآباد، در اواخر یک صد و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ
بعد واقعہ ہائلہ پدر بزرگوار بہ عمر ہفت دہ سالگی در دہلی رفت و بہ خانۂ
سراج الدین علی خاں آرزو اقامت ورزیدہ تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ[۱]. بعد
مرور دہور کہ جدائی فی مابین واقع شد، بہ رؤسائے عظام درخور و برخورد
و بفراغت تام و خوبی مالا کلام با اعزا و اقربا زندگی بسر می برد[۲]......
..... آخر کار بہ ایمائے نواب وزیر...... بہ بلاد مشرقی شتافتند
و در بلدۂ لکھنؤ...... مورد عواطف آصفی شدند. شہرۂ حسنِ کلام
زمین و زماں را برگرفت، ذرہ ذرہ روشناس و قطرہ قطرہ محو سپاس.
چہ تعظیم ہا کہ ندیدند و چہ آفرین ہا کہ نہ کشیدند...... (میر) مرحوم
مردے بود متوکل. سپاہی پیشہ. رقیق القلب پابندِ وضع. جہاں دیدہ.

(بقیہ نوٹ ص ۵۷۸) ــــ "فقرہ اول بلہجۂ فارسی صاف دل آرا، یوم الجمعہ و بست (بدون ی) و یکم از مہ شعبان. فقرہ ثانی بزبان پاکیزہ بنیان ہند جمعہ (کذا) کا اچھا روز اور اکیسویں ماہ شعبان کی" (کلیاتِ فارسی منشا: نسخۂ کتاب خانہ مشرقیہ پٹنہ. ورق ۳۲) منشا اور محمد محسن کے بیانات میں دن کا اختلاف نہیں، تاریخ کا فرق ہی اس طرح میر کا انتقال ۲۱ شعبان ۱۲۲۵ھ یعنی ۲۱ ستمبر ۱۸۱۰ء کو ہوا۔

[۱] فتح علی حسینی گردیزی نے تذکرۂ ریختہ گویاں میں لکھا ہی: شمع استعدادش برکردہ شعلہ ادراک سراج الدین علی خاں آرزو است (ص ۱۳۷، ۱۳۸)۔
قائم نے مخزن نکات میں لکھا ہی: "میر، در خدمتِ خان آرزو...... لختے دانش اندوختہ" ص ۸۰

[۲] اس عبارت سے شیفتہ کے اس بیان کی تردید ہوتی ہی کہ در بدو حال بہ شاہجہاں آباد آمد و تمتع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ می گزراند (گلشن بے خار)

سرد و گرم زمانہ چشیدہ ۔ سر آمد سخنوران ماضی و حال ۔ در سخن سنجی بے مثال بکم اختلاط ۔ و با دوستاں سراپا ارتباط ۔ سنجیدہ ۔ از حرص و ہوائے دنیا آزاد دکسے را بنا زردے ۔ ہرگز حملہ براں بیاوردے ۔ کسے را بدنمی گفت و بدنمی شنفت ۔ استغنائے بیش از بیش ۔ بہ تعظیم ہر کہ و مہ پیشا پیش ...... از نوادر الکملا نقل گرفتہ شد و زیب دیوانش نمودہ آمد[۱]

تذکرہ بہارِ بے خزاں (قلمی): میر تخلص، محمد تقی نام، از اہل اکبر آباد خواہر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو، ہم دوش مہوشان پری جلوۂ نکتہ دانی، و ہم آغوش دوشیزگانِ شوخ ادائے معانی است، دیوانۂ طرز دلکش و دلآویز، آشفتۂ مضمون عاشقانہ و درد انگیز، مجنون بہار حسن لیلائے دل فریبی، فرہاد تلخ کام شیریں ادایانِ محبوبی، پروانۂ برشتہ جگر بزم شمع رویاں، ہم بسترِ ناکامی و ہمدم یاس و حرماں بودہ ۔ کلام شور انگیزش لختِ دل و پارہ جگر تفتہ درونان معنی آشنا در آتش انداختہ و روزمرہ گفتگوئے بے ساختہ او لطفِ حسنِ بندشِ دیگر لہا از دل ہا بر داشتہ ۔

مشہور است کہ بشہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میلی خاطر داشتہ ۔ آخر عشق او خاصہ مشک بید اکردہ می خواست کہ بکجیہ بجار سوئے رسوائی بشکند و حسن بے پردہ بہ جلوہ گری در آید از ننگ افشائے راز، و طعن اقربا یا دلے .... پروردہ

---

[۱] دیوان چہارم میر (قلمی)، کتاب خانۂ ریاست محمود آباد (اودھ) بہ حوالہ نوادر الکملا، نایاب ۔ یہ عبارت دیوان کے ختم ہونے کے بعد دوسرے صفحہ پر درج ہی ۔ یہ محمد محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی ۔ کسی دوسرے شخص نے اسی زمانہ میں کسی کتاب نوادر الکملا سے نقل کر دی ہے۔

حسرت و حرماں و با خاطرِ ناشاد دست و گریباں، قطعِ رشتۂ حبِ وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ براندازی ہا بشہر لکھنؤ رسید و سنگِ شکیبائی بر سینہ زدہ از آوارہ گردی ہا آرمید و ہمیں جا بصد حسرتِ جانکاہ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدارِ یار و دیار جاں بجہاں آفریں داد۔ تا بقید رشتۂ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت۔ از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک برد۔ چند مثنوی ہا و شش دیوان ریختہ دارد و بفارسی ہم سلیقہ درست داشتہ۔ القصہ کلام قیامت زائش تاثیرے دارد کہ ہمچو خدنگ خارا شگاف از سینہ بروں می جہد[1]"

تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی: گارساں دتاسی: میر (محمد تقی) معروف بہ میر و میر تقی۔ میران کا تخلص بھی ہے۔ یہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ مگر ابتدا ہی میں دہلی میں آکر مقیم ہوئے جہاں ان کی نشو و نما ہوئی۔ یہ میر عبد اللہ کے بیٹے اور آرزو کے بھانجے اور شاگرد تھے۔ ان کی تعلیم آرزو ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ میر کی تصانیف سے ان کے فکر کی بلندی، ان کے کمالات شعری اور ان کی

---

[1] تذکرہ بہارِ بے خزاں (قلمی) کتاب خانہ مولانا ابو الحسن علی ندوی خلف حکیم عبد الحیٔ مرحوم صاحب گل رعنا۔ تذکرہ کے ایک حاشیہ پر حسبِ ذیل تاریخ درج ہے:

"تاریخ تذکرہ از کفایت علی کافی تخلص

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف رنگ گلستاں　　یادگار شاعران کشور ہندوستاں
فکر کافی سے ہوئی تاریخ اسکی آشکار　　یہ عجب گلزار زیبا ہے بہارِ بے خزاں"

۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)

منطق کی باا ثری کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ علی ابراہیم خاں لکھتے ہیں کہ" وہ لوگ جن میں تھوڑی بھی بصیرت ہے اور جو تلخ و شیریں میں فرق کر سکتے ہیں، بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ میر اپنے عہد کے تمام ہندوستانی شعرا سے ممتاز ہیں"۔ لطف آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ میر تمام شعرائے اردو سے خواہ وہ ماضی سے تعلق رکھتے ہوں یا حال سے، بڑھ کر ہیں۔ میر نے کل اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اہلِ ہند کے سخن فہموں کا خیال ہے کہ غزل و مثنوی میں کوئی شاعر حتیٰ کہ سودا بھی میر کا مقابل نہیں، گو سودا ہجو و قصیدہ میں میر پر تفوق رکھتا ہے[1]

یہ نامور شاعر سودا کی وفات (۱۷۸۱ء) کے وقت دہلی میں تھا۔ لیکن یہ ۸۳-۱۷۸۲ء میں لکھنؤ جانے کے لئے دہلی سے روانہ ہوا۔ آصف الدولہ نواب اودھ نے ان کا وظیفہ مقرر کیا جسے ان کے جانشین نواب سعادت علی خاں نے برقرار رکھا اور جو ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۱، ۱۸۰۰ء) میں انھیں ملتا تھا۔ یہ تصنیف گلشن ہند کا سنہ ہے۔ اس لئے میر اس وقت تک زندہ تھے۔ بینی نرائن ان کی وفات کا ذکر کرتا ہے لیکن اس کی تاریخ نہیں بتاتا۔ وہ صرف اس قدر کہتا ہے کہ مرنے کے وقت ان کی عمر ۸۰ کے قریب تھی مصحفی کہتے ہیں کہ ۹۴-۱۷۹۳ء ہی میں اس عمر کے تھے۔ میر جس کا کلام بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے بڑا پُر گو ہے۔ اس نے ایک تذکرہ شعرائے ہندوستانی مسمّی بہ نکات الشعرا بھی لکھا ہے جس میں ۱۰۲[2] شاعروں کے

---

[1] تذکرہ سرور (قلمی، نسخہ لندن میں ہے)" پایہ او کم تراز سودا نیست بلکہ در غزل گوئی رجحان دارد"۔ [2] مسر گور ادسلے کے پاس ایک نسخہ ہے جن سے اطلاع ملی ہے کہ یہ ۱۳۲ صفحوں پر مشتمل ہے اور سنہ ۱۲۱۱ھ میں نقل ہوا۔ (دتاسی)

مختصر تراجم ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ہر ماہ کی پندرہویں کو شعرائے ریختہ کا جلسہ ہوا کرتا تھا جو پہلے درد کے یہاں ہوتا تھا لیکن ان کی خواہش کے مطابق میر نے اپنے یہاں اس کا انعقاد شروع کیا۔ میر نے مشرقی تذکرہ نگاروں کی رسم کے بموجب اس کتاب میں اپنا ترجمہ بھی دیا ہے جو سب کے آخر میں ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے سوا کچھ نہیں لکھا کہ میں اکبرآبادی ہوں اور انقلاب لیل و نہار سے کچھ دنوں سے اردوئے شاہجہاں آباد میں ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے ۷ صفحوں میں اپنے اشعار نقل کئے ہیں مگر یہ صرف غزل اور رباعی کے ہیں۔

کلیات میر کا انطباع کلکتہ میں بنام "کلیات میر تقی" ہوا۔۔۔۔۔ آں جہانی شکسپیر نے میر کی ایک مثنوی شائع کی ہے جس کا ترجمہ میں نے "بُرے شاعروں کو مشورے" کے نام سے چھپوایا ہے[1]۔ میجر کارمائکل اسمتھ نے ایک دوسری مثنوی شعلہ عشق شائع کی ہے[2]۔ جس کا ترجمہ اس مضمون کے آخر میں ملے گا۔ لطف کا بیان ہے کہ دریائے عشق میر کی مقبول ترین مثنویوں میں ہے۔ جنرل لو ریزبڈنٹ کا بیان ہے کہ کتاب دار شاہ اودھ کے قول کے مطابق یہ علی الخصوص لکھنؤ میں بہت پڑھی جاتی ہے۔

کلیات میر طبع کلکتہ میں میر کے کلام کا بڑا حصہ شامل ہے۔ میر تخلص ہے، لقب نہیں، شورش کہتا ہے کہ یہ شیخ تھے، سید نہ تھے[3]۔ یہ آرزو کے

۱؎ اس کا نام تنبیہ الجہال ہے دتاسی نے غلطی سے جِہال بالکسر و بدون تشدید لکھا ہے ۲؎ مجموعہ اشعار میر مطبوعہ میں یہ نام دوسری مثنوی کا ہے۔

۳؎ اشپرانگر نے لکھا ہے: "میر عموماً ان کے نام سے پہلے لکھا جاتا ہے لیکن شورش کا خیال ہے کہ وہ شیخ تھے۔" فہرست اشپرانگر ص ۱۷۵ (یادگار شعرا)

بھانجے اور متوطن آگرہ تھے۔ باپ کی وفات کے بعد قیام کے لئے دہلی گئے جہاں یہ اپنے اشعار پر آرزو سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ ۱۱۹۷ھ (۸۳-۱۷۸۲ء) کے بعد یہ لکھنؤ گئے جہاں آصف الدولہ نے ان کا وظیفہ ۳۰۰ روپئے ماہوار مقرر کر دیا تھا اور جہاں ان کی وفات ۱۲۱۵ھ اور ۱۲۲۱ھ کے درمیان قریب ۱۰۰ برس کی عمر میں ہوئی۔...

میر نے اپنا تذکرہ وفاتِ مخلص (۱۱۶۴ھ) کے تقریباً ایک برس بعد لکھا۔ یہ فارسی میں ہی اور اس میں ۱۰۰ شاعروں کا مختصر حال اور ان کے کلام پر ریمارکس ہے۔ میر کا مرتبہ شعرائے ہندوستانی میں عموماً دوسرا[۱] سمجھا جاتا ہی۔ لیکن تذکرہ نگار انھیں سودا کے برابر جگہ[۲] دیتے ہیں۔ اور ان کی بہت سی چیزوں کو سودا کی چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو میر کو اس بادشاہِ شعرائے حال ہندوستان[۳] سے قطعی طور پر بہتر سمجھتے ہیں۔

کمال نے مجمع الانتخاب (سنہ تصنیف ۱۸۰۴ء) میں لکھا ہے کہ میر ۸۰ برس سے زیادہ کے ہیں۔ شیفتہ نے بتایا ہی کہ یہ لکھنؤ میں مرے۔ اور سال وفات ناسخ کے قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہی۔ یہ ۱۲۲۵ھ ہے جو سال انطباع کلیات بھی ہی۔

---

۱ سیکنڈ ریٹ مراد نہیں۔ اہمیت میں اوّل نہیں، دوم۔ (مترجم)

۲ اینالس آف فورٹ ولیم کالج ص ۲۸۶۔

۳ مراد سودا۔ مصحفی نے تذکرہ ہندی گویاں میں لکھا ہی: "اکثرے در فن ریختہ او (میر) را در پایۂ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثر در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا در ہجو و قصیدہ بر و فضیلت می دہند غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ بر و مسلم است" ص ۲۰۴۔

میر ہندوستانی شعرا میں سب سے پُرگو تھے اور فارسی شعر بھی کہتے تھے بکال نے لکھا ہے کہ ان کا فارسی دیوان ہے مگر یہ کلیات میں شامل نہیں جس میں صرف ہندوستانی اشعار ہیں۔

کچھ لوگ دریائے عشق اور شعلۂ عشق کو ایک سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ جس کا ترجمہ میں دے رہا ہوں، وہ دریائے عشق ہے[۱]۔۔۔۔

کلیات مطبوعہ کلکتہ میں یہ دونوں مثنویاں نہیں اور اسی وجہ سے میں اس کے لئے وہ نام اختیار کرتا ہوں جو آنجہانی کارمائیکل اسمتھ نے کیا ہے۔[۲]

میر کے مرتبے کا تعین

میر کی شاعری کی جڑیں حقیقت کے آب و گل میں دور تک چلی گئی ہیں، انھوں نے زمانے کے گرم و سرد کو چکھا تھا۔ اس کی چوٹیں سہی تھیں، جگہ جگہ پھرے تھے وقت کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا تھا۔ عام انسانوں کی خوشیاں اور غم محسوس کئے تھے۔ بدسلوکی اور افلاس کی تکلیف برداشت کی تھی اور دردمندی اور ہمدردی کا لطف اٹھایا تھا۔ ان کی روح فطرت کی محرم تھی، ان کا دل حسن کا اداشناس تھا اور ان کا جگر عشق کی شورشوں سے آشنا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حسن و صداقت کا ایسا گہوارہ ہے جس میں زندگی کی ہدایت پڑی مسکرا رہی ہے۔

۱۔ بموجب مجموعہ مثنویات مشتمل بر ہر دو، طبع لکھنؤ ۱۸۴۶ء۔

۲۔ *Histoire de la literature Hindouie et Hindoustanie — Vol: II p. 303-321*

تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد دوم ص ۳۰۳، ۳۲۱۔ یہ ترجمہ فرانسیسی سے جناب قاضی عبدالودود نے میری فرمائش پر کیا ہے جس کے لئے ان کا شکرگزار ہوں۔

میرؔ نے اپنی وضعداری اور خودداری کو اس وقت بھی قائم رکھا جب زندگی کی ساری قدریں مضمحل ہو رہی تھیں اور اس سیلاب میں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا آشیانہ انسانوں کی بستی سے دور نہیں بنایا۔ اور نہ اس خاکدانِ ارضی کے لوگوں پر اس طرح نگاہ کی جیسے وہ کوئی احسان کر رہے ہوں، انھوں نے تحمل حسین خاں کے عیش کا ذکر نہیں کیا۔ عوام کے دل کی دھڑکنوں کو پیش کیا ہے۔ جہاں وصفِ گل و یاسمن کا موقع تھا وہ بڑے نازک دماغ اور کم اختلاط تھے۔ لیکن دوستوں کے ساتھ سراپا ارتباط بھی تھے "وہ شیشہ کا دل اور فولاد کا جگر رکھتے تھے۔ بڑی بڑی کڑیاں جھیل سکتے تھے۔ مگر کڑی بات نہ اٹھا سکتے تھے"[۱] انھوں نے مشاعروں، عرسوں، اور میلوں میں شرکت کی ہے، خوبرویوں کے ساتھ محبت کی ہے، دوستوں کے ساتھ ہنسی دل لگی کی باتیں کی ہیں، مصاحبت کی ہے۔ امیروں اور رئیسوں کے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔ قصیدے اور شکار نامے لکھے ہیں۔ لیکن ایک جگہ بھی اپنی خودداری اور غیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میرؔ قدردانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اس کے ہاتھ بک نہیں سکتے۔

میرؔ کا عشق انسانی اور مجازی ہے۔ خانقاہی اور ماورائی نہیں، وہ اصلی اور حقیقی ہے۔ روایتی اور رسمی نہیں۔ ان کی محبت میں گوشت و خون سے پیدا ہونے والے جذبات ہیں لیکن ایسا خلوص، سپردگی اور پاکیزگی بھی ہے جو اردو میں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ ان کے عشق میں جنس کا طوفان اور تلاطم۔ اور ان کی محبت میں شورش اور ہنگامہ نہیں ہے۔ اعتدالِ احساس اور اعتدالِ بیان ہے۔

---

[۱] جواہرِ سخن ج ۲ صفحہ ۱۳، ع۔

بڑا دکھ رکھاؤ، ضبط اور ٹھہراؤ ہے۔ دھیمی دھیمی آنچ اور میٹھا میٹھا درد ہی، اسی نے ان کے لب ولہجہ میں بلند سنجیدگی اور ماورائی سادگی پیدا کردی ہے اور باوجود ہجوم غم کے ان کی شاعری کو ایک اثباتی میلان اور تاب و توانائی دی ہے، جو زندگی کی ظلمت میں بہت بڑا سہارا ہے۔ انسانی عظمت کا جو احساس و اہتزاز میر کے یہاں ہے وہ اچھی قدروں کا اثبات کرتا ہے اس کی نفی نہیں۔ ان کا ثبات قدم دراصل شدت اور مدت کا حاصل ضرب ہے۔ ان غیر معمولی حالات میں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے میر کا اقدارِ عالیہ پر ایمان اور انسانیت کا احترام، جہد حیات میں ان ہی کا نہیں، ہمارا بھی سہارا ہے۔

میر کی شاعری بڑی شاعری ہے۔ وہ ہمیں من و تو کی محدود فضا سے نکال کر کبھی کبھی کائنات کی وسعتوں میں پہنچا دیتی ہے۔ ان کے یہاں حیات و کائنات کا شعور و احساس موجود ہے۔ اور انھوں نے ان بلندیوں تک اپنی خلاقانہ سادگی و پرکاری اور غم انگیز وجدان کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

میر فن و فکر کے بنیادی رشتہ سے باخبر ہیں۔ ان کے لب ولہجہ اور شاعرانہ اسلوب کے بنانے میں ان کی سیرت، ان کے خاندانی ورثہ اور معاشرتی ماحول کو بڑا دخل ہے۔ ان کے یہاں جو خصوصی اداسی، نرمی، گھلاوٹ، ضبط، اور پندار ہے وہ اردو شاعری کا بہترین سرمایہ ہے۔ ان کا غم عشق، غم آفاق کو گذرتا ہوا، بلند ترین المیہ کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ اس میں وہ گہرائی، سنجیدگی اور خیر و برکت ہے جو بغیر آگ کو گلزار بنائے ہوئے پیدا نہیں ہوتی۔

محمد شاہی دور میں ریختہ اس مرتبۂ عالی میں نہیں تھا جہاں میر نے اُسے پہنچا دیا۔ انھوں نے اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اس کو صرف ایک پاکیزہ اسلوب ہی نہیں بخشا بلکہ اسے اپنے ذوق و سلیقہ اور خون جگر کی آمیزش کر

اس قابل بنا دیا کہ وہ شائستہ محفلوں میں بار پا سکے اور نوائے سرمدی کہلایا جا سکے "انھیں عوام سے گفتگو" ضرور ہے لیکن ان کے اشعار "خواص پسند" ہیں انھوں نے جامع مسجد کی سیڑھیوں اور اس کے روزمرّہ اور محاورہ کو نظر انداز نہیں کیا،[1] لیکن اس میں سوقیت بھی نہیں آنے دی۔ وہ زبان پر قدرت رکھتے ہیں لیکن ان کی قدرت یا مہارت کا تصور مولویانہ یا مُدرسانہ نہیں ہے وہ خیال یا جذبہ کو جس زبان میں پیش کرتے ہیں وہ اسی میں سجتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ اسی لئے ان کے اسلوب میں ہیرے کی چمک اور پنکھڑی کی سی لطافت ہے۔

میرؔ نے ماضی کی ساری رنگینیوں کو اپنے اندر جذب کر کے مستقبل کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ فارسیت ان کے یہاں گھل مل گئی ہے اور وہ اجنبی یا بے میل نہیں معلوم ہوتی۔ اسی طرح ہندی الفاظ و محاورات کے بلند ترین اور بہترین امکانات بھی ان کے یہاں ہیں۔ کھڑی بولی کی ایسی نکھری ہوئی شکل کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ہے۔

ان میں سے ایک خصوصیت بھی میرؔ کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے کافی تھی۔ لیکن ان تمام خوبیوں نے مل کر ان کو اردو کے کلاسکی شاعروں میں بہت ممتاز حیثیت دیدی ہے۔ میرؔ کے یہ اشعار تعلّی نہیں حقیقت ہیں :-

جو دیکھو مرے شعرِ تر کی طرف ۔۔۔ تو مائل نہ ہو پھر گہر کی طرف

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ ۔۔۔ مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

---

[1] میرؔ نے مسجد کو مسیت، پلید کو پلیت، دستخط کو دسخط، شتاب کو شتابی، امیری کو امرائی خیال کو خیال (بروزن حال)، نزدیک کو نزیک نظم کیا ہے۔

ریختہ خوب ہی کہتا ہے جو انصاف کرو
چاہیے اہلِ سخن میرؔ کو استاد کریں

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ عالی میں میرؔ
جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا

تمّت

ضمیمہ

میر کے متعلق بعض کتابیں بر وقت مطالعہ میں نہیں آ سکیں۔ اُن کی نایابی اور اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے کہ اُن کے چند اقتباسات یہاں درج کر دیئے جائیں:

(۱) دیوانِ فارسی: میر تقی میر (مکتوبہ ۱۱۹۲ھ و مملوکہ ادارہ ادبیاتِ حیدرآباد دکن)

میر کے فارسی دیوان کا یہ نادر نسخہ مصنف کی زندگی میں نقل کیا گیا ہے۔ آخر میں لکھا ہے:

> تمام شد دیوان فارسی از میر تقی میر بدستِ لالہ دولت رائے
> بتاریخ چہارم ذی قعدہ سنہ ۱۱۹۲ھ موافق ۲۰ رجلوس والا جبب الفرمائش
> شیخ محمد شکر اللہ تحریر پذیر رفت۔

اس دیوان میں میر کی ایک مثنوی در فراقِ شہر ہند (ورق ۸۵) بھی شامل ہے

جو انھوں نے زورِ تخیّل سے نہیں، خونِ جگر سے لکھی ہے۔ اس نادر اور غیر مطبوعہ مثنوی کے چند مربوط اشعار ملاحظہ ہوں :

اے صبا گر سوئے دہلی بگذری — ہم چو صرصر آہ مگذر سرسری

بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من — بود بر آں خاک عمرے روئے من

بر مقابر آیۂ رحمت بخواں — در مساجد خدمتے از من رساں

ہم بکن پیدا جبینِ تازۂ — سجدۂ بر ہر سرِ دروازۂ

وقفۂ بر ہر سرِ کوئے ساعتے — بر درو بامش نگاہ حسرتے

سیر کن طفلاں تہ بازار را — اشتیاقم گو درو دیوار را

از مصیبت دیدگاں یادے بکن — زیر ہر دیوار فریادے بکن

پس نشانِ دوستانِ من بجو — حُسن اگر بینی ز من عشقے بگو

بعد از بحث سرایں داستاں — یعنی آں سرخیلِ آفت دیدگاں

از وطن مجبور بیدل میر نام — می کند از غم بکائے صبح و شام

نے خطِ شوقش زیارے می رسد — نے پیامے از نگارے می رسد

زیر لب دارد شکایت خوں چکاں — کائے فلک رحمے بدور افتادگاں

بے کسم ہر دم ملامت می کشم — کس چہ داند من چہ حالت می کشم

زرد گشتم، زار گشتم دل گداخت — آب غربت بر مزاج من نساخت

یادِ یارانِ وطن از دل نرفت — تختہ ام زیں ورطہ بر ساحل نرفت

بود ہر جائے کہ آباد انیئے — گوش زد می گرد دم ویرانیئے

در چنیں ویرانہ بنود ضبط باب — ایں بنا با بدر سانیدن بآب

یعنی از غم ، زاو می باید گریست ۔۔۔ ہر قدم بسیار می باید گریست
خانۂ بنشستہ گہ منزل شود ۔۔۔ از سرشک آں خاک باید گِل شود
دیر سیر آں عمارت کردہ ام ۔۔۔ ہر مقامے را زیارت کردہ ام
بر جبین خاک از نیازے دیر ماند ۔۔۔ گل رخاں خاکے بسر باید فشاند
باغِ ویرانے اگر پیش آیدت ۔۔۔ چشم عبرت بیں کشودن بایدت
خار از جائے کہ سر بر کردہ است ۔۔۔ جلوہ ہا ایں جا گلِ تر کردہ است
ہر کجا دل می شود از خود گداز ۔۔۔ سایہ افگن بود آں جا سروِ ناز
ناگہاں آں بزم خرم بر شکست ۔۔۔ آں شراب افتاد و آں ساغر شکست
چشم گل پوشیدہ شد ہم آب رفت ۔۔۔ سبزہ تر دیر شد در خواب رفت
نے گل و نے لالہ و نے سروِ باغ ۔۔۔ ماندہ ام من با ہزاراں دردِ داغ
نالۂ از درد گاہے می کشم ۔۔۔ گاہ گاہ از سینہ آہے می کشم
کار دارم با سکوت و غم کشی ۔۔۔ دم کشی گو تا نمایم دم کشی
من کہ از شوقِ وطن دل خستہ ام ۔۔۔ ورنہ عمرے شد کہ لب را بستہ ام
گو دماغ و دل کجا و وقت کو ۔۔۔ تا کنم ایں گونہ درہم گفتگو!
شہرۂ شہر است استغنائے من ۔۔۔ شور دارد بے دماغی ہائے من
دل ز جوش درد و غم خوں می کنم ۔۔۔ مصرعے را گاہ موزوں می کنم
رفتہ عشقم غم من وافر است ۔۔۔ ہر کہ داند شاعرم ناشاعر است
سینہ را بخراش در اندوہ شہر ۔۔۔ گریۂ بسیار کن بر یادِ شہر

شہر از بس خوش عمارت بودہ است — ہر مکانش قصر جنت بودہ است
زاں بناہا مطلقاً آثار نیست — از عزیزاں ہیچ کس دیار نیست[۱]

تعداد اوراق ۸۸ ۔

(۲) کلیات میر فارسی : (۱۷۹۹ء ۔ آصفیہ) کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں بھی میر کے فارسی کلیات کا ایک قلمی نسخہ (نشان ۱۱۲۴) ہے اس کے کاتب کا نام اللہ رکھا ابن قاضی جان محمد ہے جس نے "روز پنج شنبہ ہنگام برآمدنِ آفتاب بقدر نیزہ" اسے اختتام تک پہنچایا۔ حاشیہ پر سرخ روشنائی اور اسی کاتب کے قلم سے لکھا ہے: "مقابلہ نمودہ شد باصل نسخہ کہ بخط مصنف علیہ الرحمۃ بود با حضرت شاہ عبد اللطیف روز چہار شنبہ ہفدہم شہر ربیع الآخر ۱۲۱۴ھ" (۱۷۹۹ء)

یہ نسخہ اگر ۱۷۹۹ء کا مکتوبہ ہے تو میر کو علیہ الرحمۃ لکھنا تعجب انگیز ہے اس لئے کہ ان کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا ہے۔ اس میں میر کی پہلی غزل کا پہلا مصرع ہے:

---

[۱] نالہ درد (سن تصنیف ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) میں خواجہ میر درد نے لکھا ہے: "شہر مبارک دہلی .... عجب گلستانے بود وحالا پامال خزانِ حوادث زمانہ گشتہ وطرفہ انہار واشجار آبادی ہا مرد مان ہر جنس داشت واکنوں تاراج صدمات ہر شدہ بہر وجہ در تمام روئے زمیں چوں روئے محبوبان مہوش ومانند سبزۂ خط ایشاں دل کش بود .... رباعی

دہلی کہ خراب کردہ اکنوں دہرش — جاری شدہ اشک ہا بجائے نہرش
بودست ایں شہر مثل روئے خوباں — چوں خط بتاں بود سواد شہرش

(ص ۲۰)

الٰہی جوشِ طوفاں بخش چشم اشکبارم را

بعض غزلیں بڑی مستانہ اور وجد آفریں ہیں مثلاً ورق ۱۱، ۱۲ پر یہ غزل ؎

باتو برہنہ خفتہ ام سینہ بسینہ، لب بلب

راز نہاں بشنفتہ ام، سینہ بسینہ، لب بلب

لذت وصل می کشد میر مرا دریں غزل

نے زہوا شگفتہ ام سینہ بسینہ، لب بلب

یا یہ غزلیں:

(۱) ورق ۱۶ : لب لعلت گزیدنم ہوس ہست

(۲) ورق ۲۶ : ہوسِ بوسۂ آں غنچہ دہانم دادند

(۳) ورق ۵۵ : بوسہ تامستانہ بر لب ہائے آں دلبر زدم

(۴) ورق ۶۷ : ؎

گر عاشق آں دلبرے، دیوانہ شو، دیوانہ شو

خواہی وصال آں پری دیوانہ شو، دیوانہ شو

غزلیات کے بعد "قصیدہ فی مدح شیخ علیہ الرحمۃ" ہے۔ اس میں شیخ کا اشارہ کس کی طرف ہے، یہ یقین سے کہنا مشکل ہے۔ لیکن اسی حصۂ کلیات میں ایک قطعہ "در صفت مے خانہ وبعہد ملازمت مرشدِ کامل ہادی آگاہ دل، شیخ زمانہ شاہ عنایت اللہ القادری قدس سرہ" درج ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے:

چہ مے خانہ بہار ہستی عشق

ممکن ہے پہلا قصیدہ بھی شاہ عنایت اللہ قادری کی تعریف میں ہو۔ اسی حصہ کلیات

میں ایک اور قطعہ دل چسپ ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے:

جنوں را مشتری گر دید ہوشم   شکیبائی بہ غارت داد جوشم

محبت کرد اسباب سفر راست   دل از حظِّ وطن فی الفور برخاست

اس نسخہ کی آخری حکایت ایک "شہوت صوفی" کی ہے۔ جو اس مصرع پر ختم ہوتی ہے:

دیدہ و دانستہ در کفر آمدم

اس کے بعد تمّت ۲۰ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۴ھ لکھا ہے اور آخر میں حافظ کا یہ شعر

ع مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(۳) دیوان اوّل (اردو): میر تقی میر (قلمی نسخہ مکتوبہ ۱۱۷۶ھ مملوکہ ادارۂ ادبیاتِ اردو

ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن کے فارسی دیوان کی جلد میں میر کا پہلا اردو دیوان بھی ہے جو شیخ محمد شکر اللہ ہی کی فرمائش پر صرف اٹھارہ دن میں بڑے اہتمام سے نقل کرایا گیا ہے۔ اس قدیم نسخے کے بعض حصے غیر مطبوعہ ہیں۔ مندرجہ ذیل عنوانات سے میر کی زندگی اور شاعری کے نئے گوشے سامنے آجاتے ہیں:۔

ورق ۷۹: ہشت آنہ روز از سرکار دالابخش برائے من مقرر شدہ بود،

قبول نکردم ع دستخطی فرد کا سنو احوال الخ

ورق ۱۰۹ ب: مثنوی مسمی بدم الفضول ع

اس چرخ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے

میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے

(آسی : مثنوی در ہجو شخصے ہیچ مداں کہ دعوے ہمہ دانی داشت)

ورق ۱۱۵ : در مبارک بادی کد خدائی بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگر مل کہ برقفیر حفظہاد اللہ

ے آؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے چشم بد دور خوب صحبت ہے

ورق ۱۴۸ ب : مثنوی شعلۂ شوق : آغاز قصہ جاں کاہ کہ در عہد محمد شاہ

در عظیم آباد پٹنہ و ضیع و شریف بہ ظہور رسیدہ بود۔ عجب کام پٹنے میں

اسے ہوا الخ

سانواں قصیدہ در شکایت نفاقِ یارانِ زماں :

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے الخ

اس نسخہ کے ابتدائی ۵۵ اوراق میں غزلیں ہیں جن کو میر محمد علی نے لکھا ہے۔ ترقیمہ

کے الفاظ یہ ہیں :۔

تمت تمام شد بتاریخ دوئم روز یکشنبہ شہر ذی قعدہ ۱۱۹۲ھ نبوی

بہ حسب فرمائش شیخ محمد شاکر جیو سلمہٗ ربہٗ بدست میر محمد علی تحریر پذیرفت

سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ

ورق ۵۶ سے رباعیات شروع کی گئی ہیں جن کی تعداد ۳۳ ہے۔ ورق ۵۸ ب

سے مخمسات کا آغاز ہوا ہے۔ ان کے بعد بھی میر محمد علی کا ترقیمہ ہے :۔

تمت تمام شد دیوان میر تقی میر بتاریخ چہارم شہر ذی قعدہ روز سہ شنبہ

بہ حسبِ فرمائش میاں محمد شکر اللہ بدستِ میر محمد علی رضوی موافق سنہ ۱۱۹۲ھ

تحریر یافت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ غازی۔

ورق ۶۳ سے مثلث، تضمین، ترکیب بند، مسدس، واسوخت اور مخمس لکھے

گئے ہیں۔

ورق ۷۹ پر لکھا ہے : ہشت آنہ روزانہ از سرکار والابخش برائے من مقرر شدہ بود قبول کردم

دستخطی فرد کا سنو احوال　　　بے دماغی سے ہیں تو دی تھی ڈال
ایک مشفق کو تھا ادھر کا خیال　　　مہربانی سے اونے کھوج نکال
شیخ جی کا رہے سو عجائب مال

ورق ۹۳ پر جو مخمس ہے وہ اس طرح شروع ہوتا ہے :
وقتے کہ از کاماں واسوختہ برآمدہ بودم ، گفتہ شد ؎
قابل ہے میر سیر کے اطوار روزگار
چالیس عجب طرح کی چلے ہے کجی شعار

اس کے بعد حضرت علیؑ مرتضیٰ کی منقبت میں تین مخمس اور ایک مسدس ہے۔
ورق ۹۴ سے (۱) مثنوی اژدرنامہ شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد حسب ذیل مثنویاں ہیں :- (۲) تنبیہ الجہال (ورق ۹۵ ب) (۳) مثنوی در ہجو بے ادبی مسمی بہ زبان زد عالم ؎
سنیو اے اہل سخن بعد از سلام　　　چھیڑتا ہے مجھ کو ایک تخم حرام (ورق ۹۷ ب)
ہجو آئینہ دار ؎
آج سے مجھ کو نہیں رنج و ملال　　　جب سے نکلے بال ، تب سے ہے یہ حال (ورق ۱۰۱)
(۵) سگ نامہ (۱۰۲ ب) (۶) در ہجو خانہ خود (۱۰۳ ب) (۷) مثنوی سگ و گربہ (ورق ۱۰۵) (۸) در تعریف مادہ سگ (ورق ۱۰۶) (۹) در بیان جوش باراں (ورق ۱۰۶ ب) (۱۰) ہجو اکول (ورق ۱۰۸) (۱۱) مثنوی مسمی بہ دم الفضول (ورق ۱۰۹ ب) ؎
اس چرخ بے مدار کے کیا کیا کروں گلے
میرے جگر میں جیسے ستارے ہیں آبلے
تنکا سا اُن نے جور و جفا کر سکھا دیا　　　پھر تس پہ میرے اشک میں مجھ کو بہا دیا

(۱۱) مرثیہ مرغ (ورق ۱۱۳)

ورق ۱۱۳ ب سے قطعات کا آغاز ہوا ہے جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) تعریف اسپ (ورق ۱۱۳ ب) (۲) ہجو خواجہ سرا:

ایک جو خوجہ سے ملا ایک حکیم (ورق ۱۱۴)

(۳) قطعہ در مبارک بادی صحیح شدن بزرگے (ورق ۱۱۴)

ورق ۱۱۵ سے پھر مثنویاں شروع ہوتی ہیں:۔

(۱) مثنوی در تعریف آغا رشید خوش نویس بفرمائش اعزالدین صاحب ؎

میر خطاط یک قلم دیکھے لیکن آغا سے لوگ کم دیکھے

یعنی عبدالرشید تھا استاد خوش نویسی کی جس نے دی ہے داد (ورق ۱۱۵)

(۲) در مبارکبادی کدخدائی بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگرمل کہ برفقیر حقہا داشتند ؎

آؤ ساقی کہ بزم عشرت ہے چشم بد دور خوب صحبت ہے

(۳) ساقی نامہ ؎

ہے قابل حمد وہ سر انداز جو سب میں ہوا ہے جلوہ پرداز

اسی میں میر کی غزل ہے: شراب نکلا، آفتاب نکلا،

(ورق ۱۱۷ ب)

(۴) مثنوی جوش عشق (ورق ۱۲۱) (۵) دریائے عشق (ورق ۱۲۶)

(۶) اعجاز عشق (ورق ۱۳۵) (۷) خواب وخیال (ورق ۱۴۴)

(۸) مثنوی شعلۂ شوق۔

شروع میں لکھا ہے:

آغاز قصہ جاں کاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد پیش وضیع و شریف

بہ ظہور رسیدہ بود ؎

عجب کام بٹنے میں اسے ہوا　　　عجب اہل عالم کو جتے ہوا (کذا)

(۹) مثنوی در ہجو خانہ (ورق ۱۵۶) (۱۰) در تعریف بچہ کپی:

تھا کپتے کا بچہ ایک درویش پاس (ورق ۱۵۹ ب)

(۱۱) در تعریف گربۂ خود کہ موہنی نام داشت (ورق ۱۶۰ ب)

اس کے بعد قصائد ہیں:

(۱) قصیدہ لامیہ (۲) در تعریف امام رضا (۳) در منقبت حضرت علی

(۴) ایضاً (۵) قصیدہ در مدح بادشاہ ہندوستان ؎

جو پہنچی قیامت تو آہ و فغاں ہے　　　مرے ہاتھ میں دامن آسماں ہے

(۶) قصیدہ در مدح وزیر الممالک (۷) قصیدہ در شکایت نفاق یاران

زماں ؎

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے الفت ہے

خراب کوچہ و بازار یہاں محبت ہے

اسی نسخہ کے اوراق ۶۳ سے ۱۷۵ تک ایک دوسرے کاتب رادھا کشن نے لکھے ہیں۔ ترقیمہ میں لکھا ہے:

تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ بیست نہم شہر شوال روز پنجشنبہ سنہ ۲۰ جلوس شاہ عالم مطابق سنہ ۱۱۹۲ھ بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ من مقام دار الخلافہ شاہ جہان آباد بخط احقر العباد بندہ رادھا کشن کاتب تحریر یافت۔

عبد الباری آسی نے جس قدیم اور قلمی نسخہ کا حوالہ دیا ہے وہ سنہ ۱۲۴۹ھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ نسخہ اس سے زیادہ قدیم ہے۔

(۴) ذکر میر: مخطوطاتِ لاہور و رام پور

ذکر میر کو مرتب کرتے وقت ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے صرف اٹاوہ اور لاہور کے نسخوں سے استفادہ کیا ہے۔ در رام پور کا نسخہ ان کی نظر سے نہیں گزرا، اور ان دونوں کا سالِ انجام و آغاز انھوں نے ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء قرار دیا ہے جو اُن کے خیال میں میر کے لکھنؤ جانے کا بھی زمانہ ہے[1]۔ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں نسخہ اٹاوہ میں آخری واقعات، غلام قادر روہیلہ کا قتل اور دہلی میں مرہٹوں کا تسلط، درج ہیں۔ اول الذکر واقعہ ۶ رجادی الآخر ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۸ء کو پیش آیا ہے اس طرح اس نسخہ میں بلاشبہ ۱۱۹۷ھ / ۱۷۸۲ء کے بعد کے واقعات بھی ہیں۔

نسخہ لاہور کے متعلق قاضی عبدالودود صاحب نے خان بہادر مولوی محمد شفیع سے چند سوالات کئے تھے۔ موخرالذکر کے خط کے بعض ضروری حصے شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج ہیں:

"ذکر میر کا میرا نسخہ بتاریخ ۲۶ ربیع الاول ۱۰ سنہ جلوس اکبر ثانی مطابق بست و ہفتم فروری ۱۸۱۶ء (۱۲۳۱ھ) تحریر ہوا۔ اختتامِ کتاب کا قطعہ تاریخی اس میں ہے[2]...... ۶۰ برس کے ہو جانے کا جو ذکر مطبوعہ نسخے میں ہے وہ میرے قلمی نسخے میں نہیں اس کے بجائے پنجاہ برس کے ہو جانے کا ذکر ہے۔ میرے نسخہ کا خاتمہ چند لطائف پر ہوتا ہے۔ اور ان سے پہلے کی عبارت وہ عبارت ہے جو مطبوعہ نسخے کے صفحہ ۱۲۸ کی سطر ۴ پر ختم ہوتی ہے لیکن اس مصرعہ (این شامت اعمال قیامت بسر آورد) کے بعد یہ سطر دی ہے: "آنچہ از اسلوب معلوم می شود، حسام الدین خان (در اصل

---

[1] ذکر میر: مقدمہ ص "ص" [2] ایضاً صفحہ "ف"

ازمیاں رفت، چراکہ بدست دشمناں جانی افتادہ است۔[1] تامقدور زندہ نخواہند گزاشت...... اس کے بعد یہ عبارت ہے۔" وگرنہ اختیار در دست اوست۔ (نسخہ مطبوعہ ص ۱۵۳ سطر آخر) اور اس کے بعد...... چھ سات ورق لطائف کے دئے ہیں۔ خاتمہ قطع تاریخ پر ہوتا ہے اور پھر لکھا ہے: تمام شد نسخہ ذکر میر بتاریخ ۲۶ ربیع الاول الخ"

ذکر میر کے نسخہ رام پور کا مفصل ذکر اس کتاب میں پہلے آچکا ہے۔ جو رمضان ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں بھی یہ عبارت ہے:" اکنوں کہ پیری رسید یعنی عمر بہ پنجاہ کشید۔" "احوال فقیر از سہ سال" میں لکھا ہے کہ "اکثر قرض دارمی باشم و بہ عسرت تمام بسر می کنم۔"

افسوس ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے اِس دعوی کے باوجود کہ نسخہ لاہور کے وہ عبارات جو نسخہ' اٹاوہ سے مختلف تھے، درج حاشیہ کئے گئے ہیں۔" یہ نہایت اہم اختلاف نہیں بتلایا کہ اس کے خاتمہ پر عمر ۵۰ سال لکھی ہے۔ جناب قاضی عبدالودود نے لکھا ہے:

"قطعی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں کہ ذکر میر کا آغاز کب ہوا۔ میرا قیاس ہے کہ یہ ۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء میں شروع ہوئی۔ نسخہ لاہور کا انجام بظاہر ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں ہوا اور نسخہ اٹاوہ ظاہراً ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۸ء میں تمام ہوا۔ آغاز کتاب کے بارے میں میرا قیاس صحیح ہے تو کتاب کا بیشتر حصہ (نسخہ مطبوعہ میں ص ۱ سے ص ۱۲۰ تک) کاماں میں قلم بند ہوا ہے۔ محض چند صفحے (۱۲۱ سے ۱۲۸ سطر ۴) دہلی میں اور باقی لکھنؤ[2] میں معرض تحریر میں آئے ہیں۔"

---

[1] حسام الدین کی گرفتاری ۵ جون ۱۷۷۳ء کو عمل میں آئی [2] نقوش نمبر ۳۵، ۳۶، نجف خاں کا انتقال ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۱ء کو ہوا ہے اِس وقت میر لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

(۵) تذکرۂ شورش: مخطوطۂ آکسفرڈ

اِس تذکرہ کے مصنف میر غلام حسین شورش عظیم آبادی (متوفی عشرۂ اولیٰ ۱۱۹۵ھ) ہیں جنھیں عام طور پر میر بھنیائے بھی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر اشپرنگر اور گارساں دتاسی دونوں نے تصنیف کا سال ۱۱۹۳ھ قرار دیا ہے۔[1] لیکن تذکرۂ مسرت افزا میں مرقوم ہے کہ شورش نے اپنے تذکرہ کا نام "یادگار دوستاں" رکھا تھا اور تاریخ تالیف "یادگار دوستانِ روزگار" سے نکالی تھی۔[3] اس سے ۱۱۹۱ھ مستخرج ہوتا ہے۔ شورش کے قلمی نسخے میں نہ یہ نام ہے اور نہ یہ مصرع، اس میں کوئی دیباچہ یا خاتمہ بھی نہیں۔ کاتب نے اپنی جانب سے کتاب کے ختم ہونے کے بعد جو ایک آدھ سطر لکھی ہے اس میں اسے تذکرۂ شورش لکھا ہے۔ کاتب کون ہے اور تذکرہ کب نقل ہوا۔ اس کا حال بھی نہیں معلوم۔ اس میں شورش کا جو ترجمہ ہے اس کی عبارات ذیل توجہ طلب ہیں:

> از نجبایانِ (کذا) عظیم آباد است۔ علم وفضل وریاست از بزرگان میراث دارد وشعر بفصاحت تمام می گوید۔ غزل در طرفۃ العین انجام می نماید (در) کلیاتش قریب چہار ہزار اشعار بنظر درآمدہ[4]

کوئی مصنف اپنا حال اس طرح نہیں لکھتا۔ جناب قاضی عبدالودود کی رائے ہے کہ یہ تذکرہ شورش ضرور ہے لیکن اس میں کسی کے تصرفات ہیں۔

تذکرہ شورش، آبِ حیات کے مآخذ میں شامل ہے۔ آزاد نے میر کے

---

[1] اصلی تذکروں سے ماخوذ ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات از گارساں دتاسی باب اوّل۔ پیرس ۱۸۶۸ء [2] ایضاً وفہرست کتب خانہ شاہان اودھ: اشپرنگر [3] تذکرہ مسرت افزا قلمی۔ نسخہ آکسفرڈ [4] تذکرہ شورش قلمی نسخہ آکسفرڈ۔

ذکر میں لکھا ہے: "تذکرہ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انھیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا ہے۔[1]"

اس نادر اور نایاب تذکرہ کا ایک نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفرڈ میں محفوظ ہے میر کا مندرجہ ذیل ترجمہ اسی نسخہ کے عکس پر مبنی ہے جس کی نقل جناب قاضی عبدالودود صاحب نے کمال مہربانی سے مجھے مرحمت فرمائی ہے:

شاعرے بیظیر محمد تقی میر تخلص شاگرد .... آرزو، متوطن اکبرآباد، الحال در شاہ جہاں آباد تشریف می دارند و فخر شاعراں دہلی خود را می دانند. چنانچہ در تذکرۂ خود شعر شاعرانِ ہندوستان غلط تلاش نمودہ مرقوم ساختہ اگر غلط بدست نیامدہ تاہم اعتراض بے جا و اصلاح خود جاری نمودہ و زندہ و مردہ کسے را سلامت نگذاشتہ مگر بعض اعزہ کہ ازو مربوط بودند آں را محفوظ داشتہ ۔ غرض عجب کسے است و در تذکرہ خود را سید نوشتہ اند۔ مرداں می گویند کہ شیخ است چنانچہ کسے گفتہ:

شیخ تقی نام ہو اور میر کہاوے

دیگرے می گوید:

دلّی میں اک شیخ زادہ گنجے کا میر ہے

سوائے ازیں سید فتح علی گردیزی در تذکرۂ خود تقی میر را سید نوشتہ است پس ایشاں برائے استحکام سیادتِ کاذبۂ خود میر تخلص نمودہ اند۔
ازوست:

سیر کے قابل ہے دل صدپارہ اس نخچیر کا — جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوستہ پیکاں تیر کا

---

[1] آبِ حیات طبع لاہور سنہ ۱۹۵۰ء ص ۲۰۲۔

دراولِ مصرع قطعِ اضافت درست داشتہ اند۔ نزدیک شاعران وہر درست نیست : یہ بھی ایجاد میر صاحب ہے۔ واگر غلطی نمودہ اند شعر اصلاح طلب است لیکن در تذکرہ خود اول ہمیں شعر نوشتہ اند۔ غالب است کہ از غلطی نباشد بلکہ از روئے ایجاد باشد۔

جو ترے کوچے میں آیا پھر نہیں کاڑھا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا

درمصرع اول لفظ "کاڑھا" کہ آوردہ اند برائے بایاں سند است لیکن مردمانِ فصیح درعظیم آبادنمی گویند[۱] مگر عوام الناس می گویند "کھانا کاڑھا گیا"

سے

اگر شہ زور را گویند شب است ایں
بباید گفتن اینک ماہ و پرویں

ازیں راہ درست۔ اگر بہ ایں طور موزوں می کرد، خوب می شد:

جو ترے کوچہ میں آیا پھر نہیں چھوڑا اسے
تشنۂ خوں میں تو ہوں اس خاک دامن گیر کا

آج پڑے بے قرار ہیں ہم بھی
بیٹھ جا جانے ہار ہیں ہم بھی

از شاعرانِ دہلی بہ تحقیق رسیدہ کہ جانے ہار کسے نمی گوید مگر عوراتِ بازاری۔ آں جا کہ شعور ندارند جاں ہار می گویند و ایں ہم درحقِ کسے می گویند کہ از حدِ خود سخن زیادہ می گوید۔ آں را جاں ہار یعنی مرن ہار می گویند۔ تقی میر از فضل الٰہی موجد لفظ و معنی تازہ اند۔ ہرچہ فرمایند درست است۔

---

[۱] کاڑھنا نکالنے کے معنی میں میر کے علاوہ اور قدیم شعرا نے بھی استعمال کیا ہے۔

غم سے یہ میں نے طرح نکالی نجات کی　　　سجدہ اس آستاں پہ کیا اور وفات کی

روزے بخدمت شاہ اعز الدین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کہ در خوش نویسی یکتائے عصر و در شعر فہمی عالی قدر اند، برائے استفادہ التماس کردند کہ "وفات کی" درست است۔ شاہ صاحب موصوف فرمودند کہ درست نیست[1] گفتند کہ استاد گفتہ۔ فرمودہ کدام استاد؟ ایشاں ایں شعر میر تقی میر خواندند۔ شاہ صاحب فرمودند کہ قبل ازیں نمی گفتند۔ الحال ایں چنیں الفاظ می گویند۔ حاصل ایں است کہ "وفات پائی" "وفات ہوئی" درست است

اے چرخ مت حریفِ اندوہ بے کساں ہو

کیا جانے منہ سے نکلے نالے کے کیا سماں ہو

در مصرعِ ثانی ایں شعر کہ نونِ جمع برائے قافیہ از طرفِ خود ایجاد نمودہ اند کسے قبول نمی کند کہ درست نیست مگر "سما" درست می دارند۔۔۔۔[2]

خزاں التفات اس پہ کرنی بجا تھی　　　یہ غنچہ چمن میں ابھی وا ہوا تھا

خزاں، غنچہ و گل و برگ ہمہ را لمی گزارد حکم وبا دارد و در وبا از طفلِ یک روزہ تا پیرِ صد سالہ ہمہ ہلاک می شوند بر کسے لطف نمی کند۔ اگر لطف خواہند یافت آں را خزاں و وبا نخواہند گفت۔۔۔۔۔۔

گو گل و لالہ، کہاں سنبل و سمن اور نسترن

خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

دریں شعر "گو" بمعنی کجا آوردہ اند۔ ایں ہم در شعر کسے نیافتہ۔۔۔۔۔[3]

---

[1] شورش کا یہ اعتراض صحیح ہے۔ [2] قدیم کتابوں میں سماں اور سما دونوں ملتے ہیں [3] انشا: گو صولتِ اسکندر و گو حشمت دارا۔ مگر یہ پورا مصرع فارسی میں ہے۔ اس سے قطع نظر میر کے یہاں غیر [illegible]

خاک میں مل کے میراب سمجھے　　　بے ادائی تھی آسماں کی ادا

درمصرعِ اول تامّل است ۔ اگر ایں طور می گفت خوب می باشد :

خاک میں مل کے میر یہ سمجھے　　　بے ادائی تھی آسماں کی ادا

واگر لفظ اب را کہ بمعنی حال است بحال دارند ، بایں طور خوب می شود :

جب نہ سمجھے تھے میراب سمجھے　　　بے ادائی الخ ....

ایک کو چھوڑا نہ ان نے اس سبب پکڑی گئی

یہ دو سالہ دخترِ رز کس قدر شتناہ ہے

بحضور حضرت عشق مدظلہٗ العالی و مولوی حسن رضا سلمہٗ ..... تقریب ایں شعر مذکور آمدہ بود ۔ آخر بہ تحقیق رسید کہ شتنا بمعنی گوناگوں آمدہ است بنابر زن قحبہ را می گویند کہ او پیشِ شوہر خود از گربہ می زرسد ، وقتیکہ نزدِ غیری می رود درا شنائے راہ مار را می کشد ۔ درسراج می نویسند کہ دراصل شت است و الف زائد است بنابر تانیث بمعنی پراگندہ واز شعر خواجہ حافظ از مے سالہ (کذا) صغر سن بدریافت می آید :

مے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ　　　ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

واز کلام ناظم ہروی ...... از مے دو سالہ پیر بہ اثبات می رسد :

عمر دراز بے ادباں را نصیب نیست　　　گردید پیرِ دخترِ رز چوں دو سالہ شد

حاصل کلام ایں است کہ مے دو سالہ را صغر سن ہم گفتہ اند و پیر ہم قرار داد اند ، ہر دو درست است و زنِ دو سالہ را شتنا می گویند ازیں جہت کہ حکمِ صالحہ و فاسقہ بعدِ بلوغ است مگر از راہ مبالغہ و خفگیٔ مردمانِ دہلی می گویند کہ تو بڑی چھنال ہے ....

(۶) تذکرۂ مسرّت افزا۔ مخطوطۂ آکسفرڈ

اس تذکرے کے مصنّف کا نام امیرالدین احمد، عرف امراللہ، اور کنیت ابوالحسن ہے۔ اس کا صرف ایک نسخہ دنیا میں موجود ہے اور وہ سرولیم اوسلی کا مخطوطہ ہے جو بوڈلین لائبریری آکسفرڈ میں شامل کر دیا گیا ہے گارساں دتاسی نے لکھا ہے:

(مصنف نے) اپنے آبائی وطن الہ آباد کو ترک کرنے کے بعد عظیم آباد میں سکونت اختیار کی۔ پھر کلکتے گئے۔ شاعری کا اس قدر شوق تھا کہ سنہ ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں عین حالت سفر میں انھوں نے ہندوستانی شعرا کا یہ تذکرہ مرتب کیا۔ بعد کو لکھنؤ میں اس کے اور کئی نسخے نقل کیے گئے۔[۱]

اس تذکرے میں جو میر کا ترجمہ ہے وہ دل چسپی اور اہمیت سے خالی نہیں۔ اس کی نقل مجھے قاضی عبدالودود صاحب نے مرحمت فرمائی ہے۔ جو ذیل میں درج ہے میں ان کی اس عنایت کا تہ دل سے ممنون ہوں:

"محمد تقی میر تخلص، مردِ میدانِ سخن و شیر بیشۂ ایں فن است ..... وجودش از ..... اکبرآباد۔ اما قدر و قیمتش در بازار دہلی افزود مشقِ سخن بخدمت ..... آرزو کردہ شاید باوے قرابت خواہرزادگی دارد۔ بسبب رعونت ..... کہ خلقیِ اوست زباں زد زباں آوراں شود باعث عیب جوئی سخن وراں در زبان شاں افتادہ ..... ہر یکے را حوصلۂ عیب جوئی او بہم رسیدہ۔ مرزا رفیع گوید ؎

ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح   لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

---

[۱] اصلی تذکروں سے ماخوذ ہندستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات: گارساں دتاسی پیرس سنہ ۱۸۶۸ء

تذکرہ نکات الشعرا کہ تالیف اوست، دراں عجب نکتہ چینی درکلام شعرائے ریختہ نمودہ، ہرکرا یاد نمودہ بہ تحقیر و بے ادائی آوردہ و اشعار ایشاں را بے رتبہ و ناپسندیدہ چیدہ ذکر کردہ۔ اگر راست بگویم سببِ تالیف ایں تذکرہ ..... ہم ہمیں بود کہ من بزعم حاسدانِ عیب بیں و خردہ گیراں نکتہ چیں ہر یکے کماہی درسطرِ تحریر کشیدم لیکن چوں دریں غربت دیوان احدے باخود بنود کہ اتفاق انتخاب شعر ہا می شود، از اشعار ایشاں انچہ یاد بود نوشتم۔ طرفہ تر کہ میر چوں ہمتِ خود بہ انتخاب اشعار ناپسندیدہ شعرا گماشتہ بود، طبعش بہ ہمیں مرغوب گشتہ ازیں جہت از اشعار خود ہم ہرچہ دراں تذکرہ نوشتہ اکثرے ازاں بے رتبہ و ناپسندیدہ است۔ در دیوانش بہتر ازیں اشعار بنظرِ فقیر آمدہ۔

شنیدم کہ ..... میر سید نسبت۔ میر ناصر مرحوم والد میر درد بمشاہدۂ جودتِ طبعش در عنفوانِ جوانی و آغاز عالش می گفت کہ محمد تقی میر میرِ میدانِ سخن وری خواہد شد۔ ازاں روز خود را ملقب بہ میر ساختہ ...

حضرت مصیبت[1] ..... می فرمودند کہ شخصے در ہمسایۂ من بود کہ خود را شیخ می گفت، بعد چندے جہت سعیٔ معاش سفر کردہ چوں از آنجا بخانہ رسید خود را میر مشہور ساخت۔ روزے بطریقِ استہزا از و پرسیدم کہ در شیخی چہ خلل بود کہ میر شدی۔ گفت پیرِ من مرا میر خطاب داد۔ ایں چند اشعار از زادۂ طبع اوست۔"

---

[1] غلام قطب الدین نام، مصیبت تخلص۔ شاہ خوب اللہ الہ آبادی کے پوتے اور ان کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ مصنف تذکرہ مسرت افزا ان کے سالے تھے۔

(۷) عیار الشعرا (قلمی) ڈاکٹر گارساں دتاسی نے لکھا ہے:

"یہ (عیار الشعرا) دہلی کے خوب چند ذکا کا تذکرہ ہے جس کو انھوں نے بزبانِ فارسی ۱۲۴۷ھ (۲-۱۸۳۱ء) میں یا ۱۲۰۸ھ (۴-۱۷۹۳ء) سے لے کر ۱۲۴۷ھ (۲-۱۸۳۱ء) کے درمیان مرتب کیا۔ کیوں کہ خود اپنے بیان کے مطابق انھوں نے اس تذکرہ پر ۱۳ سال اپنے استاد میر نصیر الدین ناصر المعروف بہ کلّو کے ایمائے صرف کئے۔ ذکا نے ۱۸۴۶ء میں انتقال کیا اور یہ سالِ وفات ڈاکٹر اشپرنگر کو خود ذکا کے بیٹے سے معلوم ہوا۔[1]"

عیار الشعرا کا ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں اور ایک ناقص اور ناتمام نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اُردو ہند میں موجود ہے۔ میر کا ترجمہ یہ ہے:۔

شاعرے ست غرّا، زاد بودمش خطّۂ اکبر آباد، وے سرآمد شعرائے ہند است، غلغلۂ سخن در چار وانگ ہندوستان جنت نشان انداختہ و کلامش مدارج بہم رساندہ۔ چند دیوان و مثنویات و یک نسخہ تذکرہ مختصر و قصائد و رباعیات و مخمس و مسدس و ہجو و مدح و دیگر تصانیف بسیار ازو بروئے کار آمدہ۔ در لکھنؤ بصیغۂ اوستادی در سرکار فیض آثار نواب وزیر الممالک آصف الدولہ یحییٰ خان بہادر ہژبر جنگ بمواجب دو صد روپیہ شرفِ اختصاص دارد۔ الیوم در نواح لکھنؤ بعقل ناقص این بندہ ہم چو او عدیل شاعر زبردست و پر مشق و بسیار گو و خوش و شیریں بیاں، خوش زباں برنہ خاستہ۔ غرض کہ در تالیف فارسی و علی الخصوص در ریختہ گوئی بالکل لاثانی است۔ بندہ چشم آشنا نیست

---

[1] اصلی تذکروں سے ماخوذ ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات: گارساں دتاسی طبع دوم۔ پیرس ۱۸۶۸ء۔

الا سخن آشنا۔۔۔۔"

اسی تذکرہ میں میر فیض علی فیض کے متعلق لکھا ہے :۔

"در لکھنؤ است، پسر محمد تقی میر، جواں اہل طبع و ذی شعور و صاحب تلاش است۔ اشعار خود را بنظر والد بزرگوار خود می گذراند و شوقِ تنہا عی درسر دارد۔ مرد خوب است۔"

(۸) طبقات الشعرا: قدرت اللہ شوق (قلمی؛ آصفیہ)

ورق ۸۶، ۸۷:

محمد تقی میر۔۔۔۔ مصنف تذکرہ شعراء ہندوستان، صاحب دیوان مربوط و کلاں، از اعاظم مستعداں و اکابر عالی فطرتانِ زماں خود است شاعر پرمغز و ہمہ داں، استاد ہم چشمانِ اکثر سخن طرازاں و معنی یاباں محاورات و روزمرات ایں فن از ایشاں اخذ نمودہ، از زمانہ داستاد یگانہ۔۔۔۔ محاورہ دانِ متین، متلاشی مضامین رنگین، متجسس الفاظ چرب و شیریں، ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی تہ داری و پرکاری ظاہر و نمودار است۔ از مدتے بہ سبب افراط و تفریط روزگار ناہنجار ہمراہ ناگرمل کہ دیوان تن و دخیل بادشاہی بود در قلعہ ڈیگ شنیدہ می شود۔ حق تعالیٰ زندہ دارد۔"

ورق ۸۷ پر میر کا یہ شعر لکھا ہے :

کس طرح سے مانیاں یاراں کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرا تو دیکھو میر کا

اس کے بعد لکھا ہے : "دریں زمیں مطلع میرزا رفیع السودا چرب و شیریں است۔۔۔۔ (مصرع ثانی) سلسلہ بہتر ہے سودا کے لئے زنجیر کا"

ورق ۳۹ پر لکھا ہے :

از غزلیات تازۂ اوست کہ باین راقم الحروف نوشتہ

ان تازہ غزلوں میں سے چند یہ ہیں :

(۱) برقع اٹھا تھا موہنہ سے میرے بدگمان کا

(۲) بارہا گور دل جھکا لایا

(۳) الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

(۴) ہونے پر جمع اپنے پھولا بہت تھا لیکن

کیا غنچہ تنگ آیا جب وہ دہاں بنایا

(۵) اوس کام جاں و دل نے عالم کا جان مارا

(۶) ہوتی ہے گرچہ کہنے سے یارو پرائی بات

اس تذکرہ کا خلاصہ علی گڑھ سے شائع ہوا تھا اس سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔ کتب خانۂ آصفیہ میں جو قلمی نسخہ ہے وہ صاف اور روشن ہے اس کی پہلی روایت ۱۷۷۴ء میں اور دوسری ۱۷۹۴ء میں مکمل ہوئی۔

شوق نے شیخ بقاء اللہ بقا کے حال میں لکھا ہے :

در ہجو میر تقی و سودا گفتہ ؎

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ سخن فارسی سے تا ہندی

پر جدا ہے تمام عالم سے وضع سودا و طرز میر تقی

یعنی وہاں لفظ تو ہے پر کن شعر ہی سے یہاں ہے کلام کی بھرتی

کھول دیوان دونو صاحب کے ہم نے جس دم بقا زیارت کی

شعر سودا و میر کے دیکھے دے تو تو تو کرے ہیں یہ ہی ہی

(۹) مجمع الانتخاب: شاہ محمد کمال (قلمی)

یہ تذکرہ ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں مرتب ہوا ہے۔ گارساں دتاسی نے مولف کا نام شاہ محمد کمال اور شاہ کمال الدین حسین لکھا ہے۔ اس تذکرہ کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں موجود ہے اور اس کے ایک ثلث کے قریب اجزا انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانہ میں بھی محفوظ ہیں۔

کمال نے تجلی کے حال میں لکھا ہے:

"تجلی تخلص، نام میر حاجی ولد میر محمد حسین کلیم متوطن شاہ جہاں آباد خویش میر تقی میر، از فقیر بسیار ربط و اتحاد دلی داشت و بسیار آشنا پرست و شاعر کامل بود، عرصہ پنج سال می شود کہ بمکان میر صاحب موصوف بہ لکھنؤ وفات یافتہ۔"

سعادت کے بیان میں لکھا ہے:

میر سعادت علی سعادت تخلص۔ از سادات قصبہ امروہہ ہست۔ احوال ایں از تذکرہ مصحفی صاحب معلوم شدہ گویند روزے در مجلس دردانہ نامی رقاصہ رقص می کرد[1]۔ اتفاقاً کفش از ایشاں گم شد۔ ہر گاہ از مجلس بر آمد و کفش را نیافت۔ ظرافتاً بدیہہ از زبانش سرزد شدہ ایں است:

سعادت شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا
گیا تو جانے دے، دردانہ کے بھڑووں کے سر صدقے"

---

[1] نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ خان دوراں نے بھی بارھویں صدی ہجری کے ارباب طرب کے ذیل میں دہلی کی یگانۂ روزگار طوائفوں اور ڈومنیوں کا ذکر کیا ہے ان کے حالات پڑھنے سے اس عہد کی بزم افروزیوں اور عشرت پسندیوں کا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے۔ (مرقع دہلی ص ۷۵،۷۴)

(۱۰) گلدستۂ نازنینان: منشی کریم الدین مطبوعہ دہلی ۱۸۴۵ء

ص ۳۷: "میر تخلص، افصح فصحا اور ابلغ بلغا اور اشعر شعرائے ہند اور سخن ور عالی مقام، محمد تقی نام ہے۔ یہ شاعر خواہر زادہ سراج الدین علی خاں آرزو کا ہے۔ چھ دیوان ریختہ باصناف سخن منظوم کئے ہوئے اس کے ہیں اور واسوخت اس شاعر کا بہت مشہور اور معروف ہے ہر چند اقسام شاعری سے سب اصناف پر قادر تھا لیکن جس قدر غزلیات اس شاعر بے بدل کی شہرت یافتہ ہوئے ہیں اسی قدر قصائد نے بستگی رتبہ حاصل کی۔ دار الخلافہ شاہ جہاں میں اولاً ابتدائے حال میں آیا لیکن بسبب برگشتگی طالع کے ناکام و مایوس گیا۔ آخر ایام زیست لکھنؤ میں جا کر بسر کئے۔ اور مایحتاج سرکار نواب وزیر الممالک بہادر سے پایا کیا المختصر لکھنؤ ہی میں راہی عدم داعی اجل کو لبیک اور سعدیک کہتا ہوا دوڑا۔ اور مدح اس شاعر کی جتنی لکھئے کم ہے۔ کیوں کہ یہ شاعر ایسے ہی پایہ کا گزرا ہے۔"

اس کے علاوہ میر کے تراجم تذکرہ معدن الجواہر (قلمی آصفیہ ورق ۱۶۱) طور کلیم (طبع آگرہ ص ۱۰۲، ۱۰۳) آب بقا (نول کشور ص ۱۹۶) اور بزم سخن (مطبوعہ مفید عام آگرہ ص ۱۰۹) شمع انجمن (مطبع رئیس المطابع ص ۴۱۴)، میں بھی درج ہیں لیکن ان میں کوئی نئی یا خاص بات نہیں ہے۔

(۱۱) میر کی تصویر

میں اس کتاب میں میر کی تصویر بھی شامل کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی ایسی تصویر جس کے متعلق کامل یقین ہو کہ میر کی ہے، دستیاب نہ ہو سکی۔ سید زوار حسین زیدی دہلوی نے اردو شاعروں کے البم میں میر کی تصویر بھی صفحہ ۹ پر دی ہے۔ (طبع دوم) لیکن پروفیسر مسعود حسین رضوی نے اسے

دیکھ کر فرمایا کہ "یہ صحیح نہیں، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے پاس ایک تصویر ہے، جو میں نے دیکھی ہے اور صحیح ہے۔" ۱۵ر فروری ۱۹۵۴ء۔

سکسینہ صاحب والی تصویر مجھے دیکھنے کو نہیں مل سکی۔

اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں۔ جناب قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور ڈاکٹر محی الدین زور کے علم میں میر کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ زور صاحب کا تو خیال ہے کہ "زوار صاحب نے میر کی جو تصویر البم میں چھپوائی تھی اس کا ماخذ مشتبہ ہے ..... اور میر کی اصلی تصویر اب کہیں نہیں ہے۔"

(مکتوب بنام مؤلف مورخہ ۲۶ر مارچ ۱۹۵۳ء)

اس سلسلہ میں زوار صاحب کا بیان یہ ہے:

"میر کی تصویر کے متعلق عرض ہے کہ سب سے پہلے غالباً ۳۸ء میں رسالہ شاعر آگرہ میر تقی میر نمبر میں یہ تصویر چھپی تھی۔ میں نے اسی سے لی ہے۔ میرا یہ البم شائع ہو چکا تھا کہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں رسالہ ادبی دنیا (نوروز نمبر) ۱۹۳۲ء نظر سے گزرا۔ انھوں نے (یہ تصویر) اس رسالہ میں سب سے پہلے شائع کی تھی اور اس میں لکھ دیا ہے کہ یہ تصویر دہلی کے قدیم گھرانے سے حاصل کی ہے۔ آگرہ والوں نے اسی تصویر کو سامنے رکھ کر دوسری تصویر بنوائی لیکن ان سے بن نہ سکی۔ رسالہ ادبی دنیا میں جو تصویر ہے وہ اس سے بہت اچھی ہے گو اس کے خط و خال نمایاں نہیں ہیں۔ اگر مجھ کو یہ تصویر پہلے مل جاتی تو میں اسی کو شائع کرتا ..... یہی تصویر مستند ہے۔"

(مکتوب بنام مؤلف مورخہ لاہور ۲۸ر مارچ ۵۳ء)

میر کی تصویر کا سب سے قدیم ذکر مجھے شاہ محمد کمال کے قلمی اور نادر تذکرہ مجمع الانتخاب (۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) میں ملا ہے۔ ملاحظہ ہو:

..... خاکپائے فقرا شاہ محمد کمال ولد سید قادر نواز خاں ..... الحجہ غزل ہا می گفت بنظر میاں جرأت صاحب موصوف می گزرانید و بروز اصلاح کہ در ہر ہفتہ دو روز مقرر بود یعنی روز چہار شنبہ و یک شنبہ کہ ہمہ شاگرداں یک جا شدہ غزل ہائے خود می خواندند و اصلاح ہر یک می شد۔ این صحبت و جلسہ در تمام شہر ہیچ جا نبود و بر حال فقیر چنداں الطاف و اشفاق می فرمودند کہ از تحریر و تقریر بیرون است ...... و چوں غیر از سخن انیسے و بجز شعر جلیسے از عالم طفولیت بنظر نیامدہ ازیں جہت تا نوزدہ سال از شوق کمال نقل دواوین اساتذہ یعنی ہر کہ صاحب دیوان بودند تمام و کمال دیوان نویسانیدہ ...... و مبلغ خطیر دریں کار صرف نمودہ و مدت ہا دریں ہمیں فکر عمر گراں مایہ خود را تلف نمودہ، ایں قدر اشعار بہم رسانیدہ کہ در کتب خانۂ نواب آصف الدولہ مرحوم بنودند و نہ جائے دیگر و فقیر اکثر تصویر صاحب دیوان یعنی مرزا رفیع سودا مرحوم و مغفور و میر محمد تقی میر صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ و میر حسن صاحب و میاں محمد قائم صاحب مرحوم و مغفور قریب بیست شعرا صاحب دیوان جمع نمودہ بود کہ بودن تصویر سبب اعتبار است۔

(۱۲) مثنوی لیلیٰ مجنوں

بلوم ہارٹ نے فہرست کتب خانہ انڈیا آفس جلد دوم حصّہ دوم (۱۹۰۰ء) میں میر کی ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ذکر کیا ہے۔ جو کلکتہ سے ۱۸۶۸ء میں چھپی تھی۔ اس کا ایک نسخہ مجھے حال میں ملا ہے۔ سرورق کی عبارت ہے:

قصّۂ لیلیٰ مجنوں: تصنیف کی ہوئی میر تقی صاحب مرحوم کی ہے۔

بالفعل از بس نایاب ہے اس لئے محمّد دائم اللہ نے حاجی سید عبداللہ

مرحوم مغفور کے مطبع احمدی میں ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں چھپوایا۔
یہ مثنوی ٹائپ میں چھپی ہے۔ اور نوّے صفحات پر محیط ہے۔ مصنّف کے قول کے مطابق سن تصنیف ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۵ء ہے۔ شروع میں حمد ہے (بنام جہاں دارِ ارض سما) پھر نعت ہے۔ اس کے بعد خلفائے ثلثہ کی تعریف میں ایک ایک شعر ہے:

ابو بکر صدّیق ہیں یارِ غار — کروں اپنا جی جان ان پر نثار
عُمر جس کو عادل خدا نے کیا — اور اس کو بڑا درجہ اس نے دیا
امیر سوم شاہ عثمان ہے — کیا جمع جس نے کہ قرآن ہے

لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی تعریف میں سولہ شعر ہیں۔ اس کے بعد اپنے وطن اور بزرگوں کا حال لکھا ہے:

ارے میر اپنی حقیقت کو بول — کلی اپنے دل کی شتابی سے کھول
نشان دے تو اپنے وطن کا شتاب — یہ ہی میرا تیرا سوال جواب
ہے بستی بڑی خوبی و ناز کی — سنواری ہوئی بہت اعزاز کی
عجب دل لگن شہر ہے گلعذار — جہاں باغ دیکھے ہزاراں ہزار
وطن میرا اے یار در نود ہے — وہ دفتر میں شاہوں کے ہر نود ہے
بسے جس میں اشراف شیخ و پٹھان — مغل سید اس شہر کے درمیان
بہت اس میں بانکے بہت ہوشمند — ہر اک اپنے گھر بیچ رہتے انند
جو اس شہر کا وصف تھا سو کیا — وہاں ہے مزارِ حسن اولیا
بڑا پیر کہتے ہیں ان کو وہاں — ولایت وہاں کی ہے ان پر عیاں
ولے ہے وہاں اور حاجی ولی — ہے ہادی انھوں کو جناب علی
ہے میرے بزرگوں میں شاہ شرف — کہ ساکن تھے وہ ہند کے اس طرف
مجھے اس طرف کی بڑی یاد ہے — بزرگوں کے ناموں سے دل شاد ہے

اگرچہ بلوم ہارٹ اور سجاد مرزا دہلوی دونوں نے اپنی فہرستوں میں لیلیٰ مجنوں کے اس مطبوعہ کو میر تقی ہی کی طرف منسوب کیا ہے لیکن میرا ذوق کسی طرح اسے تسلیم نہیں کرتا کہ یہ مثنوی میر محمد تقی میر اکبر آبادی ثم الدہلوی پسر محمد علی کی زائیدہ فکر ہے۔ یہ مثنوی کسی ایسے شخص کی ہے جس کا تخلص میر تھا۔ نام کیا تھا، اس کا پتا مثنوی سے نہیں چلتا۔ اس کا مدار کہ میر تقی نام تھا، صاحبِ مطبع کے قول پر ہے جو ضروری نہیں کہ لازماً صحیح ہو۔ ذکر میر سے واضح ہے کہ میر کے باپ، دادا اور پردادا اکبر آباد میں مقیم تھے۔ جس کا مولد ماوی اکبر آباد ہو وہ درنودیا ہر نود کو اپنا وطن کیوں کہے گا؟ اسی طرح حسن اولیا اور شاہ شرف کا کوئی تعلق آگرے سے تحقیق نہیں ہو سکا۔ میر کے والد سنی تھے گو یہ ممکن ہے کہ تفضیلی ہوں لیکن میر کے شیعہ ہونے میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں صاف صاف کہتے ہیں:

جو حیدری نہیں اسے ایمان ہی نہیں

ہو گو شریفِ مکہ مسلماں ہی نہیں

دیوانِ دوم کی دوسری غزل میں "قضیۂ فدک" اور "بتول کی حق تلفی" کا ذکر کیا ہے۔ تیسری غزل (آسی: ص ۲۱۱) تمام تر مدحِ علی میں ہے۔ اور اس میں خلفائے ثلثہ پر کھلی ہوئی چوٹ ہے:

راہِ خدا میں ان نے دیا اپنے بھی تئیں

بہ جود منہ تو دیکھو کسو آشمال کا

اس لئے مثنوی مذکور کا بیان "درصفت چہار یارانِ پیغمبر" میر، شاعرِ مشہور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ بریں اس مثنوی کی زبان اور اس کا انداز و اسلوب میر سے مختلف اور پست ہے۔ میر گلزار کے بدلے گلعذار، بہت بہ سکونِ اوسط اور ریزن

فارع، اور نفع کو وفا کے قافیہ کے ساتھ نہیں لکھ سکتے (ص ۸، ۱۷) اسی طرح

میں ہوں شاعروں کی گلی کا گدا " (ص ۱۲)

یہ انکسار میر کی روش کے بالکل خلاف ہے۔ سنہ ۱۱۶۹ھ سے پہلے میر کی تعلّی اور انانیت دونوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ کلیاتِ میر کے کسی نسخہ میں یہ مثنوی نہیں ملتی حالاں کہ سن مذکور کے بعد کے لکھے ہوئے کلیات ملتے ہیں۔

مآخذ

اصلی تذکروں سے ماخوذ ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات ، باب اول

گارساں دتاسی کتب خانہ مشرقیہ روم یونی ورسٹی (اردو ترجمہ)

آشوب نامۂ ہندوستان بہشتی : مخطوطہ برٹش میوزیم نمبر ۲۶۲۳۵ . نیز مطبوعہ نول کشور لکھنؤ مارچ ۱۸۸۳ء

اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔ مئی ۱۹۲۶ء : مقالہ بعنوان ریختہ از پروفیسر محمود شیرانی

اورنٹیل بیاگرافیکل ڈکشنری : بیل۔ لندن ۱۸۹۴ء

اودھ کے پہلے دو نواب : سری واستو (انگریزی)

انتخاب کلامِ میر : ڈاکٹر عبد الحق

ایشیاٹک سالانہ رجسٹر : ۱۸۰۰ء۔ جلد دوم

آئینِ اکبری : ابو الفضل مرتبہ سرسید احمد خاں

آثار الصنادید : سرسید احمد خاں ۔ مطبع نول کشور

اُردو غزل : ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۔ طبع دوم ۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ : عبد اللہ یوسف علی

افادات سلیم : مرکنٹائل پریس دہلی

ان فلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر : ڈاکٹر تاراچند

الندوہ : اکتوبر ۱۹۰۶ء

الندوہ : فروری ۱۹۱۱ء

احوالِ غالب : مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین آرزو مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند

انیس العشاق : حسن بن محمد شرف الدین

ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ : ڈاکٹر سید عبداللہ (انجمن ترقی اُردو ہند)

اینالس آف فورٹ ولیم کالج (انگریزی)

ارباب نثر اُردو : سید محمد (طبع حیدرآباد دکن)

اُردو کی عشقیہ شاعری : فراق گورکھپوری (طبع الہ آباد)

آب حیات : محمد حسین آزاد (شیخ مبارک علی لاہور)

برہان قاطع : نول کشور ۱۸۸۷ء

بہارستان : مولانا عبدالرحمٰن جامی

بحث و نظر : ڈاکٹر سید عبداللہ - مکتبہ اُردو لاہور

پنجاب میں اُردو : پروفیسر محمود شیرانی - طبع دوم

تذکرہ شعرائے اُردو : میر حسن دہلوی - انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۴۰ء

تذکرہ بہار بے خزاں : قلمی نسخہ مملوکہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ

تذکرہ ہندی گویاں : غلام ہمدانی مصحفی - انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۳ء

تذکرہ خوش معرکۂ زیبا : قلمی - مؤلفہ سعادت خاں ناصر - کتب خانۂ مشرقیہ - پٹنہ

(سال آغاز تذکرہ ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء)

تذکرہ کریم الدین و فیلن : طبقات شعرائے ہند۔ مطبع العلوم مدرسہ دہلی سنہ ۱۸۴۸ء

تذکرہ عقد ثریا : شیخ غلام ہمدانی مصحفی۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند

تکملۃ الشعرائے جام جمشید : قلمی ۔ شوق رام پوری ۔ نسخۂ رام پور

تذکرہ سخن شعرا : عبدالغفور نساخ ۔ مطبع منشی نول کشور سنہ ۱۸۷۴ء

تذکرہ شمیم سخن : مولوی عبدالحیٔ صفا بدایونی ۔ مطبوعہ نول کشور سنہ ۱۸۹۱ء

تذکرۂ شاکر خاں (قلمی) : نواب شاکر خاں بن لطف اللہ خاں

تذکرہ عشقی عظیم آبادی : قلمی نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ

تذکرہ ریختہ گویان : فتح علی حسینی گردیزی ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند سنہ ۱۹۳۳ء

تذکرہ سرور دہلوی : قلمی نسخہ لندن ۔ سال آغاز ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء

تذکرہ گل رعنا : حکیم سید عبدالحیٔ ناظم ندوۃ العلما ۔ مطبع معارف اعظم گڑھ

تذکرہ گلشن بے خار : نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ نول کشور

تذکرہ قاسم : مجموعہ نغز ۔ مرتبہ پروفیسر محمود شیرانی ۔ طبع لاہور

تذکرہ مخزن نکات : شیخ قائم چاندپوری ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۲۹ء

تذکرہ گلدستہ نازنینان : مولوی کریم الدین رضا لائبریری رام پور ، وکتب خانہ آصفیہ

تذکرہ طبقات الشعرا : قدرت اللہ شوق ۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن

تذکرہ چمنستان شعرا : لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) سنہ ۱۹۲۸ء

تذکرہ نکات الشعرا : مرتبہ نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی ۔ اشاعت اول

تذکرہ نکات الشعرا : مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۔ اشاعت ثانی

تذکرہ ریاض الفصحا : شیخ غلام ہمدانی مصحفی ۔ مطبوعہ انجمن ترقی اُردو ہند سنہ ۱۹۳۴ء

تذکرہ گلستانِ سخن : صاحب عالم مرزا قادر بخش صبا دہلوی مطبع مرتضوی دہلی
تذکرہ مقالات الشعرا (قلمی) : قیام الدین حیرت۔ رضا لائبریری رام پور
تذکرہ گل عجائب : تمنا اورنگ آبادی مطبوعہ انجمن ترقی اردو سنہ ۱۹۳۶ء
تذکرہ بہارستان ناز : مولفہ حکیم محمد فصیح الدین رنج مطبع دار العلوم میرٹھ سنہ ۱۸۶۹ء
تذکرہ گلشن ہند : مرزا علی لطف۔ مطبع مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سنہ ۱۹۳۴ء
تذکرہ گلزار ابراہیم : قلمی۔ نواب امین الدولہ علی ابراہیم خاں بہادر خلیل رضا لائبریری رام پور
تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار : نصر اللہ خاں خرجوی۔ مطبوعہ فتح الاخبار کول سنہ ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء
تذکرہ گلشن سخن : قلمی۔ مرزا کاظم مبتلا لکھنوی (رضا لائبریری رام پور)
تذکرہ شاعرات اردو : مطبوعہ قومی کتب خانہ بریلی
تذکرہ آب بقا : جعفر علی نشتر لکھنوی۔ نول کشور۔
تذکرہ سراپا سخن : سید محمد محسن علی مولوی محسن طبع سنہ ۱۲۷۷ھ ۱۸۶۰ء
تزک جہاں گیری : مطبوعہ سنہ ۱۸۶۳ء
تذکرہ شورش : (قلمی نسخہ۔ بوڈلین لائبریری آکسفرڈ) مولفہ میر غلام حسین شورش عظیم آبادی سنہ ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء۔
تذکرہ مسرت افزا : (قلمی نسخہ بوڈلین لائبریری آکسفرڈ) مولفہ ابو الحسن امیر الدین احمد المعروف بہ امر اللہ الہ آبادی ساکن عظیم آباد سنہ ۱۱۹۳ھ ۱۷۷۹ء
تذکرہ مجمع الانتخاب : (قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند) مولفہ شاہ محمد کمال سنہ ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء
تذکرہ عیار الشعرا : قلمی نسخہ انجمن ترقی اردو ہند۔ مولفہ خوب چند ذکا دہلوی
تذکرہ معدن الجواہر یعنی تذکرہ شاعرانِ منتخب مولفہ مولوی محمد مہدی واصف قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن۔

تذکرہ گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب : مطبوعہ نول کشور مولفہ
حکیم سید قطب الدین باطن ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء
تذکرہ طور کلیم : سید نور الحسن خاں مطبع مفید عام آگرہ ۱۲۹۸ھ ۱۸۸۰ء
تذکرہ شمع انجمن : صدیق حسن خاں ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء مطبع رئیس المطابع
تذکرہ بزم سخن : سید علی حسن خاں ابن صدیق حسن خاں مطبوعہ مفید عام آگرہ ۔
تاریخ عالم گیر ثانی : (قلمی) مصنف نامعلوم
تاریخ ہند : مولوی ذکاء اللہ دہلوی ۔ طبع علی گڑھ ۱۹۱۷ء
تاریخ اودھ : حصہ سوم ۔ نجم الغنی خاں رام پوری ۔ نول کشور ۱۹۱۹ء
تاریخ فرخ آباد : اردو ترجمہ
تاریخ محمدی : مولفہ مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی مخطوطہ رام پور
تاریخ فرشتہ : ابو القاسم ہندو شاہ فرشتہ ۔ نول کشور
تاریخ اہل ہند : ڈاکٹر تارا چند
تاریخ جہاں کشائے نادری : مرزا مہدی ۔ بمبئی
تاریخ مشائخ چشت : پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ ندوۃ المصنفین دہلی
تاریخ احمد شاہی : اول و آخر ناقص
تاریخ حسین شاہی : امام الدین حسینی
تاریخ عبرت افزا : مولوی خیر الدین خاں گویاموی مترجمہ مرزا علی رضا محزون مطبوعہ برلاس پریس مراد آباد
تاریخ زبان اردو : ڈاکٹر مسعود حسین خاں مطبوعہ دہلی
تنقیدی مقالات : ڈاکٹر محی الدین زور ۔ طبع چہارم
تاریخ مظفری : محمد علی خاں مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

تاریخ ادب ہندی : پنڈت شیام بہاری مصرا
تاریخ ادبیات ہندی وہندوستانی : گارساں دتاسی (فرانسیسی) جلد دوم طبع ثانی
ٹوای لائٹ آف دی مغلز : پی اسپیر
ٹریولس ان انڈیا : ٹی ٹوئننگ
جرأت - ان کا عہد اور عشقیہ شاعری : اردو اکاڈمی کراچی ۱۹۵۲ء
جلوۂ خضر : ج ۲ . صفیر بلگرامی
جزئیات وکلیات : ضیاء الدین نخشبی
جواہر سخن : جلد دوم مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد
چہار گلزار شجاعی : (قلمی) ہرچرن داس
چراغِ ہدایت : سراج الدین علی خاں آرزو
حدائق الشعرا : نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال
حجۃ اللہ البالغہ : شاہ ولی اللہ دہلوی . ترجمہ اردو . مطبوعہ امرت سر
خزانہ عامرہ : آزاد بلگرامی مطبع نول کشور کان پور ۱۸۷۱ء
خاندان شیواجی : (انگریزی) سرجدو ناتھ سرکار
خم خانۂ جاوید : لالہ سری رام دہلوی مطبوعہ جلد پنجم
خزینۃ العلوم فی متعلقات منظوم : منشی درگا پرشاد نادر سرہندی . مطبع مفید عام لاہور ۱۸۷۹ء
خطباتِ گارساں دتاسی : مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۵ء
خطبہ صدارت انڈین ہسٹری کانگریس منعقدہ کلکتہ : از ڈاکٹر تارا چند

دیوانِ جہاں : بینی نرائن جہاں لاہوری ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء (مطبوعہ)

دیوان قصائد مصحفی : مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

دیوان زادۂ حاتم : قلمی۔ رضا لائبریری رام پور

دریائے لطافت : میر انشاء اللہ خاں انشا مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۵ء

دہلی کرونیکل : مجہول المصنف۔ تلخیص از سر جدو ناتھ سرکار۔ اقتباس مرسلہ جناب قاضی عبدالودود،

دہلی اُردو اخبار : ۲۱ فروری ۱۸۴۱ء (نیشنل آرکائیوز نئی دہلی)

دستور الفصاحت : احد علی یکتا مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔ ہندوستان پریس رام پور ۱۹۴۳ء

دیوان چہارم میر : (قلمی) کتب خانہ مہاراجہ صاحب محمود آباد۔ مکتوبہ محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد

دیوانِ میر۔ فارسی : قلمی نسخہ مملوکہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن

دیوانِ میر ادل (اُردو) : قلمی نسخہ مملوکہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن ۱۷۷۸ء

دیوان سودا : (قلمی) کتب خانہ حبیب گنج مکتوبہ ۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۰ء

دلی کا دبستان شاعری : ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی مطبوعہ انجمن اُردو

داستان تاریخ اُردو : مولانا حامد حسن قادری۔ طبع آگرہ

ذکر میر : مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق مطبوعہ اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

ذکر میر : (قلمی) رضا لائبریری رام پور نمبر ۳۸۳ و نسخہ ہائے لاہور و اٹاوہ۔

رسالہ اُردو : اپریل ۱۹۲۶ء، جلد ۷، ۱۹۲۷ء، جنوری ۱۹۳۸ء، جنوری ۱۹۳۱ء،

اپریل ۱۹۳۱ء، اپریل ۱۹۳۶ء، اپریل ۱۹۴۷ء

رسالہ اُردو: کراچی اپریل ۱۹۵۱ء

رسالہ نگار لکھنؤ: ستمبر ۱۹۴۵ء، ج ۴۴ ش ۴، اردو شاعری نمبر، مارچ ۱۹۵۱ء

رسالہ دلگداز: جلد ۱۹: ش ۱ تا ۱۱: ۱۹۱۶ء

رسالہ نیرنگ رام پور: میر نمبر ۱۹۲۸ء

رسالہ معارف: ج ۴۵، ش ۳ و ۴

رسالہ ندیم: بہار نمبر ۱۹۳۵ء

رسالہ مصنف علی گڑھ: دسمبر ۱۹۴۳ء

رسالہ مرقع لکھنؤ: (وصل بلگرامی) جون ۱۹۲۶ء

رسالہ صدائے عام پٹنہ: عید نمبر ۱۹۵۳ء

رسالہ نقوش لاہور: ش ۳۳: ۳۴

رسالہ معیار پٹنہ: مئی ۱۹۳۶ء

رسالہ معاصر پٹنہ: ستمبر ۱۹۴۱ء، حصہ ۱ و ۲

رسالہ برگ گل کراچی: ش ۱

رسالہ ہمایوں لاہور: خاص نمبر ۱۹۴۳ء

رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن: مقالہ دہلی ۱۸۲۶ء میں"

رسالہ زمانہ کرے: ج ۱۹۳۲ء مقالہ بعنوان غیر ہندو مرہٹی ادب از سی جی کروے

زوال سلطنت مغلیہ: سرجدو ناتھ سرکار ۳ جلدیں (انگریزی)

سیر المتاخرین: نواب غلام حسین خاں طبا طبائی

سرگزشت حاتم : مرتبہ ڈاکٹر محی الدین زور طبع حیدرآباد ۱۹۴۴ء

سیرت فریدیہ : حالات فریدالدین خاں وزیر اکبر شاہ ثانی مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۶ء

سوز و گداز : (مثنوی) از شوق نیموی

سودا : شیخ چاند۔ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۶ء

سفر نامۂ انند رام مخلص : مرتبہ ڈاکٹر اظہر علی۔ طبع رام پور ۱۹۴۶ء

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات : مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

شعر الہند : مولانا عبدالسلام ندوی مطبع معارف اعظم گڑھ ج ۱، ۲

شرح دیوان غالب : نظم طبا طبائی

شعر العجم : مولانا شبلی نعمانی۔ دار المصنفین اعظم گڑھ جلد ۴

شعلہ عشق : نسخہ قدیمہ مملوکہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن۔ مطبوعہ مطبع مصطفائی ۱۸۱۲ء

شعلہ جاں سوز : منشی محمد باقر علی خاں۔ مطبع محمدی ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۸ء مملوکہ دہلی کالج لائبریری، دہلی

شعلہ جوالہ : مطبوعہ نول کشور

شاہ عالم نامہ : غلام علی خاں خواص۔ بپٹسٹ مشن پریس کلکتہ ۱۹۱۴ء

شکایت رنجش : داسوخت امیر مینائی۔ مخطوطۂ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء

شاہ عالم اینڈ ہز کورٹ : اے، ایچ، پولیر

عماد السعادت : سید غلام علی خاں نقوی مطبع نول کشور ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء

عبرت نامہ : خیر الدین محمد جلد ۲ مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

عالم گیر نامہ : منشی محمد کاظم بن محمد امین مخطوطہ دہلی کالج لائبریری دہلی۔ نیز نسخہ مطبوعہ کالج پریس کلکتہ ۱۸۶۸ء

عالم گیر نامہ : مرزا محمد ساقی مستعد خاں مطبع الٰہی آگرہ ۱۸۷۳ء

غرۃ الکمال : (دیباچہ) حضرت امیر خسرو دہلوی مطبع قیصری دہلی
غوامض سخن : مطبع نظامی کان پور ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء
فہرست کتب خانہ ہائے شاہ اودھ : اشپرانگر مطبوعہ کلکتہ ۔ نیز یادگار شعرا
مترجمہ طفیل احمد مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد ۱۹۴۳ء
فہرست مخطوطات برٹش میوزیم : بلوم ہارٹ مطبوعہ ۱۸۹۹ء
فہرست مخطوطات انڈیا آفس : بلوم ہارٹ ۔ فہرست مطبوعات ج ۲ حصہ ۲۔
فیض میر : میر تقی میر ۔ مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی
فوائد الفواد : ملفوظات حضرت شیخ نظام الدین اولیا ۔ از خواجہ میر حسن علا سجزی
مطبوعہ نول کشور
فلسفہ میر : آہ سیتاپوری ۔ ۱۹۳۶ء
قواعد میر : عشرت لکھنوی
قدیم دلّی کالج نمبر : دلّی کالج میگزین کا قدیم دلّی کالج کا نمبر مرتبہ راقم الحروف
۱۹۵۳ء ۔ مقالہ گلستان سخن از قاضی عبدالودود صاحب
قولِ فیصل : امام بخش صہبائی ، مطبع نظامی کان پور ۱۸۶۲ء
قاموس المشاہیر : جلد اول و دوم مطبوعہ نظامی پریس بدایوں
کلیات میر فارسی : قلمی ۔ آصفیہ حیدرآباد دکن نمبر ۱۱۲۴ مکتوبہ ۱۷۹۹ء
کلیات ولی : مرتبہ مولانا احسن مارہروی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۲۷ء
کلیات ولی : مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی طبع ۱۹۴۵ء
کلیات نشا فارسی : مرزا احمد نشاد اد سید انشا ۔ نسخہ کتب خانہ مشرقیہ پٹنہ۔

کلیات مصحفی : قلمی - پنجاب یونی ورسٹی لائبریری لاہور

کلیاتِ میر : قلمی - رضا لائبریری رام پور مکتوبہ ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۰ء

کلیاتِ میر : مرتبہ آسی لکھنوی - نول کشور سنہ ۱۹۴۱ء

کلاسکی ادب : خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ آزاد کتاب گھر، دہلی

کلیات ناسخ : ناسخ لکھنوی - مطبع مولائی، لکھنؤ

کاشف الحقائق : نواب سید امداد امام اثر جلد دوم

کلمات طیبات : مطبع نامی گرامی مفید عام آگرہ سنہ ۱۹۱۴ء

کیمبرج ہسٹری آف انڈیا : (انگریزی) ج ۴

گنج تواریخ : عبدالغفور ناسخ

گلزار شجاعی : قلمی نسخہ

گلشنِ فیض : (لغت) جلال لکھنوی

لے ٹر مغلز : ڈبلو ارون

مزامیر : نواب جعفر علی خاں اثر - کتابی دنیا، دہلی جون سنہ ۱۹۴۶ء

مرقع زبان و بیان دہلی : سید احمد دہلوی طبع سنہ ۱۹۱۵ء

ملفوظات شاہ عبدالعزیزؒ : مرتبہ قاضی بشیر الدین مطبوعہ میرٹھ سنہ ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء

مصحفی اور ان کا کلام : ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور

مجموعہ مکاتیب سید احمد بریلوی : قلمی نسخہ کتب خانہ ریاست ٹونک

مرقع دہلی : نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ خان دوراں مع مقدمہ از حکیم سید
سید مظفر حسین حیدر آبادی - تاج پریس حیدر آباد دکن

مقدمات عبدالحق : ڈاکٹر مولوی عبدالحق جلد اول و دوم

مجمع النفائس : خان آرزو ۔ قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور

مقدمہ شعر و شاعری : مولانا الطاف حسین حالی

موازنہ انیس و دبیر : شبلی نعمانی

مرزا شوق لکھنوی : خواجہ احمد فاروقی ۔ نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مقدمہ دیوان مومن : مولانا ضیاء احمد بدایونی

مراثی میر : مرتبہ سید مسیح الزماں جائسی مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۵۱ء

مراۃ الاصلاح : آنند رام مخلص

معراج العاشقین : حضرت گیسو دراز

مجمع الانتخاب : مولفہ شاہ کمال سنہ ۱۲۱۹ھ / ۱۸۱۴ء

مفتاح التواریخ : مطبوعہ نسخہ ۔ دہلی کالج لائبریری

معدن الفوائد : مرزا قتیل مطبع محمدی سنہ ۱۲۵۷ھ / ۱۸۴۱ء

مجالسِ رنگین : مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ۔

مثنویاتِ میر : سر شاہ سلیمان ۔ نظامی پریس بدایوں

نکات سخن : مولانا حسرت موہانی ۔ کان پور

نادرات شاہی : مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی مطبوعہ رام پور سنہ ۱۹۴۴ء

نشتر عشق : (قلمی) حسین علی خاں عاشقی عظیم آبادی ۔ رضا لائبریری ۔ رام پور

نادر شاہ : فریزر

نوادر الکملا : بحوالہ دیوان چہارم میر (قلمی) مکتوبہ محمد محسن مملوکہ کتب خانہ ریاست محمود آباد

نالۂ درد : خواجہ میر درد ۔ مطبع شاہ جہانی بھوپال سن تصنیف ۱۱۹۰ھ

واقعات دارالحکومت دہلی : بشیرالدین احمد دہلوی طبع دہلی ۱۹۲۴ء جلد اول

وقائع عالم شاہی : کنور پریم کشور فراقی ۔ مطبوعہ رام پور ۱۹۴۹ء

واسوخت عرش : علیہ حضرت میکش اکبرآبادی ۔

ہندوستانی مغلوں کی فوج : ولیم ارون

ہسٹری آف دی رین آف شاہ عالم : فرینکلن ۔ لندن ۱۷۹۸ء

ہماری زبان : دہلی مورخہ یکم دسمبر ۱۹۴۲ء

یادگار وطن : شوق نیموی مطبوعہ قومی پریس لکھنؤ ۱۸۹۶ء

یادگار شعرا : ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد ۱۹۴۳ء